شذراتِ سلیمانی

حصہ سوم

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ (ہند)

حوالہ اردو

ش
۸۲
۲۷

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (نمل ۱۷)

شذرات سلیمانی

حصہ سوم

A.No =
~~270340~~
108/072
0098 30

مولانا سید سلیمان ندوی کے ان شذرات کا مجموعہ جو سنہ ۱۹۳۳ء سے سنہ ۱۹۵۰ء تک
مختلف النوع موضوعات پر معارف میں شایع ہوئے

دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ (ہند)
۲۷۶۰۰۱

جملہ حقوق بحق دارالمصنفین محفوظ

سلسلہ دارالمصنفین نمبر ۱۸۱

نام کتاب شذرات سلیمانی حصہ سوم
مصنف علامہ سید سلیمان ندوی ؒ
صفحات ۴۵۴ + ۸
پہلا ایڈیشن اکتوبر سنہ ۱۹۹۸ء
مطبع معارف پریس شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ
ناشر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ
قیمت

باہتمام

عبدالمنان ہلالی

ش ۲۲ / ۲۷

فہرست

شذرات سلیمانی حصہ سوم (سنہ وار)

دیباچہ ضیاء الدین اصلاحی ا - ب

سنہ ۱۹۳۳ء ۱ - ۳۸

جنوری (صـ ۱) فروری (صـ ۳) مارچ (صـ ۶) اپریل (صـ ۱۰) مئی (صـ ۱۳) جون (صـ ۱۶) جولائی (صـ ۱۹)
اگست (صـ ۲۱) ستمبر (صـ ۲۵) اکتوبر (صـ ۲۸) نومبر (صـ ۳۱) دسمبر (صـ ۳۵)

سنہ ۱۹۳۴ء ۳۹ - ۷۳

جنوری (صـ ۳۹) فروری (صـ ۴۱) مارچ (صـ ۴۳) اپریل (صـ ۴۷) مئی (صـ ۴۸) جون (صـ ۵۱) جولائی (صـ ۵۴)
اگست (صـ ۵۷) ستمبر (صـ ۶۰) اکتوبر (صـ ۶۳) نومبر (صـ ۶۶) دسمبر (صـ ۷۰)

سنہ ۱۹۳۵ء ۷۴ - ۱۰۵

جنوری (صـ ۷۴) فروری (صـ ۷۷) مارچ (صـ ۸۰) اپریل (صـ ۸۴) مئی (صـ ۸۷) جون (صـ ۹۰) جولائی (صـ ۹۳)
اگست (صـ ۹۶) ستمبر (صـ ۱۰۰) اکتوبر (صـ ۱۰۳)

سنہ ۱۹۳۶ء ۱۰۶ - ۱۲۶

اپریل (صـ ۱۰۶) جولائی (صـ ۱۰۹) اگست (صـ ۱۱۲) ستمبر (صـ ۱۱۴) اکتوبر (صـ ۱۱۷) نومبر (صـ ۱۲۱) دسمبر (صـ ۱۲۳)

سنہ ۱۹۳۷ء ۱۲۷ - ۱۶۰

جنوری (صـ ۱۲۷) فروری (صـ ۱۲۹) مارچ (صـ ۱۳۲) اپریل (صـ ۱۳۴) مئی (صـ ۱۳۶) جون (صـ ۱۳۹)
جولائی (صـ ۱۴۱) اگست (صـ ۱۴۴) ستمبر (صـ ۱۴۶) اکتوبر (صـ ۱۴۹) نومبر (صـ ۱۵۱) دسمبر (صـ ۱۵۸)

سنہ ۱۹۳۸ء

۱۶۱ - ۱۹۰

جنوری (ص ۱۶۱) فروری (ص ۱۶۳) مارچ (ص ۱۶۵) اپریل (ص ۱۶۸) مئی (ص ۱۷۱) جون (ص ۱۷۳)
جولائی (ص ۱۷۶) اگست (ص ۱۷۹) ستمبر (ص ۱۸۱) اکتوبر (ص ۱۸۴) نومبر (ص ۱۸۶) دسمبر (ص ۱۸۸)

سنہ ۱۹۳۹ء

۱۹۱ - ۲۲۰

جنوری (ص ۱۹۱) فروری (ص ۱۹۳) مارچ (ص ۱۹۵) اپریل (ص ۱۹۸) مئی (ص ۲۰۳) جون (ص ۲۰۵)
جولائی (ص ۲۰۷) اگست (ص ۲۰۹) ستمبر (ص ۲۱۱) اکتوبر (ص ۲۱۳) نومبر (ص ۲۱۵) دسمبر (ص ۲۱۸)

سنہ ۱۹۴۰ء

۲۲۱ - ۲۵۵

جنوری (ص ۲۲۱) فروری (ص ۲۲۳) مارچ (ص ۲۲۶) اپریل (ص ۲۳۱) مئی (ص ۲۳۴) جون (ص ۲۳۸)
جولائی (ص ۲۴۰) اگست (ص ۲۴۲) ستمبر (ص ۲۴۵) اکتوبر (ص ۲۴۸) نومبر (ص ۲۵۰) دسمبر (ص ۲۵۲)

سنہ ۱۹۴۱ء

۲۵۶ - ۲۸۳

جنوری (ص ۲۵۶) فروری (ص ۲۵۸) مارچ (ص ۲۶۰) اپریل (ص ۲۶۲) مئی (ص ۲۶۵) جون (ص ۲۶۷)
جولائی (ص ۲۷۰) اگست (ص ۲۷۲) ستمبر (ص ۲۷۴) اکتوبر (ص ۲۷۶) نومبر (ص ۲۷۸) دسمبر (ص ۲۸۱)

سنہ ۱۹۴۲ء

۲۸۴ - ۳۱۶

جنوری (ص ۲۸۴) فروری (ص ۲۸۷) مارچ (ص ۲۹۰) اپریل (ص ۲۹۲) مئی (ص ۲۹۴) جون (ص ۲۹۷)
جولائی (ص ۲۹۹) اگست (ص ۳۰۲) ستمبر (ص ۳۰۵) اکتوبر (ص ۳۰۸) نومبر (ص ۳۱۰) دسمبر (ص ۳۱۳)

سنہ ۱۹۴۳ء

۳۱۷ - ۳۳۷

جنوری (ص ۳۱۷) فروری (ص ۳۲۰) مارچ (ص ۳۲۲) اپریل (ص ۳۲۵) مئی (ص ۳۲۸) جون (ص ۳۲۹) جولائی (ص ۳۳۲)
ستمبر (ص ۳۳۵)

سنہ ۱۹۴۴ء ۳۳۸ - ۳۴۹

اگست (ص ۳۳۸) ستمبر (ص ۳۴۰) اکتوبر (ص ۳۴۲) نومبر (ص ۳۴۵) دسمبر (ص ۳۴۷)

سنہ ۱۹۴۵ء ۳۵۰ - ۳۷۱

اپریل (ص ۳۵۰) مئی (ص ۳۵۲) جون (ص ۳۵۵) جولائی (ص ۳۵۸) اگست (ص ۳۶۱) نومبر (ص ۳۶۵)
دسمبر (۳۶۸)

سنہ ۱۹۴۶ء ۳۷۲ - ۳۹۸

جنوری (ص ۳۷۲) فروری (ص ۳۷۵) مارچ (ص ۳۷۸) اپریل (ص ۳۸۱) مئی (ص ۳۸۴)
جون (ص ۳۸۷) جولائی (ص ۳۹۰) ستمبر (ص ۳۹۳) اکتوبر (ص ۳۹۵)

سنہ ۱۹۴۸ء ۳۹۹ - ۴۱۲

جولائی (ص ۳۹۹) ستمبر (ص ۴۰۳) اکتوبر (ص ۴۰۶) نومبر (ص ۴۰۹)

سنہ ۱۹۵۰ء ۴۱۳ - ۴۱۹

مئی (ص ۴۱۳) جون (ص ۴۱۵)

اشاریہ ۴۲۱ - ۴۵۴

ش ۵
۴۲
۲۴

دیباچہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی نے شذرات سلیمانی کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ الحمد للہ اس جلد کی اشاعت کے بعد مکمل ہو گیا۔ اس حصہ میں ۱۹۳۳ء سے ۱۹۵۰ء تک حضرت سید صاحبؒ کے تحریر کردہ شذرات شامل ہیں۔

پہلے دونوں حصوں کی طرح یہ تیسرا حصہ بھی مفید اور قیمتی خیالات اور بلند مطالب پر مشتمل ہے، اس میں اس دور کے اہم حالات و واقعات، قوم و وطن کے افکار و رجحانات، ملی، علمی، تعلیمی، ادبی اور تصنیفی اداروں، مختلف انجمنوں، تحریکوں، مدارس و جامعات اور اردو کے مسائل کا جا بجا تذکرہ ہے، اردو کی مقبولیت اور عالمگیری کا، صوبہ کی پنت گورنمنٹ کا اس کے خلاف معاندانہ رویہ بھی زیر بحث آیا ہے، سید صاحب نے اردو کا نام بدل کر ہندوستانی رکھے جانے کی بار بار تجویز پیش کی ہے اور اس کو نہایت مفید بتایا ہے، ایک جگہ آنجہانی ٹنڈن جی کے اس مطالبہ کا جائزہ لیا ہے کہ "مسلمان ہندو کلچر اختیار کر لیں"۔

غرض اس کتاب کے مشمولات سے اب بھی بہت کچھ رہنمائی ملے گی، اس لیے اس کی اشاعت ضروری تھی، امید ہے کہ اصحاب علم و ادب اس کو پسند کریں گے اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

ناچیز

ضیاء الدین اصلاحی

۱۰؍ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

شذرات

(جنوری سنہ ۱۹۳۲ء تا دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء)

شاید ناظرین کو معلوم ہو، کہ ہماری سیرۃ النبیؐ کی تین گذشتہ جلدوں کا ترجمہ قسطنطنیہ میں ترکی زبان میں ہوچکا ہے، جناب نواب فخر یار جنگ بہادر (حیدرآباد دکن) جن کے پہلو میں اسلامی درد ہے، اور جو نہایت دیندار مسلمان ہیں، وہ ٹرکی کی سیاحت ابھی کر آئے ہیں، اپنے ایک مکرمت نامہ میں لکھتے ہیں،

> میں کچھ عرصہ ہوا، ترکی گیا تھا، اور باوجود اس کے کہ جن لوگوں کے ہاتھ زمام حکومت ہے، وہ اس سے زیادہ تعلق نہیں رکھتے، ایک بڑی جماعت ایسے لوگوں کی ملی، جو سیرۃ النبیؐ مبارک کی بڑی مداح ہے، اور اس کا جو ترجمہ ترکی میں ہو چکا ہے، اس کو وہ بہت شوق سے مطالعہ کرتے ہیں، خود استنبول تو چونکہ مغرب زدہ ہوچکا ہے، وہاں زیادہ لوگ نہیں ملے، لیکن بروصا میں جو شاہان عثمانیہ کا فتح استنبول سے پہلے قریب ڈیڑھ سال کے دارالحکومت رہا ہے، بہت احباب کو سیرۃ النبیؐ کا دلچسپی سے ذکر کرتے سنا، خدا آپ کے مساعی جمیلہ کو بارآور کرے،

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے، کہ اس نے دارالمصنفین کے اس نیک عمل کو یہ عزت بخشی، کہ

اس کے ذریعہ سے ترکی میں جس کے متعلق ہر روز خدا جانے کیا کیا کہا جاتا ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا فیض پہنچایا، دل سے دعا ہے، کہ وہ خداوند قلوب اس کے بدولت خود اس کے مؤلف اور مسلمانوں کے دلوں کو اس محبت نبوی ﷺ سے ہمیشہ معمور رکھے،

ہم نے تاریخ ہند کی نسبت پچھلے دو پرچوں میں جو تجویز پیش کی تھی، بحمد اللہ کہ اس نے ہر دل عزیزی حاصل کی، اور اکثر صاحبوں نے اس کی ضرورت کا اعتراف کیا، اکثر اردو اور بعض انگریزی اخبارات میں اس کا خیر مقدم کیا گیا، خصوصیت کے ساتھ طلبہ کے حلقہ میں سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تجویز کتنی ضروری اور اہم ہے، اور عجیب اتفاق یہ کہ پنجاب کونسل میں نواب احمد یار خاں دولتانہ نے اسی قسم کی ایک تجویز پیش کی تھی، جو افسوس ہے کہ منظور نہ ہو سکی، اس مجوزہ تاریخ ہند کی نسبت پورا خاکہ ہم آئندہ پیش کریں گے، جس میں جلدوں کی تعداد، مباحث کا تعین اور مصنفین کے نام لکھے جائیں گے۔

ہندی کو ہندوؤں کی ملکی زبان بنانے کی جو کوشش ملک میں ہو رہی ہے، وہ قابل قدر ہے۔ راجپوتانہ، اور بالآخر گجراتی بولنے والی ریاست بڑودہ میں ہندی کو سرکاری زبان کا منصب مل رہا ہے، لیکن ضرورت ہے، کہ اس کے ساتھ اردو کو بھی زندہ رہنے دیا جائے، صوبہ متوسط کے شعبہ تعلیمات سے سنا جا رہا ہے، کہ اردو کو شہر بدر کیا جا رہا ہے، اگر یہ صحیح ہے، تو حقیقت میں یہی وہ باتیں ہیں، جو ہندوستان کی دو قوموں کو بار بار لڑنے پر آمادہ کرتی ہیں، مدراس کی رکشنا بھارت ہندی پرچار سبھا کے جلسہ تقسیم انعامات منعقدہ ۲۸ ر دسمبر ۳۳ء میں میسور کے ڈاکٹر ہسٹری نے یہ بجا کہا ہے، کہ "سنسکرت شمال وجنوب کی مادری زبان تھی، اور اردو اور ہندی اس کی دو بیٹیاں ہیں، لیکن ضرورت ہے، کہ ان دونوں بہنوں کو باہم دست و گریباں ہونے سے بچایا جائے"

ڈاکٹر صاحب نے اس جلسہ میں یہ تجویز بھی پیش کی ہے، کہ اردو ہندی دونوں زبانوں کے ماہرین کا ایک متحدہ جلسہ حیدرآباد میں منعقد کیا جائے، تا کہ ان دونوں زبانوں کے

درمیان اتحاد کی دقتوں کا حل سوچا جائے، ہم نے خود اسی قسم کی تجویز ہندوستانی اکیڈیمی الٰہ آباد کے سامنے پیش کی تھی، اب بھی ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے ایک آئندہ شائع ہونے والے مجموعۂ مضامین میں اپنے نام کے مضمون میں پیش کی ہے، ضرورت ہے کہ دونوں زبانوں کے چند نیک دل اتحاد پسند اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف توجہ فرمائیں۔

سنا جارہا ہے، کہ بنگال کے کچھ مسلمان اس پر مصر ہیں، کہ اردو کو اپنے صوبہ کے دائرۂ تعلیم میں داخل نہ ہونے دیں، تاکہ صوبہ کے "زبانی اتحاد" میں فرق نہ آنے پائے، یہ خیال مبارک ہے، مگر سوال یہ ہے، کہ صوبہ کے ہندو اگر ہندی کو ملک کی عمومی زبان کی حیثیت سے صوبہ میں داخل ہونیکی اجازت دیدیں، تو اس اتحاد میں فرق آجائے گا، یا نہیں، اور اس وقت بنگال کے مسلمانوں کا اردو کی نسبت طرزِ عمل کیا ہوگا،

ہم کو یہ اچھی طرح معلوم ہے، کہ بنگال، گجرات، مہاراشٹر، مدراس وغیرہ مختلف صوبوں کے مسلمان بچوں کو اپنے صوبوں کی زبانوں کے سیکھنے کے ساتھ ساتھ ایک نئی زبان اردو سیکھنے کی مشکل بھی پیش آتی ہے، جو ہندو بچوں کو پیش نہیں آتی، لیکن اس تھوڑی سی دقت اٹھانے کا فائدہ یہ کیا کم ہے، کہ آج اردو میں لکھی ہوئی ہر کتاب ہندوستان کے ہر صوبہ کے اکثر مسلمان پڑھ لیتے ہیں، اور ایک اردو اخبار پورے ملک کے مسلمانوں کو بیدار اور ہشیار رکھنے میں کامیاب ہے، اور ہندوستان کے ہر صوبہ کے جلسہ میں اردو ذریعۂ تقریر ہے، حالانکہ دوسری قوم اس ملکی عالمگیری کے لئے انگریزی کا سہارا لینے پر ہر قدم پر مجبور ہے، اس کے علاوہ اب تو ہر صوبہ کے ہندو بھی ہندی کو ملکی زبان کی حیثیت سے قبول کرتے جاتے ہیں، اس طرح ایک نئی زبان کا بار صوبوں کی دونوں قوموں پر آیندہ شاید برابر ہوگا، (معارف ماہ جنوری ۱۹۳۳ء)

(۲)

پنجاب یونیورسٹی کی مجلس تحقیقات نے دوسرے صیغوں کے ضمن میں مشرقی علوم اور اورنیٹل کالج لاہور کے مسائل پر کچھ غور کیا ہے، اس کے متعلق مختلف افواہیں اخبارات کے صفحوں میں پڑھنے میں آرہی ہیں، گو آج کل کے کمیشنوں کی اصلاح اور تخریب کے معنوں میں

بہت کم فرق ہے، تاہم ضرورت ہے، کہ پنجاب کے اہلِ علم اس موقع سے فائدہ اٹھاکر متحدہ یکجہتی سے کام لیں، اور علوم مشرقی کی تعلیم میں وہ جدید مناسب اصلاحیں جاری کرائیں، جن سے وہ موجودہ ضروریات کا ساتھ دے سکے، طرزِ تعلیم، طریقۂ تعلیم، نصابِ تعلیم، حقوق یہ سب باتیں بحث واعتنا کے قابل ہیں، اور بجائے اشخاص اور جماعتوں کے متحدہ قوم کی طرف سے اس کا لائحہ عمل پیش ہونا چاہیئے، اور اس کے پیچھے پنجاب کے اسلامی اخبارات کی پوری طاقت ہو، ڈر ہے کہ اختلاف، جماعت داری، اور فرقہ پروری سے فائدہ کے بجائے نقصان پہونچ جائے،

ہمارے پاس بوٹسڈم (جرمنی) سے ایک جرمن فاضل ڈاکٹر برلڈ فان کلوبر (KLUYER) کا ایک جرمن خط مع ایک بگڑے ہوئے اردو ترجمہ کے آیا ہے، جس میں موصوف نے یہ لکھا ہے، کہ وہاں کے انسانی عجائب خانہ میں ہندوستان کا بنا ہوا، ایک عربی کرہ (گلوب ہے) جس پر اس کے بنانے والے کا نام "ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن مُلا عیسیٰ بن شیخ الہداد ہمایونی اصطرلابی لاہوری متوفی ۱۰۶۱ھ" درج ہے، وہ اس پر ایک مضمون لکھنا چاہتے ہیں، اور ہندوستان کے اہلِ علم سے اس کے بنانیوالے کا حال دریافت کرتے ہیں، اور اگر اس قسم کے کرے ہندوستان میں اور اس کے بنائے ہوئے ہوں، تو وہ ان کا بھی حال جاننا چاہتے ہیں، ہم کو اب تک اس شخص کا کچھ حال معلوم نہیں ہو سکا ہے، اگر دوسرے اہلِ علم ہم کو اس کے متعلق کچھ مدد دے سکتے ہوں، تو ممنونیت کا باعث ہوگا، اس کے بنائے ہوئے دو اصطرلابوں کا علم ہم کو ہے، ایک ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانہ میں ہے، اور دوسرا مولانا ابوبکر صاحب جونپوری (ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی) کے پاس ہے، ہندوستان میں جن صاحبوں کے پاس قدیم کرے یا اصطرلاب ہوں، براہِ کرم وہ ان کے کاریگروں کے ناموں اور تاریخوں سے مطلع فرمائیں، جو عموماً ان کروں اور اصطرلابوں پر کھدے رہتے ہیں، شاید کہیں سے کوئی مسئلہ حل ہو سکے، ہم اب تک اس کے متعلق جو کچھ پتہ لگا سکے ہیں، وہ آئندہ حاضرِ خدمت ہوگا،

معارف کا مجموعۂ مضامین اہل السنۃ والجماعۃ رسالہ اہل السنۃ والجماعۃ کے نام سے چھپ کر

شائع ہوا ہے، اس کا ملیالم ترجمہ وکم (ٹراونکور) کے اسلامیہ دار الاشاعت نے گذشتہ سال چھاپا تھا، اب ۱۹۳۳ء کے نئے سال میں حافظ محمد یوسف صاحب باقوی نے اپنے دار الاسلام مدراس کی طرف سے اس کا تامل زبان میں ترجمہ شائع کیا ہے، ہم کو یہ بھی معلوم ہوا ہے، کہ ایک بنگالی متعلم دار العلوم ندوہ نے بنگالی میں اس کا ترجمہ کیا ہے،

تمام ہندوستان میں مسلمانوں کی جتنی آبادی ہے، اس کی کسی قدر کم نصف تعداد بنگال میں آباد ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی نقطۂ نظر سے بنگال کے مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کا مسئلہ کس قدر اہم ہے۔ تاہم یہ کسقدر قابل افسوس بات ہے کہ بعض مسلمان اہلِ سیاست اس کے دوسرے صوبوں کی مسلمان آبادی کی قیمت میں فروخت کرنا چاہتے ہیں اور بعضوں نے تو یورپین سوداگروں کے ہاتھوں میں اسکو عملاً فروخت بھی کرڈالا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تقریباً نصف تعداد ہمیشہ کیلئے اپنے گھر کے اندر بیگانوں کی غلام بنی رہے، بہر حال ہم کو یہاں ان کی سیاسی غلامی سے زیادہ ان کی ذہنی غلامی سے بحث ہے، ہندوستان کے تمام صوبوں سے زیادہ عربی و مذہبی تعلیم جہاں جاری ہے، وہ بنگال ہے، پٹنہ سے لے کر بنارس، الہ آباد، کان پور تک اور وہاں سے لے کر دیوبند تک ہر جگہ بنگال کے طالب علموں کی کثرت ہے۔ خاص بنگال کے بڑے مدرسوں میں ساٹھ ہزار طالب علم عربی کی تحصیل میں مصروف ہیں۔ بایں ہمہ وہیں سب سے زیادہ مذہبی و علمی جہالت ہے۔۔ اور وہیں جاہل ملاؤں اور جاہل پیروں کی سب سے زیادہ کھپت ہے، انگریزی تعلیم نے اس قرب کے باوجود بہت کم اثر کیا ہے، اور سنتے ہیں کہ جاہل مولوی اب تک وہاں انگریزی کو کفر کے ہم رتبہ سمجھتے ہیں، بلکہ روایتیں تو یہاں تک ہیں، کہ خود بنگالی زبان ان کے یہاں کافروں کی زبان سمجھی جاتی ہے، جب تک یہ صورتحال باقی ہے ہندوستان میں مسلمانوں کے سب سے اہم صوبہ کی اصلاح کا کام خواب و خیال ہے، حالانکہ یہ تاریخی واقعہ ہے، کہ بنگال کی بولی کو جنھوں نے زبان کا درجہ دیا، اور اس کو علم و ادب کے قابل بنایا وہ بنگال کے مسلمان سلاطین ہیں،

زباں گر بہر حق خوانی چہ عبرانی چہ سریانی

ہم نے پچھلے معارف میں بنگال کے مسلمانوں کو اردو زبان کی طرف جو توجہ دلائی تھی، اس کا منشا یہ نہ تھا، کہ وہ اپنے صوبہ کی زبان چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کریں، بلکہ منشا تھا، کہ اپنی صوبائی زبان کے ساتھ ساتھ اس عمومی قومی زبان سے، جو بہت کم وقت لیتی ہے، بے توجہی نہ برتیں، ورنہ نتیجہ یہ ہوگا، کہ اتنا حصہ ہندوستان کی اسلامی برادری سے گویا کٹ جائے گا، اور اسلامی تحریکات کے پھیلنے میں سخت رکاوٹ پیش آئے گی، ورنہ ظاہر ہے، کہ ہم تو اس تجویز کے حامی ہیں، کہ نہ صرف یہ کہ ان صوبوں کے مسلمانوں کو ان زبانوں میں مہارت حاصل کرنی چاہیئے، بلکہ ان زبانوں کو اسلامی لٹریچر کی فراوانی سے مسلمان بنا ڈالنا چاہیئے،

ہمارے ملک میں افسانہ نویسی جس طرز کی جاری ہے، اس کے لئے نہ علم کی ضرورت ہے نہ مہارت انشاء کی، ہر وہ صاحب قلم جو دو انسانوں کی باتوں کو قید تحریر میں لانا جانتا ہو، وہ ہمارے ملک کا بڑا افسانہ نویس ہے، اس طرز تحریر میں نہ منطق و دلائل کی حاجت پڑتی ہے، نہ فلسفیانہ نظریوں کی، نہ تاریخی معلومات کی، نہ ادبی نکتہ دانی کی، نہ مذہبی علوم کی، بلکہ صرف اتنا سلیقہ کافی ہے، کہ وہ مبتذل خیالات، سوقیانہ تصورات اور عریاں جذبات کو نامانوس ترکیبوں اور مضحکہ انگیز فقروں میں ادا کرکے نوخیزوں کو بہلا اور نوجوانوں کو بہکا سکے،

مدیر نگار کے افسانوں کے بعد ابھی حال میں معاصر سچ لکھنؤ، نے تفویض نام ایک افسانہ پیش کیا ہے، جس میں بے سبب صحابۂ کرام اور ائمۂ مجتہدین کی نسبت نادانی سے دل آزار الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، اور اس ہفتہ سرفراز لکھنؤ نے ایک رکن کونسل کے افسانوں کے اقتباسات نقل کئے ہیں، جن میں خدا اور رسول پر پھبتیاں کہی گئی ہیں، کیا علم و دانش کے بعد اخلاق و آداب بھی اس طبقہ سے رخصت ہوچکا،

(معارف ماہ فروری ۱۹۳۳ء)

(۳)

آج دنیا میں ہر طرف ترقی کی پکار ہے، مسلمان بھی ہر ملک میں اسی کی رٹ لگا رہے ہیں،

جہاں تک لفظ کا تعلق ہے، کسی کو اس سے اختلاف نہیں، لیکن جب اس کے معنی کی توضیح چاہی جاتی ہے، تو دفعۃً ہر طرف سے ذہنی بغاوت کا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے، کوئی صاحب اس سے یورپین طرز تمدن و طرز معاشرت مراد لیتے ہیں، کوئی فرقہ اس سے دولت و تمول کا مفہوم سمجھتا ہے، کوئی نئی تعلیم اور ڈگریوں کی کثرت کو اس کا مرادف جانتا ہے، کوئی سیاسی سرگرمیوں کو تنہا ترقی کہہ کر پکارتا ہے، کوئی اس سے صنعت و حرفت و تجارت کی طرف اشارہ کرتا ہے، کوئی "پرانے خیال کا آدمی" اس سے قرون اولیٰ جیسی اخلاقی و روحانی حالت و کیفیت کی تعبیر کرنا چاہتا ہے، اور بہت سے نوجوانوں کے نزدیک مستورات کی عریانی اور ڈنر کے بعد محفل رقص و سرود کا نشاط اور یورپین تہذیب کے دیگر معائب کے مجموعہ کا نام ترقی ہے، غرض

شد پریشاں خواب من از کثرتِ تعبیرہا

حالانکہ واقعہ یہ ہے، کہ ترقی صرف اس روح کا نام ہے، جو قوموں کو زندہ کر کے ان کے ہر رگ و ریشہ میں جد و جہد اور سعی و عمل کی تڑپ پیدا کر دیتی ہے، وہ تمام قوم میں کسی متفقہ غرض کے حصول کی خاطر ہر قسم کی تکلیف و مشقت کی برداشت کی قوت پیدا کرتی ہے، ترقی کسی خاص مادی مظہر کا نام نہیں، بلکہ یہ وہ بجلی ہے، کہ جب کسی قوم کے افراد میں کوندجاتی ہے تو ہر ایک کے دست و بازو میں اپنے فرائض کے بجا لانے کی استعداد پیدا کر دیتی ہے، اور قوم کے تمام قویٰ کو اپنے نشو و نما اور تکمیل کے لئے بیدار کر دیتی ہے، اور پوری قوم اپنے افراد کی مختلف استعدادوں اور قوتوں کی مجموعی کوششوں سے زندگی اور عمل کے نئے قالب میں ڈھل جاتی ہے،

کسی کارخانہ میں ہم کوئی عظیم الشان انجن دیکھتے ہیں، جس کا ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ مختلف ضروری کام انجام دے رہا ہے، دفعۃً وہ انجن بگڑ جاتا ہے، اب اناڑیوں کا ایک گروہ اس کی مرمت اور اصلاح کے درپے ہے، کسی نے ایک پرزہ کو کھینچا، کسی نے دوسرے پرزہ کو صاف کیا، کوئی کہیں کا تسمہ پکڑ کر کھینچتا ہے، کوئی کسی اور پرزہ کو بے قاعدہ حرکت

دیدینا چاہتا ہے ، اور ہر ایک اپنے کام کو اپنی اصطلاح میں اصلاح و مرمت کہتا ہے ، مگر کیا یہ بگڑا ہوا انجن اپنی اصلی قوت اور طاقت کے خزانہ کو بغیر صرف ظاہری چمک دمک اور کھینچ کھانچ سے چل سکتا ہے ،

ہماری قومی ترقی کا بھی یہی حال ہے ، دنیا میں یہودیوں نے اور ہندوستان میں پارسیوں نے یورپین تہذیب و تمدن کے ہر اچھے برے نمونہ کا چربہ اتارا ، اور آج جو کچھ ہمارے نوجوان چاہتے ہیں ، وہ سب کچھ ان کے مردوں اور عورتوں نے انجام دیا ، مگر کیا ترقی کے بلند آشیانہ ہما کو وہ ان تدبیروں سے اپنے جال میں پھنسا سکے ، وہ اب بھی وہی ہیں ، جو پہلے تھے ، دوستو ! مظاہر کا نام ترقی نہیں ، ان مظاہر کی اصل روح و مصدر کا نام ترقی ہے ، اب بتائیے کہ مسلمان قوم کی روح و مصدر کون سی قوت بن سکتی ہے ، اسی کے جواب سے یہ معمہ لاحل ہو سکتا ہے ،

ہر قوم کی تخلیق خاص قسم کے "معنویات" سے ہوئی ہے ، غور کرنا چاہئے کہ مسلمان قوم کے معنویات کیا ہیں ، کیا بھارت ماتا کی محبت ، کیا جائے کی تقدیس ، کیا دولت کی چاہ ، کیا جمشید اور فریدوں اور رام و کرشن کی عقیدت ، کیا گنگا اور جمنا اور نیل و فرات کی پرستش نہیں ان میں سے کوئی چیز نہیں ، بلکہ ان سے مافوق ایک واحد اعلیٰ برتر مقدس قادر علی الاطلاق ہستی کی عقیدت ، اور ایک عالمگیر انسانی برادری کو مساوات اور اس تعلیم کے تمام متعلمین اور خصوصاً آخری معلم علیہم الصلوٰۃ کی محبت اور ان کی تعلیم پر عمل کا جذبہ اسلامی قوم کے معنویات ہیں ، اور انہی کا جوش و خروش ہمارے انجن کی اصلی طاقت اور قوت ہے ، اب اگر ہم اس کو چھوڑ کر کسی اور طاقت سے زندگی پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں ، تو ضرور ہے ، کہ پہلے ان معنویات کو مٹا کر کوئی اور مقصد حیات اس کے سامنے رکھیں ، اور اس کو کسی اور قوم کے قالب میں بدل دیں ،

ہم نے حیرت کے ساتھ سنا کہ مسلمان لڑکیوں کے واحد کالج (علی گڑھ میں) "قاضی

جونپور" کا ڈراما کھیلا گیا، شکایت اس کی نہیں ہے، کہ ڈراما کیوں کھیلا گیا، یہ تو ایک جزئی بات ہے، اصل شکایت جس کی ہے، وہ یہ ہے، کہ ہم مسلمان لڑکیوں کے سامنے کس زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کرتے ہیں، اور کیا بننے کی ان کو ترغیب دے رہے ہیں، اگر ہماری لڑکیاں بہترین ایکٹریس، بہترین نے نواز، اور بہترین موسیقی داں بن جائیں، تو آیا ہم نے تمدن کے محاسن کی نقالی کی، یا اس کے معائب کی، عیش ونشاط اور سرود شادمانی ترقی کی علامت نہیں، انحطاط کی ہے، آیئے اسلامی ہی تاریخ کی مثال دیں، ہندوستان کے اسلامی دور ترقی میں تغلق وخلجی اور بابر وہمایوں کے عہد میں یہ منظر آپ کو نظر آتا ہے۔ یا محمد شاہ رنگیلے اور واجد علی شاہ جانعالم، اور عبداللہ تاناشاہ کے درباروں میں یہ تماشے دکھائی دیتے ہیں، پھر آپ کیا بننا چاہتے ہیں، اور کیا بنانا چاہتے ہیں، جو ہاتھ ابھی تیغ وتبر اور تیر وتفنگ کے عادی نہیں ہوئے ان کو رباب وبربط اور ستار اور پیانو کا عادی بنانا، قوم کو موت و ہلاکت کا زہر ہلاہل پلانا ہے، کسی دشوار گذار سفر کے طے کئے بغیر، بستر راحت پر آرام کی کوشش کرنا "گناہ بے لذت" کا ارتکاب ہے،

آیندہ معارف میں ایک نہایت اہم دلچسپ اور مفید مضمون استاذ العلماء شائع ہوگا، اور جو ملک کے نامور ادیب ومصنف وصاحب قلم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے زور قلم کا نتیجہ ہے، کہنے کو تو یہ اس صدی کے ایک فاضل ونامور عالم (مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم) کے سوانح حیات ہیں، جن کی زندگی سے نصف صدی تک ہندوستان میں علم وفن کی گرم بازاری رہی، لیکن درحقیقت یہ ہماری پچھلی علمی وتعلیمی زندگی کا ایک صاف وشفاف آئینہ ہے، جس میں ہماری گذشتہ علمی تہذیب اور تعلیمی کیفیت کی ہر تصویر پوری صفائی کے ساتھ نظر آئے گی، اور معلوم ہوگا، کہ ہمارے عہد گذشتہ میں کیونکر ایک واحد شخصیت پوری یونیورسٹی کا کام دیتی تھی،

ہمارے صوبہ میں بلکہ پورے ہندوستان میں ریاست رام پور کا شاہی کتب خانہ اپنے نوادر کی کثرت اور قلمی کتابوں کی فراوانی کے لحاظ سے بہت بڑی تاریخی دولت ہے، پچھلے سال اس کے لائق وامین ناظم حافظ احمد علی خاں صاحب شوق کے پنشن لے لینے سے باہر کے لوگوں کو

کتب خانہ کے لائق نگراں کار کی علٰحدگی کا افسوس تھا، مگر اب یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی، کہ خود حضور نواب صاحب رام پور کو اپنے تاج ریاست کے اس قیمتی ہیرے کا بے حد خیال ہے، بعض لائق نگرانوں کا انتخاب ہوا ہے، کتب خانہ کی جگہ تنگ تھی، اور سرکار عالی نے اس کے لئے ایک نہایت عالیشان محل عطا فرمایا ہے، اور حکم دیا ہے، کہ کتب خانہ کے شایان شان فرنیچر، الماریاں اور سامان فراہم کئے جائیں، مولوی سید ابو محمد صاحب ریونیو منسٹر جو خود صاحب علم ہیں، وہ کتب خانہ کے افسر اعلیٰ منتخب ہوئے ہیں، اور سنا ہے، کہ موصوف کتب خانہ کی ترقی میں پوری دلچسپی لیتے ہیں، چنانچہ کتب خانہ کی عربی کتابوں کی ایک دستی فہرست (ہینڈ لسٹ) تیار کرنے کا حکم انہوں نے دیا ہے۔ واقعی اس کتب خانہ کے لئے اب تک یہ بڑی کمی ہے، کہ اس کا جدید طریق کا کیٹلاگ اب تک مرتب نہیں کیا جا سکا ہے، امید ہے کہ ادھر بھی توجہ مبذول ہوگی۔

(معارف ماہ مارچ ۱۹۳۳ء)

(۴)

پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کی طلب اور اصرار پر اڈیٹر معارف نے ۲۰ مارچ ۱۹۳۳ء کو مسلم یونیورسٹی کی انجمن اردوئے معلیٰ میں "ہندوستان میں ہندوستانی" پر ایک خطبہ پڑھا، جلسہ کی صدارت نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی نے فرمائی، گو لوگ دو روز پیشتر سے حسین رؤف بے کے استقبال و آمد اور جلسوں کی بھرمار سے تھک چکے تھے، تاہم یونین کا ہال پورا بھرا تھا، معلومات کے لحاظ سے تو یہ خطبہ چنداں اہم نہ تھا، لیکن اپنے اصلاحی مشوروں کے لحاظ سے بہت زیادہ دلچسپی سے سنا گیا، جن میں سب سے اہم بحثیں یہ تھیں، قومیت کی تکوین میں زبان کا درجہ اور مسلم یونیورسٹی میں تعلیم کی زبان۔ طلبہ کی طرف سے ان دونوں تجویزوں کا خیر مقدم جس گرم جوشی سے کیا گیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اب وقت آگیا ہے، کہ مسلم یونیورسٹی اپنے تعلیمی انقلاب کا اعلان کرے،

حوالہ اردو
۲۲ / ۲۷

اس خطبہ میں ایک تجویز یہ بھی تھی، کہ ہم کو اپنی زبان کی اشاعت کے لئے یہ بھی ضروری ہے، کہ آیندہ اس کو اردو کے بجائے ہندوستانی کے نام سے پکاریں، اردو ایک نئی اصطلاح ہے، جسکی عمر سوڈیڑھ سو برس سے زیادہ نہیں، اور جس میں کسی قسم کے وطنی و قومی جذبہ کی جھلک نہیں، اور نہ تمام ملک کی وسعت کے تعلق کا اس لفظ سے اظہار ہوتا ہے، برخلاف اس کے ہندوستانی جو اس کا صحیح ترین نام ہے، ان تمام جذبات اور خیالات کو حاوی ہے،

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے، کہ اس زبان کا "ہندوستانی" نام انگریزوں کا بخشا ہوا ہے خطیب نے تاریخی حوالوں سے اس کو ثابت کیا ہے، کہ یہ قطعی غلط ہے، اور کم از کم دسویں صدی کی تاریخوں میں انگریزوں کے اثر سے بہت پہلے اس زبان کا یہ نام پڑ چکا تھا،

A.No 278340

اس خطبہ کا ایک فقرہ جس پر اس ہال میں سب سے زیادہ پسندیدگی کا اظہار کیا گیا یہ تھا، کہ یہ درسگاہ پنجاہ سالہ امیدوں کا قید رہی ہے، اور اب بھی صدیوں تک رہ سکتی ہے صرف شرط اتنی ہے، کہ وہ اپنا رخ مغرب سے پھیر کر مشرق کی طرف کرلے، اور ہر چیز کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کے بجائے وہ اپنی نظر سے دیکھے،

108/072
0009830

یہ پورا خطبہ آیندہ یونیورسٹی کے میگزین میں شائع ہوگا،

علی گڈھ یونیورسٹی میں میری دوسری تقریر آفتاب ہوسٹل کے طلبہ کے سامنے ہوئی، یہ نیا ہوسٹل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے نام پر ان کے دوستوں اور عزیزوں اور کالج کے پرانے طالب علموں کے چندوں سے بنا ہے، اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے، کہ منتظمین نے یہ طے کیا ہے، کہ علی گڈھ کے دوسرے دار الاقاموں کے برخلاف اس میں ہر چیز میں سادگی اور کفایت شعاری ملحوظ رکھی جائے، یہاں تک کہ یہاں کے کھانے کی فیس صرف چھ روپئے مقرر کی ہے، بالفعل اس میں اسی لڑکوں کے قریب ہیں، کوشش یہ ہے کہ، یہ دار الاقامہ دوسرے دار الاقاموں کے مسموم اثرات سے حتی الوسع محفوظ رہے،

یہاں کے طلبہ کے سامنے جو تقریر کی گئی، اس میں سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی کے

ساتھ اس جد وجہد اور جفاکشی سے بھری ہوئی زندگی کا نمونہ پیش کیا گیا، جس کے بغیر مسلمان طلبہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ناکام رہتے ہیں، اور بتایا گیا، کہ مذہب کے ذکر کو چھوڑیئے خود علوم جدیدہ کی تحصیل وتکمیل میں اگر انگریزی زبان کو الگ کر دیا جائے، تو ہم نے کون سی اچھی مثال اب تک پیش کی ہے، اور ہماری یہ زندگی جو تمام تر دوسری قوم کی نقالی پر مبنی ہے، کہاں تک ہمارے اندر قومی روح کی سرگرمی پیدا کر سکتی ہے،

اس کے بعد دوسری تقریر طبیہ کالج کے ہال میں ہوئی، اسی طبی کالج کے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا، کالج کے پرنسپل ڈاکٹر بٹ صاحب نے مہربانی فرماکر کالج کے ایک ایک شعبہ کو دکھایا، خوشی ہوئی کہ ہماری قدیم طب کو بھی اس "جدیدستان" میں زندگی کا موقع مل رہا ہے، حکومت نے جب سے بجا بجا دیسی طب اور ویدک کی طرف توجہ کی ہے، ملک میں جا بجا طبی اسکول کھل رہے ہیں، جہاں ایک طرف یہ خوشی کا موقع ہے، وہیں دوسری طرف یہ افسوس ہے، کہ ان طبی درسگاہوں میں طالب علموں کے قبول کرنے کا معیار بہت ہلکا رکھا گیا ہے، یہاں جو تقریر کی گئی، اس میں اسلامی طب کی تاریخ کے ساتھ عزیز طالب علموں کو یہ نصیحت کی گئی، کہ آپ طبیب بننے کی کوشش کریں، ڈاکٹر بننے کی نہیں، اور بتایا گیا، کہ آج دیہات سے لے کر شہروں تک ہندوستان کی صحت عامہ کا دارومدار ولایتی طب پر نہیں، جو طب ہونے کے ساتھ بدیسی تجارت بھی ہے، بلکہ دیسی طب پر ہے، جس کی اکثر دوائیں خود ہمارے ملک کی پیداوار ہیں،

مسلمان والدین اپنے بچوں کو علوم عربیہ کی جو تعلیم دلاتے تھے، اس کے مختلف وجوہ تھے، مثلاً ان کا مذہبی ہونا اور ہماری تاریخ ادبیات کا اس کے اندر موجود ہونا، لیکن ان مذہبی اور علمی اسباب کے علاوہ اس کی ایک تیسری وجہ یہ تھی، کہ وہ معاش کا ذریعہ بھی تھی، علوم عربی پڑھنے کے بعد وہ حکومت وقت کے بڑے بڑے عہدے پاتے تھے، حکومت کے انقلاب نے ایک ایک کرکے ان تمام وجوہ معاش کے دروازے علوم عربی کے طالب علموں پر بند کر دئے، اور اسی نسبت سے عربی تعلیم کی طرف توجہ بھی روز بروز کم ہوتی گئی، تاہم اب تک صرف دو دروازے

کھلے تھے، ایک اسکولوں کی مدرسی اور دوسری طبابت، سو فارسی کے دبیر و فاضل کے درجوں نے پہلی چیز کا تو خاتمہ کر دیا، اور اب اسکولوں میں عربی کے مولوی فاضل کے بجائے فارسی کے منشی فاضل وہی استحقاق رکھتے ہیں، بلکہ فارسی تدریس کے لئے انہی کو ترجیح دی جا رہی ہے، دوسری چیز کا خاتمہ ان طبی اسکولوں کے ذریعہ ہو رہا ہے، جن میں طب کی ترقی کے لئے عربی کے بجائے اردو کتابوں کے ذریعہ اردو خوانوں اور فارسی خوانوں اور نیم انگریزی دانوں کو طب کی تعلیم دی جا رہی ہے، ظاہر ہے، کہ اب صرف مذہب اور علم کی خاطر کتنے مسلمان اپنے بچوں کی قربانی گوارا کر سکیں گے، یہ ہیں ہماری قوم پر وہ تعلیمی عنایات جن کا شکریہ ادا کرنا ہماری قوم پر ہر وقت واجب ہے،

۱۵ر۱۶ر اپریل ۳۳ء کو لاہور میں ادارۂ معارف اسلامیہ کا جلسہ ہے، جس میں مختلف اہل علم اسلامی علوم و فنون پر مختلف مقالات پڑھیں گے، اس سلسلہ میں دار المصنفین کے بعض رفقاء بھی لاہور جائیں گے، اور جلسہ مذکور میں اپنے مقالات پیش کریں گے، میرا مضمون، "لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور لال قلعہ بنایا" ہو گا، مولوی سید ریاست علی ندوی سسلی کے اسلامی تمدن پر اور مولوی سعید صاحب انصاری "عربی لغت کی تاریخ" پر مضامین پڑھیں گے،

(معارف ماہ اپریل ۱۹۳۳ء)

(۵)

۱۱ر اپریل ۱۹۳۳ء کی شب کو جامعہ ملیہ دہلی میں معارف کے اڈیٹر نے "مسلمانوں کی آیندہ تعلیم" پر ایک بسیط مقالہ پڑھا، جس میں سب سے پہلے اس پر زور دیا گیا تھا، کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی زندگی کا مقصد کیا ہو، اور پھر یہ کہا گیا، کہ ہماری آیندہ تعلیم گذشتہ کی طرح بے مقصد نہ ہو، بلکہ بامقصد ہو، اور درسگاہوں کا یہ فرض ہو، کہ بے مقصد افراد قوم کے

بجائے بامقصد افراد پیدا کریں، اسی مقصد کی روح قومی زندگی کے ہر شعبہ کی حیات کی ذمہ دار ہے اسی سلسلہ میں مسلمانوں کی گذشتہ قدیم بامقصد تعلیم کے نتائج دکھائے گئے۔ بعد ازیں یہ کہا گیا، کہ درسگاہوں کا دوسرا فرض قومی ومذہبی اخلاق اور کیرکٹر کی تعمیر ہے، جو قوم اپنے قومی ومذہبی اخلاق اور کیرکٹر سے محروم رہے گی، وہ باعزت زندگی سے بھی محروم رہے گی، پھر یہ ثابت کیا گیا کہ یونیورسیٹیوں کی جس اعلیٰ تعلیم کی طرف ہم جا رہے ہیں، وہ ہماری شکم سیری کے سامان سے اب تمام تر عاجز ہے، اعلیٰ تعلیم کی طلب صرف علم کی خاطر ہونی چاہیئے۔ بقیہ عام تعلیم صرف شکم سیری کی تدبیروں کے لئے چاہیئے، درمیان میں یہ بتایا گیا تھا، کہ موجودہ سرکاری تعلیم صرف حکومت کے نقطۂ نظر سے دی جا رہی ہے، قومی نقطۂ نظر سے یہ نظام تعلیم سراسر خالی ہے، اور دین وملت کی پرحرارت روح سے تمام تر تہی مایہ ہے، یہ بھی کہا گیا، کہ میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے ذریعہ جو ابتدائی دیہی اور شہری تعلیم دی جا رہی ہے، اس میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم غیر مشترک اور علیٰحدہ نظام کے ماتحت ہونی چاہیئے، اور مقرر کی نگاہ میں اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کی خاطر غیر مخلوط ابتدائی تعلیم کے مطالبہ کی ضرورت ہے، آخر میں ہندوستان کی زبان کے ذریعۂ تعلیم بنانے پر زور دیا گیا تھا،

لاہور کے شاہدرہ اسٹیشن سے چند اسٹیشنوں کے بعد ایک قصبہ "بدوملہی" ہے، ہم نے حیرت کے ساتھ سنا کہ یہ چھوٹا سا قصبہ ہندوستان بھر کے مذاہب کا اکھاڑہ ہے، قادیانی اور احمدی لاہوری جماعتوں کے علاوہ عیسائیوں اور آریوں کا بھی بڑا مرکز ہے۔ اور کس قدر افسوس کے ساتھ سنا کہ ایک مسلمان زمیندار خاندان یہاں عیسائی ہو گیا ہے، یہاں کے غریب مسلمان جو زیادہ تر کاشتکار اور مزدور پیشہ ہیں، وہ ان مختلف تحریکات اور ترغیبات کا شکار ہو رہے ہیں، چند سال سے یہاں کے بعض مسلمانوں نے ایک اسلامی انجمن کے ذریعہ اپنی تنظیم کا کام شروع کیا ہے، ۱۳؍ اپریل کی دوپہر کو یہاں کے مسلمانوں کے شدید اصرار پر لاہور اسٹیشن سے یہاں جانا پڑا، وہاں مسلمانوں کی اصلاحات پر دو دن دو تقریریں کیں، امید کہ

وہاں مسلمانوں کی کوششوں سے اب ایک ابتدائی اسلامی تعلیم گاہ کا انتظام ہوجائے، اور مسلمانوں کی حفاظت کا کام سرانجام پائے،

گذشتہ اطلاع کے مطابق ۱۵ر اپریل کو راقم اور اس کے دو رفقائے دار المصنفین مولوی سعید صاحب انصاری اور مولوی ریاست علی صاحب ندوی نے لاہور میں دائرہ معارف اسلامیہ کے اجلاس میں شرکت کی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سبب سے یوپی کے بھی بعض اہل علم شریک اجلاس تھے، پہلا جلسہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی صدارت میں شروع ہوا، لاہور کے تمام سربرآوردہ اہل علم اور پنجاب اور دہلی کے کالجوں کے مشرقی علوم کے بعض استاذ اور پروفیسر بھی شریک تھے پہلے اجلاس میں صدارتی خطبوں کے بعد سب سے پہلا مقالہ راقم الحروف کا پیش ہوا جس کا عنوان تھا "لاہور کا ایک مہندس خاندان جس نے تاج اور لال قلعہ بنایا" اس مقالہ میں اس خاندان کے تقریباً ڈیڑھ سو برس کے علمی کارناموں کی سرگذشت نامعلوم گوشوں سے نہایت تلاش اور تفحص کے ساتھ مرتب کی گئی تھی، اور تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ اس خاندان کے مورث اول نادر العصر استاذ احمد معمار شاہجہانی لاہوری کے حالات بتائے گئے، اور اس کے بیٹے ملا لطف اللہ مہندس (جو شاہجہاں کے زمانہ میں موجود تھا، اور دارشکوہ کا درباری تھا) کی معاصرانہ شہادت سے یہ ثابت کیا گیا، کہ تاج کا معمار درحقیقت یہی استاد احمد معمار شاہجہانی لاہوری ہے یہ ہندسہ، ہیئت، اور ریاضیات کا بہت بڑا عالم تھا، اس دریافت سے وہ تمام افواہیں، جو تاج کے کاریگروں اور معماروں کی نسبت مشہور تھیں، بے سروپا ہوکر رہ گئیں،

ہمارے دو رفیقوں میں سے مولوی سعید صاحب انصاری نے عربی علم لغت کی تاریخ بڑی جامعیت کے ساتھ لکھ کر پیش کی، اور مولوی ریاست علی صاحب ندوی نے سسلی کے اسلامی تمدن پر اردو میں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ مشرقی زبان میں سب سے پہلی دفعہ مقالہ پیش کیا، جس میں اس جزیرہ نما کے اسلامی تمدن کے ہر شعبہ پر پوری تفصیل کے ساتھ گفتگو کی تھی؛ دوسرے مقرروں میں سے جہاں تک یاد ہے سب سے زیادہ قابل ذکر مضمون دہلی یونیورسٹی کے استاذ علوم مشرقیہ

مولانا عبدالرحمن صاحب کا تھا، جس میں تیموری بادشاہوں کے نظام منصب داری کے اصول پر فاضلانہ تبصرہ تھا، علاوہ ازیں پروفیسر شفیع نے تاریخ آل میکال پر سورت کے ڈاکٹر ہمدانی نے رسائل اخوان الصفاء پر، پروفیسر شیرانی نے اردو کی قدیم نصابی کتابوں پر، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے عرب کے موسمی خصائص اور اثرات پر، مولانا عبداللہ صاحب چغتائی نے اسلامی مصوری اور نقاشی پر اور دوسرے فضلاء نے مختلف عنوانوں پر اپنے اپنے دلچسپ مضامین، دائرہ کے مختلف جلسوں میں پڑھے اور پیش کئے، اور اس طرح اسلامی مشرقی علوم وفنون کی مجلس کا پہلا اجلاس ١٦ر اپریل کی شب کو بخیر وخوبی ختم ہوا،

(معارف ماہ مئی ۱۹۳۳ء)

(٦)

تبلیغِ دین مسلمانوں کا فریضہ ہے، لیکن اس فرض کو ہم کہاں تک ادا کر رہے ہیں، اس کا جواب بجز ندامت اور اعتراف قصور کے ہم کیا دے سکتے ہیں، آج کل کی دنیا میں تبلیغ کی سب سے منظم شکل اخبارات اور رسائل ہیں، ہمارے ادبی وعلمی رسالے تو شاید ہزاروں ہوں، لیکن ہمارے مذہبی رسالوں کی تعداد مشکل سے چند ہو، اور خصوصاً ہمارے صوبہ میں تو ایک بھی ایسا مذہبی رسالہ نہیں، جس میں دین ومذہب کے متعلق اعلیٰ مضامین اور مسلمانوں کے دینی وتمدنی واخلاقی اصلاحات پر معتدل خیالات شائع ہوں، درآنحالیکہ الحاد کے سرچشمے یہیں یعنی دار الحکومت سے ابل رہے ہیں اسی بناء پر چند دردمند اصحاب نے ارادہ کیا ہے، کہ اصلاح کے نام سے لکھنؤ سے ایک ماہوار مذہبی واخلاقی واصلاحی رسالہ نکالیں، ہمارے نوجوان عزیز مولوی مطلوب الرحمن صاحب نگرامی ندوی نے اس کی ادارت کا بار اٹھانے کی ہمت کی ہے، قیمت سالانہ تین روپے ہوگی، دین کے دردمندوں سے درخواست ہے، کہ وہ خریداری سے اس مقدس کام کی اعانت کریں، پتہ دفتر اصلاح نگرام ہاوس، لکھنؤ ہے، اگر کوئی صاحب ہمت اس ضروری کام میں مالی مدد فرمائیں،

تو اجر جزیل کے مستحق ہوں گے ،

دار العلوم ندوۃ العلمار لکھنؤ کی مجلس طلبائے قدیم گو ایک مدت سے قائم تھی ، مگر ادھر چند سالوں سے وہ مردہ سی ہو کر رہ گئی تھی ، اب مولوی رئیس احمد صاحب جعفری ندوی اور دوسرے ارباب ہمت برادران ندوہ کی کوششوں سے اس نے نئی زندگی پائی ہے ، پچھلے سال دسمبر ۱۹۳۲ء کا اجلاس خاص طور سے اہم تھا ، کہ اس کے مقامی صدر استقبالی مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی اڈیٹر سچ اور صدر اجلاس مولانا مسعود علی صاحب ندوی تھے ، اس اجلاس میں مولانا عبد الماجد صاحب نے صدر استقبالی کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھ کر سنایا تھا ، وہ ادب وانشار کا اعلیٰ نمونہ ہونے کے علاوہ اپنی روحانی تاثیر کے لحاظ سے بے حد قابل قدر تھا ، کتنی آنکھیں تھیں جو اس خطبہ کے سنتے وقت اشکبار تھیں ، صاحب صدر مولانا مسعود علی صاحب کا زبانی خطبہ حسبِ معمول زندگی اور زندہ دلی کی تصویر تھا ، جس نے روتوں کو بھی ہنسا دیا ،

گریانم و خندانم چوں طفل بخواب اندر

مولوی رئیس احمد صاحب ندوی نے ندوۃ العلمار کے ان "اطفال قدیم" کے اس گریاں و خنداں خواب "، کا مرقع کاغذ پر کھینچ کر جلسۂ مذکور کی روداد کی صورت میں شائع کیا ہے ، یہ مطبوعہ روداد جس میں دونوں خطبے اور جلسہ کے مشاعرہ کی غزلیں اور ہمدردوں کے خطوط بھی شامل ہیں ، مولوی صاحب سے قرول باغ جامعہ ملیہ دہلی کے پتہ سے ملے گی ،

اس دفعہ لاہور کے سفر میں یہاں کی تاریخی عمارتوں کے دیکھنے کا موقع ملا ، یہ دیکھ کر اور سن کر بڑا افسوس ہوا ، کہ سکھوں کے چند سالہ عہد حکومت میں یہاں کی اکثر اسلامی عمارتوں کو شدید نقصان پہونچایا گیا ، یہاں کی مسجدوں اور مقبروں کے پتھروں اور طلائی کاموں کو اکھاڑ اکھاڑ کر امرتسر کے سکھ معبدوں کو آراستہ کیا گیا ، سب سے زیادہ افسوسناک منظر یہ ہے ، کہ لطافت ونزاکت کی مجسمہ بیگم نورجہاں کے مقبرہ کی عمارت کے ایک ایک پتھر کو نوچ کر اس طرح اس کو برہنہ کر دیا گیا ہے کہ دنیا کی نسوانیت اس کی اس قابل رحم حالت پر ہمیشہ کے لئے سوگوار اور ماتم گسار رہے گی ،

خدا مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب پر اپنی رحمت نازل کرے کہ ان کی قومی غیرت نے بیگم اور اسکی لاڈلی بیٹی کی برہنہ قبروں پر سپید سنگ مرمر کی دو چادریں چڑھا دی ہیں ، اور کتبہ کا پتھر لگا کر ان کے ناموں کو مٹنے سے بچا لیا ہے ،

یہی کیفیت نورجہاں کے بھائی اور جہانگیر کے وزیر آصف خاں کے مقبرہ کی کی گئی ہے ، عمارت کے گوشہ گوشہ پر عبرت کی آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں ، خود جہانگیر کے مقبرہ کو گو ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے ، تاہم اس کے سر کا تاج بھی اتار لیا گیا ہے ، یعنی مقبرہ کی دوسری منزل پر سپید مرمر کی بارہ دری تھی ، یہ بارہ دری سکھوں نے وہاں سے اکھاڑ لی ، اور ایک دوسری جگہ لیجا کر اس کو آسمان سے اتار کر زمین پر پٹک دیا ہے ، یعنی زمین پر اس کے ٹکڑوں کو جوڑ کر دوبارہ ... بارہ دری بنائی ہے ، یہ بارہ دری بھی انقلابات کے گرد وغبار سے اٹ کر زمین میں چھپ گئی تھی ، چند سال ہوئے کہ اب حکومت انگریزی نے مٹی ہٹا کر اس سنگی خزانہ کو دوبارہ زمین سے نکالا ہے ،

نہ گور سکندر نہ ہے قبر دارا
مٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

پچھلے مہینہ کی اسلامی دنیا میں مشرقی ترکستان میں وہ عظیم الشان انقلاب پیش آیا ، جس کا انتظار ہماری آنکھوں کو دس پندرہ برس سے تھا ، ترکستان کا یہ اہم خطہ جس پر صدیوں سے چین نے قبضہ کر رکھا تھا ، اسلامی تاریخ میں مسلمان فاتحوں اور کشورکشاؤں کا گہوارہ رہا ہے ، یہیں وہ ایلک خانی خاندان جو آل اسباب اور ملوک خانیہ بھی کہلاتا ہے ، تیسری صدی سے چھٹی صدی تک فرماں روا رہا ہے ، جس نے ایک طرف محمود غزنوی اور دوسری طرف ملک شاہ سلجوقی کو مصالحت اور مصاہرت پر مجبور کر دیا تھا چینیوں نے اس پر بار بار حملے کئے ہیں ، اور پھر اس نے خود مختاری حاصل کر لی ہے ، ۱۸۶۰ء میں یعقوب خاں کی سرداری میں اس ملک نے خود مختاری حاصل کی ، لیکن سات برس کے بعد اس پر چینیوں نے پھر قبضہ کر لیا ، نااتفاقی کا برا ہو ، جس نے ہمیشہ ... ملک کی خود مختاری کا خاتمہ کیا ہے ، خدا اس دفعہ ہمارے ان مشرقی

ترک بھائیوں کو اس سے محفوظ رکھے، اور دوسری طرف بالشویک روس کے پنجے سے بچائے، تو یہ نئی اسلامی سلطنت کشمیر و تبت اور افغانستان و چین و روس کے بیچ میں، اسلامی تمدن کا نیا مینارہ بن کر کھڑی ہو،

قوم کے غم خواروں میں مشورے ہو رہے ہیں کہ مریض جاں بلب کے علاج کے لئے مسلم لیگ کو پھر پوری اجتماعی قوت سے زندہ کیا جائے، یہ خیال مبارک ہے، مگر اس کے انسداد کی تدبیر کیا ہے، کہ ہم میں سے کسی اختلاف کے موقع پر پھر ایک جماعت ٹوٹ کر ایک نئی مسلم لیگ یا نئی مسلم کانفرنس نہ بنالے گی، جنگ عظیم کے بعد سے لے کر آج تک ہم نے بچوں کی طرح سیاسی کھلونوں کے بنانے اور توڑنے کے سوا اور کیا کیا ہے، جب تک ہم یہ عزم نہ کریں، کہ ہماری ہمیشہ ایک ہی سیاسی مجلس ہوگی، اور جو فرقہ کسی اختلاف کی بنا پر کوئی الگ رائے قائم کرے گا، وہ اس مجلس کو توڑ کے اور دوسری سیاسی مجلس کے بنانے کے بجائے وہ اس پرانی مجلس کا ایسا فریق اقلیت بن کر رہے گا، جو آئینی جد و جہد سے اپنی اکثریت کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے گا، اس وقت تک مسلم لیگ کے احیار کی یہ دوبارہ کوشش بھی وقتی تفریح طبع سے زیادہ وقیع نہیں ہے،

(معارف ماہ جون سنہ ۱۹۳۳ء)

(۷)

(ماہ جولائی سنہ ۳۳ء کے شروع کے شذرات شاہ انور صاحب، سر فخر الدین احمد، نظم طباطبائی محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار اور ناصر علی مدیر صلائے عام کی وفات پر ہیں، اور یہ بزم رفتگاں میں آگئے ہیں،)

لوگوں کو یاد ہوگا کہ ٹرکی میں ہماری سیرۃ النبیؐ اور سیر الصحابہؓ کے ترجمہ کا کام شروع ہوا تھا، اور ان کی متعدد جلدیں ترکی میں ترجمہ ہو کر وہاں مقبول ہو چکی ہیں، لیکن ٹرکی میں دو برس سے

جب سے عربی حروف کے بجائے لاطینی حروف کو رواج دیا گیا، ادھر سے خاموشی رہی، خیال ہوا کہ شاید حروف کی تبدیلی سے خیالات میں بھی تبدیلی آگئی ہے، بارے اس ہفتہ میں قسطنطنیہ سے مترجم مذکور کا ایک عربی خط آیا، جس سے پہلے خیال کی غلطی دور ہوئی، اس میں موصوف نے سیرت کی جلد چہارم اور سیر الصحابہ کے حصص مہاجرین کی جلدیں ترجمہ کی غرض سے طلب کی ہیں، اسی خط میں وہ لکھتے ہیں، کہ سیر الصحابہ میں سے انصار و مہاجرین کی جلد اول اور صحابیات کا ترجمہ وہ تمام کرچکے فالحمد للہ،

ہم نے ہندوستان میں عربی زبان کی ترقی و اشاعت کی غرض سے آج سے ایک سال پہلے الضیاء کے نام سے لکھنؤ سے جو ماہانہ عربی رسالہ نکلوایا تھا، خدا کا شکر ہے کہ اس نے ایک سال کی عمر طے کرکے دوسرے سال میں قدم رکھا، ہندوستان کے دو سو شائقین نے اس کو خرید کر اپنی قدر دانی کا ثبوت دیا، ساتھ ہی ہماری تحریک پر حسب ذیل اصحاب نے اس کے اجراء میں مالی امداد دے کر اس کی طبع و اشاعت کی مشکلات کو آسان کیا،

۱ - نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر بھیکن پور علی گڈھ - ۱۰۰ر روپے
۲ - نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی حبیب گنج علی گڈھ - ۵۰ر روپے
۳ - مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی انسپکٹر مدارس عربیہ الہ آباد - ۵۰ر روپے
۴ - مولانا عبد الباری ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن - ۱۵ر روپے
۵ - خاکسار سید سلیمان ندوی - ۱۰۰ر روپے

اس ایک سال کے عرصہ میں اس رسالہ نے ہندوستان اور دیگر ممالک عربیہ میں جو عزت و منزلت حاصل کی، اور ہندوستان کے مسلمانوں کے عربی ذوق کا جو ثبوت بہم پہنچایا، وہ ہماری توقع سے زیادہ ہے، ضرورت ہے کہ اس مقدس زبان کی اشاعت کے قدرشناس رسالہ کی دوسری منزل میں بھی ہمارا ہاتھ بٹائیں،

(معارف ماہ جولائی ۱۹۳۳ء)

(۸)

گذشتہ شذرات میں بعض غلطیاں رہ گئی ہیں، جن کی اصلاح مناسب ہوگی، ورنہ آگے چل کر وہ شاید تاریخ کی غلطیاں نہ بن جائیں، مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر وفات کے وقت یاد سے ستاون برس لکھ دی گئی تھی، مگر ان کے رفقائے خاص سے یہ معلوم ہوا، کہ اونسٹھ برس تھی، اسی شذرہ کے آخر میں "علم وحرفت" چھپ گیا ہے، حالانکہ وہ "علم و معرفت" ہے، امید ہے کہ ناظرین اسکو اپنے قلم سے درست کرلیں گے،

منشی محبوب عالم کے تذکرہ میں یہ لکھا گیا ہے، کہ وہ اردو کے پہلے روزانہ اخبار کے بانی اور اڈیٹر تھے، اس سے مراد مسلمانوں میں تھی، یعنی اردو کے پہلے اسلامی روزانہ اخبار کے وہ بانی اور اڈیٹر تھے، اردو میں منشی نولکشور، لکھنؤ کا اودھ اخبار ان کے اخبار سے پہلے نکلا تھا اور اب تک نکل رہا ہے،

اس دفعہ احباب کے اصرار پر جلسہ سیر کے موقع پر بڑودہ جانا پڑا، اعظم گڈھ سے ۲/ جولائی کی شام کو نکل کر لکھنؤ اور دہلی میں بارہ بارہ گھنٹے ٹھہر کر ۵/ جولائی کی رات کو ۸/ بجے بڑودہ کے دارالریاست میں پہنچا، اسٹیشن پر ریاست کے نمایندہ مسٹر کلکرا اور دوسرے مسلمان احباب نے خیر مقدم کیا، ریاست کے مہمان خانہ میں ٹھہرنے کی جگہ ملی، دوسرے دن ہزاکسلنسی دیوان بہادر کے زیر صدارت بڑودہ کالج کے بڑے ہال میں جلسہ منعقد ہوا، میں نے اور دوسرے مسلمان اور ہندو مرہٹہ مقرروں نے اپنے اپنے انداز میں سیرۃ نبوی کے موضوع پر تھوڑی تھوڑی تقریریں کیں، تیسرے دن جمعہ کے روز شہر کی جامع مسجد میں بعد نماز میری ایک اور تقریر ہوئی،

بڑودہ ہندوستان کی بڑی ترقی یافتہ ریاستوں میں ہے، آج سے ۲۲/ برس پہلے جب میں نے حضرت الاستاذ مرحوم کے زیر سایہ انجمن اشاعت اسلام کا کام شروع کیا تھا، تو یہاں بھی آیا تھا، اس وقت یہاں کے مشہور مسلمان رئیس نواب صدر الدین خاں مرحوم جن کے صاحبزادے

میرے عزیزانہ و برادرانہ تعلقات تھے، اور ہیں، زندہ تھے، مرحوم نے اس وقت اردو کا سب سے بڑا کتب خانہ جمع کیا تھا، اور جامع مسجد مذکور کی تعمیر ختم ہو رہی تھی۔ اب وہ ان کا اردو کتب خانہ اسی جامع مسجد میں ان کے صاحبزادوں نے منتقل کر دیا ہے، مگر افسوس کہ وہ متقفل پڑا رہتا ہے اور کسی کو اس سے استفادہ کی توفیق نہیں ملتی،

ریاست بڑودہ کی آبادی چوبیس لاکھ ہے، جس میں پانچواں حصہ مسلمانوں کا ہے۔ خود شہر کی ایک لاکھ کی آبادی میں بیس ہزار مسلمان ہیں، الغرض یہاں بیس فیصدی مسلمان آباد ہیں، تاہم آپ کو یہ سنکر افسوس ہوگا، کہ یہاں ایک بھی خاص مسلمانوں کا اسکول نہیں، مجھے بتایا گیا، کہ یہاں ایک انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ ہے، جس سے اس وقت اگیارہ سو لڑکے کامیاب ہو چکے ہیں، مگر ان میں مسلمان صرف آٹھ دس تھے، جن میں سے تین ریاست کے باہر کے تھے، یہی ہے کہ بیس فیصدی اسلامی آبادی ہونے کے باوجود ریاست کی ملازمت اور مناصب اور عہدوں میں مسلمانوں کا نام و نشان نہیں ہے، مسلمان اپنی غفلت کا الزام ریاست پر ڈالتے ہیں، کہ وہ ہماری تعلیم کی طرف توجہ نہیں کرتی۔ ہم کو بڑودہ کے بیدار مغز مہاراجہ کے ساتھ جو حسن ظن ہے، اس کی بناء پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا، کہ خود ان کی ریاست کی بے توجہی سے وہاں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے، حالانکہ یہ واقعہ ہے، کہ بڑودہ کی ریاست کی تعمیر میں مسلمان امیروں اور سپاہیوں کی تلواروں کو بھی دخل ہے،

اگر لکھنؤ کو باغوں کا شہر کہا جا سکتا ہے، تو بڑودہ کو کتب خانوں اور مدرسوں کا شہر کہا جا سکتا ہے، ریاست کے پورے طول و عرض میں متحرک کتب خانوں، مکتبوں، اور مدرسوں کا جال پھیلا ہے، اور گجراتی کی ابتدائی تعلیم ہندو مسلمان سب کیلئے جبری ہے، شہر میں ایک عام کتب خانہ ہے، ایک خاص سنسکرت کا مشرقی کتب خانہ ہے، ایک متحرک کتب خانوں کا مرکزی کتب خانہ ہے، یہاں کے کتب خانوں کی عمارت ترتیب اور تقسیم سب امریکی نظام پر ہے، اور حق یہ ہے کہ آج تک یہاں سے بہتر طریق پر کوئی کتب خانہ نظر نہیں آیا، سب سے بڑے

کتب خانہ کی الماریاں منزل بہ منزل لوہے کے چھڑوں اور تختوں سے بنائی گئی ہیں، اور ہر منزل کی چھت دبیز شیشہ کی بنی ہے، تاکہ نیچے کی منزل میں بھی روشنی پہونچ سکے، اور کتب خانہ آتش زنی سے محفوظ رہے، اس وقت ریاست کے مرکزی کتب خانہ کے ماتحت پینتالیس بڑے اور آٹھ سو کے قریب چھوٹے کتب خانے ہیں، اور تقریباً ہر سال چار لاکھ کتابیں پڑھی جاتی ہیں،

بڑودہ سے بھڑوچ اور وہاں سے راندیر، راندیر سے سورت، وہاں سے انکلشور، انکلشور سے ٹڈابھیل اور ڈابھیل سے سورت ہو کر دہلی اور لکھنؤ کے راستہ سے ۱۶ر جولائی کو اعظم گڈھ واپسی ہوئی، ہر جگہ ایک دو تقریریں کرنی پڑیں، بھڑوچ سے دریائے نربدا کے کنارے وہ مقام ہے جہاں ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں بحرِ عرب کی راہ سے نربدا میں داخل ہو کر مسلمانوں کا ایک فوجی دستہ پہنچا تھا۔ اس کے ساحل پر پہنچ کر تاریخ کا وہ مرقع آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا، اور بے اختیار چند مصرعے موزوں ہو گئے۔

راندیر گجرات کے دیندار تاجروں کا مرکزی وطن ہے، یہاں کی مسجدوں کی شان وشکوہ کو دیکھ کر ان سندباد بحری و بری تاجروں کے قصے یاد آگئے، جن کا الف لیلہ میں ذکر ہے، ۱۸ر مسجدیں ہیں، اور اکثر بڑی مسجدیں شروع سے آخر تک سنگِ مرمر اور سنگِ موسیٰ کی موزوں ترکیب سے بنائی گئی ہیں، جامع مسجد، مسجد قوت الاسلام، اور مسجد چنار دار بہترین مسجدیں ہیں، اور اپنی صفائی اور ستھرائی میں ہندوستان بھر میں بے نظیر معلوم ہوئیں، پانچ ہزار کی اسلامی آبادی ہے، مگر اس کے اندر بہترین میونسپلٹی، بہترین سڑکیں، اور ہر جگہ سڑک پر برقی روشنی کا انتظام ہے، مسجدیں برقی پنکھوں سے راحت رساں، اور برقی روشنیوں سے منور ہیں، ان ظاہری سامانوں کے ساتھ باطنی حیثیت سے بھی یہ مسجدیں نمازیوں سے آباد نظر آئیں، نوجوان مسلمانوں کی ایک خاص مجلس ہے، جس کے ارکان باہمت ہیں، محفل اسلام نام ایک مجلس ہے، جس نے اردو، عربی، انگریزی، اور گجراتی کا اچھا خاصا کتب خانہ جمع کیا ہے، ایک گوشہ میں ایک پرانا مزار بھی ہے، جو حسبِ دستور ایک گنبد کے نیچے چادروں اور غلافوں

لپٹا ہوا مزدوروں کے جھرمٹ میں ہے، اور جس کی نسبت کہا جاتا ہے، کہ یہ کسی تابعی یا تبع تابعی کا ہے، بھڑوچ اور سورت اور راندیر میں ایسی مسجدیں نظر آئیں، جن کی تاریخیں پانچویں صدی کی بتائی جاتی ہیں، اور کہیں دروازوں پر لکھی بھی دی گئی ہیں، راندیر میں ایک عربی مدرسہ محمدیہ بھی موجود ہے، جس میں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی، کہ اس میں قدیم عربی کے ساتھ جدید عربی بھی سکھائی جاتی ہے،

ڈابھیل سورت سے ایک دو اسٹیشن بعد ایک گانوں ہے، جہاں کے دو تاجر مل کر اس ستارہ کو جو دیوبند کے نظام شمسی سے چند سال پہلے ٹوٹا تھا، یہاں اٹھا لائے ہیں، ہر قسم کی عمارتیں مسجد کتب خانہ، مہمان خانہ، دار الحدیث، اور دار الطلبہ غرض ہر چیز صرف ان ہی تاجروں کی فیاضی سے بے منت غیرے چھ برس کی مدت میں بن کر تیار ہو گئی ہے، صرف مدرسہ کی خاطر بجلی کی روشنی کا خاص اہتمام ہے، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، مولانا سراج احمد صاحب مولانا ادریس صاحب، اور دوسرے فاضل علما درس میں مصروف ہیں، اور تین سو کے قریب طالب العلم ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان کے زیر تعلیم ہیں، گجراتی اور اردو کے مکتب الگ ہیں، جائے وقوع گانوں سے باہر میدان میں ہے، خوش فضا منظر، سکون کا مقام اور اسٹیشن سے جس کا نام مرولی ہے، چار، پانچ میل دور ہے، گجرات کے خاص طالب العلم بھی یہاں آرہے ہیں، ہم کو توقع ہے کہ انشاء اللہ یہ چند سال میں گجرات کا دار العلم ہو جائے گا۔

اس صوبہ گجرات کے ہر مقام میں جو پایۂ تخت دہلی سے سینکڑوں میل دور ہے، یہ دیکھ کر تعجب ہوا، کہ ہماری پچھلی اسلامی حکومت کے دھندلے نشان اب بھی در و دیوار سے نمایاں ہیں، ہر جگہ مسلمانوں کے وہ پچھلے خاندان آباد ہیں، جن کو سلاطین دہلی نے جاگیریں دے دیکر ہر جگہ بسایا تھا، اور تعلیم و تدریس یا قضا یا ہدایت و رہنمائی کی غرض سے جا بجا آباد کیا تھا، وہ اب تک اسی طرح آباد ہیں، ان میں سے ہر خاندان میں قلمی کتابوں کا سرمایہ پرانے تمدن کی یادگاریں ہیں، اور وہ آبادی میں امتیاز خاص رکھتے ہیں، ہر شہر اور قصبہ میں قاضیوں

اور عالموں کے خاندان آباد ہیں، جو اب تک اپنی حیثیت کو سنبھالے ہوئے ہیں، لیکن آگے ضرورت ہے کہ یہ لوگ اپنے ماحول کی ضرورتوں کو سمجھیں، اور زمانہ کے تقاضوں کو پورا کریں، ورنہ

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

(معارف ماہ اگست ۱۹۳۳ء)

(۹)

اخبار پڑھنے والے دوستوں کو معلوم ہوگا، کہ آج کل دار العلوم ندوة العلماء لکھنؤ کے احاطہ میں طلبہ اور مدرسین کے لئے ایک مسجد زیر تعمیر ہے، اور ہمارے مہتمم دار المصنفین مولانا مسعود علی صاحب ندوی رکن ندوة العلماء نے اس کی تعمیر کا کام اپنے ذمہ لیا ہے، اور اسی تقریب سے وہ دو تین مہینوں سے لکھنؤ میں مقیم ہیں، موصوف کا کام نہ صرف مسجد کو اپنی نگرانی میں بنوانا ہے، بلکہ اس کی تعمیر کے لئے سرمایہ فراہم کرنا بھی ہے، خوشی کی بات ہے کہ ان کو حسبِ دستورِ سابق دونوں کاموں میں کامیابی ہورہی ہے، مسجد کا طول ترسٹھ فٹ ہے، اور محرابوں تک عمارت پہونچ چکی ہے، مسجد کے نقشہ میں کسی قدر جدت بھی روا رکھی گئی ہے، جس سے مسجد ہوادار اور خوش منظر بھی ہوگی، دائیں، بائیں اور قبلہ رخ بمبئی کی مسجدوں کی طرح دروازے اور کھڑکیاں رکھی گئی ہیں، اور گنبدوں کے بجائے چھت کا خیال ہے،

تعمیر مسجد میں امداد سے مسلمانوں کو فطرةً جو شغف ہے، وہ بیان کا محتاج نہیں، اور نہ معارف کے ناظرین کو اس کے ثواب کی آیتیں، اور حدیثیں سنانی ہیں، صرف ان کو یاد دلانا اور متوجہ کرنا ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے پرجوش اور فرض شناس ناظرین اپنے خود اور اپنے خاندان کے افراد اور اپنے شہر کے نیک عمل مسلمانوں سے تحریک کریں، اور جو کچھ جمع ہو، اس کو ناظم صاحب ندوة العلماء لکھنؤ کے پتہ سے بھیج دیں۔

آج کل مولانا مسعود علی صاحب ندوی کے قیام کی وجہ نے دار العلوم کے مختلف صیغوں میں

اصلاح اور ترقی نظر آرہی ہے ، اور امید ہے کہ ان کے ،، ڈکٹیٹر شپ ،، میں دارالعلوم کو ہر قسم کے فوائد میسر ہوں گے ، ضرورت اس کی ہے ، کہ ہمارے طلبہ اور مدرسین بھی اپنے فرائض کو محسوس کریں گے ، یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ طلبہ آج کل مسجد اور مدرسہ کے کام میں پوری دلچسپی لے رہے ہیں ، اور سمجھ رہے ہیں ، کہ کسی درسگاہ کی اصلی اہمیت بلند عمارت اور وسیع سامان نہیں بلکہ خود طلبہ ہیں ،

دارالعلوم کے فارغ شدہ طلبہ بھی آج کل کے ماحول میں دین وملت کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں ، لاہور میں مولانا محمد حنیف صاحب ندوی خطیب جامع مبارک کے خطبات پسند کئے جارہے ہیں ، کلکتہ میں مولانا مظفرالدین صاحب ندوی ایم ، اے پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ نے انگریزی میں اسلام کے اصول وماخذ پر ایک محققانہ کتاب لکھی ہے ، جس میں اسلام کے عقائد کلامی اور تصوف کے قرآنی ماخذ بتائے ہیں ، اور ان مستشرقین کی پرزور تردید کی ہے ، جنہوں نے اسلام پر دوسرے مذاہب کی خوشہ چینی کا الزام لگایا ہے ، اور ان کی غلطیاں دکھائی ہیں ، ایک تیسرے ندوی عالم مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب نگرامی ندوی نے لکھنؤ سے اصلاح کے نام سے ایک ماہوار تبلیغی رسالہ جاری کیا ہے ، جس کے تین پرچے نکل چکے ہیں ، تین روپئے سال اسکی قیمت ہے ، اس رسالہ کا مقصد مسلمانوں کی مذہبی ، اخلاقی اور معاشرتی اصلاح ہے ، ضرورت ہے کہ مسلمان اس کی خریداری کی طرف توجہ کریں ،

آج کل کے اسلامی اخبارات میں باہمی ذاتی مناقشوں کی ایسی بدترین تصویریں نظر آرہی ہیں ، کہ ان کے صفحات کو غض بصر کے بغیر پڑھنا مشکل ہے ، ایک دوسرے پر الزام تراشی اور حریف کو ہر طرح بدنام کرنے کے لئے مشتبہ الفاظ ، ذومعنین جملے ، اور دوسرے ناپاک واقعات کی تلمیحات بے محابا استعمال کی جارہی ہیں ، اور مزید تعجب یہ ہے کہ ان چھینٹوں سے مقدس عباؤں کے دامن بھی پاک نہیں ، انقلاب وزمیندار وہند جدید کا قضیہ تو پرانا ہوچکا ، اب ہند جدید اور خلافت باہم دست وگریباں ہیں ، مدینہ اور الجمعیۃ ایک طرف ، الامان ووحدت

دوسری طرف ہیں، بہار میں اتحاد ایک جانب اور نقیب دوسری سمت باہم اس طرح نبرد آزما ہیں، کہ متانت اور سنجیدگی کو آنکھیں بند کر لینی پڑتی ہیں، جب ہمارے معلمین اخلاق کے یہ اخلاق ہیں، تو عام مسلمانوں کا کیا شکوہ، ؟

ان خانہ جنگیوں کا آغاز گو اختلاف رائے سے ہوا، مگر اب وہ تو قومیات کے بجائے ذاتی عناد و کاوش کا مظاہرہ کر رہی ہیں، جن میں ہر فریق اپنے حریف کو بدنام کرنے کے لئے اس کے خلاف غلط فہمیوں کو پیدا کرنے میں سراپا مصروفِ عمل ہے، موجودہ جدید طرز تحریر کا ہر اسلوب ایک مستقل حربہ کی صورت میں استعمال پا رہا ہے، مشتبہ الفاظ، سوالات، نقطے، افواہ طنز، تلمیحات، بے نام تحریریں ہر چیز معرض اشاعت میں آرہی ہے، اور ان کو "پاک قومیات" کا درجہ دیا جا رہا ہے، یہ منظر کس قدر دردناک ہے،

مسلمانوں کا سیاسی انتشار اب کچھ چھپا راز نہیں، ہم نے پہلے مسلم لیگ بنائی، پھر خلافت قائم کی، پھر جمعیت کھڑی کی، بعد ازیں مسلم کانفرنس کو پیدا کیا، پھر جماعت احرار میدان میں آئی، اور ان میں سے ہر ایک کو مسلمانوں کی سیاسی نمایندگی کا دعویٰ ہے، اور ہر ایک پوری قوم کی زبان ناطق بننے کی مدعی ہے، ایسی حالت میں مسلمانوں کا کوئی پروگرام اب تک نہ قابل عمل ہو سکا ہے، اور نہ آیندہ ہو گا، اس سے پہلے کہ مسلمانوں کو اصلاح کی دعوت دی جائے، ضرورت ہے کہ ان انجمنوں کی شکست وریخت کی جائے، ان میں سے بعض کو دفن کر دیا جائے، بعضوں کے مقاصد بدل دیئے جائیں، اور صرف ایک سیاسی انجمن قائم رکھی جائے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ احرار اور معتدلین دو گروہوں میں منقسم ہو کر دو سیاسی مجلسیں بنا لیں، لیکن یہ تو نہ ہو، کہ دو جمعیۃ العلمائیں ایک شہر میں بلکہ ایک ہی محلہ میں قائم ہو کر "جمعیۃ علمائے ہند" کہلائیں، اور اصلی کو نقلی سے تمیز کرنا مشکل ہو جائے، حالانکہ شعرار کے تخلص کی طرح ابھی نئی انجمنوں کے لئے ناموں کی کمی نہیں،

ملکی حالات کے انقلاب کے سبب سے ضرورت ہے، کہ ہم اپنے خیالات پر پھر ایک نظر

ڈالیں، اور گذشتہ تعصبات کو چھوڑ کر فکر و عمل کی وحدت کی نئی کوشش کریں، اور اس ذمہ داری کو محسوس کریں، جو پوری قوم کی گمراہی اور غلط روی سے ہمارے رہبروں کے سر پر عائد ہوگی، ذاتی کدو کاوش اور پرانی مخالفتوں اور رایوں کے اختلاف کو اگر اب بھی مسلمانوں نے دفن نہیں کیا، تو وہ نہ ملک کے کام آسکیں گے، اور نہ حکومت ہی کی خوشنودی کی وہ "دولت" پاسکیں گے، جس کے لئے ہمارے بہت سے افراد بہت بے تاب ہیں، سلطنتیں دوستی کا پیمان اس طاقت اور قوت سے باندھتی ہیں، جو ان کو نفع یا نقصان پہونچا سکے، مختلف الآراء، کمزور دل اور ناتواں جماعت کس برتے پر کسی کو اپنے ساتھ عہد و پیمان باندھنے پر مجبور کرسکتی ہے،

(معارف ماہ ستمبر ۱۹۳۳ء)

(۱۰)

دار المصنفین سے امسال تین کتابیں چھپ کر شائع ہوں گی، ایک خیام، جس میں خیام کے سوانح اور تصنیفات پر ناقدانہ تبصرہ ہے، اور آخر میں اس کے چھ فلسفیانہ عربی اور فارسی رسالوں اور رباعیات کے ایک مستند نسخہ کا ضمیمہ ہے، ضخامت ۵۰۰ سے کچھ زائد ہوگی، دوسری کتاب سیر الصحابہ کی ساتویں جلد ہوگی، اور اسی پر اس وسیع سلسلہ کا خاتمہ ہوگا، اور تیسری افکار عصریہ ہوگی، جس میں موجودہ سائنس کے تمام شعبوں کے نظریاتی مسائل سہل اور آسان اور دلچسپ عبارت میں لکھے گئے ہیں، یہ کتاب انگریزی سے ترجمہ کی گئی، اور اس خیال سے شائع کی جا رہی ہے، کہ عربی مدرسوں کے نصاب میں داخل ہوسکے، اور عربی خواں طلبہ کو سائنس کے جدید نظریوں سے آگاہی ہوسکے،

خوشی کی بات ہے، کہ حجاز (مکۂ معظمہ) میں "مطبعہ سلفیہ" کے نام سے ایک علمی مطبع قائم ہوا ہے، اور اس کے ذریعہ سے مفید عربی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا ہے، ازرقی نے جو امام مالک کے ہمعصر ہیں، مکہ کی تاریخ لکھی تھی، جو گو یورپ میں چھپ چکی تھی، مگر مدت سے

اس کے نسخے مفقود تھے ، مطبع مذکور نے اس کے دوبارہ چھاپنے کا اہتمام کیا ہے ، حجاز کے مکاتب کے لئے سستم القرآۃ العربیہ کے نام سے چند ریڈریں چھاپی گئی ہیں ، اور بعض دوسرے رسالے بھی وہاں چھاپے گئے ہیں ،

اس سلسلہ میں سب سے اہم خبر یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے امام مالک کی موطا کی جو دو شرحیں مسوی (عربی میں) اور مصفی (فارسی میں) لکھی تھیں ، اور جو ہندوستان میں کئی دفعہ چھپ چکی ہیں ، مگر اس طرح کہ عربی شرح فارسی شرح کے حاشیہ پر اب عربی شرح مسوی مستقل طور سے متن میں چھاپی گئی ہے ، شروع میں مولانا عبدالوہاب دہلوی مقیم مکہ معظمہ کے قلم سے حضرت شاہ صاحب کے حالات و سوانح لکھے گئے ہیں ، اور مصفی کے شروع میں شارح نے جو مفید مقدمہ فارسی میں لکھا تھا ، اس کا عربی ترجمہ شامل کیا گیا ہے ، کہیں کہیں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سابق ناظم نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی کے قلم سے مزید حواشی درج ہیں خوبصورت ٹائپ ، اور مفید حواشی اور ضمیموں کے ساتھ اس کتاب کی اشاعت بہترین خدمت ہے ، کتاب ۱۲ عـ ..... میں شرف الدین کتبی و اولادہ واقع بھنڈی بازار بمبئی سے ملے گی ،

چونکہ اس کتاب کی اشاعت میں ذمہ دار ہندوستان کے علماء ہیں ، اس لئے ان کی خدمت میں یہ گذارش بیجا نہ ہو گی ، کہ اگر وہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ کی دیگر فارسی تصانیف کو عربی جامہ پہنا کر شائع کریں ، تو ہندوستان کی نیک نامی ایک طرف اس سے زیادہ یہ کہ شاہ صاحب کے علوم سے دنیائے اسلام فیض یاب ہو گی ، اور یہ اسلام کی ایک مہتم بالشان خدمت ہو گی ،

شاہ صاحب کی فارسی شرح مصفی درحقیقت ایک مجتہدانہ تصنیف ہے ، اس کا ترجمہ بے حد مفید ہو گا ، شاہ صاحب کی ازالۃ الخفا نصف عربی اور نصف فارسی میں ہے ، اگر یہ کل عربی میں ترجمہ ہو کر کئی جلدوں میں شائع ہو تو بڑی خیر و برکت کی چیز ہو گی ، شاہ صاحب کی فوز الکبیر فی علم التفسیر کا فارسی متن اکثر ملتا ہے ، اور اب عربی مدرسوں میں اکثر زیر درس ہے ، مگر اس کا فارسی متن عربی طالب علموں کے لئے وقت طلب ہے ، اس کا ایک عربی متن بھی ہے ، جو سنہ ۱۲۹۵ھ میں آج سے

ستاون ۵۷ برس پہلے مکہ معظمہ میں محمد فیروز آبادی کی سفر السعادۃ (عربی) کے حاشیہ پر چھپا تھا، اور آخر میں فتح الخیر شامل تھی، اب اگر مطبعہ سلفیہ ان دونوں رسالوں کا یہ عربی متن مستقل طور سے چھاپے تو علوم قرآن کی تفہیم واشاعت کے کام میں عظیم الشان خدمت ہوگی،

عین اس وقت جب یہ سطریں زیر تحریر تھیں، مکہ معظمہ میں دار الحدیث کے قیام کی خوشخبری موصول ہوئی، حرم محترم میں حدیث اور قرآن پاک کا درس ہمیشہ سے جاری تھا، اور اس فیض کے سرچشمہ سے پوری دنیائے اسلام سیراب ہوتی تھی، جنگ عظیم کے بعد سے حجاز میں فتنوں کا جو سیلاب آیا، وہ تمام پچھلی روایات کو بہا کر لے گیا، موجودہ حکومت سرمایہ کی کمی کے باوجود ان روایات کو دوبارہ بہتر صورت میں قائم کرنے کے لئے مقدور بھر کوشاں رہتی ہے، حرم محترم کے ہر قسم کے مصارف کا بار اوقاف وعطایا وخیرات کی صورت میں کل عالم اسلام اٹھا رہا تھا، اب اس عہد میں اسلامی سلطنتیں کچھ تو برباد ہوگئیں، اکثر پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا، اور جو باقی ہیں، وہاں فاسد قومیت ووطنیت کا وہ زور ہے، کہ بین الاسلامی تعلقات کا خاتمہ ہوگیا، اب حرم محترم کے مصارف کی ذمہ داری خاص حجاز کی مفلس حکومت اور حاجیوں کی جیبوں پر ہے، اور ان دونوں کا سرمایہ حرمین کے ضروری مصارف کا بار اٹھانے کے ناقابل ہے، یہ صورت حال مسلمانان عالم کے غور کے لائق ہے،

بہرحال یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا، اصل میں یہ کہنا ہے، کہ مکہ معظمہ میں حدیث وقرآن پاک کے درس کا انتظام اس حکومت موجودہ کے عہد میں دوبارہ قائم ہوا ہے، اور دار الحدیث کے پرانے نام سے ایک نئی درسگاہ ۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۲ھ سے قائم کی گئی ہے، جس میں علوم حدیث وتفسیر کا باقاعدہ درس جاری ہوگا، صحاح ستہ کا دورہ محدثین سلف کے قاعدہ کے مطابق ہوگا، اور عربی زبان وادب کی تعلیم بھی ضمناً ہوگی، تعلیم کی کوئی فیس نہ ہوگی، اور کتابیں وغیرہ طلبہ کو مفت ملیں گی، بلکہ بعض مستحق طالب علموں کو وظائف دیے جائیں گے، طریق تعلیم میں محدثین کے پرانے طریق املاء کو زندہ کیا جائے گا، اور طلبہ کو بحث وتحقیق اور تقریر و املاء کی

مشق کرائی جائے گی، اس کے مہتمم حرم کے امام عبدالظاہر ابوالسمح، خزانچی عبداللہ دہلوی اور ارکان شیخ محمد تصنیف، محمد عبدالرزاق حمزہ، عبیداللہ دہلوی (سندھی) عبدالوہاب دہلوی، محمد کامل کردی، محمد راضی، محمد نور فطانی، محمد صیاد منتخب ہوئے ہیں،

ضرورت ہے، کہ حساس دل مسلمان ادھر توجہ فرمائیں، اور وہ کام جن کے انجام دینے سے آج سلطنتیں اغماض کر رہی ہیں، ان کو غریب اپنی جھولیوں سے انجام دیں، ان مفید کاموں کے انجام دینے میں حجاز کے مسلک اور سیاست کی الجھنیں مسلمانوں کو اپنے فرض سے باز نہ رکھیں، کہ حرمین کی خدمات کا فرض سیاسیات اور فرقہ داریوں سے بلند تر اور اعلیٰ تر ہے، دارالحدیث کے خزانچی عبداللہ دہلوی صاحب ہیں، اور غالباً علی جان صاحب مرحوم کی کوٹھی واقع دہلی کے ذریعہ ہندوستان سے امدادیں بھیجی جا سکتی ہیں،

تاریخ خطیب پر مولانا شروانی صاحب کا تبصرہ علحدہ رسالہ کی صورت میں چھپ رہا ہے، اس لئے اس کو ضمیمہ کے طور پر آخر میں شائع کیا جا رہا ہے،

(معارف ماہ اکتوبر ۱۹۲۳ء)

(۱۱)

ناظرین یہ سن کر خوش ہوں گے، کہ اعلیٰ حضرت فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہٗ کی سرکار عالی مقدار نے دارالمصنفین کو یہ اعزاز بخشا ہے، کہ اس کو اپنی ضرورت کے لئے فقہ حنفی کے رو سے ایک ضابطۂ جنایات قتل و قصاص کی ترتیب و تدوین کا حکم دیا ہے، چنانچہ حکم والا کی تعمیل کی گئی، اور سابق دولت عثمانیہ کی مجلۃ الاحکام کی طرح یہ قانون جنایات بھی دفعہ وار مستند کتب فقہ حنفی کے حوالوں سے مرتب کیا گیا ہے، اب عنقریب اس کا مسودہ صاف ہو کر سرکار عالی کے ملاحظہ میں پیش ہو گا، اور اس کے بعد شاید منتخب مجلس علماء کے سپرد ہو، کہ وہ اس پر نظر ثانی کرے،

اعلیٰحضرت نادرخاں شاہ افغانستان کے عہد میں جو تعلیمی و علمی ترقیاں افغانستان میں روز افزوں ہیں، اب ان کی ترتیب و تنظیم کی تجویز زیرِ غور ہے، اور ایک کابل یونیورسٹی کی تکمیل عمل میں آرہی ہے، اور ساتھ ہی تراجم و تالیفات کے دائرے بھی وجود میں آرہے ہیں، اور غالباً انہی امور میں مشورہ کی غرض سے ہندوستان سے چند اصحاب کو دارالسلطنت آنے کی دعوت افغانستان کی حکومت کی طرف سے دی گئی ہے،

یہ تعلیمی و علمی دعوت ڈاکٹر سر محمد اقبال، نواب سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اور ایڈیٹر معارف کو موصول ہوئی ہے، خدا کرے اس علمی وفد سے اس دولت خداداد کی جس کا خداداد ہونا کئی دفعہ تاریخ میں ثابت ہو چکا ہے، اگر مفید خدمت انجام پا سکے، اور جس طرح اس کا ملک خداداد ہے، اس کا علم و تمدن بھی خداداد ثابت ہو سکے،

یہ عجیب اتفاق ہے، کہ راقم کی بعض اہم تصنیفات جب جب شائع ہوئیں، تب وہ ہندوستان سے باہر تھا، سیرۃ عائشہؓ جب سنہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تو لندن میں تھا، سیرۃ النبیؐ کی دوسری جلد جب شائع ہوئی تب بھی لندن میں تھا،

.... ، چنانچہ اس کا مقدمہ بھی وہیں بیٹھ کر لکھا گیا۔ سیرۃ النبیؐ کی تیسری جلد جب چھپی، تو مؤلف سلطان ابن سعود اور شریف علی کے محاذِ جنگ پر جدہ میں تھا، اور اس کا مقدمہ وہیں سے لکھ کر ہندوستان بھیجا گیا، اور اب جب خیام کی چھپائی کی باری آرہی ہے، تو پھر جلاوطنی کے سامان ہیں، کیا حسنِ اتفاق کے سوا ان دو واقعوں میں کوئی منطقی ربط و لزوم بھی ہے،

آج کل بعض جماعتوں نے مسئلۂ قضا کی تحریک و اشاعت کی کوششیں از سرِ نو کی ہیں، یہ حسنِ اقدام مبارک ہے، لیکن اس سے پہلے کہ اس کے لئے قدم اٹھایا جائے، ضرورت اس کی ہے، کہ مسلمان مجالس اور انجمنوں کے اتحاد و تعاون کی طرف قدم اٹھایا جائے، حکومت صرف قومی قوت کو مانتی ہے اور قوت صرف اتحاد سے پیدا ہو سکتی ہے، ڈر ہے کہ اتنی اہم و ضروری تحریک

بھی ہمارے اختلافات باہمی کے نذر ہوجائے ،

جہاں تک اس تحریک کی تاریخ کا تعلق ہے ، یہ سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں معارف کے صفحات میں مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے وقت میں کی گئی ، اور اس کے بعد جمعیۃ العلماء کے خطبۂ صدارت کلکتہ اور جمعیۃ العلماء کی تجاویز اور معارف کے شذرات میں بار بار پیش کی جاتی رہی یوپی گورنمنٹ نے ۱۹۲۶ء میں سر جسٹس سلیمان کی صدارت میں بعض مسلمان ارکان کونسل اور بعض علماء کی مجلس اس غرض سے قائم کی تھی ، کہ نکاح وطلاق کے درج رجسٹر ہونے کے امکان پر غور کیا جائے ، اس مجلس نے متعدد نشستوں میں اس کام کو انجام دیا ، اور صوبہ کے اکثر ممتاز علماء اور معززین کی شہادتیں قلم بند کی گئیں ، اس کمیٹی کے ایک ممبر ڈاکٹر شفاعت احمد خاں بھی تھے ، علماء میں مولانا کفایت اللہ صاحب ، مولانا قطب الدین عبد الوالی صاحب مولانا نعیم الدین صاحب مرادآبادی ، اور یہ خاکسار اور بعض دوسرے اصحاب بھی تھے ، اس سلسلہ میں کمیٹی کے ممبروں میں کچھ اختلاف تھے ، جن کی بنا پر ہم میں سے بعض اصحاب نے اپنا اختلافی نوٹ الگ پیش کیا تھا ،

اختلافی نوٹ کی تحریر کی خدمت خاکسار کو سپرد ہوئی تھی ، اور مولانا کفایت اللہ صاحب مولانا قطب الدین عبد الوالی صاحب اور چودھری رشید الدین صاحب رئیس بارہ بنکی نے اس کی تائید فرمائی تھی ، اس اختلافی نوٹ میں مسئلہ قضا کی اہمیت ، ضرورت اور اس کے قیام کی تدابیر پر مدلل بحث تھی ، یہ تحریر رپورٹ میں شامل ہو کر گورنمنٹ میں پیش ہوئی ، مگر تعجب ہیکہ نہ ہمارے صوبہ کی گورنمنٹ نے اور نہ کونسل نے اپنی اس تحریک و تجویز کی خبر لی ، ممکن ہوا تو آیندہ معارف میں ہم اس تحریر کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے ، تاکہ مسئلہ مذکور کے اکثر پہلو سامنے آجائیں ،

فلسطین میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی تحریک سال دو سال سے چل رہی ہے ، اور سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین ، جو فلسطین کے اسلامی جسم کا دماغ اور روح ہیں ، وہ اس

تجویز کو عمل میں لانے کے لئے پوری طرح منہمک ہیں ، اور کئی مہینوں سے ہندوستان کا دورہ فرما رہے ہیں ، موصوف سے ہم کو موتمر اسلامی مکہ معظمہ کے زمانہ سے ذاتی تعارف حاصل ہے ، اور ان کے اخلاص اور درد ملت میں ذرہ برابر بھی شک نہیں ، لیکن ان کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا ہے ، کہ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کے استیلاء کے بعد مسلمانوں کو ایک اسلامی یونیورسٹی کے تخیل میں ہر ملکی ضرورت اور سیاسی تغیر سے الگ رکھ کر تعلیم کی وادی تیہ میں چالیس سال تک سرگرداں رکھا گیا ، کہیں تاریخ کا اعادہ اسی طرح بنی اسرائیل کے بدلہ مسلمانان فلسطین کو تو (جواب ہماری ہی طرح انگریزی تخت واقتدار میں ہیں) ہر طرف سے موڑ کر اس وادی میں نہیں لے چل رہا ہے ، فتنبہ :

مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے گذشتہ اجلاس میں ایک تجویز یہ بھی پیش ہوئی تھی ، کہ اس یونیورسٹی کے کالجوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کی اجازت دی جائے ، وائس چانسلر صاحب کی تحریک سے یہ تجویز علمی مجلس کے سپرد کردی گئی ہے ، کہ وہ اس کا مناسب فیصلہ کرے وہ فیصلہ کیا ہوگا ، اس کی خبر نہیں ،

اس موقع پر یہ گذارش بیجا نہ ہوگی ، کہ ہم اپنے طور وطریق اور طرز تمدن کو خیرباد کہہ کر جن قوموں کی ریس کرنا چاہتے ہیں پہلے ان ہی سے پوچھنا چاہیئے کہ آیا وہ اس کو اپنے تمدن کے حق میں زندگی سمجھ رہے ہیں ، یا موت . بہرحال جو کچھ ہونا ہے ، وہ ہوکر رہے گا ، تاہم ہماری چیخ پکار اگر سنگدل کو رحم دل نہیں بنا سکتی ، تب بھی جب تک جسم میں زندگی ہے ، چوٹ لگنے پر دل سے آہ تو ایک دفعہ نکل ہی جائے گی ،

خوشی کی بات ہے ، کہ مسلم یونیورسٹی نے اردو امتحانات اور ڈگریوں کے مسئلہ میں ایک قدم آگے بڑھایا ہے ، ایک دن یہ حقیقت بھی تسلیم کرلی جائے گی ، کہ اردو زبان بھی دوسری زبانوں کی طرح یہ حق رکھتی ہے ، کہ اس کو بھی اعلیٰ معیاری امتحانوں میں جگہ دی جائے ،

(معارف ماہ نومبر ۱۹۲۳ء)

(۱۲)

اس ماہ کے سلسلۂ مقالات میں "سفر افغانستان" کے عنوان سے پہلا مقالہ درج ہے ، جس میں اس سفر کے سرسری اور جزئی خیالات کا بیان ہے ، کہیں کہیں غیر اہم باتیں بھی آگئی ہیں، جس کا سبب یہ ہے ، کہ غیر ملک کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی سیاح کو نئی اور انوکھی معلوم ہوتی ہیں، سفر کے سرسری واقعات کے ختم ہونے کے بعد اس ملک کے حالات پر ایک مفصل تبصرہ بھی حوالۂ قلم ہوگا، اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس ملک کی اصلی خدمت یہ ہے ، کہ اسکو اس امن و امان اور سکون کے حصول کا موقع دیا جائے ، جو اس کو میسر نہیں آتا، پھر اس کو اس کی قبائلی زندگی سے نکال کر وسیع قومی و وطنی دائرہ میں آنے کی تلقین کی جائے ، اور ملک میں صحیح تعلیم کی اشاعت عام کی جائے ۔ اور وہاں کی مذہبی تعلیم میں نصاب و طریقۂ درس کی وہ اصلاح کی جائے، جس کی ضرورت آج تمام علمائے اسلام نے بالاتفاق تسلیم کر لی ہے ،

افغانستان کے علمی و ادبی حلقہ میں روزافزوں ترقی کے آثار نمایاں ہیں، اس سلسلہ میں تاریخ اسلام کی ضروری کتابوں کے ترجمے بھی ہو رہے ہیں، اس سے پہلے علامہ شبلی مرحوم کی الفاروق کا فارسی ترجمہ وہاں شائع ہو چکا ہے ، اور اب خاکسار کی سیرت عائشہؓ کا ترجمہ کیا گیا ہے ، ترجمہ مکمل ہو چکا ہے ، اور اس وقت سردار شاہ محمود خاں وزیر حربیہ کے مطالعہ میں ہے، موصوف صاحب سیف و قلم ہیں، میری نئی تصنیف خیام اس سفر میں میرے ساتھ تھی جس ذوق و شوق سے انہوں نے لی، اس سے ان کے ادبی و علمی شغف کا پتہ چلتا تھا، امید ہے کہ یہ ترجمہ چند ماہ کے بعد وہاں کے حالات کے سکون کے بعد شاہ ظاہر خاں کے عہد میں طبع ہو کر شائع ہو عجب نہیں کہ وہ افغان خونیں کی نئی راہ زندگی میں نمونہ اور اسوہ کا کام دے ،

اس سلسلہ میں یہ خبر بھی مسرت افزا ہوگی ، کہ مکہ معظمہ کے چند ادباء نے مل کر یہ تہیہ کیا ہے کہ دار المصنفین کی سیرۃ النبیؐ اور سیرۃ عائشہؓ کا ترجمہ عربی زبان میں کریں ، شیخ رشدی الصالح ملحس اڈیٹر ام القریٰ اس تجویز کے محرک ہیں ، اگر یہ ترجمے واقعًا چھپ کر شائع ہو گئے۔

تو امید ہے، کہ دنیائے اسلام کے مرد و زن کے سامنے اسلام کے دونوں صنفوں کے بہترین نمونے آجائیں گے،

صوبۂ بہار کے بعض نوجوانوں نے صوبہ کے علمی و روحانی مرکز پھلواری میں جو اب سلسلۂ آبادی میں صوبہ کے دارالحکومت پٹنہ سے ملحق ہو رہا ہے، ایک مسلم اکاڈیمی کا خواب دیکھا ہے، یہ مجلس گو شروع تونخ کی ایک شخصی کوشش سے ہوئی، مگر اب چند سال سے یہ ایک جماعتی مجلس کے قالب میں ڈھل رہی ہے، مجلس کے مقاصد حسبِ ذیل ہیں، زبان اردو کی توسیع، و ترویج ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلامی روایات اور پچھے کارناموں سے، روشناس کرنا، اسلام اور شاہان اسلام کے متعلق جو غلط فہمیاں ہوں ان کو دور کرنا ٹکسٹ بک کمیٹی اور بورڈ آف اسٹڈیز کی منظور کردہ کتابوں کو مذہبی، تاریخی اور ادبی نقطہائے نظر سے جانچنا، اردو اور انگریزی زبان کی تصانیف کا ایک کتب خانہ قائم کرنا، خوشی کی بات ہے کہ سابق وزیرِ تعلیمات مرحوم سر فخرالدین کی طرح حال وزیر تعلیم مولوی سید محمد حسین صاحب بھی اس کی سرپرستی فرما رہے ہیں،

لاہور کے صیغۂ مشرقیات کے اساتذہ تحسین و آفرین کے مستحق ہیں، کہ وہ ہمارے علمی، ادبی ذخیرہ میں ہر سال کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے رہتے ہیں، پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی نے حکیم میر قدرت اللہ قاسم کا تذکرۂ شعرائے اردو (مجموعۂ نغز) بڑی محنت سے شائع کیا ہے، پروفیسر محمد اقبال نے اخبار الدولۃ السلجوقیہ نام بنی سلجوق کی ایک عربی تاریخ تصحیح کر کے شائع کی ہے، اور عنقریب تاریخ الحکمار بیہقی (تتمہ صوان الحکمۃ) پروفیسر محمد شفیع صاحب کی محنت و کوشش سے شائع ہونے والی ہے،

اب تک مسلمانانِ چین کے حالات میں پروفیسر آرنلڈ کی دعوتِ اسلام کے حصہ چین کے سوا ہماری زبان میں کوئی کتاب موجود نہ تھی، حالانکہ چین کی اسلامی برادری کا علم ایک مدت سے ہم کو ہے، اب مسرت کی جگہ ہے کہ خود ایک چینی نوجوان اہل قلم نے جن کا اسلامی نام بدر الدین ہے، اور جو چھ سات سال سے ہندوستان میں تحصیل علم میں مصروف ہیں، اس کمی کو پورا کیا ہے،

اور مسلمانانِ چین کے گذشتہ اور موجودہ حالات پر دو ڈھائی سو صفحوں کی ایک کتاب لکھ کر ہم کو اشاعت کی غرض سے دی ہے، نوجوان موصوف کلکتہ سے پہلے دار العلوم ندوہ لکھنؤ میں آئے پھر انگریزی تعلیم کی غرض سے جامعہ ملیہ دہلی گئے، اور وہاں سے فراغت کرکے عربی ادب میں تکمیل و ترقی کی غرض سے پھر دار العلوم ندوہ میں مقیم ہیں، انہوں نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ عربی میں مضمون لکھ دیتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اپنی اس کتاب کا عربی میں خود ہی ترجمہ کریں۔

لکھنؤ سے جو ماہوار اصلاحی و اخلاقی و مذہبی رسالہ اصلاح نام نکالا گیا تھا، بحمد اللہ کہ وہ چھ مہینوں سے اب تک نکل رہا ہے، اور اپنی بعض خصوصیات کے لئے پسند کیا جا رہا ہے، ضرورت اس کی ہے، کہ مسلمان اس کی طرف توجہ کریں، اور اپنی خریداری اور امداد سے اس کے نوجوان اڈیٹر کی حوصلہ افزائی فرمائیں، رسالہ کی قیمت صرف تین روپئے سالانہ ہے، اور پتہ رسالہ اصلاح، بادشاہ باغ لکھنؤ ہے،

یورپ میں لندن اور لائیڈن سے انگریزی، فرنچ اور جرمن میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے نام سے جو مسلسل اجزاء ۱۹۱۳ء سے شائع ہو رہے ہیں، اور جواب واؤ تک پہونچ چکے ہیں، اور جن میں اسلام، اسلام کے عقائد، عبادات، فقہ، تاریخ، اور مسلمان ملوک و سلاطین و حکماء و مصنفین، غرض اسلامی علوم و فنون و تاریخ کے جملہ مباحث ہوتے ہیں، مصر کے چند ارباب علم کی کوشش سے اکتوبر ۱۹۳۳ء سے ان کا عربی ترجمہ شروع ہوا ہے، محمد ثابت الفندی سند یافتہ فلسفہ و احمد الشنتناوی سند یافتہ فلسفہ و تاریخ، ابراہیم زکی خورشید سند یافتہ تاریخ اور عبد الحمید یونس کے نام ترجمہ کی لوح اول پر ثبت ہیں، ابھی صرف اس کا پہلا جزء شائع ہوا ہے، اور ہندوستان میں ابناء شرف الدین تاجرین کتب بھنڈی بازار بمبئی اس کے ایجنٹ ہیں، ہر دو ماہ میں اس کے چار چار جزء (۶۴ صفحے) شائع ہوا کریں گے۔ اور ہر اشاعت دو ماہہ کی قیمت ایک روپیہ ہوگی شائقین علم اس کے لئے ابناء شرف الدین کے پتہ سے درخواستیں بھیج کر اس کے خریدار بن سکتے ہیں، مصر میں اس کے دفتر کا پتہ شارع قصر النیل نمبر ۲۳ ہے،

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اکثر اجزاء، نظر سے گذرے ہیں، اور دار المصنفین ان کا مستقل خریدار ہے، یہ بات بے محابا کہی جا سکتی ہے، کہ مسلمانوں کے علوم و فنون و تاریخ پر یورپ کی تحقیقات جہاں تک پہونچی ہے ...... ان کا نچوڑ، اور عطر ان اجزاء میں کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے، لیکن جہاں تک مذہبی علوم و مباحث کا تعلق ہے، افسوس ہے کہ ان میں بے حد غلطیاں ہیں، خصوصًا اے، جی، ونسنک صاحب کی تحقیقات میں عصبیت اور دانستہ شرارتوں کا طومار ہے، اور وہ انسائیکلوپیڈیا کے مؤلفین میں سے ایک ہیں، لیکن خوشی کی بات ہے، کہ مصر کے اہل علم بھی ان کی اس حیثیت سے اچھی طرح واقف ہیں، چنانچہ مصر کی شاہی لغوی مجلس میں ان کے شریک کئے جانے پر اختلافات برپا ہیں، انسائیکلوپیڈیا کے عربی مترجمین بھی اس کتاب کی اس کمزوری سے آگاہ ہیں، اور اسی بنا پر وہ علمائے ازہر اور دیگر مسلمان اہلِ علم سے قابل اعتراض مواقع پر حواشی لکھوا کر کتاب میں شامل کر رہے ہیں،

(معارف ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء)

شذرات

جنوری سنہ ۱۹۳۴ء تا دسمبر سنہ ۱۹۳۴ء

بحمد اللہ تعالیٰ کہ معارف اپنی زندگی کے انیسویں سال میں داخل ہو رہا ہے، اور اس سے زیادہ شکر کا مقام یہ ہے کہ اوقات اور معیار کی پابندی کے ساتھ وہ اس اثنا میں برابر اپنے خدمات میں مصروف رہا، دعا ہے کہ اسی طرح تا دیر اس کو ادائے خدمت کا موقع ملتا رہے،

سال گذشتہ کی تصنیفات میں خیام تو پہلے شائع ہو چکی تھی۔ اور اب سیر الصحابہ جلد ہفتم کی اشاعت کی خبر دی جاتی ہے، اس میں ایسے ڈیڑھ سو صحابہ کے حالات ہیں، جو عہد رسالت میں کمسن تھے، اور اسی جلد پر اس وسیع سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا، آج سے تیئیس برس پہلے حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے سیرۃ النبیؐ کے ساتھ ساتھ صحابۂ کرام کی مبارک سیرتوں کی تدوین کا بھی خواب دیکھا تھا، اور اس کی تکمیل کے لئے خاتمۃ الملۃ المحمدیہؐ و مخدومۃ الامۃ الاحمدیہؐ نواب سلطان جہاں بیگم سابق فرماں روائے بھوپال رحمۃ اللہ تعالیٰ کی سرکار میں تحریک کی گئی تھی، خوشی اور شکر کا مقام ہے، کہ ان مرحومین کی مقدس تمناؤں کی تکمیل کے ساتھ اردو زبان میں اسلام کے سب سے مقدس اور پاک دور کی تاریخ مرتب ہو گئی، دار المصنفین کے ذخیرۂ اعمال میں اگر صرف یہی ایک کارنامہ ہوتا تو اس کے فخر کے لئے کافی ہوتا، ولا فخر،

افکار عصریہ جس کی اشاعت کا اعلان کیا گیا تھا، گذشتہ سال اس کی چھپائی شروع نہ ہو سکی، کاپیاں لکھی ہوئی پوری موجود ہیں، امید ہے کہ سنہ ۳۴ء کی پہلی سہ ماہی میں چھپ جائے اس کے بعد انشاء اللہ تاریخ صقلیہ کی دوسری جلد کی چھپائی شروع ہو گی، اس جلد میں مسلمانان صقلیہ کے علوم و فنون اور تمدن کی پوری تاریخ آگئی ہے۔

ڈیڑھ دو سال کے قریب گذرا کہ معارف میں یہ خبر درج کی گئی تھی کہ وینسنک صاحب کی معیت میں مستشرقین کی ایک جماعت کتب احادیثِ نبوی کی ایک مرتب فہرست تیار کر رہی ہے، دو ماہ ہوئے کہ اس فہرست کا پہلا ٹکڑا شائع ہو گیا، اس میں باب الالف کے مضامین کے حوالے درج ہیں۔ مثلاً اجارہ کے متعلق .... جسقدر حدیثیں جن کتب حدیث میں ہیں، ان کے حوالے بقید صفحات یا ابواب ایک ایک دو دو لفظوں میں لکھدیئے گئے ہیں، تمام متون اور حوالے کل کے کل عربی میں ہیں، اس لئے خاص عربی داں اصحاب بھی ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، افسوس یہ آتا ہے کہ کام کن کے کرنے کا تھا، اور کون کر رہے ہیں، فاعتبروا یا اولی الابصار۔

یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ رام پور کے مشہور علم دوست فاضل اور وہاں کے مشہور شاہی کتب خانہ کے سابق ناظم اور متعدد کتابوں کے مترجم و مصنف حافظ احمد علی خاں صاحب شوق نے اوائل رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ میں تقریباً پینسٹھ یا ستر برس کی عمر میں انتقال فرمایا، مرحوم نہایت با اخلاق، با مروت علم دوست اور صاحبِ کمال تھے، قلمی اور نادر کتابوں کے خاص ماہر تھے، معارف کے ناظرین کبھی کبھی ان کی تحقیقات سے مستفید ہوا کرتے تھے، ان کی سب سے بہتر کتاب تذکرہ کاملین رام پور ہے، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے،

اسلامی علوم و فنون لطیفہ کی تحقیقات کا ایک نیا رسالہ "آرس اسلامیکا" ولایات متحدہ امریکہ سے محمد آغا اوگلو (شاید کسی ترک) کی اڈیٹری میں مشیگان یونیورسٹی پریس سے نکلنا شروع ہوا ہے، اس میں امریکہ، یورپ، اور ایشیا کے اکثر مستشرقین مضامین لکھیں گے، سال میں دو دفعہ جنوری اور جون میں نکلا کرے گا، قیمت ۵ ڈالر مضامین انگریزی، فرنچ، جرمن تین زبانوں میں ہوں گے،

(معارف ماہ جنوری ۱۹۳۴ء)

(۲)

۱۵ ؍ جنوری ۱۹۳۴ء کے دو بجے دن کا وقت ہر حیثیت سے قیامت صغریٰ تھا، خصوصاً بہار اور اس کے حصۂ شمال میں تو کہنا چاہیئے کہ ان زلزلۃ الساعۃ شیٔ عظیم (اس گھڑی کا زلزلہ بڑی مصیبت کا ہوگا) کا نقشہ تھا، قیامت کے سانحوں اور حادثوں کا جو نقشہ قرآن نے کھینچا ہے، وہ چھوٹے پیمانہ پر حرف بحرف بہار میں نظر آیا، زمین کے طبقات کا الٹ جانا، پہاڑوں کا ہلنا، دریاؤں کا جوش مارنا، انسانوں کی نفسی نفسی والدین کی اولاد سے اور اولاد کی والدین سے بے تعلقی ہر چیز قیامت کی مثال و نظیر تھی، اور یہ کہنا سچ ہے، کہ انسانوں نے اپنے دو سو برس کے علم اور سائنس سے شمالی بہار میں جو کچھ بنایا تھا، اس کو خدائے قادر کے دو منٹ کے اظہار جلال نے عدم محض اور ہباءً منثورا کر کے دکھا دیا، لمن الملک الیوم للہ الواحد القھار (ایک قہر والے خدا کے سوا آج کس کی سلطنت ہے) کا صور اس قطعۂ ارض کے ہر ذرہ سے ہر شخص کو سنائی دے رہا تھا،

ہمارے صوبہائے متحدہ پر گو اس کا اثر بہار سے کم پڑا، تاہم اس کے مشرقی اضلاع میں بعض جانوں کا اور ان سے زیادہ عمارتوں کا نقصان ہوا، ہمارے ضلع اعظم گڈھ میں بھی چند جانیں ضائع ہوئیں، اور عمارتوں کو بھی صدمہ پہونچا، شہر میں جانوں کی ہر طرح خیریت رہی، البتہ چند کچے مکانات گر گئے، اور بعض پختہ عمارتیں پھٹ گئیں، شہر کی جامع مسجد کے میناروں کو سخت نقصان پہونچا، دار المصنفین کی عمارتوں کی بعض دیواریں پھٹ گئیں، مسجد کی خیریت رہی، کتب خانہ کی ایک دیوار گوشہ سے ایک انگل پھٹ گئیں،

ہر آبادی میں اور ہر شخص پر اس زلزلہ کے الگ الگ جو اثرات ہوئے، اور جو ذاتی و مقامی تجربے اور مشاہدے ہوئے، اور بچ جانے، زخمی ہو جانے اور مر جانے کے جو مختلف حادثے اور واقعے پیش آئے، اگر ان کو کوئی شخص قلم بند کر سکے، تو اس کو خدا جانے کتنے عجائبات اور آثار قدرت اور آیات بینات نظر آئیں، جن کی نہ کوئی علمی توجیہہ ہو سکتی ہے

اور نہ بحث و اتفاق کے بے معنی لفظ کے سوا کسی اور چیز سے اس کی تعبیر کی جا سکتی ہے، بجز اس کے کہ یہ کہا جائے، کہ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیر، (خدا تعالیٰ کو ہر چیز پر قدرت ہے)

اس سلسلہ میں ہمارے ایک صاحب علم لیکن دیندار چودھری دوست غلام احمد صاحب پرویز (مقیم دہلی) نے چند سطریں لکھ کر بھیجی ہیں، جو علم و دانش کے مدعیوں کے لئے بصیرت کا موجب ہوں گی۔ لکھتے ہیں۔

عین الیقین

"معجزہ اپنے وجود میں کسی خارجی دلیل کا محتاج نہیں ہوتا، لیکن بعض اوقات ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں، جن کی روشنی میں ان "محالات عقلی و عادی" کی سرحدیں طبعی ممکنات سے جا ملتی ہیں، ۱۵ر جنوری کو جو ہیبتناک زلزلہ آیا، اہل بصیرت کے لئے انسانی بے بسی و بیچارگی کی کھلی کھلی نشانیاں اپنے اندر رکھتا ہے، "بُرُوجِ مشیَّدہ" میں بیٹھنے والے اس سراسیمگی میں ادھر ادھر بھاگتے نظر آتے تھے، کہ "این المفر" کی زندہ تفسیر معلوم ہوتے تھے، بڑے بڑے دماغ مختل اور دماغوں کی بڑی بڑی اسکیمیں دھری کی دھری رہ گئیں، اور بقول اکبر مرحوم،

بیک گردش چرخ نیلوفری ۔۔ نہ انجن بماند نہ انجینیری

لیکن اس کی تفصیلات میں ایک ایسا واقعہ نظر سے گذرا جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، بنی اسرائیل کے لئے دریا کا پھٹنا، اور راستہ دیدینا روشن خیال حضرات کے نزدیک ایک "مذہبی افسانہ" سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، حتیٰ کہ دورِ جدید کے بعض مفسرین بھی اس کی تاویل میں مدوجزر کے روزانہ معمول سے آگے نہیں بڑھے، لیکن ۲۰ر جنوری کے اسٹیٹسمین میں جریدۂ مذکور کے نامہ نگار کی وساطت سے ایک صاحب نے جو زلزلہ کے وقت پٹنہ کے دریائے گنگا کے کنارے کھڑے تھے، حسب ذیل چشم دید واقعہ شائع کیا ہے۔

"جہاں میں کھڑا تھا، اس کے مقابل دریا کے بیچ ریت کا چھوٹا سا ٹاپو تھا، ادھر کی طرف جہاں پانی کا بہاؤ کم تھا، کچھ لوگ اسنان کر رہے تھے، اور دوسری طرف جہاں پانی

گہرا تھا، کشتیاں اور اسٹیمر چل رہے تھے، یکایک تلاطم کی سی آواز آئی، پھر بھیانک سا شور سنائی دیا، اور میں کیا دیکھتا ہوں کہ پانی کے نیچے سے زمین ابھر کر ریت کے ٹاپو کے برابر آگئی، پانی پھٹ کر کہیں جذب ہوگیا، اور دریا کے آرپار خشکی کا مسلسل قطعہ بن گیا، اشنان کرنے والوں کا نچلا دھڑ بجائے پانی کے ریت میں تھا، اور کشتیاں اور اسٹیمر خشکی میں کھڑے تھے، پانچ منٹ تک یہی حالت رہی، پھر یکایک اس خشکی کے قطعہ سے پانی جوش مارتا ہوا، دکھائی دیا، زمین پھٹی، اور کہیں کہیں پچاس پچاس فٹ لمبی دراڑیں پڑ گئیں، جن میں سے پانی کے چشمے ابلتے ہوئے نکلے، سب سے بڑی خلیج وہاں تھی، جہاں پہلے ریت کا ٹاپو تھا، چند سکنڈ میں تمام دریا پانی سے بھر گیا، اور گنگا اپنی قدیم روانی سے بہے چلا جارہا تھا، گویا کوئی خلاف معمول واقعہ ہی نہیں ہوا،

اس واقعہ کے ذکر کرنے سے بنی اسرائیل کے واقعہ "فرق البحر" پر استشہاد مقصود نہیں بلکہ صرف یہ کہ پرستاران سائنس مذہب کے خلاف یک طرفہ ڈگری صادر فرماتے وقت صرف اس قدر سوچ لیا کریں، کہ سائنس کے اس قدر انکشافات و ترقی کے باوجود رموز فطرت کا ایک دفتر بے پایاں ہے، جو ابھی ذہن انسانی کی دسترس سے بہت آگے ہے، اور خود سائنس کے نظریئے جنہیں وہ اس درجہ غیر متبدل اور اٹل سمجھ رہے ہیں، ان کی حقیقت دور حاضر کے ایک بڑے سائنس داں سر آرتھر سٹینلے ایڈنگٹن کے قول کے بموجب یہ ہے کہ،

> "سائنس کے نظریئے دورِ گذشتہ میں بھی خطرناک غلطیاں کرتے چلے آئے ہیں، اور یقیناً آج بھی کرتے ہیں"

پرویز

(معارف ماہ فروری ۱۹۳۴ء)

(۳)

یہ خبر نہایت حیرت و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی، کہ اعلحضرت خسروِ دکن خلد اللہ ملکہ

کے چھوٹے بھائی نواب صلابت جاہ بہادر نے ستائیس سال کی عمر میں چند روز بیمار رہ کر رحلت فرمائی، مرحوم شاہی خانوادۂ آصفی کے ایک رکن رکین ہونے کے علاوہ مشرقی علوم ادب سے پوری دلچسپی رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم نوجوان شہزادہ کے سر پر اپنے الطاف و رحمت کا تاج رکھے، اور اعلیحضرت برادر اکبر اور دیگر اعزہ کو صبر و سکون اور رضا بالقضا کی غیر فانی دولت سے ممتاز فرمائے،

مصر و ترکی کے ان ارباب فکر میں جو موجودہ سیاسی ہنگاموں سے الگ ہو کر یورپ کے کسی گوشہ میں زاویہ نشیں ہیں، ایک قابل ذکر ہستی ڈاکٹر بہجت وہبی کی ہے، یہ نسلاً عرب ہیں اور حضرت معاذ بن جبل صحابیؓ کی اولاد سے ہیں، مادری زبان عربی ہے، مگر ابتدائی تعلیم ترکی میں پائی ہے، اور اعلیٰ تعلیم کیمبرج (انگلستان) میں حاصل کی ہے، ان کی طبی تعلیم و تدریس و تحقیق کا خاص موضوع علم تشریح (اناٹومی) ہے، مصر کی طبی درسگاہ میں وہ اس کے استاد بھی رہے ہیں ـــ ایک مدت سے وہ یورپ میں سکونت پذیر ہیں، ۱۹۳۰ء کے وفد خلافت میں خاکسار کو ان سے طریطے واقع سوئزرلینڈ میں ملاقات کا اتفاق ہوا تھا. موصوف نہایت سنجیدہ، متین، خوش خلق، اور تیس برس سے اسلامی احوال و ماجریات کے بغور مطالعہ کرنے والے اور اس طویل عہد کے بہت سے واقعات اور سوانح کے چشم دید گواہ اور عینی شاہد ہیں،

ہمارے محبوب رہنما ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے دوسرے قومی احسانات کے سلسلہ میں انکا یہ احسان بھی کچھ کم نہیں ہے، کہ وہ دو سال سے عالم اسلامی کے کسی نہ کسی نامور مفکر کو ہندوستان آنے کی دعوت دیتے ہیں، چنانچہ گذشتہ سال غازی رؤف ان کی دعوت پر ہندوستان آئے تھے، اور امسال ڈاکٹر بہجت وہبی آئے ہیں، اور امید ہے کہ آیندہ سال خالدہ ادیب خانم کو وہ ہندوستان آنے کی دعوت دیں، اور اس طرح ہندوستان اور اسلامی ممالک کے ارباب فکر کے درمیان مبادلۂ خیال کا بہترین موقع ہاتھ آتا ہے،

ڈاکٹر بہجت وہبی فروری کے شروع میں ہندوستان آئے، اور دہلی آکر جامعہ ملیہ اسلامیہ

میں مسلمانوں کے عروج و زوال پر انگریزی میں چار لکچر دیئے، یہ لکچر، ۱ر فروری سے لیکر ۱۲ر فروری تک دُو دُو روز کے وقفہ سے ہوتے رہے، اور اکثر تعلیم یافتہ مسلمان ان کے خیالات کو سننے کیلئے جمع ہوتے رہے، موصوف نے پہلے خطبہ میں اسلام کی ترقی کے اسباب بتائے، دوسرے میں اسلامی تہذیب و تمدن کے مناظر دکھائے، تیسرے میں زوال کے اسباب سے بحث کی، اور چوتھے میں علاج کی تدابیر کے متعلق مشورے دیئے، عنقریب یہ چاروں لکچر جامعہ کی طرف سے مختلف اسلامی زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوں گے،

مجھے موصوف کی دو پہلی تقریروں کے خلاصے پڑھنے کا اور دو پچھلی تقریروں کے بذاتِ خود سننے کا موقع ملا، ہم کو اس اظہار میں بڑی خوشی ہے، کہ اس موجودہ دور میں دنیائے اسلام میں یہ پہلی آواز تھی، جس میں نوجوان مسلمانوں کو یورپ کے نیک و بد میں تمیز کرنے کی دعوت دی گئی تھی، جس میں دین و مذہب کے اعلیٰ جوہر کی اصلی قدر و قیمت کی شناخت کا رمز پوشیدہ تھا، جس میں یورپ کی اندھی تقلید اور علماء کے متکلمانہ مباحث، موجودہ تنگ و محدود قومیت پرستی اور سلاطین اسلام کی خود مختاری و مطلق العنانی ہر چیز کی یکساں مذمت کی گئی تھی،

مقرر کے نزدیک اسلام کی ترقی کے حسبِ ذیل اسباب تھے، حضرت پیغمبر اسلام علیہ السلام کی مقدس و مکمل شخصیت، قرآن پاک کی اعلیٰ تعلیم، اسلام کے صاف اور سادہ اصول، توحید کا بلند تصور اور اسلامی تعلیمات کا فطری ہونا، اور تاریخ عالم کا وہ مخصوص عہد و ماحول جس میں اسلام قوموں کا رہنما بن کر آیا،

مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سب سے پہلا سبب انہوں نے سلاطین کی شخصی اور مطلق العنان حکومت کو قرار دیا، اور اس کے بعد علماء کے متکلمانہ مباحث اور مناظرات کو جگہ دی، پھر صلیبی لڑائیوں، تاتاری حملوں اور اندلس کی تباہی کا حال بیان کیا، آخر میں یورپ اور ہندوستان کے راستہ کے درمیان ایک نئے راستہ کی تلاش کا ذکر کیا، جس نے عالم میں انقلاب پیدا کر دیا، اور سب سے آخر میں اس محدود المعنی قومیت و وطنیت کا تذکرہ کیا، جس کے سیلاب میں

مصر، ایران، عراق، ٹرکی، اور دیگر اسلامی ممالک بہتے چلے جا رہے ہیں،

موصوف نے اپنی آخری تقریر میں فرمایا کہ یورپ کی اندھی تقلید ہمارے مرض کا علاج نہیں، ہم کو یورپ کے سائنس کی ضرورت ہے، اس کی سوسائٹی اور طریق تمدن کی نہیں، اصل ضرورت یہ ہے، کہ اسلام کو عہد سلف کی طرح سادہ اور فطری بنایا جائے، اور تمام خارجی اثرات سے اس کو پاک کرکے اپنے نوجوانوں اور نیز غیر قوموں کے سامنے پیش کیا جائے، یہ بھی فرمایا کہ لڑکوں کو تعلیم کی غرض سے یورپ بھیجنا ہماری بہت سی تباہیوں کا ذمہ دار ہے' اس پر بھی زور دیا کہ سائنس کے علاوہ تمام دیگر علوم کو مادری زبانوں میں پڑھایا جائے، سائنس اور علوم جدیدہ کی تعلیم کے لئے انہوں نے بوجوہ انگریزی زبان کو ترجیح دی، اور ساتھ ہی . . . . مسلمانوں کی واحد عالمگیر مذہبی زبان (عربی) سے تغافل پر متنبہ فرمایا، اور آخر میں مسلمان نوجوانوں کے اندر اخلاقی و مذہبی جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ظاہر کی، اور اسی کو مسلمان قوموں کی زندگی کی اصلی روح قرار دیا،

مقرر نے جو کچھ کہا بالکل سچ ہے، جنگ عظیم سے پہلے جب سارے یورپ کا تقریباً یکساں نظام عمل تھا، یہ کہنا بہت آسان تھا، کہ مشرق کی ترقی کا راز مغرب کی تقلید میں ہے، مگر جنگِ عظیم کے بعد جب یورپ ایک یورپ نہیں رہا، بلکہ متعدد یورپوں میں تقسیم ہوگیا، یہ کہنا مشکل ہے کہ یورپ اور پھر کس یورپ کی تقلید ہماری نجات کا باعث ہے، کیا ریمزی میکڈانلڈ کے یورپ کی، یا ہر ہٹلر کے یورپ کی یا اڈولفس کے یورپ کی یا اسٹالن کے یورپ کی یا مسولینی کے یورپ کی۔

اس عہد جدید کا سب سے پامال لفظ ترقی ہے، ترقی ترقی کی پکار سے ہمارے کان بہرے ہوگئے ہیں، اور ذرہ نہیں غور کرتے، کہ اس لفظ سے ہمارا مقصود کیا ہے، اور اس کے حصول کی تدبیر کیا ہے، ترقی کے معنی کسی قوم کا دنیا میں ذہنی و جسمانی، فکری و معاشی، اور علمی و عملی ہر حیثیت سے ممتاز و فائق ہو جانا ہے، اور اس کے حصول کی تدبیر صرف ایک ہے، پوری قوم کا

کسی ایک بلند ذہنی تخیل یعنی ایمان پر غیر متزلزل یقین کے ساتھ متفق ہو کر ایک ہو جانا، اور اسکے لئے ہر قسم کا ایثار، قربانی، اور کوشش کرنا، اسی آگ میں اختلافات کے تمام خس وخاشاک جل کر راکھ ہو جاتے ہیں، اور وحدت ایمان ووحدت عمل کی ناقابل شکست قوت پیدا ہو کر جمود کو روانی، سکون کو حرکت، خود غرضی کو ایثار اور حیات فردی کو حیات اجتماعی سے بدل دیتی ہے، تمام اقوام کی ترقیاں اسی ایک اصول پر ہوئی ہیں، ہوتی ہیں، اور ہونگی،

(معارف ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۴ء)

(۴)

امسال مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس اواخر مارچ میں میرٹھ میں منعقد ہوا، نواب ڈاکٹر سر مزمل اللہ خاں بہادر اس کے صدر منتخب تھے، مگر افسوس کہ وہ اپنی علالت کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہو سکے، تاہم ان کا لکھا ہوا خطبۂ صدارت پڑھا گیا، موصوف نے اس خطبہ میں جسمیں شعروادب کی دلچسپی بھی کافی ہے، اپنی زندگی کے تعلیمی تجربوں کا پوری وضاحت سے بیان کیا ہے دارالمصنفین ممنون ہے، کہ اس کے ناچیز خدمات کو بھی اس خطبہ میں پوری طرح سراہا گیا ہے، یہ پہلا موقع ہے، جس میں کانفرنس نے ہم گوشہ نشینوں کو یاد کیا ہے،

آج کل اسلامی اخبارات میں بعض انگریزی اخبارات ورسائل کے ان مضامین کیخلاف صدائے احتجاج بلند ہے، جن میں ذات پاک نبوی ؐ اور خلفائے اسلام وتاریخ اسلام پر ناجائز نکتہ چینی کی گئی ہے، مسلمان اندازہ کرتے ہوں گے، کہ اس قسم کے مضامین مسلسل اور بالتواتر انگریزی اخبارات میں نکلتے رہتے ہیں، اور کبھی کبھی ہماری چیخ پکار پر وہ معافی بھی مانگ لیتے ہیں، اس کا علاج صرف یہ ہے، کہ انگریزی میں ہمارا اسلامی تاریخی لٹریچر اتنا پیدا کیا جائے جو اس پروپگنڈے کا جواب ہو سکے۔

(معارف ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۴ء)

(۵)

جب تک قدیم ہندوستان کی تاریخ کا سرمایہ صرف زبانی روایات اور اصنامیات تھا، یہاں کی قدیم آرین تہذیب کی عظمت کا گیت بڑی بلند آہنگی سے گایا جاتا رہا، مگر جب سے اس ملک کے قدیم آثار کی تحقیق و تفتیش کا کام شروع ہوا ہے، حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھتی جاتی ہے، قدیم ہند کی سطوت کا اصلی گہوارہ پاٹلی پتر (پٹنہ) کا موریا خاندان ہے، مگر اثری تحقیقات نے اس کو ہند کے بجائے ایران پہونچا دیا، اور وہ پارسی تہذیب کا نمونہ ثابت ہوا۔

اب حال میں سندھ کی اثری تحقیقات نے جن ہزاروں برس کے دبے ہوئے دفینے کا پتہ چلایا ہے، وہ بھی ہند کے بجائے عراق کی ملکیت ثابت ہوا، فروری ۱۹۲۴ء کے آرین پاتھ میں تاریخ ہند کے مشہور ماہر ایچ، جی، رالسن کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں ثابت کیا گیا ہے، کہ "مہنجو دارو اور ہڑپا (سندھ) کے اثری انکشافات سے یہ گمان ہوتا ہے، کہ ہندو تہذیب میں سامی عنصر بہت نمایاں ہے،

اسی پرچہ میں ایک ہندو فاضل کے قلم سے مورخ مذکور کا جواب بھی شائع ہوا ہے، جسمیں زیادہ تر ویدوں کے حوالوں سے ہندو تہذیب کی قدامت ثابت کی گئی ہے، مگر ویدوں کی اتنی قدامت کا دعویٰ تو خود مشتبہ ہے، اس سے دوسرے دعویٰ پر استدلال کہاں تک صحیح ہوگا، بہرحال کہنا صرف یہ ہے، کہ گذشتہ آرین قومیں پارسی اور سامی تہذیبوں سے استفادہ کے باوجود ہندو رہیں، تو آج اسلامی تہذیب جو آریائی اور سامی دونوں تہذیبوں سے ملکر پیدا ہوتی ہے، اور اس سے گذشتہ ایک ہزار برس تک ہمارے ہندو بھائی بھی مستفید ہوتے رہے کیوں بدیسی چیز سمجھی جائے،

یہ بات کہ مسلمانوں کا کوئی متحدہ خط ہونا چاہیئے، تنگ خیال قومیت پسندوں کے نزدیک ضروری ہے، ترکوں نے اپنا خط لاطینی کرلیا، ایک نقطۂ نظر سے یہ اقدام ایک قوم کی محدود

مقامی بات ہے، مگر اس کا وسیع اثر ملاحظہ فرمائیے، کہ ترکی کے مشترک عربی و فارسی الفاظ اور عربی خط سے ترکی نہ جاننے والے مسلمان اور مشرقی اشخاص بھی کچھ نہ کچھ مطلب سمجھ جاتے تھے، اور وحدت خیال کی ایک ہلکی سی زنجیر باہم قائم تھی، مگر اب ہمارے ان کے درمیان بعد المشرقین ہے، ان کے رسائل و اخبارات ہندوستان آئیں، یا ہندوستان کے وہاں جائیں، دونوں یہی کہیں گے،

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم

اس وقت یہ بات یوں یاد آگئی، کہ چھٹی صدی ہجری کے ایک مسلمان فلسفی ابو البرکات بغدادی کی کتاب المعتبر بہت مشہور ہے، اس میں اس نے فلسفۂ ارسطو پر سخت اعتراضات کئے ہیں، اور کہا جاتا ہے، کہ امام رازی نے فلسفہ پر جو اعتراضات کئے ہیں، وہ اکثر اسی کتاب سے لئے گئے ہیں، اس بنا پر اہل علم میں اس کتاب کی اہمیت خاص ہے،

پچھلے دنوں جرمنی کے ایک کتب فروش کے پاس سے خبر آئی، کہ کتاب المعتبر کی ایک جلد قسطنطنیہ سے چھپ کر شائع ہوئی ہے، یہ سن کر ہم کو بے انتہا خوشی ہوئی، اور اس وقت اپنے لندن کے ایجنٹ کو لکھا کہ وہ کتاب ہمارے پاس بھیج دی جائے، چند مہینوں کے بعد جب یہ اطلاع آئی کہ کتاب المعتبر چھپی تو ضرور ہے، مگر وہ عربی کے بجائے نئے ترکی لاطینی خط میں چھپی ہے، تو جتنی خوشی ہوئی تھی اتنا ہی رنج ہوا، کہ وہ کتاب جس سے ساری دنیائے اسلام فائدہ اٹھا سکتی ہے، صرف ترکوں کے محدود حلقہ کے لئے ہو کر رہ گئی،

موجودہ مسلمانوں کا عجیب خاصہ یہ ہے، کہ وہ کسی کام کو اپنے سوچ بچار اور غور و تدبیر کے بعد استواری کے ساتھ نہیں کر سکتے ہیں، انکو کام کرنے کے لئے ہمیشہ جذبات کی شراب پینے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے، پالٹیکس سے یہ مرض بڑھتا بڑھتا مذہب بلکہ ادبیات تک پہونچ گیا ہے، دین کی تبلیغ مسلمانوں کا ضروری فرض ہے، مگر ہماری تبلیغی انجمنیں اور مجلسیں اسی وقت سرگرم کار ہوتی ہیں، جب آریہ پرچارک سبھائیں اپنا زور دکھائیں، اپنی قومی تہذیب کو برقرا،

رکھنے کے لئے اپنی زبان کی حفاظت بھی ہر اس شخص کا فرض ہے، جو اپنے منہ میں زبان رکھتا ہے مگر اس تحریک کا جوش بھی مسلمانوں کو اسی وقت آتا ہے، جب ہندی سمیلن اپنی قوت عمل کی نمائش کرتی ہے،

پچھلے دنوں دہلی میں مہاراجہ بڑودہ کے زیر صدارت ہندی کا جلسہ ہوا، اور اس کے لئے ایک لاکھ روپئے کی امداد کا اعلان ہوا، تو دہلی کے چند مسلمانوں کو بھی جوش آیا، اور ایک اردو کانفرنس صوبہ سرحد کے ایک ممتاز مسلمان نواب کے زیر صدارت منعقد ہوگئی، اگر اسی کے مقابلہ میں یہاں بھی ایک لاکھ کی امداد ہو جاتی، تو ہم سمجھتے کہ نقل پوری ہوگئی۔ اور یہ کہتے ع عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد، مگر شور وغل اور اخباری چہل پہل کے سوا اس قسم کی کانفرنسوں کا نہ کوئی نتیجہ ہوا ہے، نہ ہوگا، ضرورت مستقل پائدار اور استوار اصول پر آہستگی اور سنجیدگی کے ساتھ کام کرنے کی ہے، اسی پر کامیابی کا دارومدار ہے، گھنگھور گھٹائیں گرجتی نہیں اور گرجتے بادل برستے نہیں،

ہندی کی بنیاد صرف ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں نہیں پڑ رہی ہے، بلکہ دیہاتوں میں، ڈسٹرکٹ بورڈ کے مکتبوں اور اسکولوں میں پڑ رہی ہے ہزار در ہزار لڑکے جن میں مسلمان بھی داخل ہیں انکو ہندوستانی کے بجائے ہندی سکھائے جا رہی ہے، اور اس طرح ہندوستان کی زبان بدلی جا رہی ہے، اس کی دوسری بنیاد گورنمنٹ کے دفاتر میں پڑ رہی ہے جہاں ہندوستانی فارموں کو دبا کر ہندی فارم جبراً ہندوستانی جاننے والوں کو بھی دیئے جاتے ہیں، تاکہ ہندی کی ضرورت اہل غرض پر دلیل جبر سے ثابت ہو جائے، ہم ہندی خط کے دشمن نہیں ہیں، مگر ہندی خط کے پردہ میں مشترک ہندوستانی زبان کو مٹانے کی کوشش ہمالیہ سے بھی زیادہ بڑی غلطی ہے،

مجلس دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن میں سنن بیہقی کی پانچویں جلد چھپ کر تمام ہو گئی، اور اب دو نئی کتابیں طبع کے لئے تیار کی گئی ہیں، ان میں سے ایک ابن رفاعہ کی جوامع اصطلاح المنطق اور دوسری امام بخاری کی نایاب تصنیف تاریخ کبیر ہے، امید ہے کہ آخری کتاب کی اشاعت سے فن اسماء الرجال کے ذخیرہ میں نہایت قیمتی اضافہ ہو جائے گا،

(معارف ماہ مئی ۱۹۳۴ء)

(۶)

ہندوستان کبھی ایک ملک نہ تھا، اسلامی فتوحات نے اس کو زبردستی ایک ملک بنا دیا، ایک ملک کے لئے ایک واحد زبان کی ضرورت ہوئی، شروع شروع میں ہر صوبہ کی دیسی زبان میں مسلمانوں نے اپنے عربی و فارسی الفاظ ملا کر ہر صوبہ کی زبان کو "ہندی" کا لقب دیا، آخر شاہجہاں کے زمانے سے خاص پایۂ تخت دہلی کی ہندی نے سارے ملک میں ٹکسالی زبان کی حیثیت سے رواج پایا، ابتداءً وہ "زبان اردوئے معلیٰ" یعنی پایۂ تخت یا شاہی قلعہ کی زبان کہلائی اور آخر میں انگریزوں کے عہد کے آغاز میں "اردو زبان" اس کا نام قرار پایا۔

یہ اس زبان کی سب سے مختصر تاریخ ہے،

اس زبان کو یہاں ملک کی ضرورت نے پیدا کیا، ضرورت نے اس کی اشاعت کی، اور ضرورت نے اس کو ترقی دی، اس مختلف بولیوں والے ملک میں اس زبان کی جیسی سخت ضرورت تھی، اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، کہ ایک صدی کے اندر اندر یہ پورے ملک میں پھیل گئی، اور لکھنے پڑھنے میں خواہ اس کو کہیں جگہ ملی ہو، یا نہ ملی ہو مگر بول چال میں اس کو ہر جگہ، جگہ ملی، اور ہر صوبہ میں اس کو فروغ حاصل ہوا، آج ہندوستان کا کون سا صوبہ ہے، جہاں اس زبان کے مکتب، مدرسے اور اخبارات اور رسالے نہیں، بلکہ یہ سنکر آپ کو تعجب ہو گا، کہ یہ زبان ایک طرف کابل و بخارا تک، اور دوسری طرف

عراق و حجاز تک اور تیسری طرف افریقہ کے سواحل تک اپنا قدم جما چکی ہے، ہر سال ہندوستان سے جو حاجی حجاز یا جو زائر عراق جاتے ہیں، وہ اپنے ملک کی زبان جاننے والے ہر جگہ پاتے ہیں، بمبئی اور کراچی سے ہر ہفتہ جو جہاز یورپ کی سمت روانہ ہوتے ہیں، وہ مشرق کی انتہائی حد پورٹ سعید اور اسکندریہ تک اس زبان کو لے جاتے ہیں، اور اس طرح ان سواحل میں یہ زبان اپنی ضرورت سے آپ بولی اور سمجھی جاتی ہے، افغانستان میں یہ دیکھ کر کس قدر تعجب ہوا، کہ بادشاہ سے لے کر وزراء اور عام اہلِ منصب تک اس زبان کو نہایت خوبی سے بولتے اور سمجھتے ہیں، اور اسی کو ہندوستان کی واحد زبان جانتے ہیں،

اب اگر ہندوستان کی کوئی قوم یہ کوشش کرتی ہے، کہ صدیوں کی اس محنت کو مٹا ڈالے، اور متھرا، یا بنارس کی کسی بولی کو "ہندی" کا نام اور ہندوستان کی واحد مشترک زبان قرار دے کر نئے سرے سے اس کو دنیا میں روشناس کرے، تو ہر حیثیت سے یہ ایک شدید غلطی ہوگی،

ہندو بھائی اگر یہ چاہتے ہوں، کہ اس زبان کے لکھنے کے لئے اپنا کوئی علٰحدہ خط جیسے ناگری مقرر کریں، تو اس کا ان کو اختیار ہے، لیکن اس خط کے پردے میں زبان کو بدلنے کی کوشش ملکی افتراقات کی تمام سیاسی چالوں کے مقابلہ میں یہ ادبی افتراق کی چال ملک کی سب سے بڑی بدنصیبی ہوگی، ملک کی دو بڑی قومیں جو اس وقت تک کم از کم شمالی ہندوستان اور دکن میں ایک ہی زبان بولتی چالی اور سمجھتی ہیں، ان کو دو زبانوں میں بانٹ کر دونوں کے دلوں کو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا کر دینا ہے،

حقوق طلب مسلمان ہندوستان میں اپنے ایک تہائی حقوق کا مطالبہ ہر چیز میں کرتے ہیں، اسی سیاسی اصول کی بنا پر اگر اس ادبی نزاع کا بھی فیصلہ کر دیا جائے، تو یہ مذاق حسنِ مذاق سے کم نہ ہوگا، عام اردو زبان میں عربی اور فارسی لفظوں کا میل ایک تہائی سے زیادہ نہ ہوگا، اگر اس تہائی حق کو ہندو بھائی مان لیں، تو ہندی کی نئی بھاشا کو

پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہو، اور دونوں قومیں مل کر "ہندوستانی" کے پھیلانے اور بڑھانے میں ہر طرح کی کوشش ایک ساتھ کریں، یہ تجویز اس وقت ایک مزاح کی صورت ہے، مگر مزاح کو سنجیدگی سے بدل دینا کتنی دیر کا کام ہے،

ہندوستان میں ہندوستانی یعنی اردو زبان بولنے والے اور سمجھنے والے کتنے ہیں، اور ان کی تعداد کی نسبت ہندوستان کی دوسری بولیوں کے بولنے والوں کے ساتھ کیا ہے؟ اس کا جواب سرکاری مردم شماری کے کاغذات سے مل سکتا ہے، لیکن اس سے اکثر اس زبان کے بولنے والوں کو تشفی نہیں ہوتی، زبانی پیمائش کی تحقیقات بھی اس بارہ میں سند کی حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن نے یہ قرارداد منظور کی ہے، کہ ہندوستان میں اس زبان کے بولنے والوں کی تحقیقی اور حقیقی تعداد کا پتہ چلایا جائے، اور اس کے لئے اس نے یہ تجویز کی ہے، کہ ہر صوبہ میں اس زبان کی پیمائش کا کام کیا جائے، اور جس میں حسب ذیل معلومات فراہم کئے جائیں، اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد، سالانہ تصانیف، اخبارات، اور مطابع کی تعداد، اور ہر صوبہ میں اس زبان کی تاریخی اور ادبی حیثیت وغیرہ،

یہ کام گو حقیقت میں بہت کٹھن ہے، اور سلطنتوں کے انجام دینے کے لائق ہے، لیکن اگر قومیں کسی بات کے کرنے کا عزم مصمم کرلیں، تو پھر ان کی عملی طاقت کس بات میں سلطنتوں کی قوت عمل سے کم ہے، انجمن نے اس کام کے لئے تقریباً ساٹھ ہزار کے خرچ کا اندازہ کیا ہے، اور اس کے لئے اپیل کی ہے،

مقالات شبلی جس کی تین جلدیں چھپ کر شائع ہوچکی ہیں، امسال اس کی چوتھی جلد زیر طبع ہے، یہ مولانا شبلی مرحوم کے تنقیدی مضامین پر مشتمل ہوگی، اس میں وہ تمام مضامین یکجا ہوں گے، جو موصوف نے مختلف مطبوعہ اور قلمی کتابوں کے نقد و تبصرہ پر لکھے ہیں، ضخامت ڈیڑھ سو صفحوں کے قریب ہوگی، تاریخ صقلیہ کی دوسری جلد بھی مطبع کو دی جارہی ہے،

اس میں صقلیہ کے اسلامی علوم وفنون وتمدن کی مفصل روداد ہوگی،

(معارف ماہ جون سنہ ۱۹۳۴ء)

(۷)

لوگ گرمیوں میں پہاڑی مقامات کا رخ کرتے ہیں، اور میں نے اس کے لئے اپنی خاک وطن (دیسنہ ضلع پٹنہ) کی دیہاتی دہقانی زندگی پسند کی ہے، دو مہینوں سے میں اپنے مرکز (دار المصنفین اعظم گڈھ) سے دور ہوں اس درمیان میں احباب کے خطوط مجھے دیر سے ملتے رہے، اور اسی نسبت سے جواب میں تاخیر وتعویق ہوتی رہی، اور اب بھی بہت سے دوستوں کے خطوط کا مقروض ہوں، جس کے لئے ان سے معافی کا خواستگار ہوں، امید ہے، کہ ۱۵؍ جولائی تک میں اپنے مرکز میں پہونچ جاؤں گا، اور ان قرض خواہوں کے تقاضوں اور مطالبوں سے نجات پانے کی جلد کوشش کروں گا،

اس اثنا میں صوبہ بہار اور اڑیسہ کے سرکاری عربی مدارس کی ترتیب نصاب کے سلسلہ میں رانچی کے سفر کا اتفاق ہوا، یہ سفر دخانی گھوڑے کی گاڑی (موٹر) پر طے ہوا ہمارے وطن سے رانچی دو سو میل ہے، یہ دو سو میل ۸؍ گھنٹوں میں طے ہوئے، رفیق سفر، ہمارے ہمسایہ، ہم پیشہ اور عزیز دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی تھے، راستہ ادبی، مذہبی اور صوفیانہ لطائف میں آتے جاتے بہت دلچسپی سے کٹا، رانچی جانے کا پہلے بھی اتفاق ہوا تھا، جب مولانا ابو الکلام آزاد رانچی میں نظر بند تھے، لیکن پٹنہ رانچی کے لئے راستے سے موٹر کے جانے کا پہلا اتفاق تھا، انتہائی جنوبی بہار اور "چھوٹا ناگپور" کے اس خطہ کے مشاہدہ نے تاریخ قدیم کے بہت سے کہنہ اوراق اور عجائب فطرت کے متعدد دلچسپ صفحات نظر کے سامنے کر دیئے،

قصبہ بہار جس کی نسبت سے اس صوبہ مگدھ کا اسلامی نام بہار پڑ گیا، بودھوں کی

حکومت اور حکمت کا قدیم پایہ تخت ہے، اس کے نام کا صحیح تلفظ "ویہار" ہے، جس کے معنی بودھ درسگاہ اور خانقاہ کے ہیں، اس تعلق سے پہلے اس قصبہ کا نام، پھر پورے صوبہ کا نام ویہار، (بہار) پڑ گیا، بہار سے ایک سڑک تو پٹنہ کو جاتی ہے، جس کا قدیم نام پاٹلی پتر ہے، اور دوسری گیا کو، یہ دونوں راستے بودھوں کے پرانے تاریخی آثار سے بھرے پڑے ہیں، بہار سے گیا کو جو سڑک جاتی ہے، اس میں بہار کے بعد اس سے ۲۲؍ میل کی مسافت پر ایک قصبہ نوادہ آتا ہے، جس کی فارسی اصل (بقول رفیق سفر مولانا گیلانی) نوآبادہ ہے، یہ مغلوں کے اخیر عہد طوائف الملوکی میں ایک حوصلہ مند امیر نواب کامگار خاں کا دار الامارہ تھا، اس خاندان کے کچھ لوگ اب بھی زمیندار کی حیثیت سے اس کے آس پاس رہتے ہیں،

بہار سے آگے بڑھ کر ایک سڑک تو نوادہ ہو کر گیا چلی جاتی ہے، اور دوسری راجگیر کو جاتی ہے، جو قدیم ہندو اور بودھ اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے چلہ گاہ ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کے توجہات کا مرکز بھی ہے، اسی قصبہ بہار اور راج گیر کے بیچ میں مشہور بودھ درسگاہ نالندہ کے کھنڈر واقع ہیں، بہار اور نوادہ کے درمیان نوادہ سے دو میل پہلے یاداپوری نام جینیوں کی سب سے بڑی پرستش گاہ ہے، یہ مقام جینی مت کے بانی کی جائے پیدائش ہے، یہاں ان کے مندروں کا سلسلہ دور تک قائم ہے، اور مارواڑیوں کی دولت مندی کا مظہر ہے،

نوادہ سے آگے نکلے تو وہ سڑک ملی جو شیر شاہ نے مغربی سرحد سے لے کر بنگال تک بنائی تھی، سنا ہے اس کے قریب اس کی بنائی ہوئی سرائیں، مسجدوں اور دھرم شالوں کے مٹے مٹے نشان کہیں کہیں ملتے ہیں، پھر رجولی کا جنگل آیا، جو ہندوستان میں شیروں کے شکار کے لئے مشہور ہے، اس کے بعد ابرک کے پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوا ٹھیک بارہ بجے دن کا وقت تھا، آفتاب کی روشنی پورے عروج پر تھی، اور ساری زمین میدان اور پہاڑی سلسلۂ ابرک کی ضوفشانی سے جگمگا رہا تھا، اور آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا،

اس کے بعد کوڈرمہ کی نئی آبادی آئی، جہاں ریلوے اسٹیشن ہے، آج سے بیس سال پہلے جب یہ بے آباد تھا، ایک مسلمان صاحب دل حکیم بادشاہ میاں صاحب نے اس کو اپنی سکونت کے لئے پسند کیا، حکیم صاحب ممدوح ایک طرف شیروں کا شکار اور دوسری طرف انسانی دلوں کا شکار کیا کرتے ہیں، چنانچہ ممدوح نے اپنے دونوں شکار دکھائے، ایک بہت بڑے شیر کی کھال مع سر دکھائی، جس سے بڑا شیر ہندوستان میں شاید ہی شکار ہوا ہو، اور ایک تعلیم یافتہ بنگالی نوجوان کو دکھایا، جو صدق دل سے مسلمان ہو کر متقی بن گیا ہے،

کوڈرمہ کے بعد ہزاری باغ آیا، اور اس احاطہ کے سامنے سے گذر ہوا، جہاں صوبہ سرحد کا شیر خان عبدالغفار خاں اینٹوں کے کٹہرہ میں بند تھا، یہ قید خانہ آبادی سے دور ایک کھلے میدان میں واقع ہے، ہزاری باغ کی آبادی سے نکلے تو بارہ میل کا ایک اور جنگل شروع ہوا، یہ پورا علاقہ مع رانچی کے، رام نگر کے راجہ کی ملکیت ہے، جنگل سے باہر ہوئے تو رانچی کی چڑھائی آئی،

رانچی ایک بلند کھلے میدان میں واقع ہے، شہر کی آبادی پچاس ہزار ہے، ایک چوتھائی مسلمان ہیں، مولانا ابوالکلام کی نظربندی کی یادگار ایک انجمن اسلامیہ اور اس کا مدرسہ قائم ہے، مدرسہ اور انجمن کی خاص عمارت ہے، شہر کے اندر سیر کے قابل کوئی چیز نہیں، جا بجا حکومت کے صیغوں کی دفاتر کی معمولی عمارتیں ہیں،

لیکن دو برس سے یہاں ایک عجیب جائے عبرت وجود میں آئی ہے، شہر سے باہر سر علی امام کا وہ ناتمام قصر واقع ہے، جس کے سربفلک ستونوں، مناروں، اور سقف کی زبان حال انسانی آرزوؤں کی ناتمامی کی داستان سنا رہی ہے، اس عظیم الشان قصر کا دامن قسم قسم کے نادر درختوں سے بھرا ہے، اور ہائے افسوس کہ اس عظیم الشان قصر و باغ کے ایک دور افتادہ گوشہ میں پھوس کے ایک چھپر کے نیچے اس کا اولوالعزم بانی دو گز مٹی کے فرش پر تنہا پڑا سویا ہے، زبان نے اس فرش خاک پر سونے والے کے لئے دعائے مغفرت مانگی، اور

آنکھوں نے آنسوؤں کے چند پھول تربت پہ چڑھائے ، اور دل نے کہا ،

آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے

(معارف ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۳ء)

(۸)

انگریزی زبان میں قرآن پاک کے ترجمے حقیقت یہ ہے، کہ بہت ہیں، اور ایک بھی نہیں زیادہ تر ترجمے تو نامسلمانوں کے ہیں، جو اعتبار کے لائق نہیں، مسلمانوں میں ایک ترجمہ انجمن احمدیہ اشاعتِ اسلام لاہور کا ہے، جو ظاہر ہے کہ خاص عقائد و خیالات کو سامنے رکھکر کیا گیا ہے، بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ اس میں مرزا غلام احمد صاحب کے خیالات سے زیادہ سرسید احمد خاں کے خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے، یعنی قادیانیت سے زیادہ اس میں نیچریت ہے اسی سے عام مسلمانوں کو اس پر اعتبار نہیں،

ایک اور مجتہدانہ ترجمہ الہ آباد کے ایک ہمہ داں مسلمان مترجم کا ہے، جس نے اول تو قرآن پاک کی ترتیب الٹ دی ہے، پھر ترجمہ میں اس نے اجتہاد کی وہ شان دکھائی ہے، کہ نہ عربی لغت کا اعتبار رہا، نہ تفسیر نبوی کا لحاظ، اور نہ اسلام کے مسلمہ اصول کا خیال، ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ مسلمانوں کے کس کام آسکتا ہے، ایک اور ترجمہ جزائر ہند میں کسی ہندوستانی مسلمان مبلغ نے کیا ہے، لیکن وہ ہماری نظر سے نہیں گذرا، اس لئے اس کی نسبت کچھ کہا نہیں جاسکتا،

اس وقت سب سے بہتر ترجمہ انگریز مسلمان مسٹر محمد پکھتال کا ہے، کہ وہ ایک صاحبِ زبان مسلمانوں کے قلم کا ہے، اور مصر کے بعض مسلمان عرب فاضلوں کی امداد سے ہوا ہے، اور اسی لئے اس میں نسبۃً غلطیاں بہت کم ہیں، لیکن وہ حواشی اور نوٹس سے خالی ہے، اسی لئے وہ قرآن پاک کی تبلیغ و تفہیم کے کام میں نہیں آسکتا،

پھر ان میں سے کوئی ترجمہ کسی مستند عالم کے مشورہ اور نگرانی سے انجام نہیں پایا ہے، اور خالص مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے کبھی کسی غیر زبان میں قرآن پاک کی ترجمانی نہیں ہوئی، ان وجوہ سے ہمارے محترم فاضل دوست مولوی عبدالماجد صاحب بی، اے، (اڈیٹر سچ) نے مہینوں کے تذبذب اور غور وفکر کے بعد ہمت کی ہے، کہ وہ اس بارِ گراں کو خود اٹھائیں، اور انگریزی میں قرآن پاک کا ایسا ترجمہ کریں، جو صحیح ہونے کے ساتھ مستند ہو اور قابل شرح آیات پر ایسے حواشی اور نوٹ لکھیں، جو ہمارے پچھلے مفسرین کی تحقیقات کے مطابق بھی ہوں، اور ابنائے عصر کے شکوک وشبہات کو بھی دور کر سکیں،

موصوف نے اپنے انگریزی ترجمہ میں مشورہ اور نظر ثانی کے لئے انگریزی کے اچھے اچھے آدمیوں کا انتخاب کر لیا ہے، اور قرآن مجید کی آیات کے سمجھنے کے لئے ذاتی علم وبصیرت کے علاوہ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے ترجموں کو سامنے رکھا ہے، انگریزی ترجمہ کا بعینہٖ اردو ترجمہ وہ بعض دوسرے علماء کی خدمت میں پیش کرتے رہتے ہیں،

میرا اپنا خیال یہ ہے، کہ گذشتہ انگریزی تراجم کی موجودگی میں قرآن مجید کے کسی نئے انگریزی ترجمہ میں کوئی بڑی دقت نہیں ہے، کیوں کہ ان ترجموں میں لفظی غلطیاں دس بیس سے زیادہ نہیں، اصل چیز یہ ہے، کہ قرآن پاک کو معنوی تحریف سے بچایا جائے اور قابلِ شرح آیات پر ایسے حواشی لکھے جائیں، جو اسلام کے خیال کی صحیح تعبیر ہونے کے ساتھ ان کو موجودہ ذہنیت کے قریب کر دیں، اگر ہمارے دوست سے یہ کام انجام پا سکا تو اس میں شک نہیں کہ وہ اس دور میں اسلام کی بہترین خدمت ہوگی،

ظاہر ہے کہ اس ترجمہ کے کام کے لئے حوالہ کی کتابوں، تفسیروں، اور عربی انگریزی کتب لغت کی ضرورت ہوگی، جس کی مجموعی قیمت کئی سو کے قریب ہوگی، اور مسودوں کے صاف کرنے اور اس کی کئی نقلوں کے لینے کے لئے اخراجات الگ ہیں، اب تک موصوف نے

ان مصارف کا بار خود اٹھایا ہے، لیکن ضرورت ہے، کہ اہلِ کرم مسلمان اس ضروری کام میں ان کی اعانت کریں، اس کے لئے اس کی حاجت نہیں ہے، کہ عام چندہ کی فہرست کھولی جائے، بلکہ ایک دو صاحب دل و صاحب دولت مسلمانوں کا ادھر توجہ کرنا کافی ہے'

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن نے اردو زبان کے صوبہ وار جائزہ کی تجویز ملک کے سامنے پیش کی ہے، اس کے مطابق اس نے (مالی دقتوں کا خیال کئے بغیر) عملی کام شروع کر دیا ہے، انجمن کے سکریٹری جناب مولوی عبدالحق صاحب نے پنجاب اور صوبہ متحدہ کا سفر کرکے اس کام کی تکمیل کے لئے کمیٹیاں قائم کر دی ہیں، ہمارے صوبہ میں یہ کام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے ذمہ لیا ہے، لاہور میں بھی ---- کمیٹی اپنا کام کر رہی ہے، برہما اور بعض دوسرے مقامات میں بھی کام شروع ہو گیا ہے، بہار میں بھی اس کے لئے نوجوان تیار ہو رہے ہیں، اور اب سکریٹری صاحب نے ہم کو اطلاع دی ہے، کہ وہ اس کے لئے مدراس جا رہے ہیں، اس تجویز کے مطابق کام کیا کرنا ہے، اس کے لئے احباب انجمن مذکور سے مطبوعہ کاغذات منگوا سکتے ہیں،

ہم نے تحریک کی تھی کہ آئندہ ہماری زبان اردو کے غیر معروف لیکن صحیح نام ہندوستانی کو فروغ دیا جائے، اور اس زبان کو اسی نام سے شہرت دی جائے، تاکہ خود اس نام سے اس کے عام ملکی زبان ہونے کا دعویٰ ظاہر و ثابت ہو، دلی کے ایک گوشہ سے اس صحیح و مناسب تحریک کی مخالفت کی گئی، اس کا اثر یہ ہوا، کہ ۲ر جولائی کو اسمبلی کے ایک اجلاس شملہ میں، مسٹر لال چند، بھائی پرمانند، اور سر محمد یعقوب نے ایک اور مسئلہ کے ضمن میں جب اس پر بحثیں کیں، تو مسٹر لال چند کے اس کہنے پر کہ "اردو اور ہندوستانی دونوں ایک اور ہم معنی ہیں،، مسلمانوں کے نمایندہ سر محمد یعقوب نے مخالفت کی، اور ثابت کرنا چاہا، کہ دونوں دو چیزیں ہیں" اسمبلی کے ایک سامع (وزیر) نے اس پر ہم سے محاکمہ چاہا ہے، ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں، کہ "دشمن دانا بہ از دوست ناداں،

ملک میں یہ خبر پورے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی، کہ ہماری زبان کے مشہور کہنہ مشق اور استاد شاعر حضرت ریاض خیرآبادی نے نوّے ۹۰ برس کی عمر میں ۱۷ رربیع الآخر ۱۳۵۳ھ کو وفات پائی، مرحوم پنے صنف سخن میں باکمال و بے مثال شاعر تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت کی شراب طہور سے سیراب فرمائے،

(معارف ماہ اگست ۱۹۳۴ء)

(۹)

ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں بڑی خوبی کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے، کہ اشخاص و افراد کی طرح قوموں کی بھی عمریں ہوتی ہیں، وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، جوان ہوتی ہیں، بوڑھی ہوتی ہیں، اور مرجاتی ہیں، دنیا کی تمام تاریخیں اس نظریہ کے ثبوت میں ہیں، اور کہا جاسکتا ہے، کہ اب فلسفۂ تاریخ کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے،

لیکن اگر زیادہ دقت نظر سے کام لیا جائے، تو معلوم ہوگا، کہ اقوام کے ان مختلف دوروں میں ان کی زندگی کے خصوصیات و لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں، بچپن میں ان کی خواہشیں بچوں کی سی ہوتی ہیں، جوانوں میں جوانوں جیسی اور بڑھاپے میں بوڑھوں کی طرح، ان اقوام کی تعلیم و تربیت کے اصول بھی نوعمروں ہی کی تعلیم و تربیت کے مماثل ہوتے ہیں،

قوم کے مصلح قوم کے معلم ہوتے ہیں، کامیاب معلم وہی ہے، جو تعلیم و تربیت کے ان فطری اصول کی پیروی کرتا ہے، جس طرح استادوں کو اس کی ضرورت ہے، کہ طلبہ کو صبح خیزی، ورزش، اور جدوجہد کی عادت دلائیں اور ان کو آرام طلبی، راحت جوئی، وضعداری اور فیشن پرستی سے باز رکھیں، اسی طرح قوم کے مصلح کے لیے ضروری ہے، کہ وہ اس کو عیش پرستی، آرام طلبی اور تعطل سے باز رکھ کر محنت، جدوجہد اور دوڑ دھوپ میں مصروف رکھے اور اسی سے اسلام کے جہاد کی حقیقت اہلِ بصیرت پر روشن ہوگی،

استادوں کے لئے ضروری ہے، کہ وہ بچوں سے ایک کام کو شروع کراکر دلجمی اور استقلال کے ساتھ اس کو ان سے پورا کرائے، تاکہ ان میں عزم و استقلال پیدا ہو، اور ایک کامیابی سے دوسری کامیابی کی ہمت پڑے اور حوصلہ بڑھے، ایسی ہی قوم کے مصلح کا فرض ہے، کہ قوم کے سامنے جب کوئی تجویز پیش کرے، تو اس پر عمل فوراً شروع کرادے، اور جیسے بنے، اس سے اس کام کو پوری مستعدی اور جوش وخروش کے ساتھ سرانجام کرادے، تاکہ ایک کامیابی کے نشہ میں وہ دوسرے کام کو پورے زور کے ساتھ کرسکے، اور اس طرح اس کا عزم پختہ، استقلال مضبوط، ہمت بلند اور حوصلہ بڑھتا رہے، اگر اس اصول کی پیروی نہ کی جائے گی، تو قوم کا عزم روز بروز کمزور، استقلال مفقود، ہمت پست، اور حوصلہ فنا ہوتا رہے گا،

ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ قومی تعلیم وتربیت کے دور میں اس اصول کی سب سے کم پروا کی گئی، بلکہ انجمنوں اور کانفرنسوں نے جو ان کی تعلیم وتربیت کے لئے بنائی گئی تھیں، سب سے زیادہ ان کو نکما اور سست بنانے میں مدد دی، انہوں نے اپنی قوم کی یہ عادت ڈلوائی، کہ وہ بڑی بڑی تجویزوں کے ذریعہ جن کا اصطلاحی نام، ع

برعکس نہند نام زنگی کافور   رزولیشن یعنی اظہار عزم

نام رکھا، مگر عملاً اس کے معنی بات بنانے کے قرار دیئے، نتیجہ یہ ہوا کہ قوم باتونی تو ہوگئی مگر کامی نہ ہوئی،

ہر انجمن اور کانفرنس کی روداد ان "قومی عزائم" کی فہرست سے معمور ہے، مگر جہاں تک عمل کا سوال ہے، ان میں سے ہر ایک ہمارے قومی ضعف، روحانی انحطاط اور اخلاقی کمزوری کا ایک ایک قدم ہے، مسلمانوں کی اگلی تاریخ کو چھوڑیئے، خود ہندوستان میں سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۲ء میں اس کا مشاہدہ ہوا، اور روسی اشتراکیوں اور کمالی ترکوں نے اپنے پنج سالہ پروگراموں کے ذریعہ دکھایا، کہ قوموں کی تعلیم وتربیت کس طرح ہوتی ہے، اسی ایک نکتہ سے

احکام قرآنی کے بتدریج نزول کی حکمت سمجھ میں آسکتی ہے ، قرآن کا مقصد دنیا میں ایک عملی قوم پیدا کرنا تھا . محض نظری وخیالی نہیں ،

قوموں کی تعلیم وتربیت کا بڑا راز یہ ہے ، کہ جو بات جماعتی واجتماعی حیثیت سے ان کی زبان سے نکلوائی جائے . اس کو کر کے چھوڑا جائے ، تاکہ ان کے حوصلہ کا ہر قدم آگے بڑھتا رہے ، اور ان کی زندگی کا چشمہ جوش مارتا رہے ، اس عہد کا سب سے بڑا ہندو مصلح ٹھیک اسی اصول پر گامزن ہے ، مگر مسلمان مصلحوں کے طریقۂ تعلیم پر ذرہ غور کرو کہ جنگ بلقان ، جنگ طرابلس ، واقعۂ کانپور ، ہنگامۂ مسلم یونیورسٹی ، جنگ عظیم ، مسئلہ خلافت ، مسئلہ مقامات مقدسہ مسئلہ آزادی کس اہم مقصد پر ان کے مورچے مضبوطی کے ساتھ گاڑے گئے . اور ان کو کامیاب بنا کر چھوڑا گیا ، اب تک یہی عمل جاری ہے ، آج ایک بات اٹھائی گئی ، اور کل وہ بھلوا دی گئی ، نتیجہ یہ ہے ، کہ روز بروز مسلمانوں کے حوصلے پست ، ہمتیں ضعیف اور ارادے کمزور ہوتے جا رہے ہیں ، اور ان میں کسی ایک مورچہ پر بھی جم کر لڑنے کا مادہ اب تک پیدا نہیں ہوا ،

تعلیم وتربیت کا دوسرا اصول یہ ہے ، کہ انفرادیت فنا کر کے اجتماعیت پیدا کیجائے اور بار بار کے تجربوں سے طالب علموں کو مشاہدہ کرا دیا جائے کہ جماعتی طاقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے ، اور انفرادیت اس طاقت کی زندگی کے لئے زہر قاتل ہے ، اسکولوں اور کالجوں کے تمام کھیل ، اسی اصول کی تعلیم اور مشق کے لئے ہیں ، بوڑھی قومیں جب فنا ہونے لگتی ہیں ، تو ان کی موت کے جراثیم ، اسی انفرادیت کی آب وہوا میں پرورش پاتے ہیں ، جس کے نتیجہ کے طور پر ان میں خود غرضی ، عدم ایثار ، ذاتی اعزاز کی طلب اور قومی خیانت پیدا ہو جاتی ہے ، اسلام کی ہر عبادت میں جماعت کی تعلیم اسی اصول کی حفاظت کے لئے ہے ،

آج قوموں کے مصلح اسی جماعتی قوت کی تعلیم کے لئے ایک روز اور وقت مقرر کر کے

کبھی ہڑتال ، کبھی جلوس ، کبھی جلسۂ عام ، کبھی قومی روز و ہفتہ اور کبھی قومی عید اور تہوار منانے کی مشق کراتے ہیں ، مدت متعینہ میں مقررہ چندہ کی مقدار فراہم کرنے کی تجویز بھی اسی اصول کا ایک سبق ہے ، کیا مسلمان قوم کے موجودہ مصلحوں سے یہ پوچھا جاسکتا ہے ، کہ ان کی قوم اس سبق کو کہاں تک یاد کرسکی ، ایسی حالت میں ایسے اجتماعات عامہ کا اعلان کراکر ان کا پورا نہ کرانا مسلمانوں کے مرض کو کس تیزی سے بڑھا رہا ہے ، یا تو بغیر استعداد اور تیاری کے قوم کے منہ سے کوئی بات نکلوائی نہ جائے ، اور نکلوائی جائے ، تو جس طرح ہو ، پوری کرائی جائے ، اگر ایسا نہ کیا گیا ، تو قومی ضعف عزم انحطاط قویٰ ، اضمحلال روح کو پیدا کرکے اس کو موت کے منہ میں ڈھکیل دینا ہے ،

(معارف ماہ ستمبر ۱۹۳۴ء)

(۱۰)

خوشی کی بات ہے ، کہ ہر سال یورپ کے متعدد افراد از خود یا مسلمانوں کی تبلیغ یا اسلامی ممالک کی سیاحتوں اور عینی مشاہدوں کے اثر سے دین حق کو قبول کرتے ہیں ، اور ایسا نظر آتا ہے ، کہ اسلامی ممالک سے قریب تر یورپین ملک آسٹریا اور ہنگری یورپ میں اسلامی تبلیغ کے مرکز بن کر رہیں گے ، عربی اخبارات میں ان ممالک کے نومسلم مسلمانوں کے جو حالات وقتاً فوقتاً چھپتے رہتے ہیں ، ان سے معلوم ہوتا ہے ، کہ ان کا اسلام انگریز نومسلموں کی طرح حصولِ شہرت ، جلب منفعت اور ندرت پرستی کا نتیجہ نہیں ،

ڈاکٹر جرماتوس جو شانتی نکیتان بنگال میں اسلامی علوم وفنون کے پروفیسر بن کر آئے تھے ، اور یہیں انہوں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تھا ، وہ اپنے وطن آسٹریا ہنگری میں واپس جاکر نہایت مفید خدمات انجام دے رہے ہیں ، انہوں نے تمام متفرق مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کیا ہے ، ایک اسلامی درسگاہ کے افتتاح کی کوشش کی ہے ، اور اپنے عربی ملک کے

بھائیوں سے برابر مراسلات کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں، چند مصری مجاہدین دین بھی اس کام میں ان کی رہبری کر رہے ہیں،

ہم کو اپنے تمام نومسلم بھائیوں میں سے سب سے زیادہ جس کی شخصیت نے متاثر کیا ہے، وہ آسٹریا کے ایک گمنام نومسلم لیوپولڈ وائس معروف بہ محمد اسد ہیں، موصوف ایک اخبار کے مراسلہ نگار کی حیثیت سے اسلامی ملکوں کی سیاحت پر مامور ہوئے، انہوں نے عربی ممالک کی سیاحت کی، اور مسلمانوں سے میل جول بڑھایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گئے، سالہا سال حجاز میں گذارے، اور وہاں ایک عرب خاتون سے نکاح کیا، اب تقریبًا دو برس سے ہندوستان میں ہیں، گذشتہ سال لاہور کے جلسۂ حمایتِ اسلام میں اور امسال جامعہ ملیہ دہلی کی ایک تقریب میں ان سے ملاقات ہوئی، وہ ایک ایسے نومسلم نظر آئے، جن کو دیکھ کر مغرور پشتینی مسلمانوں کو شرمانا چاہیئے۔ وہ نہ صرف عقیدہ کے مسلمان ہیں، بلکہ فرائض وسنن ومستحبات اور تمدن ومعاشرت تک میں مسلمان ہیں، وہ وہ یوربین ہیں، جو نہ صرف مسیحی عقیدہ کے بلکہ یورپین تمدن کے مخالف ہیں، عربی زبان بولتے اور سمجھتے ہیں، اور انگریزی اتنی جانتے ہیں، کہ اس میں لکھ پڑھ سکیں،

موصوف کے دل میں اسلام کی بڑی عظمت ہے، اور وہ اس کو حقیقت حقہ جانتے اور یقین کرتے ہیں، اور ان کے دل میں لگن ہے، کہ وہ اسلام کی کوئی حقیقی خدمت بجا لائیں، اب انہوں نے اپنا لائحہ عمل (پروگرام) مرتب کر لیا ہے، اور قرول باغ دہلی میں "عرفات" کے نام سے ایک ادارہ قائم کر لیا ہے، اس کی طرف سے عنقریب وہ ایک انگریزی رسالہ کے اجرا کا ارادہ رکھتے ہیں، اور ایک "عرفات بکڈپو" کے ذریعہ سے اپنی تصنیفات کی اشاعت کا انتظام کر لیا ہے،

چند ماہ ہوئے کہ موصوف نے ایک مختصر لیکن جامع کتاب "اسلام ان کراس روڈ" (اسلام راہِ عبور پر) بزبانِ انگریزی شائع کی ہے۔ (عرفات بکڈپو، قرول باغ، دہلی)

اس میں موجودہ حالات وخیالات کے پیش نظر اسلام کی تعلیم کو بطور طریق نجات کے پیش کیا ہے ، اسی ضمن میں یورپ کے تمدن اور رجحانات دماغی کی تنقید کی ہے ، بعض مسلمانوں میں اس وقت یورپین تجدد اور احادیث وسنن نبویہ سے روگردانی کی بدعتوں کو "اصلاح" کے نام سے پیش کرنے کی جو افراط وتفریط پیدا ہو رہی ہے ، اس کی غلطیاں نہایت صحت اور نکتہ سنجی کیساتھ ظاہر کی ہیں ، کتاب کے اس باب کو پڑھ کر اپنے ان نئے خیال کے دوستوں کو حافظ کا یہ شعر سنانے کو جی چاہتا ہے ،

حسن زبصرہ ، بلال از حبش ، صہیب از روم
زخاک مکہ ابوجہل این چہ بوالعجبی است

قرآن پاک کے صحیح وخالص انگریزی ترجمہ کی ضرورت کا احساس مسلمانوں میں روز بروز بڑھ رہا ہے ، اگست کے شذرات میں ہم نے جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بی اے کے انگریزی ترجمہ قرآن کا ذکر کیا تھا ، اب ان کا ترجمہ چار پاروں تک پورا ہو چکا ہے ، وہ حواشی میں توضیح مطالب کے ساتھ معترضین کے جوابات بھی دیتے جاتے ہیں ، اور عیسائیوں اور مستشرقوں کے شکوک اور اعتراضات کو بھی دور کرتے جاتے ہیں ، ہم کو اس وقت اس کی خبر نہ تھی ، کہ علامہ عبداللہ یوسف علی صاحب بھی قرآن پاک کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں ، پنجاب کے دوستوں سے اس کی اطلاع پا کر بے حد خوشی ہوئی ،

موصوف کا فضل وکمال نہ صرف انگلستان بلکہ پورے یورپ میں مسلم ہے ، ان کی انگریزی زبان دانی پر انگریز اہل قلم کو بھی رشک ہے ، وہ عربی زبان سے واقف ہیں ، اور صاحب علم ونظر علماء کے مشورے بھی ان کو حاصل ہیں ، وہ پوری مستعدی اور انہماک کے ساتھ ترجمہ کے کام میں مصروف ہیں ، دو ماہ ہوئے کہ ان کا پہلے پارہ کا ترجمہ چھپ کر شائع ہو گیا ، انگریزی کے مسلمان ادیب فضلاء کی رائیں دریافت کیں ، تو سب نے اس کی فصاحت وخوبی وبلندی کی متفقہ تعریف کی ، ہم کو تو صرف یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ انہوں نے تاویلات کی گمراہی سے کلیۃً احتراز

کیاہے، اور معجزات کو عقلی حماقتوں کا بازیچہ گاہ نہیں بنایا ہے، معانی کے سمجھنے میں اہلِ زبان مفسرین کی تفسیروں سے مدد لی ہے، اور متعلقہ آیات میں اسرائیلیات کے بجائے خود بائبل کے حوالے دیئے ہیں،

یہ ترجمہ اشرف بک ڈپو کشمیری بازار لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہو رہا ہے، اس کی چھپائی کا کام گو لاہور ہی میں ہو رہا ہے، مگر اس قدر عمدگی اور خوبی کے ساتھ چھپ رہا ہے، کہ ظاہری شکل و صورت میں بھی ان ترجموں سے کم نہیں، جن کو لندن سے چھپوا کر منگوایا گیا ہے، ایک کالم میں متن قرآن فوٹو بلاک میں بالمقابل انگریزی ترجمہ موٹے ٹائپ میں اور نیچے حواشی باریک ٹائپ میں چھاپے گئے ہیں، ہر دو ماہ میں ایک پارہ کا ترجمہ شائع ہوگا، ہر حصہ کی قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول ہوگی، ضرورت ہے، کہ انگریزی خواں مسلمان بکثرت اس ترجمہ کو خریدیں، تاکہ شیخ محمد اشرف صاحب کی جنہوں نے اس ترجمہ کی اشاعت کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے، حوصلہ افزائی ہو، اور کام وقت پر پورا ہو سکے، انہوں نے یہ بھی آسانی کی ہے، کہ جو خریدار دو روپے بھیجکر اپنا نام مستقل خریداروں میں درج کرائے گا، اس کو محصول ڈاک معاف کر دیں گے،

ہمارے پاس ہانگ کانگ (ساحل چین) سے وہاں کی اسلامک لٹریری سوسائٹی کی روداد بابت ۱۹۳۳ء آئی ہے، سوسائٹی نے دوران سال میں مفید اسلامی رسائل و کتب کی اشاعت کا کام کیا ہے، اور ارادہ رکھتی ہے، کہ آئندہ چینی زبان میں تبلیغی کتابوں کی اشاعت کرے، اس روداد میں یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ ہماری مسلم یونیورسٹی کے ایک طالب علم حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری اس سوسائٹی کی تحریری مدد کرتے ہیں،

(معارف ماہ اکتوبر ۱۹۳۴ء)

(۱۱)

ہندوستان کی ایک مکمل اسلامی تاریخ کی ترتیب و تدوین کی تحریک معارف کے صفحات میں

بار بار پیش کی گئی ہے، آج اسی سلسلہ میں خان بہادر مولوی محمد حسین خاں صاحب سابق ڈپٹی اکاؤنٹنٹ گورنمنٹ آف انڈیا (مصنف تزک عبدالرحمٰنی) وغیرہ کی ایک تحریر شائع کی جارہی ہے، موصوف ہماری زبان کے پرانے صاحب قلم ہیں، اوراس ضرورت کے احساس کرنے کا موقع بھی ان کو اچھا خاصہ ملاہے، دوسرے اکابر کی تحریریں بھی اس باب میں وقتاً فوقتاً موصول ہوتی رہتی ہیں، اس سے اتنا تو ثابت ہوتاہے، کہ اس کام کے ضروری ہونے میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں،

۱۹۳۲ء کے معارف (بابت ماہ نومبر و دسمبر) میں پروفیسر شیخ عبدالقادر (پونہ) کی تحریر اسی مسئلہ کے متعلق جب شائع ہوئی تھی، تو ہم نے اس مجوزہ تاریخ کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا تھا، اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کر دیا تھا، کہ اس کام کو شروع کرنے کے لئے کم از کم پانچ ہزار روپئے کی ضرورت ہے، ہم کو اس بات کے ظاہر کرنے میں خوشی ہے کہ جناب مولوی محمد حسین خاں صاحب نے نہ صرف اس کام کی زبانی تاکید فرمائی ہے، بلکہ وہ اس کام کی مالی امداد میں بھی حصہ لینے کو تیار ہیں، چنانچہ سر دست پانچ سو روپئے اس کام کے لئے عنایت فرمائیں گے،

تاریخ ہند کے سلسلہ میں ہندوستان کے اسلامی تمدن کی تاریخ کا کام تقریباً دو سال سے یہاں جاری ہے، اور اس کے لئے تمام ضروری معلومات فراہم کئے جارہے ہیں، ہماری مجلس کے صدر نشین نواب صدریار جنگ، بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے ایک سال تک پچاس روپئے ماہوار کی امداد اس کے لئے منظور فرمائی ہے، ہم اپنے ان دونوں قومی محسنوں کے شکر گذار ہیں، اور اب ہماری نگاہیں دوسرے دردمند و علم دوست ارباب ہمم کی طرف اٹھی ہوئی ہیں، اور ان کے حوصلہ افزا جواب کا انتظار ہے،

خیال ہے کہ یہ کتاب چودہ جلدوں میں لکھی جائے، پہلی جلد آغازِ اسلام سے غزنوی خاندان کے ظہور تک کے واقعات پر مشتمل ہوگی، مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی جو دس

پندرہ برس سے تاریخ ہند کا عموماً اور اس دورِ اوّل کی تاریخ کا خصوصاً محققانہ مطالعہ کررہے ہیں، اس جلد کی ترتیب وتالیف کا کام انجام دیں گے،

اس سال ابھی تک دارالمصنفین کی طرف سے کوئی نئی کتاب شائع نہ ہوسکی، افکارِ عصریہ بالکل چھپ کر تیار ہے، صرف فہرست ولوح اور بعض ضمیمے باقی ہیں، مقالاتِ شبلی کا حصہ چہارم جس میں مولانا شبلی مرحوم کے قلم سے مطبوعہ اور قلمی کتابوں پر تبصرے یکجا کئے گئے ہیں، نصف سے زیادہ چھپ گیا ہے، ایک اور کتاب "موجودہ فرماں روایانِ عرب" کی چھپائی بھی ختم کے قریب ہے، اور تاریخ صقلیہ جلد دوم کی کتابت ہورہی ہے، غالباً یہ آیندہ سال شائع ہو،

آج کل ہندوستان، مصر، عراق، اور کابل کے اسلامی اخباروں اور رسالوں میں جاپان میں اشاعتِ اسلام کی خبریں بڑے زور شور سے گشت لگارہی ہیں، بدگمانی کا برا ہو، کہ یہ خبریں جاپان کی اس کوشش کا نتیجہ نہیں، کہ مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرکے اسلامی ملکوں کی بازار ہاتھ میں لائے جائیں، تو ہم کو ان افواہوں سے کم از کم فالِ نیک کی بھنک تو معلوم ہوتی ہے، جاپان میں ہندوستان کے مسلمان تاجروں کا اچھا خاصہ گروہ پہلے سے موجود تھا، پھر بالشویک روس سے بھاگ کر بعض ترکی وتاتاری، مسلمان وہاں آباد ہوگئے ہیں، تازہ واقعہ ہے، کہ منچوریا جہاں مسلمان رعایا کی خاصی تعداد ہے، جاپان کے زیرِ اقتدار باقاعدہ آگیا ہے، اور ادھر جاپانی تاجروں نے اسلامی ملکوں کے بازاروں کی تلاش میں براہِ راست آمد ورفت شروع کردی ہے، غرض ان گوناگوں تعلقات نے جاپان میں اسلام کی اشاعت کے امکان کو بہت کچھ وسعت دیدی ہے،

ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ دوستوں میں مولوی محمد شاکر صاحب ندوی (بڑودہ) جاپان میں تجارت کرتے ہیں، ۱۹۳۳ء میں ان سے بڑودہ میں ملاقات ہوئی تھی، وہ کہتے تھے، کہ اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے، کہ اسلامی فرقوں کے مختلف افراد جو وہاں جمع ہیں، وہ

باہم مل جل کر کام کریں، چنانچہ ایک دو سال ان کی کوشش سے یہ ہوا، کہ عیدین کی نمازیں سب مسلمانوں نے ایک جگہ مل کر ادا کیں،

ابھی پچھلے ستمبر میں ہم کو جاپان سے ایک مسلمان ہندوستانی فاضل پروفیسر نورالحسن برلاس صاحب کا خط موصول ہوا ہے، موصوف جاپان کے پایۂ تخت ٹوکیو کے مدرسہ السنہ خارجہ (اسکول آف فارن لنگویجز) میں تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں، کہ ان کے مدرسہ کے کتب خانہ میں اردو کی معتد بہ کتابیں ہیں، مولانا شبلی مرحوم کی تمام تصنیفات ہیں، لیکن ضرورت یہ ہے کہ انگریزی زبان میں اسلامی لٹریچر وہاں فراہم کیا جائے، موصوف لکھتے ہیں، کہ مسلمانوں کو موجودہ موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اور اس ملک کو اپنی تبلیغی کوششوں کا مرکز بنا لینا چاہیے،

پروفیسر برلاس صاحب تبلیغ اسلام کا ولولہ رکھتے ہیں، اور کبھی کبھی اسلامی مسائل پر وہاں انگریزی میں تقریریں کیا کرتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اسلام میں عورتوں کی حیثیت پر اورینٹل کلچر سمر کالج کا روائزوہ (انگلش مسودہ نمبر ۹۶۰) میں بتاریخ ۳ر اگست ۱۹۳۴ء میں جو انگریزی میں تقریر کی تھی، اس کا ایک نسخہ ہمارے پاس بھیجا ہے،

آسٹرین نومسلم محمد اسد صاحب جن کی کتاب "اسلام براہِ عبور پر" کا تذکرہ پچھلے معارف میں آچکا ہے، اپنے ایک تازہ خط میں یہ خوشخبری سناتے ہیں، کہ انہوں نے صحیح بخاری کے انگریزی ترجمہ کا کام شروع کر دیا ہے، بخاری کے تیس پاروں کو مع عربی متن تیس جزوں میں ماہوار شائع کریں گے، پہلا جزو وہ غالباً آیندہ دسمبر یا جنوری میں شائع کر دیں گے، ان کا خیال ہے، کہ مسلمان نوجوانوں کے سامنے "سنّت محمدیؐ" کی اصلی تصویر پیش کرنی چاہیئے، تاکہ ان میں اس کی پیروی کا صحیح جذبہ پیدا ہو سکے، "عرفات بک ڈپو" قرولباغ، دہلی کے پتہ سے اس کی خریداری کی درخواستیں بھیجی جائیں،

(معارف ماہ نومبر ۱۹۳۴ء)

(۱۲)

اسلامی ہند کی مکمل تاریخ

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور سلاطین اسلام کی بادشاہی و حکومت اور مسلمانوں نے اس ملک کو جو ترقی دی، اور یہاں جو تمدن پیدا کیا، ان سب کی ایک مفصل و مکمل اسلامی تاریخ کی ضرورت تاریخی، علمی، قومی، سیاسی ہر حیثیت سے روز بروز بڑھتی جاتی ہے، لیکن یہ کام اس قدر اہم ہے، کہ اس کو صرف شخصی ہمت سے انجام دینا مشکل ہے، اربابِ نظر کی نگاہیں اس کے لئے برابر دار المصنفین پر پڑ رہی ہیں، دار المصنفین نے اب تک اس خدمت کے انجام دینے سے اس لئے پہلو تہی کی، کہ اس کے لئے گراں قدر مصارف کی ضرورت ہے، جس کے لئے اس کا موجودہ سرمایہ کافی نہیں، اس کام کے لئے اس کو جو ضرورت در پیش ہے، اس کا مختصر خاکہ حسبِ ذیل ہے،

(۱) تاریخ ہند کے غیر مطبوعہ قلمی نسخوں کی فراہمی، نقل اور ہو سکے تو خریداری،

(۲) تاریخ ہند کی جو مطبوعہ کتابیں ہمارے پاس نہیں، ان کو حاصل کرنا،

(۳) یورپین زبانوں میں قدیم یورپین سیاحوں نے مغلوں کے عہد کے احوال لکھے ہیں، یا آج کل انگریزی میں ہندوستان کی جو قابل ذکر تاریخیں لکھی ہیں، ان کو خرید کر یا ہدیہ لے کر حاصل کرنا،

(۴) مرہٹوں اور سکھوں نے اپنے اپنے عہد کے جو تاریخی مواد فراہم کئے ہیں، ان کو جمع کرنا،

(۵) مختلف کتب خانوں میں ہندوستان کی تاریخ کے متعلق جو نادر قلمی کتابیں موجود ہیں، بسفر کر کے ان کا مطالعہ کرنا، اور ان سے معلومات فراہم کرنا،

(۶) کتاب کی ترتیب و تدوین کے لئے چند لائق اشخاص کے خدمات کو مناسب معاوضہ پر حاصل کرنا ،

(۷) تیار شدہ جلدوں کو چھاپ کر شائع کرنا ،

خیال ہے ، کہ ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ کو پندرہ حصوں میں تقسیم کیا جائے ،

حصہ اول : آغازِ اسلام سے غزنویوں کی پیدائش تک ،
حصہ دوم : غزنویوں کا عہد ،
حصہ سوم : غوریوں سے لے کر حکومت غلاماں کے خاتمہ تک ،
حصہ چہارم : خلجی و تغلق ،
حصہ پنجم : از آمد تیمور تا خاتمہ خاندان لودھی تک ،
حصہ ششم : بابر سے خاندان سوری تک ،
حصہ ہفتم : ہمایوں بار دوم سے جہانگیر تک ،
حصہ ہشتم : شاہجہاں سے عالمگیر تک ،
حصہ نہم : بہادر شاہ اول سے بہادر شاہ ثانی تک ،
حصہ دہم : بہمنیہ و عادل شاہ وغیرہ سلاطین دکن ،
حصہ یازدہم : گجرات و مالوہ و خاندیس ،
حصہ دوازدہم : کشمیر و ملتان و سندھ ،
حصہ سیزدہم : جونپور و بنگال و دیگر متفرقات ،
حصہ چہاردہم : اسلامی ہند کا آخری دور نظامت ، حیدر آباد و مرشد آباد و عظیم آباد و اودھ و روہیلکھنڈ و میسور و ارکاٹ ،
حصہ پانزدہم : ہندوستان میں اسلامی تمدن کی تاریخ ،

اگر ان پندرہ جلدوں میں سے ہر جلد کی ترتیب و تالیف پر کم از کم پانچ سو ، اور چھپائی پر

بھی اسی قدر لاگت کا تخمینہ کیا جائے، تو پندرہ جلدوں پر پندرہ ہزار سے کم خرچ نہ آئے گا، اور کتابوں کی خریداری وبہم رسانی کا خرچ دو ہزار بھی رکھا جائے، تو مجموعہ سترہ ہزار ہوتا ہے ہماری قوم میں ایسے ارباب ہمت موجود ہیں، جو اس عظیم الشان کام کے لئے سترہ ہزار یک مشت دے سکتے ہیں، اور ہم کو مشکلات اور زحمتوں سے بچا کر دین کے ثواب کے ساتھ دنیا کی ابدی شہرت و ناموری کے مستحق ہوسکتے ہیں، لیکن ایسے بلند پرواز عنقا کے انتظار میں ہم کام کو ملتوی کرنا نہیں چاہتے، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر بھروسہ کرکے کام شروع کردینا چاہتے ہیں،

اس وقت تک اس سلسلہ میں دو قومی محسنوں نے اپنے چندوں کا اعلان کیا ہے۔ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ایک سال تک پچاس روپئے ماہوار کا، اور جناب خاں بہادر مولوی محمد حسین خاں صاحب سابق اکاؤنٹنٹ گورنمنٹ آف انڈیا وسابق فینانس منسٹر رام پور نے پانچسو یکمشت کا وعدہ فرمایا ہے، اس کے بعد جو ارباب ہمت علم دوست ہماری امداد فرمائیں گے، ان کے نام بعد کو شائع کئے جائیں گے،

اس وقت عام مسلمانوں کی خدمت میں یہ گذارش ہے، کہ وہ ہماری مدد حسب ذیل صورتوں سے کرسکتے ہیں،

(۱) اسلامی ہند کی تاریخ کے کسی قلمی یا نایاب مطبوعہ نسخہ کی فراہمی،

(۲) شاہی فرامین یا قدیم خاندانی یادداشت وتحریر بہم پہنچانا،

(۳) کوئی ماہوار یا یکمشت چندہ دینا،

ان تمام لوگوں کو جو اس مسئلہ سے دلچسپی رکھتے ہوں، اور مفید مشورہ دینا چاہتے ہوں، ناظم دار المصنفین سے خط وکتابت کرنی چاہیئے

قومی اخبارات سے امید ہے، کہ وہ اس تحریر کو اپنے کالموں میں نقل کرکے ہماری مدد

کریں گے، اور اگر اس کی تائید میں لکھ سکیں تو مزید عنایت ہو،

سید سلیمان ندوی

✣ ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ ✣

۳ر دسمبر ۱۹۳۴ء

(معارف ماہ دسمبر ۱۹۳۴ء)

شذرات

(جنوری ۱۹۳۵ء تا اکتوبر ۱۹۳۵ء)

اس نمبر سے معارف کی عمر کے بیسویں سال کا آغاز ہو رہا ہے، جولائی ۱۹۱۶ء میں اس کا پہلا پرچہ نکلا تھا، اور اب ۱۹۳۵ء ہے، اس طویل مدت میں معارف نے اپنے امکان بھر علم و فن اور دین و ملت کی جو خدمتیں انجام دیں وہ سب کے سامنے ہیں اپنی پچھلی بست سالہ اشاعتوں کے ہزاروں صفحات میں اس نے اردو زبان میں جو کچھ پیش کیا ہے، وہ مختلف علوم و فنون کی تحقیقات کا حقیقۃً دائرۃ المعارف ہے، وللہ الحمد اب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ عالی سے مزید توفیق کے لئے دست سوال دراز ہے،

لاہور کے بعد بمبئی کے اہلِ علم مسلمانوں کو اس کا احساس ہوا ہے، کہ وہ اسلامی علوم و فنون کی ایک بلند پایہ مجلس قائم کریں، چنانچہ فروری ۱۹۳۳ء میں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کے نام سے بمبئی کے چند مخلص خادمان علم نے ایک علمی مجلس کی بنیاد ڈالی ہے اسکے مربی و سرپرست ہز ہائنس رائٹ آنریبل سر سلطان محمد شاہ آغا خاں بالقابہ، نائب مربی آنریبل سر شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد، اور ڈاکٹر سر راس مسعود، صدر جناب علی محمد جکلائی صاحب جی، پی، بمبئی، اور سکریٹری اے، اے، فیضی، ایم، اے (کیمبرج) ہیں، اور اس کے اعزازی ممبروں میں یورپ کے چند ممتاز فضلائے علوم مشرقی پروفیسر لوئی مینان (پیرس) پروفیسر مارگیولوتھ (آکسفورڈ) پروفیسر نکلسن (کیمبرج) پروفیسر زیٹرسٹین (اپالا) پروفیسر اے فر (لیپزاگ) پروفیسر ایچ، اے، آر گب (لندن) اور پروفیسر اے، جے وینسنک (لائیڈن) ہیں، ایسوسی ایشن کی قدر افزائی نے معارف کے حقیر اڈیٹر کو

بھی اپنے اعزازی ارکان کی فہرست میں شامل کرکے اس کا پایہ بلند کیا ہے،

ایسوسی ایشن نے اپنی ایک برس کی عمر میں متعدد کتابیں اپنی طرف سے تصحیح کرکے موزوں طباعت کے ساتھ شائع کی ہیں، جیسے رسالہ درحقیقت دین، تصنیف مرحوم آقای شہاب الدین (اسماعیلی مذہب کی حقیقت میں) منتخب دیوان خاکی خراسانی (سنہ ۱۰۳۰ھ سنہ ۱۰۵۶ھ) اور کتاب ہفت باب بابا سیدنا و مطلوب المؤمنین، یہ کتابیں فارسی زبان میں ہیں، اور اسماعیلی مصنفین کی تصنیفات ہیں، اس فرقہ نے اب تک اپنی کتابوں کے اخفا میں پوری کوشش کی ہے، مگر بحمد اللہ کہ اب یہ بند ٹوٹ رہا ہے، اور نوجوان اہلِ علم اسماعیلی اپنے مذہب کی تصانیف کو منظرِ عام پر لارہے ہیں، اس سے وہ بہت کچھ بدگمانیاں، جو اس فرقہ کے متعلق عام مسلمانوں میں پھیلی ہوئی ہیں، مناسب حد تک کم ہوجائینگی ایسوسی ایشن مذکور اپنے سلسلۂ اشاعت کے ذیل میں میرے چندان خطبوں کو جو عربوں کی جہازرانی پر دو تین سال پہلے بمبئی میں وہاں کے محکمۂ وزارت تعلیم کے تحت میں نے پڑھے تھے، شائع کررہی ہے،

کتب حدیث سے روایات کی تلاش میں محققین اور طلبائے حدیث کو دشواریاں پیش آتی تھیں، ان کو حل کرنے کے لئے پروفیسر اے، جی، وینسک (لائیڈن) نے حدیث و سیر کی چودہ کتابوں کی ایک مفتاح یا فہرست مضامین بقید صفحات و ابواب انگریزی میں شائع کی تھی، لیکن اس کے انگریزی میں ہونے کے سبب سے اس سے عربی داں اور علمائے اسلام جو انگریزی نہیں جانتے، فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے، خوشی کی بات ہے کہ مصر کے ایک فاضل صاحب قلم محمد فواد عبدالباقی نے اس کو انگریزی سے عربی میں منتقل کرکے ایک جلد میں شائع کیا ہے، اب یہ کتاب اس لائق ہوگئی ہے، کہ ہمارے علماء روایات کی تلاش میں بہت آسانی سے اس سے کام لے سکیں، اس میں (۱) صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی (۲) صحیح مسلم، مؤطا امام مالک، مسند زید بن علی، مسند ابی داؤد طیالسی (۳) مسند احمد بن حنبل، طبقات ابن سعد، سیرۃ ابن ہشام اور مغازی واقدی کی روایات کی فہرستیں تیار کی گئی ہیں، پہلی صنف کی

کتابوں میں باب کے نمبر سے اور دوسری صنف کی کتابوں میں حدیث کے نمبر سے اور تیسری صنف میں مطبوعہ نسخوں کے صفحات کے ذریعہ سے روایات کا حوالہ دیا گیا ہے، ہر ایک مضمون کی جو حدیثیں مذکورۂ بالا کتابوں میں ہیں، ان کو شمار باب یا شمار حدیث یا شمار صفحہ کے ذریعہ بتا دیا گیا ہے، اس طرح ہر مضمون کی حدیث کو مذکورۂ بالا کتابوں میں سے ہر ایک میں سے نہایت آسانی سے چند لمحوں میں نکال لیا جا سکتا ہے، علم حدیث کے ماہرین سمجھ سکتے ہیں، کہ اس کتاب کے ذریعہ ان کی کتنی محنت ضائع ہونے سے بچ گئی ہے، کتاب کے شروع میں کتب مذکورہ کے ابواب کا شمار بھی شامل کر دیا گیا ہے، کتاب کے آغاز میں شیخ سید رشید رضا کا ایک مختصر مقدمہ بھی ہے،

اے، جی، وینسک کی انگریزی کتاب سے استفادہ کرنے میں ایک بڑی دقت یہ تھی کہ غیر زبان میں ہونے کے باعث صحیح الفاظ حدیث کا پتہ نہیں چلتا تھا، فاضل مترجم نے ترجمہ کرنے کے بجائے نہایت محنت سے ہر حدیث کا استخراج کر کے اصل حدیث کے الفاظ کا نشان دیا ہے، اس سے اس کتاب کی افادیت پوری ہو گئی ہے، اور اس لائق ہو گئی ہے، کہ ہماری درسگاہوں اور علماء کی مجلسوں میں اس سے کام لیا جائے، یہ کتاب مصر میں دار المنار، شارع الانشاء نمبر ۱۴ سے ۶۰ قرش میں ملے گی، اور ہندوستان میں ابنائے شرف الدین بھنڈی بازار بمبئی سے بارہ روپے میں ملے گی،

تاریخ ہند کی جو تجویز معارف کے گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی تھی، مسرت ہے، کہ اس کو پورے ملک میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، اسلامی اخبارات نے پُر زور تائید کی ہے، اہلِ قلم اصحاب نے اپنی قلمی امداد کا وعدہ کیا، اور مختلف لوگوں نے مختلف مشورے پیش کئے، مصنفین میں ڈاکٹر محمد ناظم پی، ایچ، ڈی، (محکمۂ آثار قدیمہ لاہور) مصنف تاریخ محمود غزنوی، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، ایم، اے، مرتب رقعات عالمگیر (اسماعیل کالج بمبئی) پروفیسر محمد ابراہیم صاحب، ایم، اے، (عثمانیہ کالج اورنگ آباد) اور جناب الطاف علی صاحب

بی، اے، مصنف حیات حافظ رحمت خاں اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے بعض فضلائے اپنے اپنے خدمات پیش کئے ہیں، ہم ان حضرات کے ممنون ہیں، کہ انہوں نے اس علمی فرض کے ادا کرنے میں ہماری مشارکت پر آمادگی ظاہر کی،

لیکن عجیب بات ہے، کہ اہل قلم کی طرف سے جس گرمجوشی کا اظہار رہوا، اہلِ کرم کی جانب سے اسی قدر سرد مہری برتی گئی، دو سابق الذکر محسنوں کے بعد ہمارے پاس جس تیسرے محسن کا وعدہ آیا ہے، وہ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب (دہلی) ہیں انہوں نے سو سو روپے کی قسط سے ایک ہزار کا وعدہ کیا ہے، ہمارے یہ تینوں محسن جناب نواب صدریار جنگ بہادر خان بہادر مولوی محمد حسن خاں (مترجم تزک امیری وہاجرہ) اور جناب خواجہ صاحب، ہر سہ حضرات اصحاب قلم ہی کی فہرست میں داخل ہیں، ہم اب بھی مایوس نہیں ہیں، اور حیدر آباد، وبھوپال وعلی گڈھ، و لاہور کے تاریخی محسنین کی طرف ہماری نگاہیں لگی ہوئی ہیں،

دار المصنفین کی طرف سے گذشتہ دسمبر میں افکار عصریہ، مقالاتِ شبلی چہارم (حصّہ تنقید) اور عرب کی موجودہ حکومتیں، تین کتابیں شائع ہوگئی ہیں، افکار میں علومِ جدیدہ کے تمام نظری مسائل آسان طرزِ عبارت میں ہیں، مقالات میں مولانائے مرحوم کے وہ مضامین ہیں، جن میں انہوں نے مطبوعہ یا قلمی کتابوں پر تبصرے لکھے ہیں، اور تیسری کتاب عرب کی موجودہ حکومتوں کے احوال اور عرب جغرافیہ میں ہے،

(معارف ماہ جنوری ۱۹۳۵ء)

(۲)

اڈیٹر نے ۱۱ر جنوری ۱۹۳۵ء سے یکم فروری ۳۵ء تک کا زمانہ لکھنؤ، لاہور، سہارنپور، دیوبند، اور دہلی میں گذارا، اور ہر جگہ علمی اور تعلیمی اداروں اور کتب خانوں کی سیر کی، اس سفر کی اصلی دعوت انجمن حمایتِ اسلام لاہور، کی طرف سے تھی، انجمن کے قیام پر امسال

پچاس برس گذر جائیں گے ، انجمن اس موقع پر اپنی طلائی جوبلی منانا چاہتی ہے ، اور اس کی یادگار میں ایک اسلامی زنانہ جامعہ قائم کرنے کا خیال رکھتی ہے ، اس تجویز پر غور کرنے کے لئے چند اصحاب کی ایک مجلس بلائی گئی تھی ، تاکہ وہ اس کے لئے ایک عملی خاکہ کی بنیاد رکھے ، چار پانچ روز رہ کر ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کے شورہ سے ایک ابتدائی خاکہ بنا کر پیش کر دیا گیا ہے ، جس پر مزید غور وخوض آئندہ کیا جائے گا ،

لاہور کے احباب اور دوستوں نے بدستور کرم فرمائی کی ، خواجہ عبدالوحید صاحب (سکریٹری اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوشن) پروفیسر صوفی تبسم صاحب اور ڈاکٹر عبدالقوی صاحب کی مخلصانہ عنایات یاد رہیں گی ، انجمن خدام الدین دیکھنے کی آرزو تھی ، یہ لاہور کے مخلص خادمان دین کی بے ریا و بے غرض جماعت ہے ، اس جماعت کے امام مولانا احمد علی صاحب ہیں ، انجمن نے اپنی ایک مختصر سہ منزلہ عمارت بھی بنوالی ہے ، جو زیادہ تر خود انجمن کے غریب ممبروں کی مالی اعانت سے بنی ہے ، انجمن نے اب تک کم وبیش ایک لاکھ اصلاحی رسالے مسلمانوں میں بانٹے ہیں ، عام کاروباری اور انگریزی خواں اصحاب کے لئے قرآن پاک کے روزانہ درس کا انتظام ہے ، ۱۵ ر ذی قعدہ سے ۵ ر ذی حجہ تک سال میں تین مہینے فارغ التحصیل علماء قرآن پڑھانے کے لئے مقرر ہیں ، اس وقت بھی انجمن میں مشہور مدرسوں کے پچیس تیس فارغ علماء موجود تھے ، ان میں زیادہ تر سرحد ترکستان ، سندھ ، بلوچستان ، اور پنجاب کے تھے ، کچھ یوپی ، بہار ، اور بنگال کے بھی تھے ، ان کے سامنے امیر انجمن مولانا احمد علی صاحب کے اصرار سے قرآن پاک کے درس کی ضرورت واہمیت پر بیٹھے بیٹھے کچھ تقریر کی گئی ،

انجمن کا بڑا مقصد عام مسلمانوں تک قرآن پاک کو پہنچانا ہے ، اس کے لئے وہ مولانا شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی کے ترجمہ کو مولانا احمد علی صاحب کے حواشی کے ساتھ بڑے اہتمام کے ساتھ مختلف قسم کے کاغذوں پر چھپوا رہی ہے ، مولانا نے اپنے ان حواشی میں جو متعدد مستند علماء کی نظروں سے گذر چکے ہیں ، قرآن پاک کی آیتوں کے باہم ربط کے بیان پر خاص

طور سے زور دیا ہے ،

انجمن کی طرف سے یہ تجویز بھی زیر غور ہے ، کہ انگریزی میں ایک پندرہ روزہ مذہبی ، تبلیغی ، اصلاحی صحیفہ نکالا جائے ، اگر یہ تجویز عمل میں آگئی ، جس کی مالی خدمت کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے انجمن آمادہ ہے ، تو اس کا یہ کارنامہ بہت سی باطل فروشوں کی دکانوں کو سرد کردیگا اور دور دراز اسلامی ملکوں تک اس کی آواز پہونچ جائے گی ،

آج کل جزیرہ ٹرینی ڈاڈ سے جو امریکہ کے قریب انگریزی عمل داری ہے ، ایک مسلمان جنکے باپ ، دادا یہیں کے رہنے والے تھے ، یہاں اس غرض سے آئے ہوئے ہیں ، کہ یہاں سے کوئی انگریزی داں عالم اپنے ملک کو لے جائیں ، ان صاحب سے پہلی ملاقات لکھنؤ دارالعلوم ندوہ میں ہوئی ، اور دوسری لاہور میں ہوئی ، ان کا بیان ہے کہ ان کے جزیرہ میں پچیس تیس ہزار مسلمان آباد ہیں ، ان کی چند مسجدیں بھی ہیں ، مگر چونکہ ان کے پاس اسلام پر انگریزی لٹریچر نہیں ، اور نہ ان کے بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام ہے ، اس لئے اکثر نوجوان عیسائی مذہب نہیں ، تو عیسائی تمدن میں گرفتار ہوتے جاتے ہیں ، اگر ان کی یہی غفلت رہی ، تو شاید ایک زمانہ میں وہ مسلمان باقی بھی نہ رہیں ،

یہ صرف جزیرہ ٹرینی ڈاڈ کا سوال نہیں ، بلکہ ان تمام نوآبادیوں کا سوال ہے ، جہاں مسلمان نوآباد کار بسے ہیں ، ماریشس ، آسٹریلیا ، مڈگاسکر ، جنوبی و مشرقی افریقہ ، اور دیگر مقامات جہاں جہاں مسلمان جا کر بسے ہیں ، وہاں وہ صرف مزدوری ، تجارت اور بیوپار کے لئے گئے ، اور اپنی اصل سے کٹ گئے ، اب ان کی اولاد در اولاد وہاں آباد ہے ، اور اب تک اپنے باپ دادوں کے بتائے اور سکھائے ہوئے مذہب کو سینے سے لگائے ہیں ، مگر یہ روایتی مذہب کب تک چل سکتا ہے ، عیسائی مشنری اور دوسرے فرق باطلہ جن میں پیش پیش قادیانی ہیں ، ان کی تلاش میں منڈلا رہے ہیں ، ضرورت ہے ، کہ ان مقامات کے مسلمانوں کی حفاظت اور تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ سامان کیا جائے ۔

جاپان کے شہر کیوبے میں ہندوستانی اور تاتاری مسلمانوں کی کوششوں سے اسلام کی سب سے پہلی مسجد کی بنیاد ڈالی جاچکی، اسی کے ساتھ یہ رنج دہ خبر بھی سنی جاتی ہے، کہ کیوبے اور ٹوکیو کے مسلمانوں میں باہم اختلاف پیدا ہوگیا ہے، ہم وہاں کے عاقبت اندیش مسلمانوں سے پر زور اپیل کرتے ہیں، کہ وہ خدارا ان جراثیم کا اس سے پہلے کہ وہ مہلک ثابت ہوں، استیصال کرلیں، یہ التجا ان سے اس اسلام کے نام پر ہے، جس کی ترقی اور سربلندی کیلئے وہ ازبس کوشاں ہیں،

تاریخ ہند کی تحریک سے ہر جگہ دلچسپی لی جارہی ہے، اور متعدد اہلِ قلم اس کے لئے اپنے خدمات پیش کر رہے ہیں، مگر اس کی مالی امداد کے سوال کا ابھی تک صرف چند اہلِ کرم نے جواب دیا ہے، کتاب کی جلدوں کا جو خاکہ ہم نے پیش کیا تھا، اس میں ہندوؤں کے عہد کی کوئی جلد نہیں رکھی تھی، مگر بعض ممتاز ماہرین کی رائے ہے، کہ اس کی پہلی جلد ہندوؤں کے دور پر ہو، تاکہ ہندوستان کے قدیم نظام حکومت اور تمدن و معاشرت کی تصویر بھی اس مرقع میں موجود رہے،

بعض صاحبوں کا خیال ہے، کہ تاریخِ ہند سے پہلے تاریخِ اسلام کی ضرورت ہے، ان کی اطلاع کے لئے گذارش ہے، کہ تاریخِ اسلام کا کام چند سال سے شروع ہے، اور اب وہ قریب ختم ہے، اور عجب نہیں کہ مختصر تاریخِ اسلام جس کا عنوان "ہماری بادشاہی" ہے، اس سال چھپ کر شائع بھی ہوجائے،

(معارف ماہ فروری ۱۹۳۵ء)

(۳)

مسلمانوں کی گذشتہ سیاسی جدوجہد کی صحیح یادگار گو بالواسطہ سہی، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہے، یہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے جدید تعلیمی و ذہنی انقلاب کا مظہر ہے، جو خود جدید تعلیم یافتہ

اشخاص کے ہاتھوں ہو رہا ہے، ہم اس کے ذریعہ اس ذہنیت کو بدلنا چاہتے ہیں، جو انگریزی حکومت کے ساتھ مسلمانوں کے اندر بلکہ ہندوستانیوں کے اندر پیدا ہو گئی ہے، کہ تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمت ہے، حالانکہ تعلیم کا اگر کوئی دنیاوی نصب العین ہو سکتا ہے۔ تو وہ صرف یہ ہے، کہ ایک بہتر کاروباری آدمی پیدا ہو، ہم نے "مسلمانوں کی آیندہ تعلیم" میں جو اب جامعہ کی طرف سے مستقل رسالہ کی صورت میں شائع ہو چکا ہے، اس کی پوری پوری حقیقت ظاہر کر دی ہے،

جامعہ کی ابتدا کس بے سر و سامانی اور کس بیرسی کے ساتھ ہوئی بارہا وہ وقت آیا جب اس کی زندگی کی کشتی بھنور میں پھنس کر نکلی ہے، اور آخر اس کے کارکنوں کی ان تھک کوششوں کی بدولت وہ دن آیا، کہ یکم مارچ ۱۹۲۵ء کو اس کی عمارت کا سنگِ بنیاد ایک معصوم بچہ کے ہاتھوں سے رکھا گیا، اہلِ جامعہ نے اس عمارت کی تعمیر و تکمیل کے لئے ڈھائی لاکھ کی اپیل کی ہے، اور خوشی کی بات ہے، کہ اس کے جلسۂ سنگِ بنیاد تک ۳۲ ہزار چندہ ہو گیا۔

ہم نے اس خیال کو بارہا ظاہر کیا ہے،

بارہا گفتہ ام و بار دگر می گویم

مسلمانوں کے سامنے بغیر کافی تیاری کرے کوئی عام تحریک پیش نہ کی جائے، اور اگر پیش کیجائے تو اہل تحریک کا فرض ہے، کہ اس کو جس طرح بنے مسلمانوں سے پورا کرائیں، تاکہ ان کی اخلاقی قوت روز بروز بڑھے، اور کسی کام کو نا ندھ کر اس کے پورا کرنے کا جذبہ ان میں پیدا ہو، یہ ڈھائی لاکھ کی رقم کچھ زیادہ نہیں، اہلِ ثروت کو بھی تکلیف فرمانے کی ضرورت نہیں، وہ صرف غریبوں کے پیسے سے پوری ہو سکتی ہے، اس کے لئے صرف اسلامی عزم چاہئیے، ویرزقہ من حیث لا یحتسب،

مدارس کا خطۂ ملیبار جس کو کیرلا کہتے ہیں، پرانے عرب خاندانوں سے آباد ہے، اور عرب و ہند کے بحری و تجارتی تعلقات کی یادگار ہے، جنگ عظیم کے بعد وہاں جو شورش برپا ہوئی،

اس نے گو وہاں کے مسلمانوں کو سخت جانی ومالی نقصانات پہنچائے، تاہم اس سے اتنی بھلائی ضرور پیدا ہوئی، کہ اس نے ان کو جھنجوڑ کر سوتے سے جگا دیا اور اب ان کو اپنی حالت کا احساس ہوا، ان میں تعلیم کی بیداری پیدا ہوئی، مذہبی اصلاحات کا خیال پیدا ہوا، ان کے علمار نے اپنی جمعیت قائم کی، جس کا نام کرلا جمعیۃ العلمار کالی کٹ ہے،

جمعیت اپنے کاموں کے حلقہ کو وسیع کر رہی ہے، اور مسلم لٹریچر سوسائٹی کی بنیاد ڈالکر قرآن پاک اور صحیح بخاری کا ملیباری (ملیالم) میں ترجمہ کرا رہی ہے، اور اسی کی طرف سے قرآن پاک کی کوئی مفید تفسیر اس زبان میں شائع کرنا چاہتی ہے، اور مسلمانوں میں مذہبی اصلاحات کو فروغ دینے کے لئے ایک ماہوار رسالہ المرشد کی اشاعت کا بندوبست شروع کر دیا ہے، ملیباری مسلمانوں سے امید ہے، کہ وہ جمعیت کے ان مفید کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائیں گے،

ہمارے اردو رسالوں کی برادری میں شاید زمانہ کانپور سے زیادہ عمر رسیدہ کوئی دوسرا نہ ہو، یہ چونتیس ۳۴ برس سے منشی دیا نراین نگم کی اڈیٹری میں یکساں آب وتاب سے نکل رہا ہے، اردو ادب کا یہ دیرینہ خادم ہماری ہر طرح کی امداد کا مستحق ہے، آج ہمارے ملک میں صرف ہندو پانی اور مسلمان پانی کا فرق نہیں ہے، بلکہ انتہا ہے، کہ ادبیات میں بھی ہندو رسالہ اور مسلمان رسالہ کا فرق نمایاں ہو گیا ہے، ایسی حالت میں تنہا زمانہ ہی ایک ایسا رسالہ ہے، جس کے صفحات میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کے ادیب اور اہل قلم دوش بدوش ملتے ہیں،

سیرۃ النبیؐ جلد چہارم کا دوسرا چھوٹا اڈیشن چھپ کر تیار ہو گیا، چونکہ تقطیع چھوٹی کر دی گئی ہے، اس لئے نو سو صفحوں کی ضخامت ہو گئی ہے، جس کو اگر کوئی چاہے دو برابر جلدوں میں تقسیم کر کے مجلد کرا سکتا ہے، اس غرض کے لئے بیچ میں دوسرا ٹائیٹل بیج رکھدیا گیا ہے، اس جلد کی قیمت قسم اول کی ۵؎ اور قسم دوم کی ؎، مقرر ہوئی ہے، جن لوگوں نے

اسکی چھوٹی تقطیع کے انتظار میں اب تک اس کو نہیں خریدا امید ہے، کہ اس کو خرید کر مطالعہ فرمائینگے،

اسی کے ساتھ اس اعلان میں بھی ہم کو مسرت ہے، کہ سیرۃ النبیؐ کی پانچویں جلد جو عبادات واخلاق پر ہے، مطبع میں دے دی گئی ہے، سو صفحوں کے قریب اس کی کتابت ہو چکی ہے، اور پہلا چو ورقہ چھپ رہا ہے، اگر درمیان میں کوئی خاص مشکل پیش نہ آئی، تو امید ہے، کہ ۱۹۳۶ء میں وہ چھپ کر تیار ہو جائے گی،

موجودہ کساد بازاری میں شائقین پر دار المصنفین کی کتابوں کی پرانی قیمتیں بار ہو رہی ہیں، اس مشکل کو پیش نظر رکھ کر اس نے اپنی مطبوعات کی پرانی قیمتوں میں مناسب کمی کر دی ہے، اخباروں میں بھی اس کے اعلانات نکل رہے ہیں، نئی فہرست بھی تیار ہو گئی ہے، جو صاحب چاہیں یہ فہرست منگا سکتے ہیں،

لاہور کی مجلس ادارہ معارف اسلامیہ جس کا پہلا اجلاس دو سال ہوئے، اپریل ۱۹۳۳ء میں ہوا تھا، اب آئندہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں اپنا دوسرا اجلاس لاہور میں منعقد کرے گی، اس کا مقصد اسلامی علوم وفنون وتمدن کی تحقیق ہے، وقت ہے کہ مسلمان علمائے تحقیق مختلف اسلامی مسائل ومباحث پر محققانہ مقالات لکھ کر اس میں پیش کریں، یورپ میں اور خود ہندوستان میں اس قسم کی مجلسیں نہایت خوبی سے اپنا کام کر رہی ہیں، مسلمان اہلِ تحقیق کو بھی گرم جوشی اور مستعدی سے اس قسم کے خدمات بجا لانے کی ضرورت ہے، گذشتہ اجلاس کے مقالات کا مجموعہ مع رُوداد عنقریب شائع ہوگا، اس سلسلہ میں پروفیسر محمد اقبال، ایم، اے، پی، ایچ، ڈی اورینٹل کالج لاہور سے مراجعت کی جائے،

ریاست بڑودہ کے اورینٹل انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ہندی کی انجمنوں اور مجلسوں کی فہرست مع مختصر حالات اور نقشوں کے شائع ہوئی ہے، جس کا مقصد ہز ہائینس مہاراجہ بڑودہ کی اس خواہش کی کہ ہندوستان میں اس "عام ومشترک زبان" کی اشاعت کی ایک مختصر روداد مرتب کی جائے، تکمیل ہے، اس روداد کی بنا پر بہار اور اڑیسہ میں ۹، پنجاب میں،

۴، صوبہ ہائے متحدہ میں ۳۱، بنگال و آسام میں ۱۴، مدراس میں ۲۸، سنٹرل انڈیا میں ۱۴، اجمیر و راجپوتانہ میں ۱۱، میسور میں ایک اور صوبہ ہائے متوسطہ میں دو سبھائیں قائم ہیں، اس سلسلہ میں دار المصنفین کا نام دیکھ کر تعجب ہوا،

(معارف ماہ مارچ ۱۹۳۵ء)

(۴)

ہانکانگ (چین) میں مسلمانوں نے ایک اسلامی لٹریری سوسائٹی قائم کی ہے، جو مسلمانوں کے لئے اور خاص طور سے مسلمان بچوں کے لئے کتابیں اور رسالے انگریزی زبان میں شائع کرتی ہے، ابھی حال میں اس نے اڈیٹر معارف کے مضمون "رسول وحدت" کا انگریزی ترجمہ مستقل رسالہ کی صورت میں شائع کیا ہے، لکھائی، چھپائی اور کاغذ ہر چیز عمدہ ہے، اردو نہ جاننے والے انگریزی داں مسلمان محصول ڈاک بھیج کر یہ رسالہ دار المصنفین سے منگوا سکتے ہیں،

مذکورہ بالا سوسائٹی نے دار المصنفین سے اس کی خواہش کی ہے کہ وہ وہاں کے بچوں کے لئے انگریزی میں چند مذہبی اور اسلامی رسائل لکھدے، دار المصنفین نے اس کی یہ درخواست قبول کی ہے اور محمد عزیر صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی۔ رفیق دار المصنفین اسکے لئے اس قسم کے رسالے تیار کر رہے ہیں۔ وللہ الحمد۔

جاپان میں اشاعتِ اسلام کی جو نا معتبر افواہیں عربی اور اردو اخباروں میں شائع ہوتی ہیں، ان کے متعلق ایک شذرہ چند ماہ ہوئے کہ معارف میں لکھا گیا تھا، اب پروفیسر برلاس دہلوی نے ٹوکیو سے اس کا مفصل حال لکھ کر بھیجا ہے، جو آیندہ معارف میں شائع ہوگا، اس مضمون سے ان افواہوں کی پوری تنقید اور وہاں کی صورت حال کی پوری تفصیل معلوم ہوگی،

ملیبار کی جس مسلم لٹریچر سوسائٹی کا ذکر گذشتہ معارف میں آیا تھا، اور اس کو جمعیۃ العلماء کیرلا سے وابستہ بتایا گیا تھا، اب اس سوسائٹی کے ڈائرکٹر اور جمعیۃ دعوتِ تبلیغ اسلام مالابار کے جائنٹ سکریٹری کا خط آیا ہے، کہ سوسائٹی مذکور کو جمعیۃ العلماء کیرلا سے اس قدر تعلق ہے کہ

اس کے چند ارکان سوسائٹی میں بمعاوضہ کام کرتے ہیں ، ہمیں یہ سن کر خوشی ہوئی ، کہ جمعیۃ دعوت وتبلیغ جس کی اکثر شاخیں پیدا ہوچکیں ، اس کی مالاباری شاخ اب تک کام کر رہی ہے ، اس کا یتیم خانہ بھی اب تک اچھی حالت میں چل رہا ہے ، اور اسی جمعیۃ کے زیر سایہ مسلم لٹریچر سوسائٹی ترجمہ قرآن کا کام کر رہی ہے ، خدا اس کو کامیاب کرے ، اور مسلمانوں کو باہم مل کر کام کرنے کی توفیق بخشے ،

ہمارے کارکن افراد میں سب سے بڑی کمی اخلاص کی ہے ، یہ فقرہ جو استعمال کیا گیا ، یہ کوئی واعظانہ خیال آرائی اور ناصحانہ نکتہ فروشی نہیں ہے ، بلکہ یہ نفسیات شخصی اور نفسیات اجتماعی کی ایک ایسی حقیقت ہے ، جس کا انکار ناممکن ہے ، جب تک کوئی کام دل کے لگن سے پورے قوائے دماغی وجسمانی کے انہماک سے اغراض غیر سے ہر طرح بے نیاز ہو کر نہیں کیا جاتا ، اس کی پائیدار اور مستقل کامیابی کا یقین کبھی نہیں کیا جاسکتا ہے ، دنیا میں جب کوئی کام کیا گیا ہے ، اسی اصول پر کامیاب ہوا ہے ، اور آئندہ بھی اسی طرح کامیاب ہوگا ، صرف شہرت طلبی ، جاہ پرستی ، ناموری ، یا معاوضہ کی خاطر جو کام بھی ہوگا ، اس کی بنیاد ریت پر ہوگی ، جو سیلاب کا ایک دھکا اور آندھی کا ایک جھونکا بھی برداشت نہ کرسکے گی ،

اس حقیقت کو مذہبی اصطلاح میں یوں ادا کرتے ہیں ، کہ ہمارے ہر کام کی غرض رضائے الٰہی کے سوا کچھ اور نہ ہونی چاہیئے ، اسی لئے تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں یہ ہے ، کہ مخلصین لہ الدین ، دین کو اور کون سا کام دین نہیں ہے ، صرف خدا کے لئے ہونا چاہیئے ، اور جب ایسا ہوگا ، خود غرضوں کی خود غرضی ، حاسدوں کا حسد اور خود کام کرنے والوں کی خود مطلبی اس کو برباد نہ کرسکے گی ،

ملک میں تعلیمی انقلاب کا جو شور ہر طرف سے بلند ہے ، اس نے آخر حکومت کو بھی اپنی طرف جھکا لیا ، چنانچہ ہمارے صوبہ میں نظام کے انقلاب اور تغیر کا مسئلہ زیر غور ہے ، سنا جاتا ہے کہ درجہ ہشتم تک عام و مشترک مضامین کی ، پھر چند سال تک مختلف صنعتوں میں تعلیم ہو گی ، اور اس کے بعد صرف وہ طالب علم جن کی غرض حصول علم اور اعلیٰ تعلیم ہو گی ، کالجوں میں داخل ہوں گے ، انقلاب تعلیم کا یہ سرسری خاکہ بظاہر ضروریات ملکی کے مطابق معلوم ہوتا ہے ، بشرطیکہ اس کو نیک نیتی کے ساتھ کیا جائے ، ورنہ یہ سمجھا جائے گا ، کہ حکومت نے بے روزگاری کے مسئلہ کا یہ حل نکالا ہے ، کہ تعلیم یافتوں کی تعداد کو کم کر دیا جائے ، پھر طلبہ کو تنہا صنعتوں کی تعلیم دلانا بھی بیکار ہو گا ، اگر صنعتوں کے کارخانے بھی حکومت قائم نہ کر سکے ، صرف سالہائے تعلیم کا تغیر اور مضامین کا گھٹانا بڑھانا اصلاح نہیں ،

ہماری قدیم تعلیمی مجلس مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس پچھلے مہینہ آگرہ میں ہوا ، اور مختلف تعلیمی ضروریات پر گفتگوئیں ہوئیں ، اور تجویزیں پاس ہوئیں ، ہمارے پرانے ماہر تعلیم ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب اس جلسہ کے صدر تھے ، موصوف خود بھی ملک کے موجودہ نظام تعلیم کے سخت مخالف ہیں ، اس لئے پہلے سے یہ توقع تھی ، کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ کو اپنے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کی بنا پر بیان کریں گے ، چنانچہ گو ان کا خطبۂ صدارت مختصر ہے ، مگر پر معنی ہے ،

انہوں نے سچ کہا کہ سرسید کے مقاصد والی ایجوکیشنل کانفرنس کا زمانہ ختم ہو گیا ، اور اب نئے حالات اور نئے دورِ خیالات میں ہماری کانفرنس کو اپنے طریق عمل اور نصب العین دونوں میں تبدیل و تغیر کی ضرورت ہے ، اسی لئے انہوں نے آئندہ اس کانفرنس کے لئے حسب ذیل تین شعبے تجویز کئے ، مسلمانوں کی بیکاری دور کرنے کا شعبہ ، دوسرا دیہاتی ترقی کی تجویز کو عمل میں لانے والا شعبہ ، اور تیسرا کونسل اور اسمبلی کے ممبروں سے تعلقات پیدا کر کے کانفرنس کی تجاویز کو منظور کرانے والا . کیونکہ اب تجاویز کو منظور کر کے سرکاری دفتروں

میں بھجوا دینا بے معنی ہے ،

ہمارے خیال میں اس وقت سب سے اہم چیز دیہاتی تعلیم و ترقی میں مسلمانوں کے حصہ کا مسئلہ ہے ، ہندوؤں نے گاندھی جی کے حسبِ منشاء اس کے لئے عمل شروع کر دیا ہے ، اور چندے جمع ہو رہے ہیں ، دوسری طرف حکومت بھی اس بازی کو ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتی ، اور ایک کروڑ روپیہ اس کام کے لئے منظور کر چکی ہے ، لیکن مسلمانوں کی محفلوں میں عملاً اب تک اس کی بھنک بھی نہیں پہونچی ہے ، اگر ایجوکیشنل کانفرنس اس کام کو مستعدی سے اپنے ہاتھ میں لے تو بڑا کام کرے گی ،

(معارف ماہ اپریل ۱۹۳۵ء)

(۵)

جو لوگ مشرق سے مشرقی علوم کی تکمیل کے لئے یورپ کی درسگاہوں میں جاتے ہیں ، اکثر دیکھا گیا ہے ، کہ وہ وہاں سے اس قدر مرعوب ہو کر واپس آتے ہیں ، کہ وہ ہمیشہ بے تحقیق وہاں کی تحقیقات اور نتائج تحقیقات کو علمی تحقیق کی اخیر حد سمجھتے ہیں ، اور عمر بھر انکی تقلید و نقالی کرتے رہتے ہیں ، تقلید محض اور بزرگوں کے ساتھ حسن ظن اگر اچھی چیز ہے ، تو اس میں مشرق و مغرب کا فرق کیا ہے ، اور اگر بُری چیز ہے ، تو ائمۂ مشرق کی تقلید جتنی بُری ہے ، کم از کم اتنی ہی اساتذۂ مغرب کی کورانہ تقلید بھی بری ہونی چاہیئے ،

مولانا مرحوم نے اپنے علماء کی تقلید جامد اور پرانی کتابوں پر ان کے جمود کو ان شعروں میں برا کہا تھا ، اور سچ کہا تھا ،

نہ قانون میں ان کی کوئی خطا ہے ⁘ نہ مخزن میں انگشت رکھنے کی جا ہے
سدیدی میں جو کچھ لکھا ہے بجا ہے ⁘ نفیسی کے ہر قول پر جاں فدا ہے

اگر کتابوں کے نام بدل کر آج کل کی مغربی تصنیفات کے نام رکھدیئے جائیں ، تو

بعینہ یہی طعن ابنائے عصر پر بھی صادق آسکتا ہے،

اسی ماحول میں اگر کبھی کوئی استثنائی مثال سامنے آجاتی ہے، تو بے انتہا اس کی قدر ہوتی ہے، جامعہ عثمانیہ کے ایک فاضل سند یافتہ محمد حمید اللہ صاحب نے جامعہ مذکور سے علوم مشرقی میں ایم، اے کر کے یورپ کی درسگاہوں کا سفر کیا، اور شام وفلسطین ومصر وٹرکی سے گذرتے ہوئے اٹلی، ہالینڈ، انگلینڈ، فرانس، اور جرمنی میں تعلیم کے اوقات گذارے، بون یونیورسٹی (جرمنی) سے پی، ایچ، ڈی، کی اور پیرس سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی، اور سب سے بڑی سعادت یہ پائی، کہ اس سفر کا آغاز حجاز سے کیا، اور مدینہ منورہ سے دماغی اور قلبی دونوں قسموں کے فیض حاصل کئے، پھر یورپ جاکر بھی وہ مسلمان رہے، اور مسلمان واپس آئے،

بون یونیورسٹی میں ان کے مقالہ کا موضوع " اسلامی قانون بین الممالک" اور پیرس میں" اسلامی سیاست خارجہ عہدِ نبویؐ اور عہد راشدہؓ میں" تھا، ان کا یہ دوسرا مقالہ پیرس کے ایک پبلشر نے چھاپ کر شائع کیا ہے، اس کتاب کے باب ششم فصل دُوم میں" مکتوب نبوی بنام ہرقل" پر بحث کی ہے، اور اس بارے میں یورپین مستشرقین کے اعتراضات وشکوک کا جواب دیا ہے، عنقریب یہ حصہ معارف میں شائع ہوگا، اصل کتاب جو فرنچ میں ہے، ہندوستان میں جبیب اینڈ کو، اسٹیشن روڈ، حیدرآباد دکن سے ملے گی،

ابتدائی مسلمان محققین کیمیا میں جابر بن حیان کو جو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا شاگرد کہا جاتا ہے، بہت کچھ اہمیت حاصل ہے، گو اس کی تاریخی شخصیت شروع ہی سے معرض بحث میں رہی ہے، تاہم اتنا مسلم ہے، کہ اس کے نام سے فن کیمیا پر عربی میں چھوٹے چھوٹے بہت سے رسالے ملتے ہیں، اور ان میں بعض کے لاطینی ترجمے بھی دستیاب . . . ہوتے ہیں، ۱۸۹۱ء میں مرزا محمد شیرازی نے بمبئی سے اس کے گیارہ رسالے پتھر پر چھاپے تھے، ۱۹۲۸ء میں پیرس سے ای، جے، ہالمائرڈ (HALMYAIRD) ہیڈ آف دی

سائنس ڈیپارٹمنٹ کلفٹن کالج، برسٹل نے انہی گیارہوں رسالوں کو ٹائپ میں چھپوایا، اور اسکی دوسری جلد ان کے انگریزی ترجمہ اور مقدمہ وحواشی کو قرار دیا،

اب اطلاع آئی ہے، کہ پیرس یونیورسٹی کے معلم فلسفۂ اسلامیہ ڈاکٹر پاؤل کراس جابر کے چھ غیر مطبوعہ رسالے مصر، قسطنطنیہ اور یورپ کے قلمی نسخوں سے مقابلہ کرکے چھاپ رہے ہیں، ان میں بعض ان اہم یونانی رسالوں کے اقتباسات بھی ہیں، جن کی یونانی اصل آج مفقود ہے، یہ مجموعہ چھ سو صفحوں میں تمام ہوگا، اور امید ہے، کہ ستمبر ۳۵ء تک شائع ہو جائے جو اصحاب پیشگی قیمت بھیجیں گے، ان کو مع محصول ڈاک ستر فرینک میں ملے گا، ہندوستان میں حبیب اینڈ کو اسٹیشن روڈ حیدرآباد کو چودہ روپئے بھیج کر نام رجسٹرڈ کرائے جاسکتے ہیں،

حافظ ابن کثیر کی مشہور تاریخی تصنیف کا نام کتاب البدایہ والنہایہ ہے، جس کی سیر کا حصہ خاص طور سے اس لئے اہم ہے، کہ اس میں مغازی ابن اسحاق، مغازی موسیٰ ابن عقبہ، وغیرہ کے اقتباسات اور کتب حدیث کے وقائع سیر شامل ہیں، حضرت الاستاذ علامہ شبلی مرحوم نے جب سیرۃ کی تالیف کا آغاز کیا، تو حسرت کے ساتھ وہ دو کتابوں کا نام لیتے تھے، اور ان کے نہ ملنے پر افسوس کرتے تھے، ایک سیرت شامی اور دوسری یہی کتاب البدایہ والنہایہ، اب دیکھئے کہ وہی نادر روزگار کتابیں بازاروں میں آکر فروخت ہورہی ہیں، کتاب البدایہ کی چار جلدیں مصر میں چھپ کر شائع ہوچکی ہیں، اور بقیہ جلدیں زیر طبع ہیں،

صحیح بخاری کی شرح فتح الباری لابن حجر المتوفی ۸۵۲ھ نے گو بخاری کی قدیم شروح پر خطِ نسخ پھیر دیا ہے، تاہم قدماء کی ہر تصنیف اپنے ماخذ کے لحاظ سے قابل قدر ہے، صحیح بخاری کی دو شرحیں زرکشی اور کرمانی بہت مشہور ہیں، پہلی بدرالدین زرکشی مصری المتوفی ۷۹۴ھ کی ہے، اس کا نام التنقیح لالفاظ الجامع الصحیح ہے، یہ ۱۲ جلدوں میں تمام ہوگی، جن میں سے پانچ چھپ چکی ہیں اور ان کی قیمت سات روپے تیرہ آنے ہے، اور دوسرے شمس الدین کرمانی المتوفی ۷۸۶ھ کی ہے، اور اس کا نام الکواکب الدراری ہے، یہ تقریباً ۲۲ جلدوں میں ہوگی،

جن میں سے دس جلدیں چھپ چکی ہیں، اور ان مطبوعہ اجزار کی قیمت چودہ روپئے ایک آنہ ہے، اس میں صحیح بخاری کا خوشخط با اعراب متن چند سطروں میں اوپر ہے، اور نیچے شرح ہے، ابنائے غلام رسول سورتی جاملی محلہ بمبئی نمبر ۳۳ سے ہندوستان میں ملے گی،

دار المصنفین کی تصنیفات میں ارض القرآن مشہور کتاب ہے، مدت سے اصحاب کا تقاضا تھا، کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو، کتاب کی اشاعت پر بیس برس گذر چلے تھے، اور اس اثنا میں معلومات بہت کچھ بڑھ گئے ہیں اسلئے کتاب کے نئے نسخہ کی تیاری کا موقعہ نہ تھا، ناظرین کو یہ سن کر خوشی ہوگی، کہ مولوی سید مظفر الدین صاحب ندوی ایم، اے پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا، اور معلومات میں اضافہ اور انگریزی کے لحاظ سے تغیر کیا، اور اب وہ تین جلدوں میں ہو کر کلکتہ میں زیر طبع ہے، ہر جلد غالباً ڈھائی سو صفحوں پر مشتمل ہوگی،

(معارف ماہ مئی سنہ ۱۹۳۵ء)

(۶)

اس وقت ملک کی دو زبانیں ہندی اور ہندوستانی (اردو) ملک کی عمومی زبان بننے کے لئے ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوششیں کر رہی ہیں، جہاں تک ہندی کا تعلق اس میں شک نہیں، کہ وہ اپنے حامیوں کی انتھک کوششوں کی ممنون ہے، ایک زبان جو صرف چند مذہبی کتابوں میں تھی، انگریز دور اندیشوں کی قوت فکر سے وہ کلکتہ کے فورٹ ولیم میں سب سے پہلی دفعہ ہندوستانی کے بالمقابل رکھ کر ملک کی دوسری زبان کی حیثیت سے رواج پائی اور کچھ دنوں کے بعد وہ دونوں مسلمان اور ہندو کی الگ الگ زبان کی حیثیت سے باہم حریف پہلوانوں کی صورت میں نظر آنے لگیں، پھر صوبہائے متحدہ کے انگریز حاکموں اور ہندو کارکنوں کی کوششوں نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ وہی زبان جس کے جاننے والے اور پڑھنے والے اس صوبہ سے باہر نہ تھے، وہ اب پورے ملک کی زبان بننے کا دعویٰ کر رہی ہے، اس کی اشاعت کی

مرکزی انجمنیں ہیں، صوبہ صوبہ میں اس کی شاخیں ہیں، اہلِ دولت اس کی مدد کر رہے ہیں، اور اہلِ قلم اس کو پھیلا رہے ہیں، اب ایک طرف وہ کشمیر، دوسری طرف راجپوتانہ تیسری طرف بڑودہ گجرات، اور چوتھی طرف مدراس میں اپنے قدم جما رہی ہے، اور ہندو ریاستیں اس کی سرپرستی میں نمایاں حصہ لے رہی ہیں،

اس کے بالمقابل ہندوستانی (اردو) کے لئے اس کے حامی کچھ نہیں کر رہے ہیں، نہ اس کے لئے تبلیغی انجمنیں ہیں، نہ اس کی اشاعت کے لئے صوبہ صوبہ میں شاخیں ہیں، نہ اس مقصد پر کسی صوبہ میں ایک پیسہ کوئی خرچ کر رہا ہے، اور نہ حیدر آباد دکن کے سوا کوئی اسلامی ریاست اس کے لئے کچھ کر رہی ہے، نہ ان صوبوں میں جہاں وہ مادری زبان نہیں اسکے سکھانے اور پڑھانے کے لئے اعزازی یا تنخواہ یاب معلم ہندی کی طرح دورے کر رہے ہیں، تاہم یہ واقعہ ہے، کہ وہ لوگوں کی ضرورت کے مطابق ہونے کے سبب سے ہندوستان کے ہر صوبہ میں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی پھیلتی جا رہی ہے، اور یہی چیز ہے جو اس کی زندگی کی ضامن اور اسکی یقینی کامیابی کی کفیل ہے،

سرکار دکن اس زبان کے لئے جو کچھ کر رہی ہے، اس کا سبب یہ نہیں ہے، کہ یہ مسلمانونکی زبان ہے، بلکہ اس لئے یہ کر رہی ہے، کہ وہ ایسی مملکت پر حکمران ہے، جہاں پہلے بھی بکثرت چھوٹی چھوٹی مقامی بولیاں رائج تھیں، اور اب بھی ہیں، ان مختلف بولیوں والی سرزمین کو ایک واحد مملکت کی صورت میں بدلنا جس کی ہر سلطنت کو اپنے قیام اور بقا کے لئے ضرورت ہے، نہ تو وہاں کے مذاہب اور فرقوں کو زبردستی ایک کر دینے سے ہو سکتا ہے، نہ تمدن اور معاشر کی یکسانی اس کو ایک کر سکتی ہے، نہ تمام قوموں کو ایک قوم کی صورت میں بدل دیا جاسکتا ہے، اس لئے سب سے آسان، سب سے کم خرچ اور سب سے بے ضرر جو صورت ہے، وہ یہی ہے کہ کم از کم پوری مملکت کی ایک تعلیمی و سرکاری زبان ہو، جس میں اس ملک کا سرمایہ بھی محفوظ رہے،

ہندوستانی زبان وہاں کوئی بیرونی زبان نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسی زبان ہے، جو وہاں کی مختلف بولیوں کے سبب سے وہیں بتقاضائے بشری بڑھی، پھیلی، اور علمی وادبی قالب میں ڈھلی، اور دکھنی کہلائی، اس لئے یہ ایک ایسی زبان ہے، جس کو اس ملک دکن سے خاص تعلق ہے، بلکہ بزرگوں کے بقول یہ سمجھنا چاہیئے، کہ یہ دہیں کی پیداوار ہے، اور وہیں سے دوسرے صوبوں اور ملکوں میں اس کی ادبی وعلمی حیثیت قابلِ قبول ہوئی، اور اسی لئے سرکار دکن پر اس کی قدردانی فرض اور اس کی ترقی کی کوشش واجب ہے، اور اسی لئے وہ اپنے اسی قدیم فرض کو ہمیشہ کی طرح آج بھی انجام دے رہی ہے،

ہندی نہ تو اندور کی زبان ہے، نہ کشمیر کی، نہ بڑودہ کی، نہ گوالیار کی، نہ مدراس کی، یہ ایک خاص صوبہ کی شاعری کی قدیم زبان تھی، جس کو پورے ملک کی عام زبان بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جارہا ہے اور اب دیہاتی اور تحصیلی مکتبوں، اور اسکولوں سے لے کر یونیورسٹی تک میں اس کے لئے کوششیں کی جارہی ہیں، اور اس طرح ملک میں دو مختلف زبانیں پیدا کرکے آئندہ کے لئے ہندوستان میں دو ایسی مختلف قومیں بنائی جارہی ہیں جنمیں باہم ملنے جلنے، سمجھنے، بوجھنے اور بولنے چالنے کا بھی وہ موقع نہ ہوگا، جو آج اس وقت بھی باقی ہے، اور اس طرح کہا جاسکتا ہے، کہ فورٹ ولیم کلکتہ میں جو بیج لگایا گیا تھا، اب وہ پورا اتنا ور درخت بن جانے والا ہے،

(معارف ماہ جون ۱۹۳۵ء)

(۷)

لکھنؤ سے سچ کے نام سے ہمارے دوست مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ایک ہفتہ وار مذہبی اخبار نکالا کرتے تھے، جو اپنے خاص رنگ میں ہر طرح ممتاز تھا، ایک سال ہوا، کہ قرآن پاک کے انگریزی ترجمہ کی مشغولیت کے سبب سے اس کو بند کردیا تھا، اب چند ہفتوں سے

انہوں نے صدق کے نام سے دوسرا اخبار نکالا ہے، جو روح و قالب اور صورت و سیرت دونوں کے لحاظ سے پہلے اخبار کا مرادف ہے، ضرورت ہے، کہ اہلِ ذوق اس کی پوری قدر کریں، اور ان کے رشحاتِ قلم سے سیراب ہوں، قیمت تین روپے سالانہ ہے، اور پتہ منیجر صدق لکھنؤ ہے،

بدرالدین چینی صاحب جو چین سے ہندوستان تحصیلِ علم کے لئے آئے تھے، اور جامعہ میں انگریزی اور ندوہ میں عربی حاصل کی، اور یہاں سے فارغ ہو کر وہ عربی زبان کی تکمیل کے لئے گذشتہ رمضان میں مصر کے جامع ازہر میں گئے تھے، اپنے ایک مکتوب میں مصر کی تعلیمی و مذہبی حالت کے متعلق اپنے حسبِ ذیل تاثرات لکھتے ہیں،

> مصر گو علوم عربی و اسلامی کا مرکز ہے، مگر نوجوانوں کے دلوں میں حرارت اسلام بہت کم ہے، یہاں کی زندگی یورپ کی زندگی سے کم نہیں، جو کچھ مظاہرے ہیں، وہ یورپی ہی یورپی نظر آتے ہیں، اور جن لوگوں میں تفریح (یورپ والی) کا رجحان کم ہے، وہ اس امید میں بیٹھے ہیں، کہ جاپان فوراً اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائے، تاکہ ان کی کشتی میں بیٹھ کر امن و سلامتی کے ساحل پر پہنچ جائے، اور ممالک اسلام کے تمام امور ان کی حفاظت میں چھوڑ دیئے جائیں، اور خود امن اور چین کی زندگی بسر کریں،

جب میں ۱۹۲۳ء میں مصر گیا تھا، تو وہاں کے سابق شیخ الازہر علامہ ابو الفضل نے مجھ سے پوچھا تھا، کہ ہندوستان کے علماء کے گذر اوقات کی کیا صورت ہے، المنار کے اڈیٹر شیخ رشید رضا جو میرے ساتھ تھے، اور ہندوستان آچکے تھے، سبقت کر کے بولے کہ ہندوستان کے علماء بڑے قناعت پسند ہیں، چند روپیوں کی تنخواہ میں گذر کر لیتے ہیں،

یں نے گذارش کی، کہ مصر دیکھنے سے پہلے تو میں ہندوستانی علماء کو بدقسمت سمجھتا تھا، کہ وہ کسی اسلامی سلطنت کی سرپرستی سے محروم ہیں، اور اس کے لئے کس مپرسی میں ہیں، لیکن مصر کو دیکھ کر معلوم ہوا، کہ خدا کی مصلحت اس میں تھی، مصر کے علماء جو سلطنت اور محکمۂ اوقاف سے شاہانہ تنخواہیں پاتے ہیں، چین کی نیند سوتے ہیں، اور امیرانہ ٹھاٹھ رکھتے ہیں، (اسوقت ہم لوگ شیخ کے ہاں مدعو تھے، میز و کرسی پر کھانا تھا، اور طلائی و نقرئی برتن اور چھری کانٹے میز کی زینت تھے)

مصر کی دولت مصر کی افیون ہے، اور اس افیون میں علماء اور تعلیم یافتہ سب مدہوش ہیں، جاگیریں ہیں، جائدادیں ہیں، بیش قرار تنخواہیں ہیں، اس حالت میں دین وملت کا خیال کس کو آئے، اور کیونکر آئے، خدا سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہٗ، اور سید اور رشید رضا کو جزائے خیر دے، جن کے بدولت وہاں امید کا چراغ روشن ہے، ورنہ ازہر اور ازہری تو اپنا اثر کھو چکے، قدیم وہاں سے جا چکا، اور جدید وہاں آیا نہیں،

عباسی عہد کا ایک مشہور عربی شاعر بشار بن برد ہے، اس کا دیوان اب تک چھپا نہ تھا، اس کے دیوان کا ایک نہایت عمدہ اور قدیم نسخہ کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد دکن میں تھا، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے ایک معلم عربی مولانا بدرالدین صاحب علوی نے جو عربی زبان کے ممتاز ادیب بھی ہیں، بڑی محنت سے اس نسخہ کی تصحیح و مقابلہ اور تحشیہ کیا ہے، اور مصر کی مجلس ترجمہ و تالیف نے اس کو اپنی طرف سے چھاپا ہے، موصوف اب ابن درید کا کلام جمع کر رہے ہیں، موصوف گو بوڑھے ہو چکے ہیں، مگر اپنی ہمت سے جوانوں کو شرماتے ہیں،

تاریخ ہند کے سلسلہ میں جس کا کام شروع کر دیا گیا ہے، شیخ عبدالعزیز صاحب دھولیا صوبہ خاندیس سے مطلع کرتے ہیں،

> اس شہر دھولیا میں ہندوؤں نے "راجوڑے شنوشو
> بدن مندھر" قائم کیا ہے، جس کی غرض وغایت یہ ہے، کہ

> "مہاراشٹر مدھر" قائم کیا جائے، جس کی غرض وغایت یہ ہو، کہ مہاراشٹر کے تاریخی معلومات بہم پہنچائے جائیں، اس غرض سے انہوں نے بہت قلمی کتابیں اور راجاؤں کے فرمان جمع کئے ہیں، اس سلسلہ میں انہوں نے مغل بادشاہوں اور بیجاپور کے سلاطین کے قریب قریب ایک ہزار فرامین فارسی کے اور پندرہ بیس قلمی تاریخی کتابیں مہیا کی ہیں، راجوڑے نامی ایک شخص پونہ کا باشندہ تھا، اس نے مہاراشٹر کے تاریخی معلومات بہم پہونچانے کے لئے بیس پچیس سال کی کدوکاوش سے بہت کچھ قلمی کتابیں اور فرمان جمع کئے تھے، وہ دھولیا میں اسی غرض سے آیا تھا، اور یہاں اتفاقاً مرگیا، اسی کی یادگار میں ہندوؤں نے "راجوڑے سونشو ہدن مندھر" قائم کیا ہے،

مردوں کی یادگار تو الگ رہی، ہمارے مسلمان زندوں کی پکار بھی سنتے ہیں، تاریخ ہند کا چرچا کچھ دنوں ہم لوگوں میں رہا، اور اس کو یونہی چھوڑ دیا جائے، تو ہماری قوم کی دوسری ہزاروں مفید تحریکات کے مدفن میں یہ بھی دفن ہوجائے، مگر عزم یہ ہے، کہ انشاءاللہ دارالمصنفین کے اندر یہ کام انجام پاکر رہے گا،

یورپ میں دستور ہے، کہ اکابر علم کے علمی خدمات کی قدرشناسی میں ان کے نام پر ان کے مذاق کے علمی تحقیقی مقالات کا مجموعہ جو مختلف اہلِ قلم کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں نذر کیا جاتا ہے، اسی کی تقلید میں اکثر پنجاب کے اور بعض ہندوستان کے اہلِ علم یہ چاہتے ہیں، کہ اردو کے مشہور محقق حافظ محمود خان شیرانی پروفیسر اردو پنجاب یونیورسٹی کے خدمات کے اعتراف میں اردو وفارسی ادبیات کے مختلف عنوانات پر اہل علم کے مقالات کا

ایک قابلِ قدر مجموعہ شائع کریں، امید ہے، کہ اکتوبر تک اس کی ترتیب عمل میں آئے،

(معارف ماہ جولائی ۱۹۳۵ء)

(۸)

اخبارات کی زبانی ناظرین تک یہ خبر پہنچی ہوگی، کہ ہماری زبان کے پرانے ادیب اور مسلمان لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کے مشہور مبلغ مولوی سید ممتاز علی صاحب مہتمم تہذیب نسواں لاہور نے وفات پائی، مرحوم کا وطن دیو بند تھا، عربی کی تعلیم پائی تھی، اور ساتھ ہی جدید تعلیم سے بھی بہرور تھے، اس زمانہ میں سر سید مرحوم کی تحریک کا شباب تھا، اس شمع کے گرد جو پروانے جمع ہوگئے تھے، ان میں ایک یہ بھی تھے، مسلمانوں میں وہ پہلے شخص تھے، جس نے تعلیم نسواں کی تبلیغ کی، اور اس تبلیغ میں ان کو کامیابی ہوئی، وفات کے وقت کا سن ستر کے قریب ہوگا، ابھی اسی سال کی اخیر جنوری میں لاہور میں ملاقات ہوئی تھی، وہ زار ونزار اور حبس بول کی شکایت میں مبتلا تھے، آخر وہ اس تکلیف سے جان بر نہ ہوسکے، اور چل بسے اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے، نہایت خوش خلق اور مرنج دوجاں بزرگ تھے،

یکم جولائی ۳۵ء سے خاکسار ایڈیٹر سفر میں ہے، چند روز راہ میں بھوپال ٹھہرا، اور اب ۸؍ جولائی سے حیدرآباد دکن میں قیام ہے، اور شاید اس پرچہ کے آپ کے ہاتھوں میں پہنچنے تک اعظم گڈھ کو واپسی ہو، وجہ سفر حیدرآباد میں فقہ کے قانون قتل و قصاص کی ترتیب و تدوین کی مجلس میں شرکت ہے، مجلس مذکور کے اجلاس متواتر ہو رہے ہیں، اور شاید دو ہفتوں تک اور رہوں،

اس سفر کے علمی فوائد ان شاء اللہ واپسی کے بعد آپ تک بھی پہنچیں گے، ریاست بھوپال کا سرکاری کتب خانہ جس کا نام کتب خانۂ حمیدیہ ہے، چند برسوں میں بہت کچھ بڑھ گیا ہے، اسی طرح حیدرآباد کے علمی خزانوں میں پہلے سے بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے،

جامعہ عثمانیہ کے شہر کے باہر بن جانے سے کہنا چاہیئے کہ ایک نیا مدینۃ العلم آباد ہو رہا ہے، سرکار آصفیہ جس فیاضی سے اس کی تعمیرات پر خرچ کر رہی ہے، اس کی مثال تاریخوں میں بھی نہیں مل سکتی، اور ہماری زبان کو اس سرکار دولت مدار کی ان کوششوں سے وہ استواری مل رہی ہے، جس کو ان شاء اللہ حوادث کا طوفان بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے گا،

جاپان کے اسکول آف فارن لینگوئجز (مدرسۃ السنہ خارجیہ) کے ہندوستانی پروفیسر نور الحسن برلاس صاحب اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۶؍ جون ۳۵ء میں لکھتے ہیں،

> معارف جاری کرنے کا تہِ دل سے شکریہ عرض ہے، پروفیسر گاموہ ہندوستانی زبانوں کے جاپانی پروفیسر اسے دیکھ کر بہت محفوظ ہوئے، انہیں اسلامی تمدن کی تحقیقات کا بڑا شوق ہے آپ کی اور علامہ شبلی کی تصنیفات سے بہت استفادہ کرتے ہیں، جاپانی زبان میں مضمون بھی لکھتے رہتے ہیں

اس اقتباس سے معلوم ہوگا، کہ ہماری ہندوستانی زبان مشرق اقصیٰ کے کناروں تک پہونچ چکی ہے،

ہندوستان کی اس عالمگیر اور وسیع زبان کا غلط نام اردو ایسا مشہور گیاہے، کہ لوگ مذہبی اصطلاحات کی طرح اس کو پکڑے ہوئے ہیں، حالانکہ اس لفظ کے اندر اس زبان کی پیدائش کی بالکل غلط تاریخ پوشیدہ ہے، عموماً ہر زبان کا نام اس زبان کے ملک یا قوم کی ہمنامی سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے ہندوستان کی اس عام اور مشترک زبان کا صحیح نام ہندوستانی ہو سکتا ہے، اور یہ وہ نام ہے، جو کم از کم تین چار سو برس سے اس زبان کا رکھا گیا ہے،

اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد میں مغل دربار یا قلعہ کی آبادی کا نام تھا، شروع شروع اس کا نام "زبان اردوئے معلیٰ" یعنی دلی کے شاہی قلعہ کی زبان مشہور رہا، اور استعمال کی کثرت سے انگریزی عہد میں اردو یعنی شاہی قلعہ اس زبان کا نام قرار دیا گیا، جو سراسر غلط اور

بے اصل ہے، اور گویا یہ کہنا ہے، کہ یہ دہلی کے شاہی قلعہ کی زبان تھی، جو سارے ہندوستان میں پھیلا دی گئی، حالانکہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے،

اس زبان کا ابتدائی نام ہندی یا ہندوستانی اور زبان ہندوستان تھا، ہمارے ہم وطنوں نے ہندی کو اپنی ایک خاص زبان اور ہم خط کے معنوں میں لے کر ایسا مشہور کر دیا، کہ یہ نام اس کے لئے خاص ہوگیا، اب دوسرا نام ہندوستان باقی ہے، اگر اردو کو چھوڑ کر اس کے اصلی اور قدیم نام کو زبان زد اور عام نہیں کیا گیا، تو

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر

مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

پچھلے سال اس مسئلہ پر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ایک مقالہ "ہندوستان میں ہندوستانی" کے عنوان سے پڑھا تھا، اس دفعہ اس موضوع پر جامعہ عثمانیہ کے یونین ہال میں ایک مفصل تقریر کی، تاکہ شمالی و جنوب کی دونوں یونیورسٹیوں کے سامنے اس نام کی اہمیت نمایاں ہو جائے ضرورت ہے، کہ ہمارے اخبارات اور رسالے جن میں بے عمل معارف بھی داخل ہے، آئندہ سے اردو کے بجائے ہندوستانی کو رواج دیں،

ہندوستان کی اسلامی ریاستوں میں عورتوں کے حقوق کی اصلاح و تعیین اور انکے حقوق کے تحفظ کے لئے عدالتی قوانین کے وضع کرنے کا میلان بڑھتا جاتا ہے، اس راہ میں سب سے پہلا قدم اعلیحضرت رفعت مآب نواب بھوپال خلد اللہ ملکہ، نے اٹھایا، اور قانون فقہی کے مختصر دفعات جو اس زمانہ کے لئے موزوں ہوسکتے تھے، علماء کے شورہ سے وضع کر کے نافذ فرمائے، اس کے بعد ریاست جاروہ نے اسی قسم کی کوشش کی، جس کی تفصیلی اطلاع بجز ایک استفتا کے ہم تک نہیں پہونچی، اب یہی تحریک سلطنت آصفیہ کی مجلس قانونی میں پیش ہے مجلس مذکور کے ایک مسلمان ممبر نے ایک مسودہ تیار کیا ہے، جو استصواب کی غرض سے عام طور سے شائع کیا گیا ہے، اور وہاں کے علمار کی مجلس نے کسی قدر ترمیم کے ساتھ اپنا دوسرا

مسودہ تیار کیا ہے، لیکن ہنوز علماء عام طور سے اس دوسرے مسودہ کی تائید میں بھی نہیں ہیں، ہم ابھی حنفی اور شافعی اور مالکی کی جنگ میں مبتلا ہیں، اور زمانہ سرے سے فقہ اسلامی کی ضرورت سے منکر ہونے پر تل رہا ہے،

جنگِ عظیم کے بعد سے اہل حجاز اور خصوصاً ساکنین مدینہ منورہ جس فقر وفاقہ میں مبتلا ہو گئے ہیں، ان کی طرف دنیائے اسلام نے اب تک جیسی توجہ چاہیئے تھی نہیں کی۔ ملک حجاز ظاہر ہے کہ ایک بے آب وگیاہ ملک ہے، لیکن مدینہ منورہ اور آس پاس کی زمینیں سرسبز وشاداب ہیں، مگر واقعہ یہ ہے، کہ سلاطین اسلام نے ان کی خدمت مشائخ زادوں کی طرح کی ہے، ان سلاطین کی نیک نیتی اور جذبۂ ایمانی میں شک نہیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ کما کر کھانے کی قوت اس سے زایل ہو گئی،

اب زمانہ کے انقلاب سے نہ وہ سلاطین اسلام باقی ہیں، نہ ان کے اوقات کا پتہ ہے، ہندوستان، عراق، شام، روم مغرب جہاں بھی حرمین محترمین کی خدمت کے لئے اوقاف تھے، وہ غیر اسلامی سلطنتوں کے قبضہ میں چلے گئے، اور بند ہو گئے، لے دے کر مصر میں اوقاف باقی ہیں، مگر وہ قومیاتی سیاسیات کے چکر میں پڑ گئے ہیں، کسی سال غلہ چلا جاتا ہے، کسی سال بند ہو جاتا ہے،

حیدر آباد بھی ایک اسلامی سلطنت ہے، یہ بھی اپنے مقدور بھر اہلِ حجاز کی خدمت بجا لاتی ہے، لیکن جو چیز زیادہ تسکین دہ ہے، وہ یہ ہے، کہ یہاں متعدد اعلیٰ منصب داروں نے حجاز کی امداد کے لئے چند غیر سرکاری مجلسیں قائم کی ہیں، جن میں یہ مشترک مقصد بھی شامل ہے، کہ حرمین محترمین میں ایسے کارخانے اور صنعت گاہیں قائم کی جائیں، جن میں حجاز کے ناداروں کو کام میں لگا دیا جائے، اور ان کو اس محنت اور مزدوری کے ذریعہ سے فائدہ پہنچایا جائے، ہمارے خیال میں اہلِ حجاز کی یہ بہترین صورت ہے، کیا اچھا ہو، کہ یہ کل کام کرنیوالے مل کر کام کریں، اور ساتھ ہی ہندوستان دوسرے شہروں میں بھی اس غرض کے لئے کچھ اشخاص

کھڑے ہوں یا معتبر انجمنیں قائم ہوں ،

ایک زمانہ تھا کہ علمائے اسلام باوجود سفر کی دقتوں اور ذرائع اطلاع کی مشکلوں کے اس طرح باہم ایک دوسرے کے فضل و کمال سے آشنا تھے ، کہ مشرق کا عالم مغرب کے علماء سے اور مغرب کا عالم مشرق کے علماء سے اچھی طرح واقف اور ایک دوسرے کے علم سے مستفید ہوتا تھا ، اور یہ سب صدقہ تھا ، حج کے اصلی مقاصد کی زندگی کا ۔ اب جو لوگ حج کرنے جاتے ہیں ، وہ تو صرف سر کا بوجھ اتارنے جاتے ہیں ، نتیجہ بھی وہی ہے ، کہ روحانیت اور قبولِ ثواب کی برکات کا حال تو اللہ جانے مگر مادی و علمی نقطۂ نظر سے تو یہ سفر جس عجلت اور بے گانہ وشی کے ساتھ کیا جاتا ہے ، وہ نہ کرنے کے برابر ہے ، ابھی آج سے تیس چالیس سال پہلے جب حرمین محترمین میں بڑے بڑے علماء موجود تھے ، اور کچھ نہیں ، تو دنیائے اسلام کے علماء حصولِ برکت اور سلسلہ کے لئے قرآن پاک و احادیث کی سندیں ہی حاصل کرتے تھے ، مگر افسوس کہ ساڑھے تیرہ سو برس کی جلتی ہوئی یہ شمع بھی بجھتی نظر آتی ہے ، لاقدر اللہ

(معارف ماہ اگست ۱۹۳۵ء)

(۹)

۲۱ ماہ اگست کو حیدر آباد کے سفر سے واپسی ہوئی ، ڈیڑھ ماہ کے قیام حیدر آباد میں دکن کے احباب اور عمائد نے جس محبت سے ذرہ نوازی کی ، وہ میرے استحقاق سے زیادہ تھی ، ہز اکسلنسی سر مہاراجہ یمین السلطنت بہادر نے خلعت پارچہ سے نوازش کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اعلیحضرت سلطان العلوم ہز اگزالٹڈ ہائنس شہریار دکن خلد اللہ تعالیٰ ملکہٗ و دولتہٗ ، نے یاد فرما کر باریابی بخشی اور الوان خاصہ سے سرفراز فرما کر ہم چشموں میں حقیر کی توقیر بڑھائی ،

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہانباں را
نظام الملک آصفجاہ علی خاں را

آج کل اعلیٰحضرت شہریار دکن کی بست وپنج سالہ جوبلی کے اہتمام وانتظام کی دھوم دھام ہے، دکن کی یہ سلطنت گو دکن کے رقبۂ حکومت میں محدود ہے، مگر سچ یہ ہے، کہ اس کے انوارِ کرم کی تابانی سے ملک ہند کا ذرہ ذرہ روشن ہے، وہ اپنی تاریخی روایات کی بنا پر سلطنت مغلیہ کی یادگار اور ہندوستان کی امیدوں کا چراغ ہے، جس امن وامان عدل وانصاف اور ہندو مسلمانوں کی باہم یکجہتی کے منظر یہاں آنکھوں کے سامنے سے گذرتے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے، کہ دہلی کی سلطنت جب زندہ ہوگی، تو اس میں اور کیسے کیسے دلفریب اور دلکش مناظر ہوں گے، ضرورت ہے، کہ اس تاریخی جشن کے موقع پر جو یکم شوال سے شروع ہوگا، پورا ملک ہند، دکن کی اس خوشی ومسرت میں شریک ہو، خصوصًا ملک کا تعلیمی وعلمی حلقہ جو خاصہ وسیع ہے، اس قدردانی وقدرافزائی کا اعتراف کرے، جو اس سلطنت کی جانب سے اس کی ہوتی رہی ہے، اور ہوتی رہتی ہے،

سرکار بھوپال کی طرف سے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسو ماہوار کی امداد شروع سے مل رہی تھی، لیکن بعض مالی دقتوں کے سبب سے ریاست نے اس امداد کو کئی برس سے نصف کر دیا تھا، پھر پچھلے سال سے دس فیصدی کی تخفیف کے اصول پر جو پوری ریاست میں جاری ہے، سو سے گھٹ کر نوے روپئے ہوگئے، اس دفعہ حیدرآباد کے سفر میں بھوپال سے گذرنا تھا، اس موقع کو غنیمت جان کر تین روز بھوپال ٹھہرا، اور دوستوں کی ملاقات کا لطف اٹھایا، اسی درمیان میں حضور پرنور ہزہائنس فرماں روائے بھوپال ادام اللہ تعالیٰ ملکہ نے ملاقات کی عزت بخشی، اور مختلف امورِ اصلاحی پر گفتگو فرمائی، دار المصنفین کی خدمات اور اس کی ضرورتوں کا حال معلوم فرما کر خود بنفسِ نفیس بدستور مقررہ رقم دوسو ماہوار کے اجراء کا حکم صادر فرمایا، اللہ تعالیٰ اس فیض رساں اور قدرشناس فرماں روا کو اپنے حفظ دامان میں رکھے،

سیر کی پانچویں جلد جو عبادات سے متعلق ہے، زیر طبع تھی، سفر کی غیر حاضری کے

سبب سے اس کا چھپنا روک دیا گیا تھا، اب پھر اس کی چھپائی شروع ہو گئی ہے، شاید یہ جلد ساڑھے تین سو صفحوں میں تمام ہو جائے، اس وقت تک تین سو صفحے چھپ چکے ہیں امید ہے کہ باقی صفحے اور فہرست اور ٹائیٹل وغیرہ تین مہینوں کے اندر چھپ جائیں، اور دسمبر تک یہ ناظرین کے ہاتھوں میں آجائے،

ان دنوں مطبع معارف سے دو نئی کتابیں چھپ کر شائع ہوئی ہیں، ایک "عربوں کی جہازرانی" اڈیٹر کے قلم سے، یہ دراصل وہ چند خطبے ہیں، جو مارچ ۱۹۳۱ء میں بمبئی میں سنائے گئے تھے، اور اب ان کو بمبئی کی اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن مذکور کے لائق سکریٹری آصف فیضی ایم. اے نے شائع کرایا ہے، ۳۴ چوپاٹی روڈ بمبئی کے پتہ سے ملے گی، نفع عام کے خیال سے اس کی قیمت صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے،

دوسری کتاب "چینی مسلمان" ہے جس کو چین کے نوجوان مسلمان عالم و ادیب بدرالدین چینی صاحب بی، اے، (جامعہ) نے اپنے ہندوستان کے قیام کے زمانہ میں لکھا، اور مطبع معارف نے چھاپا ہے، اس میں سب سے پہلی دفعہ چینی مسلمانوں کی تاریخ اور ان ہر قسم کے قومی، مذہبی تعلیمی علمی اور سیاسی حالات نہایت مستند ذریعوں سے لکھے گئے ہیں، مسلمانوں کو اس ملک کے دور افتادہ مسلمان بھائیوں کے حالات سے جو دلچسپی ہے، اس کی بنا پر یہ توقع بیجا نہیں کہ وہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے، اور پڑھیں گے، ضخامت گو تین سو صفحوں سے زیادہ ہے، مگر قیمت صرف ڈیڑھ روپے رکھی گئی ہے،

ہمارے صوبہ کے پیر سال لیکن جوان ہمت بزرگ مولوی بشیر الدین صاحب (اٹاوہ) کی قومی و تعلیمی خدمات سے کون واقف نہیں، ان کی پیری رشکِ جوانی ہے، ان کا وجود اس بات کی مثال ہے کہ دھن کے پکے لوگ کیسے ہوتے ہیں، انہوں نے اپنی تنہا کوشش سے اسلامیہ اسکول قائم کیا، اس کی عمارت بنائی، اس کا بورڈنگ بنایا، ایک نادر کتب خانہ فراہم کیا، اور کس مپرسی کے عالم میں اخبار البشیر کو اس وقت سے لے کر آج تک چلا رہے ہیں، کئی سال سے

ان کی کوشش تھی، کہ یہ اسکول انٹرمیڈیٹ کالج بن جائے، حکومت نے اس تجویز کو منظور کرلیا ہے، اور زراعت کی تعلیم کے لئے افیون گودام کو مع اس کی ملحقہ آراضی کے ایک روپیہ سال کے پٹہ پر اس کو دیا ہے، ایک بوڑھے کی جوانانہ ہمت و عزیمت نے راستہ یہاں تک طے کیا ہے، اب تک دوسکر نوجوانوں کا کام ہے، کہ وہ مناسب سرمایہ فراہم کرکے اس کی اس کوشش کو منزل مقصود تک پہونچائیں، کیا یہ افسوس کی بات نہیں، کہ پورے صوبہ میں علی گڈھ کے سوا ہمارا ایک بھی کالج نہیں،

مولانا حالی مرحوم ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے تھے، مرحوم کی پیدائش کی صدسالہ یادگار آخر اکتوبر میں حالی ہائی اسکول پانی پت میں اعلٰحضرت ہزہائنس نواب صاحب بھوپال کے زیرِ صدارت منائی جائے گی، اس موقع پر مرحوم کے سوانح حیات اور کارناموں پر مختلف تحریریں پڑھی جائیں گی، اور ان کی شہ کار تصنیف مسدس کا ایک ممتاز اڈیشن شائع کیا جائے گا،

(معارف ماہ ستمبر ۱۹۳۵ء)

(۱۰)

مولوی ڈپٹی نذیر احمد صاحب دہلوی مرحوم نے ۱۹۰۹ء میں امہات الامہ کے نام سے ازواج مطہرات کے حال اور عیسائیوں کے جواب میں ایک کتاب لکھی تھی، کتاب تو اسلام کے جوشِ حمایت میں لکھی گئی تھی، مگر اس میں زبان کہیں کہیں وہ برتی گئی تھی، جو ان مقدس ہستیوں کے شایان شان نہ تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں اس کے خلاف سخت ہیجان برپا ہوا، ۱۹۱۰ء میں ندوہ کا اجلاس دہلی میں ہوا، اور وہاں اس صورت حال پر غور کیا گیا، مصنف نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا، اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کی وساطت سے یہ معاملہ طے ہوا، کہ کتابیں نذر آتش کر دی جائیں، چنانچہ اسی پر عمل ہوا، کتاب جل گئی، تو مسلمانوں کو بھی سکون

حاشیہ مسودہ نمبر ۱۰۱۰

ہوا، اور خود مصنف نے بھی سانس لی،

اس کتاب کے جلائے جانے کا واقعہ، اس عہد کے مشہور و ممتاز و سنجیدہ، مستند و معتبر عینی شاہد (نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی) کی زبان سنیے،

> حیات النذیر کے مقدمہ کے متعلق ایک واقعہ کا اظہار ضروری ہے، مولوی نذیر احمد خاں صاحب مرحوم کے رسالہ امہات الامہ جلائے جانے کے واقعہ کو مولوی (عبدالحق) صاحب نے بڑی دلسوزی سے بیان کیا ہے، ایسا کہ دلسوزی نے اس میں کباب کا چٹ پٹا پن پیدا کر دیا ہے، واجب الاظہار واقعہ یہ ہے، کہ ندوۃ العلماء کے ارکان و شرکاء اس کے جلانے پر آمادہ نہ تھے، خود مولوی "نذیر احمد" صاحب مرحوم کی تحریک تھی اس طرف کے تامل نے تحریک کو اصرار سے بدل دیا، اور اصرار نے شدت اختیار کی، بلکہ دھمکی کی صورت جیسا کہ مولوی صاحب مرحوم کی طرف سے ایسے موقع پر ہوا کرتی تھی، مسیح الملک مرحوم نے (جو واسطہ تھے) بالآخر کہا کہ میں نے شیر کو کٹہرے میں بند کر دیا ہے، آپ نکالتے ہیں، اس پر جلسہ کر کے غور کیا گیا، اور مؤلف مرحوم کی رائے کی تائید ہوئی، چنانچہ رسالے جلائے گئے، مٹی کا تیل لا کر دو بجے رات کو جس نے رسالوں پر ڈالا تھا، وہ میں ہی تھا، اتفاق یہ کہ جلائے جانے کے بعد آندھی نے خاک تک اڑا دی، بارش نے جگہ صاف کر دی، اس طرح "بلاسی" سونگھنے کا موقع کسی کو نہ مل سکا، (مقدمۂ مقدمات عبدالحق)،

اب تقریباً پچیس برس کے بعد ان کے پوتے (شاہد احمد صاحب بی، اے) نے ایک طرح

اپنے دادا کے منشاء کے خلاف اس کا دوسرا اڈیشن بعینہٖ شائع کیا ہے، اب پھر مسلمانوں میں وہی ہنگامہ برپا ہے، ہمارے دوست مولوی عبدالماجد صاحب اڈیٹر صدق نے اپنے پرچہ میں اس کتاب کے تمام قابلِ اعتراض فقرے یکجا کر دیئے ہیں، اور پبلشر سے خواہش کی ہے، کہ وہ اس کتاب سے اتنے فقروں کو نکال کر کتاب کو دوبارہ چھاپیں، تاکہ ایک طرف اسلام کی سبکی اور مسلمانوں کی دل آزاری نہ ہو، اور دوسری طرف ڈپٹی صاحب کی زبان وادب کے قدرشناس ان کی آخری تصنیف کے لطف سے بھی محروم نہ رہیں امید ہے، کہ وہ اس کو قبول کر کے اسلام اور مسلمانوں کی لاج رکھیں گے، اور اپنے مرحوم دادا کی روح کو بھی خوش کریں گے،

آثار المدینۃ المنورہ کے نام سے مدینہ منورہ کے موجودہ تاریخی وجغرافی آثار اور یادگاروں پر عبدالقدوس الانصاری نے عربی میں ایک عمدہ کتاب لکھی ہے، جو شاید اپنے موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے، کاغذ اور لکھائی چھپائی بھی نہایت اعلیٰ ہے، کتاب میں بعض عمارتوں کے فوٹو بھی ہیں، مجموعی حیثیت سے یہ کتاب نہایت دلچسپ اور مسلمانوں کے قدر کے لائق ہے، مدینہ منورہ میں یہ کتاب مکتبہ علمیہ سے اور ہندوستان میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے مہتمم صاحب سے ملے گی، قیمت ہہ عہ

(معارف ماہ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

شذرات

اپریل ۱۹۳۶ء تا دسمبر ۱۹۳۶ء

خدا کا شکر ہے، کہ پانچ مہینوں کے بعد قلم نے کاغذ کی سطح پر قدم رکھا، اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کی تو کوئی حد نہیں ہے، وہ جیتوں کو مارتا اور مرتوں کو جلاتا ہے، اس نے اپنے ایک حقیر بندے کو موت کے بستر سے جلا کر کھڑا کر دیا، تو کیا تعجب کی بات ہے، اب دعا یہ ہے، کہ اس کو زندگی کے چند انفاس کی جو نئی مہلت ملی ہے، اس میں اس قادر مطلق کی خوشنودی کا کوئی ایسا کام اس سے انجام پائے، جو اس کی مغفرت کا سہارا اور آخرت کا توشہ ہو،

میری اثنائے علالت میں ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے سیکڑوں بزرگوں دوستوں اور عزیزوں نے ہمدردی اور طلب خیریت کے جو تار اور خط بھیجے، اور ہزاروں مسلمانوں نے مسجدوں اور مجلسوں میں مجھ گنہگار کی صحت کی جو دعائیں مانگیں، ان کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے، کہ اس نے اپنے بندوں کے دل اپنی بارگاہ میں دعا والتجاء کے لئے کھول دیئے اور بندگی کی زبان حال نے کہا،

از ہر کنار تیر دعا کردہ ام رواں
باشد کزیں میانہ یکے کارگر شود

بحمد اللہ کہ وہ کارگر ہوئی، ایڈیٹر بھائیوں نے اپنے اخباروں اور رسالوں میں میری علالت اور صحت پر اپنے جن مخلصانہ جذبات کا اظہار فرمایا، وہ میرے استحقاق سے زیادہ تھے، ان کے کرم اور قلم کا ممنون ہوں،

بیماری تو جا چکی ہے، مگر دل و دماغ کی قوت اور توانائی ابھی واپس نہیں آئی ہے اسی لئے دوستوں کے علمی استفساروں اور خطوں کے جواب اور فرمائشوں کی تعمیل سے

معذوری ہے، اپریل کے شروع میں ڈیرہ دون کا قصد ہے، اور غالباً گرمیوں کے مہینے وہیں بسر ہوں، جولائی سے امید ہے، کہ کام کرنے کی صلاحیت پوری طرح پیدا ہو، اس اثنا میں التماس ہے، کہ خطوط اور استفسارات کے بوجھ سے مجھ ناتواں کو ہلکا رکھا جائے، خصوصاً فتووں کے جواب سے تو مجھے بالکل معذور سمجھا جائے،

میری علالت کے زمانہ میں ملک وملت کی کئی نامور ہستیوں نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، حافظ ہدایت حسین صاحب مرحوم اس صوبہ کے مسلمانوں کی بڑی دولت تھے، اس دولت کا چھن جانا ہماری سب سے بڑی محرومی ہے، دلی کے پایہ تخت کی بھی ایک یادگار مٹ گئی، یہ مولانا راشد الخیری کی ذات تھی، جس نے اپنی ساری عمر مسلمان عورتوں کی علمی و ادبی و تعلیمی خدمت گذاری میں بسر کردی، دکن کے خزانہ کا بھی ایک قیمتی ہیرا گم ہوگیا، یعنی مولانا شبیر علی صاحب سابق مدرس اعلیٰ دار العلوم ندوہ وسابق استاذ کلام جامعہ عثمانیہ نے وفات پائی، مرنے والے مرگئے، مگر ان کے کارنامے دنیا میں یادگار رہ گئے،

از صدائے سخن عشق ندیدم خوشتر　یادگارے کہ دریں گنبد دوار بماند

لاہور کے ادارۂ معارف اسلامیہ کے جلسے شاید ان اوراق کے آپ کے ہاتھوں میں پہنچنے تک ہوچکیں، آج سے ڈھائی سال پہلے اس ادارہ کا پہلا اجلاس ہوا تھا، جس میں اسلامی علوم وفنون اور تمدن کے متعلق بہت سے محققانہ مضامین پڑھے گئے تھے، اور جن کا مجموعہ مجلس کے پہلے سال کی روداد میں شائع ہوچکا ہے، توقع ہے کہ اس کا دوسرا اجلاس جو ۱۰؍ اپریل سے ۱۲؍ اپریل ۱۹۳۶ء تک ہوگا، پہلے سے بڑھ چڑھ کر ہوگا، عربی اور فارسی کی نادر قلمی کتابوں اور اسکولوں کی نمائش بھی ساتھ ساتھ ہوگی،

آج ہندو بھائیوں کی سیاسی اور تاریخی دنیا میں عالمگیر سے بڑھ کر کوئی مسلمان بادشاہ برا نہیں، مگر دیکھو کہ آج کتنے ہندو مندر ہیں، جو اس بت شکن بادشاہ کی فیاضی کے بدولت آباد ہیں، ابھی اخباروں یہ خبر تازہ ہے، کہ بسمت نگر ضلع پربھنی (دکن) کے ایک بڑے

مندر کے مہنت کے پاس شاہ عالمگیر کی دی ہوئی ایک قیمتی پگڑی تھی، جس میں جواہرات ٹکے ہوئے تھے، اور جس کی مالیت کا اندازہ پندرہ ہزار تھا، یہ پگڑی سال میں ایک مرتبہ درشن کے لئے جاترا کے موقع پر مندر میں ایک مرصع تخت پر رکھدی جاتی تھی، یہ پگڑی کئی مہینے ہوئے کہ چوری گئی، اب پولیس نے اپنی تحقیقات سے چوروں کا پتہ چلالیا ہے، پگڑی کے ساتھ بادشاہ کی دی ہوئی سندیں بھی ہیں،

واقعہ اپنی نوعیت کا معمولی ہے، مگر دیکھنا یہ ہے، کہ لوگ جو یورپ کے سیاسی، تعلیمی پروپگنڈے سے متاثر نہیں، اور جو انگریزی تعلیم کی خاص ذہنیت سے پاک ہیں، ان کی نظر میں شاہ عالمگیر تھا اب نہ تو عالمگیر ہے، اور نہ عالمگیری، آج اس کے لئے آپس میں لڑنے سے حاصل نہیں، اب جو عالمگیر ہندو اور مسلمان کے سروں پر مسلط ہے، اس کی طرف نظریں متوجہ ہونی چاہئیں، پرانے زمانہ میں اگر کوئی مندر ڈھایا گیا، تو تاریخ کے سینما میں اس کا منظر آج تک دکھایا جارہا ہے، مگر آج شہید گنج پر شہید گنج ہوتے جارہے ہیں، مگر دنیا کو خبر تک نہیں ہوتی،

خرقہ پوشاں ہمگی مست گذشتند وگذشت
قصہ ماست کہ در بر سرِ بازار بماند

سیاسی مجلسوں کے انتخاب کے دن جیسے جیسے قریب آرہے ہیں، سیاسی بازیگر اپنے اپنے کھیل میں زیادہ چست نظر آرہے ہیں، آغا خان مسلمانوں کی سیاسی و تعلیمی قیادت کا مظاہرہ کرکے یورپ روانہ ہوچکے، اب اس کی زریں روداد جگہ جگہ دہرائی جارہی ہے، اور کسی نامعلوم اقتصادی تجویز کا خیالی تماشا آنکھوں کو دکھایا جارہا ہے،

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں بھی دو گروہ الگ الگ ہوگئے ہیں، ایک نرم اور دوسرا گرم، اب ان میں اتحاد کی کوششیں رات اور دن کو یکجا کرنے کی کوشش ہے، ضرورت یہ ہے کہ مختلف سیاسی مجلسوں میں جو لوگ بٹے ہوئے ہیں، وہ اپنے اپنے مجلسی حصار کو جن کے نام

مسلم کانفرنس یا مسلم لیگ اور دوسرے کا نام جمعیت یا یونٹی بورڈ یا مسلم نیشلسٹ یا کچھ اور رکھ لیجئے، اور اب مسلمانوں کو انجمن سازی کے گھروندوں سے نجات دلایئے،

تاریخ ہند کا جو کام دارالمصنفین میں کیا جانے والا تھا، اس کا آغاز کر دیا گیا ہے، مختصر تاریخ ہند کے نام سے دو سو صفحوں میں ہندوستان کے پورے اسلامی دور کی تاریخ چھپ گئی ہے، یہ اس قابل ہے، کہ اسلامی مدرسوں میں پڑھائی جائے، مفصل تاریخ ہند کی پہلی جلد جو سندھ کے حالات پر مشتمل ہے، آدھی ہو چکی ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے دوسرے معاونین بھی اپنے وعدوں کا ایفا کریں،

(معارف ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء)

(۲)

اخباروں میں یہ معلوم ہوا ہوگا، کہ ہندوؤں نے جن میں ان کے اہلِ قلم اور اہلِ سیاست دونوں شامل ہیں، ایک نئی مجلس کی بنیاد اس غرض سے ڈالی ہے، کہ ہندی اس ملک کی مشترک زبان قرار دی جائے، چنانچہ پچھلے مہینہ اس کا جلسہ بہت دھوم دھام سے ناگپور میں ہوا، اور یہ طے پایا کہ ہندوستان کی عام اور مشترک زبان "ہندی یعنی ہندوستانی" ہے،

آج تک اس زبان کے جس کو اب غلطی سے اردو کہا جاتا ہے، دو نام تھے، ایک ہندی اور دوسرا ہندوستانی، پہلا نام مدت ہوئی کہ ناگری خط میں لکھی جانے والی بھاشا کا مشہور کیا گیا، اور اس کو یہ شہرت دی گئی، کہ امتیاز کے لئے دوسری زبان کا نام اردو رکھنا پڑا اور کبھی کبھی اس کو ہندوستانی بھی کہا جانے لگا، اور خیال تھا، کہ آہستہ آہستہ یہ نام پھیل کر اردو کے غلط نام کو مٹا دے گا، مگر ہندو مدبر یہ جانتے ہیں، کہ نام میں کتنی طاقت ہوتی ہے، اردو ہندوستانی بن کر ملک کی عام زبان ہونے کی سینکڑوں دلیلوں کی ایک دلیل ہو جاتی، اس سے ناگپور میں "ہندی یعنی ہندوستانی" کی عجیب و غریب تشریح سے ایک ہی حملہ میں دونوں پر

قبضہ جما لیا گیا،

ہم نے ہندی کے حامیوں کی اس چال کو بہت پہلے سے سمجھ لیا تھا، اور آج سے چند سال پہلے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ایک مقالہ کے ضمن میں یہ تجویز پیش کی تھی، کہ ہم اپنی اس زبان کو اردو کے بجائے ہندوستانی کے نام سے یاد کریں، پھر معارف میں اس کی تحریک برابر جاری رکھی ہے، بعض صوبوں نے اس تحریک پر عمل کرنا بھی شروع کر دیا تھا، گو بعض ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے اس کی مخالفت بھی کی، لیکن غور سے دیکھئے کہ ہندو اہلِ نظر ہماری اس تحریک پر کتنے چوکنے ہو گئے، ان کو اس کے سوائے کوئی چارہ نظر نہیں آیا، کہ وہ اپنی بھاشا کے لئے ہندی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کا لقب بھی فوراً اختیار کریں،

مولوی عبدالحق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو نے جو اس کانفرنس میں شریک تھے، اس کانفرنس کی روداد پر اخباروں میں بہت اچھا تبصرہ کیا ہے، اور حقیقت بات وہی ہے جو پروفیسر مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) نے خط بنام گاندھی جی میں لکھی ہے، کہ ہندوستان کی عام بننے والی زبان کا معیار رواج ہو، نہ کہ ہندی لغت، یہی بات ہم نے ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے ایک یادگاری مجموعۂ مضامین میں لکھی تھی،

ہندی کے حامی اس بات کے درپے ہیں، کہ چند سو سال پہلے ہندی کے چند شاعروں نے جس زبان میں شاعری کی، اسی کو ملک کی علمی، ادبی اور عام زبان قرار دیں، حالانکہ انصاف یہ ہے، کہ آج پشاور سے کلکتہ تک جو زبان عام طور سے بولی چالی اور سمجھی جاتی ہے، وہی ملک کی عام زبان قرار دی جائے، مگر ہندی کے حامی ایک بات طے کر چکے ہیں، اب دیکھنا ہے، کہ ہندوستانی (اردو) کے حامی کیا طے کرتے ہیں،

ایک نکتہ ہندوستان کے مسلمانوں کے غور کے قابل ہے، اس ملک کے ہندوؤں نے خواہ وہ اپنے سیاسی مسلکوں میں کسی قدر مختلف ہوں، ایک بات قطعی طور سے طے کر لی ہے، اور وہ یہ کہ ان کا قومی نصب العین یہ ہے، کہ ہندوستان میں ہندو تہذیب و تمدن، کلچر، اور

ادب بلکہ حکومت تک کو دوبارہ قائم کیا جائے اور ہندوستان کو بجا طور پر "ہندواستھان" بنایا جائے، اس مقصد پر آریہ سماجی اور شناس دھرمی، مہاسبھائی، اور کانگریسی جی حضوری اور آزاد، ملازم سرکار اور غیر ملازم سبھی متفق ہیں، اور قوم کا ہر فرقہ اور ہر کارکن اپنے اپنے راستہ سے اسی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے، سوال یہ ہے، کہ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کا قومی نصب العین کیا ہے، اور وہ اس کے لئے کیا کر رہے ہیں،

اگر برا نہ مانا جائے، تو ہم بتائیں، علماء نے یہ طے کیا ہے، کہ ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کا مشغلہ جاری رکھیں گے، اور عام تعلیم یافتہ سب سے پہلے نوکری اور ان کے ممتاز افراد کونسلوں کی ممبری اور ہو سکے تو کسی نہ کسی طور سے وزرات کے حصول کی کوشش میں لگے رہیں گے، اس سے آگے بڑھ کر نہ ان کا کوئی قومی نصب العین ہے، اور نہ کوئی مطمح نظر ہے،

اب تو آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

انہی کونسلوں کی پیچ در پیچ سیاستوں نے ہمارے اسلامی صوبہ کا کیا حال کر رکھا ہے، جس پر ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا سارا بھروسہ ہے، یعنی پنجاب، ایک فی صدی اسلامی زیادتی کے بیسیوں متفرق و مختلف سیاسی فرقوں میں بٹ کر بے کار ہو جانے میں کوئی شک نہیں رہا، اور اس پر بھی مقصد متعین نہیں، اور نصب العین ایک نہیں،

ایسی صورت میں مسٹر جینا کی کوشش سے ملک میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ جو قائم ہوا ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ اس نے اپنا جو منشور عمل (مینی فسٹو) شائع کیا ہے اور مختلف الخیال مسلمانوں کو چند دفعات پر جو متفق کیا ہے، وہ بہت کچھ حوصلہ افزا اور مسلمانوں کی پراگندگی کو ایک شیرازہ میں باندھنے والا ہے، گو ظاہر ہے، کہ وزارت کے طلب گار اور حامی اس کا ساتھ نہ دیں گے، کیونکہ اس منشور عمل کی کسی دفعہ میں یہ نہیں بتایا

گیا ہے، کہ وزرات کس طرح مل سکے گی،

(معارف ماہ جولائی ۱۹۳۶ء)

(۳)

سید رشید رضا اڈیٹر المنار مصر کی وفات سے یہ ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو، کہ ان کا بین الاقوامی اسلامی رسالہ بند ہو جائے، مگر ان کے عزیزوں اور دوستوں کی کوشش سے یہ خطرہ دور گیا ہے، ان کی تفسیر کے سلسلہ کو شام کے مشہور سلفی عالم شیخ بہجت عطار نے اور رسالہ کی اڈیٹری کے فرض کو سید مرحوم کے بھتیجے سید محی الدین رضا نے اپنے ذمہ لیا ہے اور محرم ۱۳۵۵ء کے حساب سے اس کی اشاعت شروع کر دی ہے، امید ہے، کہ اپنی عالمگیر اسلامی حیثیت کو قائم اور مرحوم کے روحانی فیض کو جاری رکھے گا۔

مدرسۃ الاصلاح

اعظم گڈھ میں بمقام سرائمیر عربی کا ایک جدید طرز کا مدرسہ مولانا شبلی مرحوم کے بنائے ہوئے خاکہ کے مطابق مدرسۃ الاصلاح کے نام سے پچیس چھبیس برس سے قائم ہے، اس کے ناظم مولانا حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، مولانا حمید الدین صاحب نے مراجعت وطن کے بعد اپنی بقیہ زندگی اسی مدرسہ کی علمی و تعلیمی رہبری میں صرف فرمائی، اسی کی خاطر انہوں نے ہزار روپئے ماہوار کی نوکری چھوڑ دی، گھر بار چھوڑا، مدرسہ ہی میں بود و باش اختیار کی اور وہاں کے طلبہ و مدرسین کو کلام پاک کا درس دینا شروع کیا، اور اپنی ساری متاع علمی مدرسہ کے چند ہونہار طلبہ کے سپرد کر دی،

اس مدرسہ کا مقصد یہ ہے، کہ عربی صرف و نحو کی دقتوں کو کم کر کے عربی علوم کی تعلیم دی جائے، قرآن پاک کو اس تعلیم کا محور بنایا جائے، دوسرے علوم کو قرآن پاک کا خادم سمجھ کر سکھایا جائے، اور فلسفہ و منطق کی دور از کار کتابوں کو بہت کم کر دیا جائے، مدارس کا

کاروان عمل شروع سے آج تک اسی راہ چل رہا ہے، اور اچھے نتیجے پیدا کر رہا ہے، اس میں کام کرنے والے چند مدرس نہایت ایثار پیشہ بے غرض اور مخلص علماء ہیں، جن میں کچھ ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ اور کچھ خود اسی مدرسے سے نکلے ہوئے ہیں، مدح و ستایش نہیں، واقعہ ہے، کہ مدرسین نے مہینوں قوت لایموت پر گذر کر کے اور سالہا سال تنخواہ نہ پا کر اس اخلاص و ایثار کے ساتھ کام کیا ہے، اور اب تک کر رہے ہیں، کہ ہمارے موجودہ قومیات میں اسکی مثال مشکل سے ملے گی،

آس پاس میں "علمائے زمانہ" کی کمی نہیں انہوں نے اس کے مقابل دوسرا مدرسہ قائم کیا، اور اپنے مدرسے کے چلانے کے لئے یا اپنے زعم میں نیک نیتی سے وقتاً فوقتاً مدرسۃ الاصلاح کے خلاف غلط افواہیں پھیلا کر مسلمانوں کو اس کی امداد سے روکنے کی کوششیں کرتے رہے، لیکن ؏

دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تر است

ان کی ہر کوشش ناکام ہوتی رہی، اور مدرسۃ الاصلاح کا کام بڑھتا ہی رہا، چنانچہ کئی ماہ سے مدرسۃ الاصلاح کے چند علماء نے مل کر مولانا حمید الدین کی یادگار اور انکی تصنیفات قرآنی کی اشاعت کے لئے دائرہ حمیدیہ قائم کیا ہے، اور اس کی طرف سے الاصلاح نام ایک رسالہ جاری ہوا ہے، جو ماہ بماہ کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے۔

یہ جدید ترقی مخالفوں کے سامان "ہیزم کشی" کے لئے آگ ثابت ہوئی، انہوں نے اس کی تباہی کے لئے اپنے آخری بے پناہ حربہ (کافر گری) کو استعمال کیا، اور تھانہ بھون، سہارنپور، دہلی، بمبئی، اور دیوبند وغیرہ کے چند علماء کو مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین کی چند بے محل عبارتیں دکھلا کر دونوں کی تکفیر کا فتویٰ لے آئے، جن پر اہم علمائے کرام کے تصدیقی مہریں ثبت ہیں، پھر دہلی، میرٹھ اور بچھرایوں وغیرہ سے ایک درجن ایسے علماء بلا کر لے آئے، جو اپنے مخالفوں کو بہتر سے بہتر مذہبی اور اخلاقی گالیاں دے سکیں، چنانچہ مدرسے کے

قریب کی ایک زمین میں جلسہ جما کر تین روز تک پیہم ان دو مرحومین کو اور ان کے تعلق سے مدرسہ کو بدتر سے بدتر کلمات ناشایشتہ سے یاد فرماتے رہے،

یہ واقعہ اپنی نوع کا جیسا بھی ہو، تاہم اپنے برادران وعزیزان مدرستہ الاصلاح کو مبارکباد دیتے ہیں، کہ مخالفوں کے اس کل مظاہرہ میں انہوں نے صبر وسکون کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ان کے پانووں تہذیب ومتانت اور وقار وتمکنت کے جادہ سے الگ نہیں ہوئے، دوسری بشارت اس میں یہ ہے کہ دشمنوں نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چھوڑ لیا، اور انہیں معلوم ہوگیا، کہ ان کے بازوؤں میں زور اور ہمارے سینوں میں مضبوطی کتنی ہے، اب وہ بھی آرام سے رہیں گے، اور ہم بھی آرام پائیں گے۔

(معارف ماہ اگست ۱۹۳۶ء)

(۴)

ہمارے حیدرآبادی فاضل دوست ڈاکٹر محمد حمیداللہ صاحب ابھی اسی جون میں افغانستان کے سفر سے واپس آئے ہیں، وہاں کے نوجوان اہلِ علم وادب کے روز افزوں ذوق وشوق وانہماک کو دیکھ کر وہ بے حد متاثر ہوئے لکھتے ہیں،

> انجمن ادبی کے ارکان کا جوشِ عمل دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوا......
>
> ہر رکن اس کوشش میں مسابقت کر رہا تھا، کہ وہ کسی نئی چیز کا ترجمہ کر ڈالے. باوجود بے سامانی کے ان کی کارکردگی حیرت انگیز ہے......
>
> انہماک پر حیرت اور رشک ہے، اور جی چاہتا ہے، کہ کاش ان لوگونکو چیرالینا ممکن ہوتا،

لیکن ہمارے نوجوان فاضل دوست کو دیکھ کر کابل کے نوجوان اہل قلم طبقہ پر کیا اثر پڑا۔ وہ افغان ادیب فاضل جناب سرور خاں گویا کے عنایت نامہ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے،

> چند روز قبل پروفیسو رحمید اللہ خاں تشریف آورده بودند نامۂ مبارک شما زیارت کردم تا اندازۂ کہ مقدور عاجزانہ بود بایشاں مساعدت نموده از ہیچ گونہ یاوری دریغ نہ کردم زیرا شخص نامبرده مردے بود فاضل و کریم النفس و دارائے خلق نیکو و اطوار جمیل و خجستہ درحقیقت تمثال اخلاق و مثال زنده و روشنی از تتبع و تفحص در راه علم و دانش بشری، برائے تمام جوانان سرمشق خوبے است خداوند امثال ایشاں را در دنیائے اسلام بیشتر کند و زحمات شاں را پاداش جمیل بدہد ......

ہمارے افغان دوست کو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی اس اندرونی تجویز کی کہ وہ وہاں کے چند افغان نوجوان اہلِ قلم کو چرا کر ہندوستان لانا چاہیے، بروقت خبر نہ ہو سکی، ورنہ بہت آسانی سے وہیں چرا لئے جاتے، اور حیدرآباد کی ریاست کو اپنے ایک دبلے پروفیسر کے چوری جانے پر خسارۂ عظیم برداشت کرنا پڑتا۔

ادیب فاضل سرور خاں گویا کے خط سے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ انہوں نے حکیم سنائی کے کلام کا ایک قدیم و نادر مجموعہ دریافت کیا ہے، جس کی کتابت حکیم سنائی کی وفات کے پچاس برس بعد ہوئی ہے، اس مجموعہ میں حکیم ممدوح کی حسب ذیل تصانیف ہیں کارنامۂ بلخ، عشق نامہ، عقل نامہ، بہرام و بہروز، عفو نامہ، اور غریب نامہ، ہمارے دوست اس مجموعہ کو جشن فردوسی کے موقع پر ایران لے گئے تھے، وہاں کے فضلاء اس کو دیکھ کر بے حد محظوظ ہوئے، اس کا کوئی نسخہ ایران میں نہ تھا، امید ہے، کہ ہندوستان کے فضلاء بھی اس "کنز مخفی" کے ظہور پر بے حد خوش ہوں گے

جاپان سے پروفیسر بولاس اپنے ایک عنایت نامہ میں لکھتے ہیں :-

> معارف کے مارچ نمبر میں ساقی پر تبصرہ کرتے ہوئے ادارت
> سے ایک غلطی ہوئی ہے، میں نے دو جاپانی پروفیسروں سے
> اور دو طلبہ سے اس نمبر کے لئے مضمون لکھوائے تھے، ان
> صاحبان نے خود ہندوستانی میں لکھے تھے، میں نے ترجمہ
> نہیں کیا، نیز میں کالج میں استاد اردو نہیں، بلکہ استاذ
> ہندوستانی ہوں،

ہندوستانی کے حامی یہ سن کر کیسے خوش ہوں گے، کہ ان کی زبان مشرق اقصیٰ کے گوشوں تک پہنچ چکی ہے، اور نیز یہ کہ لفظ اردو کی تنگی اور اس کی جگہ لفظ ہندوستانی کی وسعت ہندوستان کے باہر بھی اب تسلیم کی جانے لگی، اور سمجھا جانے لگا، کہ ہندوستان کی مشترک زبان کا صحیح نام ہندوستانی ہے، نہ کہ اردو،

اسی خط میں پروفیسر برلاس نے جاپان میں اسلام کی اشاعت کی نسبت چند فقرے لکھے ہیں، اور بتایا ہے کہ یہاں بعض لوگ کس طرح غلط پروپگنڈے سے دنیائے اسلام میں غلط خبریں پھیلاتے ہیں، اور مسلمانوں کو حقیقت سے بے خبر رکھتے ہیں،

جاپان میں حقیقت صحیح اسلامی خدمت کی توقع اگر کسی سے کی جاسکتی ہے، تو وہ کوبے کی مسجد اور اس کے مخلص کارکن ہیں،

مولانا شبلی اور حمید الدین صاحب کی تکفیر کے فتویٰ پر جن لوگوں نے دستخط کئے تھے، ان میں سب سے ممتاز شخصیت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی تھی، مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی اور دوسرے دوستوں کے خطوط اور اخبار صدق لکھنؤ سے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ حضرت مولانا نے فتویٰ کے بعض جوابی تشریحی مضامین پڑھنے کے بعد اپنے مسلک توسع کی بنا پر ان دونوں بزرگوں کی تکفیر کے فتویٰ سے رجوع فرمایا،

اس زمانہ میں جب کہ اعتراف حق کبریت احمر ہے، حضرت مولانا تھانوی کی یہ حق پسندی

بے حد قابلِ قدر ہے،

ہمارے عزیز بدر الدین چینی صاحب نے مصر سے ہم کو ہمارے چینی بھائیوں کی حمیت دینی کی ایک تازہ مثال لکھی ہے، مشہور انگریز مؤلف ویلز نے اپنی کتاب "دی آوٹ لائین آف دی ورلڈ ہسٹری" میں اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ السلام کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا، اس کا ترجمہ چینی زبان میں بھی شائع ہوا، جب مسلمانوں کو معلوم ہوا، تو انہوں نے کمرشل پریس کے مالک کو جس کا پریس چین میں سب سے بڑا ہے، اور جو خود بھی بڑا عالم ہے، لکھا کہ اس حصہ کو جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بے ادبی ہے، نکال ڈالا جائے، اور واقعات کے مطابق وہاں ایک مبسوط حاشیہ لکھدیا جائے، مسلمان اس احتجاج میں نہ صرف کامیاب ہوئے ہیں، بلکہ اس پریس سے جتنی تاریخی کتابیں نکلی تھیں، ان کی بھی نظر ثانی ہونے لگی، اور صاحبِ مطبع نے اپنے اثر سے سنگھائی پریس کی کمیٹی جنرل کو بھی آمادہ کر دیا، کہ اہل مطبع کو متنبہ کر دیا جائے کہ اسلام کے متعلق جب کوئی مضمون یا کتاب لکھی جائے، تو چھپنے سے پہلے انجمن علومِ اسلام (سنگھائی) کے پاس بھیج دی جائے، اور اس کی منظوری اور تصدیق کے بعد اس کو چھاپنے کی اجازت دی جائے، ہم بھی اپنے چینی بھائیوں کو ان کی اس حمیت دینی پر مبارکباد دیتے ہیں،

(معارف ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء)

(۵)

دار المصنفین میں ایک مفصل و مبسوط تاریخ اسلام کی تالیف کا خیال شروع سے تھا، پانچ چھ برس ہوئے کہ مختلف رفقاء کو اس تاریخ کی مختلف جلدیں حوالہ کی گئیں، انہوں نے اس مدت میں اپنے اپنے متعلقہ دور کی تاریخ کا مطالعہ کیا، واقعات کی تلاش و تحقیق کی، اور بڑی بڑی سلطنتوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں تک کا پتہ لگایا، اور دو دو جلدوں میں

مشرقی و مغربی اور ترکی سلطنتوں کی تاریخیں مرتب کیں، اور اب موجودہ انداز کے مطابق یہ تاریخ چھ ضخیم جلدوں میں تمام ہوگی، اس کی چھپائی کا کام امید ہے کہ آیندہ سال سے شروع ہو جائے،

ضرب کلیم

ہمارے حکیم شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ایک نیا ادبی معجزہ ضرب کلیم کے نام سے ظاہر ہوا ہے، اس میں موصوف کی وہ تازہ اردو نظمیں ہیں، جن میں اسلام کے نقطۂ نظر سے زمانۂ موجودہ کے خیالات پر تبصرہ کیا گیا ہے، لیکن معلوم نہیں، کہ یہ حضرت کلیم کی وہ ضرب ہے، جو بحر احمر پر پڑی تھی، جس سے دریا پھٹ گیا تھا، اور اس سے ایک قوم آزاد اور دوسری برباد ہوئی تھی، یا وہ ضرب ہے، جو وادیِ تیہ کی ایک چٹان پر پڑی تھی، جس سے پانی کی بارہ دھاریں بنی اسرائیل کے پیاسوں کیلئے پھوٹی تھیں، بہرحال ان دو میں سے جو ہو، وہ ہمارے لئے فال نیک ہی ہے،

حضرت اقبال کی شاعری، اب شاعری کے حدود سے نکل کر خالص حکمت کے سدرۃ المنتہی تک پہونچ چکی ہے، اور ان من الشعر لحکمۃ کے خلعت نبوی سے سرفراز ہو چکی ہے، اب ان کی شاعری میں جذبات کا سراب نہیں، بلکہ عقل و حکمت کا چشمۂ حیات ہے، اب وہ لطف و لذت نہیں، بلکہ بصیرت و موعظت ہے، وہ مسلمانوں کو اب ان کے بزرگوں کا تاریخی پیغام سنانے کے لئے نہیں، بلکہ ان کو قوموں کے... عروج و زوال کا فلسفہ سمجھانے کے لئے ہے، وہ اب میدانِ جنگ کا رجز یا مسافرانِ راہ کے لئے بانگِ درا نہیں، بلکہ وہ غور و فکر کے غارِ حرا سے ناموسِ اکبر کی آواز اور جبرئیل امین کا پیام ہے،

⁂

آج کل یورپ سے چند نئی کتابیں چھپ کر شائع ہوئی ہیں، مثلاً رومہ سے ابو حاتم رازی کی منتخب اعلام النبوۃ، پیرس سے بیرونی کا رسالہ محمد بن زکریا رازی کی فہرست کتب میں، اور شیخ شہاب الدین سہروردی کا فارسی رسالہ آوازِ پر جبرئیل، اسی طرح

برلن سے متکلمین کے جزء لایتجزی پر جرمن میں ڈاکٹر پنیس (Penes) کا مقالہ اور پیرس سے شہر کوفہ کے نقشہ اور تشریحات پر پروفیسر مسینیون کا مقالہ فرنچ میں،

امسال مرحوم مارماڈیوک پکتھال کے علاوہ جن کو ہم سب جانتے تھے، کئی نامور مستشرقین نے وفات پائی، اٹلی کے پرنس کائتانی اور پروفیسر گویدی اور لائیڈن کے پروفیسر اسنوک ہرخرونئے نے امسال ہماری دنیا کو الوداع کیا، پرنس کائتانی تاریخ اسلام کے عالم اور گویدی عربوں کے ریاضیات اور جغرافیہ کے ماہر اور اسنوک ہرخرونئے "محمڈنزم" نامی کتاب کے مصنف ہیں، جس کو انہوں نے خطبہ کی صورت میں امریکہ کی "مجلس تاریخ مذاہب" میں پیش کیا تھا، اور بھی دوسری کتابیں اور مضامین ان کے قلم سے نکلے تھے،

مصر میں جب سے شیخ مصطفےٰ امراغی نے ازہر کی عنان مشیخت اپنے ہاتھ میں لی ہے وہاں بہت سی اصلاحات وجود میں آئی ہیں، اب ازہر پرانا مدرسہ نہیں رہا، بلکہ یورپ کے طرز کی یونیورسٹی بن رہا ہے، اس وقت وہاں کی اعلیٰ تعلیم تین کالجوں پر منقسم ہے، عربی زبان دانی کا کالج، (كلية اللغة العربية) مذہبی عقائد کا کالج (كلية اصول الدين) اور فقہی علوم کا کالج (كلية الشريعة) ہر ایک کی تعلیم کی مدت چار سال ہے، اس کے بعد تخصص، یعنی خاص خاص علوم میں تکمیل کے درجہ ہیں، پہلے کالج میں تکمیل کے لئے دو شعبے ہیں، نحو و قواعد اور بلاغت، دوسرے کالج میں اس کے چار شعبے ہیں، دعوت و تبلیغ و ارشاد، توحید و کلام، علوم قرآن وحدیث اور تاریخ اسلام، تیسرے کالج کے دو تکمیلی شعبے ہیں، قضائے شرعی اور شعبہ فقہ و اصول، معلوم نہیں، اس نئے قالب میں دینداری کی پرانی روح بھی رہی یا نہیں،

آج کل مصر میں قرآن پاک کے ترجمہ پر بڑے جھگڑے برپا ہیں، ایک فریق اس کو ناجائز کہتا ہے، اور دوسرا اس کو واجب بتاتا ہے، اس پر فریقین نے رسائل اور مضامین لکھے ہیں، خدا رحمت بھیجے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خاندان پر کہ انہوں نے

فارسی اور ہندوستانی میں قرآن پاک کا ترجمہ فرما کر ہندوستان کے مولویوں کو اس جھگڑے سے بچا لیا، ورنہ عجب نہیں کہ یہاں جواز و عدم جواز سے بڑھ کر شاید کفر و اسلام کا معیار قرار پا جاتا،

مولانا شبلی مرحوم و مولانا حمید الدین کے فتوائے تکفیر پر دستخط کرنے والوں میں دوسری اہم شخصیت جناب مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی تھی، موصوف نے حقیقت حال سننے اور مولانا شبلی کی آخری تحریر دیکھنے کے بعد اپنے فتوے سے رجوع فرمایا، مولانا حمید الدین صاحب کے دونوں فقروں کے متعلق فرماتے ہیں، کہ ان کو زیادہ سے زیادہ نقص تعبیر یا سماحت بیان کہہ سکتے ہیں، ان سے کفر لازم نہیں آتا، ان کی پوری تحریر اخبار صدق لکھنؤ میں چھپی ہے، مولوی محمد طیب صاحب دیوبندی نے بھی رجوع کیا۔ انہوں نے اپنا خط مدینہ بجنور میں چھپوایا ہے۔ اسی طرح مولوی لطف اللہ صاحب شاہجہانپوری مدرس زکریا مسجد بمبئی نے بھی رجوع فرمایا۔ ان کا خط الاصلاح سرائے میر میں چھپا ہے۔ **فالحمد للہ**۔

افسوس کہ اس مہینہ مولوی نور الحسن صاحب نیر بی، اے، ال، ال، بی خلف حضرت محسن صاحب کاکوروی نے ایک مدت کی علالت کے بعد وفات پائی، وہ انگریزی کے ساتھ عربی کے بھی عالم تھے، ندوۃ العلماء کے ممتاز رکن اور دار العلوم کے سابق معتمد تھے، وہ سخنور، سخن سنج، سخن شناس، سخن داں سب کچھ تھے، ان کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ اردو لغت نور اللغات کی تالیف ہے۔ خدا ہمارے اس ادیب شاعر کو اپنی رحمت کے انعام و اکرام و صلہ سے سرفراز فرمائے۔

ہمارے دوست کشن پرشاد کول نے ہندوستانی میں ہندی اردو پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے، وہ چاہتے ہیں، کہ ہندی و اردو دونوں کے لئے الگ الگ ترقی کی راہیں کھلی رہیں، اور ملک کی سرکاری تعلیمی اور عام صوبجاتی زبان انگریزی قائم رہے، پہلی تجویز تو وہی ہے، جس کا زمانہ اپنے اصول کے مطابق پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہے، کہ نہ اردو ہندی کو مٹا سکتی ہے، نہ ہندی اردو کو، اور دونوں اپنی اپنی راہ چلتی رہیں گی، لیکن دوسری تجویز ایک سیاسی

اہل الرائے کی دوربینی سے بہت دور ہے، اس عارضی زبان کی عالمگیری تو اسی وقت تک ہے، جب تک اس کی شاہنشاہی کا چتر آپ کے سر پر سایہ فگن ہے، کیا آج اکبر اور عالمگیر کی فارسی شہنشاہی قائم ہے، تو پھر کل کے لئے انگریزی کی شہنشاہی کا تصور آپ کیوں کر کرسکتے ہیں، حکمراں قوم کی زبانی حکمرانی ان کی شاہی حکمرانی کے ساتھ ساتھ ہے، امریکہ کی مثال نہ پیش کیجئے، کہ وہ بیخ میل قوم پہلے سے نہ اپنا کوئی تمدن رکھتی تھی، نہ قومیت، نہ جنسیت، نہ زبان،

(معارف ماہ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

(۶)

ہندوستان کی زبان کی ترقی و تحفظ کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ۲۴، ۲۵ر اکتوبر ۱۹۳۶ء کو علی گڈھ میں اردو کانفرنس کے دو عام اجلاس اور ایک خاص مشاورتی جلسہ منعقد ہوا، بنگال، بہار، مدراس اور پنجاب کے متعدد اور صوبہائے متحدہ کے اکثر اہلِ قلم واہلِ ادب واہل الرائے موجود تھے، پہلے عام اجلاس میں صدر استقبالی ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب کی طرف سے کہ وہ بیمار تھے، نواب صدر یار جنگ بہادر نے خطبۂ استقبال پڑھا پھر صدر منتخب جناب راجہ صاحب محمودآباد نے جن کو شاید پہلی دفعہ اس قسم کے مجمعوں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہوگا اپنا خطبۂ صدارت پڑھا، ان خطبوں میں کوئی بات نہ تھی لیکن بہرحال ان سے اجلاس کا رسمی افتتاح ہوگیا، اور کل کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بنادی گئی،

اس سب کمیٹی نے ۲۵ کی صبح سے لے کر دوپہر تک اپنا کام کیا، اور ہندوستانی زبان کو پورے ملک میں پھیلانے، بڑھانے اور ترقی دینے کی تجویزوں پر غور کیا، اور ایک ایسا خاکہ تیار کیا، کہ جس پر چند سال بھی اگر مستعدی وگرم جوشی کے ساتھ کام کیا گیا، تو یقین ہے، کہ ہماری زبان کی جغرافی اور معنوی وسعت اب سے دوچند ہوجائے گی، یہ بھی

طے پایا کہ انجمن ترقی اردو کا مرکز دلی قرار دیا جائے، اور سارے صوبوں اور دیسی ریاستوں میں اس کی شاخیں قائم ہوں، اور ان کے ماتحت ذیلی انجمنیں قائم کی جائیں، اور کوشش کی جائے کہ ہر صوبہ کے سرکاری دفتروں اور درسگاہوں میں ہندوستانی کو وہ حیثیت دی جائے، جس کی وہ مستحق ہے، یہ بھی طے پایا کہ دہلی میں ہندوستانی کا ایک مکمل اشاعت خانہ اور ایک کتب خانہ قائم کیا جائے، انجمن کے لئے تین کمیٹیاں بنائی گئیں، جن میں سے ایک اصلاح زبان و خط و رسم الخط کے مسئلوں پر غور کرے گی، دوسری ادبی مجلس ہو گی جس کے ارکان انجمن کے سلسلۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے متعلق رائیں دیں گے، اور تیسری کمیٹی انجمن کے مطبع اور اشاعت خانہ کے متعلق تجاویز پیش کرے گی،

دوسرے عام اجلاس میں سب کمیٹی کے مجوزہ لائحہ عمل کو پڑھ کر سنایا گیا، اور حاضرین نے بالاتفاق اس کو منظور کیا، اس اجلاس کی صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن نے فرمائی، موصوف نے ہندوستانی زبان اور اس زبان میں تعلیم کے مسئلہ پر ایک مختصر لیکن پر مغز تقریر فرمائی، جس کو حاضرین نے توجہ کے ساتھ سنا، آخر میں نواب صدر یار جنگ بہادر نے صدر کے منصب سے اور مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری نے حاضرین اور منتظمین کے شکریہ کا فرض ادا کیا، اور جلسہ ختم ہو گیا،

یہ کانفرنس اپنی نوعیت کی گویا پہلی کانفرنس تھی، نہ اس میں پرجوش تقریریں ہوئیں نہ ہنگامہ آرا تجویزیں پیش ہوئیں، نہ مجوزین اور موئیدین کے ناموں کی نمائش ہوئی، نہ تجویزوں کی مخالفت اور ترمیم کا شور بلند ہوا، سکون اور اطمینان خاطر کے ساتھ چند کام کرنے والے جمع ہوئے اور اتفاق و اتحاد کے ساتھ سب نے مل کر کچھ تجویزیں پیش کیں اور منظور کیں، اور آیندہ مستعدی کے ساتھ کام کرنے کا تہیہ کیا،

اس کانفرنس کی دوسری خصوصیت اس کی نمایندہ حیثیت تھی، شاید یہ پہلا موقع ہو، جب سیاسیات کے پرسوز تماشوں کے بغیر کچھ سوچنے والے اور کام کرنے والے لوگ

ملک کے مختلف سمتوں سے اکٹھے ہوئے ، اور ان کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی، جس کو دیکھ کر یہ ماننا پڑا کہ اہلِ ملک میں اپنی زبان کی ترقی و تحفظ کا خیال پہلے سے بہت زیادہ ہے، ہمارے لئے یہ بھی تسکین کا باعث تھا، کہ جلسہ میں ہندوستانی زبان کے ہندو اہلِ قلم و اہلِ ادب بھی شریک تھے۔

افسوس ہے، کہ اس جلسہ میں ہندی اور ہندوستانی کا وہ ادیب موجود نہ تھا، جس کا قلم ان دونوں دریاؤں کا سنگم تھا، یعنی منشی پریم چند، ماسوف علیہ نے اسی مہینہ اپنے دوستوں کو آخری الوداع کہا، اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے، ان کے قلم نے کم از کم پچیس برس تک اپنے دیہاتی بھائیوں کی کہانی اپنے شہری بھائیوں کو سنائی، وہ زبان کے پرجوش فصیح و بلیغ نہ تھے، ان کی عبارت تکلف اور بناوٹ سے پاک اور حد درجہ سادہ تھی، ان کی کہانیوں کا اثر ان کی زبان میں تھا، بلکہ ان کے بیان میں تھا، انہوں نے ہمارے دیہاتی تمدن، ہندوستانی وضع و آداب اور ہندی اخلاقی آن بان کی جو تصویریں کھینچی ہیں، وہ ہمارے ادبی مرقع کی زندۂ جاوید مثالیں ہیں،

دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن جو ہمارے ملک میں نادر عربی کتابوں کا واحد اشاعت خانہ ہے، اب وہ اپنی ترقی کے نئے دور میں قدم رکھ رہا ہے، اب اس کے لائق مہتمم ہمارے عزیز مولانا سید ہاشم صاحب ندوی رکن دائرۃ المعارف مقرر ہوئے ہیں، وہ دن رات اس کی ترقی اور دست برد انقلاب سے اس کے بچانے کی فکر میں مصروف رہتے ہیں، چند نئی کتابیں چھپ کر شائع ہوئی ہیں، اور کچھ زیرِ تصحیح اور زیرِ طبع ہیں،

تازہ اشاعت پذیر کتابوں میں سننِ کبریٰ بیہقی کی آٹھویں جلد ہے، جس میں نفقات وحدود و اشربہ کے ابواب ہیں، اور دو نادر کتابیں جوامع کتاب اصلاح المنطق اور کتاب احکام الوقف ہیں۔ اول الذکر کتاب تیسری صدی ہجری کے مشہور ادیب و لغوی ابن سکیت کی مشہور تصنیف اصلاح المنطق کی تہذیب ہے جس کو چوتھی صدی ہجری کے ایک بغدادی ادیب زید بن رفاعہ نے انجام دیا ہے۔

دوسری کتاب قاضی ابو یوسف کے شاگرد ہلال بن یحییٰ الراعی البصری المتوفی ۲۴۵ھ کی تصنیف ہے، اس میں وقف کے مسائل کی تفصیل و تشریح کی گئی ہے، اس میں بیان کا طریقہ بالکل نیا اختیار کیا گیا ہے، یعنی سوال و جواب اور مکالمہ کی صورت میں اور ایک دلچسپ رسالہ امام رازی کے مناظرات پر شائع ہوا ہے، امام موصوف کو ماوراء النہر کے مختلف شہروں میں علمائے وقت سے متعدد مناظرے کرنے پڑے، انہی مناظروں کو امام نے اس رسالہ میں جمع کیا ہے،

خدا کا شکر ہے کہ سیرت نبوی ﷺ کی چھٹی جلد جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس مہینہ مطبع میں دے دی گئی ہے، پوری کتاب شاید تین سو صفحوں میں تمام ہو، اور ۱۹۳۷ء کے آخر میں چھپ کر شائع ہو،

(معارف ماہ نومبر ۱۹۳۶ء)

(۷)

”سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں“

مشتے کہ بعد از جنگ یاد می آید

۶ر نومبر کی فلسطین کانفرنس دہلی میں ایک صاحب نے ۵۰ صفحوں کا ایک رسالہ ”علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں“ کے مطلا عنوان سے مجلد میرے ہاتھ میں دیا، میں نے فرصت کے وقت میں اس کو بغور پڑھا، تو معلوم ہوا کہ ایک صاحب نے بڑی محنت اٹھاکر میری پہلی بڑی تصنیف ارض القرآن سے لے کر ”عربوں کی جہاز رانی“ تک سے میری چند[1] غلطیاں فراہم کی ہیں، اور اس پر حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اور بعض دوسرے اکابر علماء سے مداحانہ تقریظیں لکھوائی ہیں، کتاب میں مجھ پر الزام لگایا گیا ہے، کہ میری تصنیفات سے الحاد و اہمال کے جراثیم پیدا ہوتے ہیں،

---

[1] چار

مجھے اس رسالہ کو پڑھ کر دو خوشیاں ہوئیں، ایک تو یہ کہ میری تصانیف کے ہزاروں اوراق میں بحمد اللہ کہ قرآن پاک کی چند ہی غلطیاں[1] ہیں، دوسری یہ کہ مصنف رسالہ اور ایک دو بریلویوں کو چھوڑ کر ان اکابر علماء نے ان کو صرف "مسامحات" قرار دیا، تکفیر و الحاد کا فتویٰ نہیں دیا،

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

اور یہ مسامحات بھی بیشتر وہی ہیں، جو جامعہ وغیرہ میں پہلے دکھائے جا چکے ہیں. میں بھی اور دلی کے علماء اور ثقاۃ بھی یہ خوب جانتے ہیں، کہ اوراق کے اصلی مصنف کون ہیں،

سر ایں رشتہ زجائے است کہ من می دانم

ان صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس فریب و سازش سے محافظین حدیث و سنّت کو خود ان کے ہم مذہبوں کے ہاتھوں سے قتل نہیں کرایا جا سکتا،

اتنی کاوشوں کے بعد بھی جو مواد فراہم کیا گیا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے، کہ میرے گیارہ اغلاط میں سے دو چھاپنے کی غلطیاں ہیں، جن میں سے ایک کا اعلان حافظ اسلم صاحب جیراج پوری کی تنقید کے جواب میں دو سال ہوئے کہ اسی معارف میں کیا جا چکا ہے، کہ میں نے قط کا ترجمہ چھٹی نہیں بلکہ چیٹھی کیا ہے، اور دوسری یہ ہے، کہ عربوں کی جہاز رانی میں ایک کے بجائے "ہر ایک" پڑھئے، جیسا کہ نفس آیت کے ترجمہ میں ہے، ارض القرآن میں دو اور خطبات میں جس ایک اہم غلطی پر صفحے کے صفحے رنگے گئے ہیں وہ معترض کی قلت تدبر کا نتیجہ ہیں، بقیہ چھ غلطیاں یہ ہیں، کہ مباحث برزخ میں اہل قرآن کے مقابلہ میں میں نے اقوال مفسرین سے

---

[1] صاحب رسالہ نے لکھا ہے، کہ انہوں نے مجھے ان اغلاط کی تصحیح کے لئے کئی خط لکھے، مگر میں نے جواب نہیں دیا. یہ میرے علم میں قطعاً خلاف واقعہ ہے، زمانہ ہوا قرول باغ دہلی سے خطبات مدراس کی ایک مشتبہ عبارت کے متعلق وہی سوال آیا تھا، جو اس رسالہ میں ہے، اور میں نے اس کا جواب دیدیا تھا،

الگ ان آیتوں کے محمل سمجھے ہیں، یعنی جو آیتیں قیامت سے متعلق ہیں، وہ برزخ پر چسپاں کر دی ہیں، اور جو پل صراط کے موقع پر لکھی جانی چاہیئے تھی، وہ بہشت کے موقع پر لکھدی ہے، اگر اقوال مفسرین سے اتنا بھی اختلاف الحاد ہے، تو مفتی کو تنہا غریب سید سلیمان کے نہیں، بلکہ بڑے بڑے علماء کے الحاد کا فتویٰ دینا ہوگا،

مسئلہ عدم خلود نار پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی بناء پر اگر یہ ہنگامہ ہے، تو پہلے یہ ...... ہنگامہ بعض مشاہیر صحابہؓ[1]، بعض تابعینؒ اور مفسرینؒ کے اور خصوصیت سے امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے خلاف برپا کرنا چاہیئے، حافظ ابن قیمؒ نے حادی الارواح اور شفاء العلیل میں اس پر ۲۵ دلیلیں قائم کی ہیں، اور ابن تیمیہ نے لکھا ہے، کہ اہلسنت کے ایک گروہ کا یہ مسلک ہے، سید سلیمان کا سوائے اس کے کوئی قصور نہیں، کہ اس نے حافظ ابن قیم کے خیالات کی ترجمانی... اردو میں کر دی ہے، جن لوگوں کو اس مسلک سے اختلاف ہے، ان کو سید سلیمان کے بجائے بعض صحابہؓ، بعض تابعینؒ، بعض مفسرین اور ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے خلاف زور آزمائی کرنی چاہیئے،

بہر حال یہ سب تو غالب کے مقطع کی سخن گسترانہ باتیں تھیں، اب میں رسالہ کے اصلی و نقلی دونوں مصنفوں کو اگر وہ نیک نیت ہیں، تو بشارت، اور اگر وہ اس سے محروم ہیں، تو یہ پرحسرت پیام سناتا ہوں، کہ ان قرآنی غلطیوں کی تصحیح کئی سال پہلے دوسرے اڈیشن میں کر دی گئی ہے۔ کچھ کی اب کر دی گئی ہے اور پہلے ایڈیشن کے جو نسخے اسٹاک میں ہیں ان میں بھی تصحیح کر دی گئی ہے اور مسئلہ نار میں جمہور مسلک کا صاحب رسالہ سے زیادہ مدلل ہے اس میں پہلے ہی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ واستغفر اللہ ربی من کل ذنب وسوء عقیدة فی الدین۔

---

[1] حسب روایات مفسرین۔ س

(معارف ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء)

شذرات

(ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۷ء تا ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء)

سنہ ۱۹۳۷ء سے معارف کا بائیسواں سال شروع ہوا، ہندوستان کی ناموافق آب و ہوا میں جہاں ہر سال سیکڑوں رسالے پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، معارف جیسے بے لطف رسالہ کا اتنے دنوں جی جانا اس کی بڑی کامیابی ہے، لوگ شعر و سخن کے چٹخارے، ادب لطیف کے آب و نمک اور بے معنی عبارت آرائی کے خوگر ہو گیے ہیں، اس حال میں اگر کچھ ایسے قدردان بھی ہوں، جو معارف کے دسترخوان کے روکھے پھیکے کھانوں کو پسند کریں تو یہ اس کے مہمانوں کا حسن اخلاق ہے۔

دار المصنفین نے اپنی بائیس برس کی زندگی میں سیرۃ نبوی کی پانچ ضخیم جلدوں اور دوسری بعض تالیفات کو چھوڑ کر جو اس سلسلہ سے باہر ہیں، ہر علم و فن کی پچاس اور سلسلہ سے باہر کی کتابوں کو ملا کر ستر کتابیں شائع کی ہیں، یہ فلسفہ، ادب، تاریخ، سوانح اور دوسرے متفرق مضمونوں پر ہیں۔

مولانا شبلی مرحوم جب شعر العجم لکھ رہے تھے، تو ان کو یہ خیال بھی نہ تھا، کہ وہ اتنی مقبول ہوگی کہ ایک طرف انگلستان کا سب سے بڑا مستشرق اس سے فائدہ اٹھائے گا، اور دوسری طرف ایران و عجم کے مشتاق اس سے بہرہ مند ہوں گے، شعر العجم کی دو پہلی جلدوں کے فارسی ترجمے پہلے نکل چکے تھے، اب کابل کی مجلس ادبی کی طرف سے اس کی تیسری جلد کا فارسی ترجمہ شائع ہوا ہے، اس کے فارسی مترجم سرور خاں گویا خود فارسی ادبیات کے ذوق شناس ہیں، اس لیے اس کا ترجمہ بھی بہت اچھا ہوا ہے، امید ہے کہ اس "قند ہندی" سے ایران و کابل کے طوطیان سخن "شکر شکنی" کا لطف اٹھائیں گے،

اب افغانستان بھی تالیف و تصنیف کے نئے طرز سے آشنا ہو رہا ہے، اس سلسلہ کی سب سے زیادہ مثال "حکیم سنائی" ہے، جس کو خلیل اللہ خاں خلیلی نے تالیف کیا ہے، اور جس میں حکیم موصوف کے سوانح، تصنیفات اور معاصرین کی تحقیق کی ہے، عمدہ ٹائپ میں اچھے کاغذ پر صفائی کے ساتھ چھپی ہے،

دو برس پہلے ایران میں فردوسی کی جو یادگار برسی منائی گئی تھی، اس میں ہندوستان اور کابل کے بعض اہل علم شریک ہوئے تھے، ان میں سے کئی دوستوں کی زبانی یہ سنا کہ خاکسار کی کتاب خیام کی قدر یورپ کے مستشرقوں اور ایران کے ادیبوں نے یکساں کی، اور فرمائش کی گئی، کہ اس کا فارسی ترجمہ جلد شائع کیا جائے، اس کے لیے تقاضا تو ایک سال سے تھا، مگر دوبارہ نظر ثانی اور ترمیم و اضافہ کے خیال سے ابھی تک تعمیل نہیں کی گئی، گذشتہ رمضان کی فرصت اس "بادہ خوار" کے سوانح پر نظر ثانی کے نذر ہوئی، جس نے سرخوش ہو کر کہا تھا

ماہ رمضاں برفت و شوال آمد
ہنگام نشاط و عیش و قوال آمد

تصحیح اور اضافہ کے بعد اب یہ نسخہ کابل بھیجا جا رہا ہے، امید ہے، کہ جلد اس کا ترجمہ بلخ و نیشاپور تک پہنچ جائے، جن کو صاحب سوانح اپنے قافلۂ عمر کا گذرگاہ سمجھتا ہے۔

اب ہندوستان میں بھی خوبصورت ٹائپ میں فارسی کتابوں کی چھپائی کا کام ترقی کر رہا ہے، کئی سال ہوئے کہ "سخنور ان ایران" دلی کے جامعہ پریس میں چھپی تھی، اب بمبئی (بھنڈی بازار) میں ابنائے شرف الدین نے عربی و فارسی کے ٹائپ کا جو مطبع قائم کیا ہے، اس میں مولانا جامی کی "سلامان و ابسال" بہت صاف اور خوشخط عمدہ کاغذ پر چھپی ہے، قیمت فی جلد ۸؏، قیمت مجلد ـــ

سلطان محمد تغلق کے بعد مصر کے بھائیوں کو سب سے پہلی دفعہ اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں کا خیال آگیا ہے، مصر کے نوجوان مسلمانوں کی انجمن (جمعیۃ الشبان المسلمین) کی طرف سے ہندوستان کے تعلیمی و مذہبی حالات کی تحقیق کے لیے ایک وفد اس مہینہ میں آیا ہے، یہ وفد ایک صدر اور چند ممبروں پر مشتمل ہے، صدر حضرت علامہ ابراہیم خیالی اور ممبر شیخ عبدالوہاب تجار اور شیخ محمد عدوی وغیرہ ہیں، جمعیۃ کے رئیس ڈاکٹر عبدالحمید سعید کا خط آیا ہے، کہ ان بزرگوں کو ہندوستان کے علمی و تعلیمی و مذہبی حالات کے مطالعہ کا موقع دیا جائے اور اتحاد اسلامی کی اس فرصت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ایک روسی پروفیسر ڈاکٹر ذکی ولیدی نے روسی زبان میں اس موضوع پر کہ مشرقی اور مغربی فضلاء

مل کر کس طرح اسلامی علوم کی تحقیقات کو ترقی دے سکتے ہیں"، ایک مضمون لکھا ہے، بھوپال سے ایک دوست نے اس کا اقتباس اصل روسی اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ بھیجا ہے، جس کو آپ آیندہ تلخیص میں پڑھیں گے۔

اس مضمون میں پہلے سر سید اور مولانا شبلی کا نام ہے، اور اس کے بعد ہمارے دوست ڈاکٹر حمید اللہ (جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن) کا ذکر ہے، جن کے ان مقالوں پر جو فرانسیسی میں انھوں نے لکھے تھے، بہت تعریف کے ساتھ یہ اظہار خیال کیا ہے، کہ مذہبیت کے ساتھ اس کی تحقیق کا معیار بہت اونچا ہے" ہم اپنے دوست کو ان کی اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور ان مسلمان یورپ زدہ علمی ڈاکٹروں کے لیے نمونہ پیش کرتے ہیں، جو اپنی کامیابی کا ذریعہ علمائے یورپ کی تحقیقات کی اندھی تقلید کو سمجھتے ہیں۔

(معارف ماہ جنوری ۱۹۳۷ء)

(۲)

دکن کا جشن سیمیں

یہ رسالہ جب آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا، تو اعلیٰ حضرت سلطان العلوم حضور پر نور فرماں روائے کشور دکن و برار خلد اللہ ملکہ، کا جشن سیمیں ممالک محروسہ اور بیرون ممالک میں شروع ہو چکا ہوگا، اعلیٰحضرت کے دور حکومت کو فرماں روایان آصفیہ کے درمیان وہی امتیاز ہے، جو خلیفہ مامون الرشید کے عہد کو خلفائے عہد عباسیہ کے درمیان، علوم و فنون کی اشاعت، تعلیم کی ترقی، عمارات کی تعمیر، دفاتر کی تنظیم، نظم و نسق کی درستی، رعایا کی خیر خواہی، اور ان کی بھلائی کی مفید تجویزیں، عہد عثمانی کے خاص برکات ہیں، یہ بھی عجیب حسن اتفاق ہے، کہ عین اس وقت جب حضور کے بست و پنج سالہ عہد حکومت کا جشن منایا جانے والا تھا، دولت آصفیہ کا پرچم ایک نئے ملک پر جو تقریباً اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، پھر لہرانے لگا، یہ مصالحانہ فتح اعلیحضرت کے ناخن تدبیر اور وزرائے آصفیہ کے حسن سعی سے حاصل ہوئی ہے، لیکن اس سلطنت کے سیاسی حدود سے وسیع تر اس کے علمی و تعلیمی حدود ہیں، جو ہمالیہ کی چوٹیوں سے لیکر بحر شور کے

کناروں تک پھیلے ہیں۔

اس جشن سیمیں کے ابر گہربار کے چند سیمین چھینٹے دار المصنفین کے دامن تک بھی پہنچے ہیں، اعلحضرت نے پانچ برس کے لیے دار المصنفین کی دو سو ماہوار کی مزید امداد منظور فرمائی ہے، اور گذشتہ دو برس چند مہینوں کی رقم چھ ہزار چھ سو پچاس روپیے محکمۂ امور مذہبی کے ذریعہ سے دار المصنفین کو عطا کردی گئی ہے، دار المصنفین ہرچند دکن سے دور ہے، مگر اس میں شبہہ نہیں، کہ اس کی سیرابی دکن ہی کے سرچشمۂ حیات سے ہے۔

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہاں باں را
نظام الملک آصفجاہ عثماں علی خاں را

گذشتہ ۱۶ - ۱۷ - ۱۸ جنوری ۱۹۳۷ء کی نمائش گاہ میں ہندوستانی اکاڈیمی کی ادبی کانفرنس کے جلسے ہوئے، حسب دستور پہلا اجلاس اردو ہندی کا مشترک تھا، جس میں صدارتی خطبے پڑھے گیے، اور باقی دنوں میں اردو ہندی کے الگ الگ جلسے ہوئے جن میں مضمون پڑھکر سنائے گیے، اردو حصہ میں سید سجاد حیدر صاحب نے ہندوستان کے لیے رومن خط کی تجویز پیش کی، اور پروفیسر مہیش پرشاد نے مرزا غالب کے سہرے پر، مجنوں گورکھپوری نے کلام آسی پر، مولوی احمد کرم صاحب اعظمی نے اردو ہندی بھائی چارہ پر، مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدی نے مرزا جہانگیر کے مقبرے پر، مرزا محمد عسکری صاحب نے فسانۂ آزاد پر، ڈاکٹر آغا مہدی حسن (آگرہ یونیورسٹی) نے ہندوستان میں تاریخ نویسی پر، اور مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے اکبر الٰہ آبادی کی معاشرتی شاعری پر محققانہ اور دلچسپ مضمون پڑھکر سنائے، عثمانیہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، آگرہ یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی اور پٹنہ یونیورسٹی کے نمائندے شریک تھے۔

ہندی اور اردو کے آسان لکھے اور بولے جانے پر سر تیج بہادر سپرو اور صدر اردو کانفرنس اور بہت سے مقرروں نے زور دیا، لیکن ہر ایک تقریر کا توڑ اس پر تھا، کہ جب تک ہندو مسلمانوں کے دل نہیں ملیں گے، زبان ایک نہیں ہوسکتی، لیکن سوال یہ ہے کہ دل کیونکر ملیں، پالٹکس میں ان کی علحدگی تو کھلی ہوئی ہے، لیکن انتہا یہ ہے کہ جس ادبی کانفرنس کے ذریعہ ہم ان کو ایک کرنا چاہتے ہیں، اس میں بھی دونوں مل کر نہیں بیٹھے،

اردو اور ہندی کے بہت سے ادیب یہاں جمع تھے، مگر دونوں دو خیموں میں تھے، ایک نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، اور ایک دوسرے کی سننا اور سمجھنا تو بعد کی چیز ہے، کیا یہ حد درجہ افسوسناک نہیں،

پچھلے پرچہ میں شعر العجم جلد سوم کے فارسی ترجمہ کی جو خبر دی گئی تھی، اس سلسلہ میں یہ مزید تفصیل معلوم ہوئی ہے، کہ جلد اول و دوم و سوم و پنجم کا فارسی ترجمہ کابل میں اور جلد چہارم کا مع رسالہ کتب خانہ اسکندریہ کے ایران میں ہوا ہے، اس طرح کتاب کی پوری جلدوں کے ترجمے کابل و ایران نے مل کر پورے کر دیئے ہیں۔

اردو کی یہ خوش قسمتی کیا کم ہے، کہ اس زبان کی تصانیف کے فارسی اور ترکی میں ترجمے ہوں، اس سلسلہ کی نئی کڑی شمس العلماء آزاد مرحوم کی کتاب "سخندان فارس" کا فارسی ترجمہ ہے، یہ ترجمہ ملک الشعرائے افغانستان قاری عبد اللہ خاں کے قلم کا رہین منت ہے۔

یہ کتنے افسوس کی بات تھی کہ تاریخ ابن خلدون جیسی اہم کتاب کا کوئی صحیح اور مکمل اڈیشن شائع نہیں ہوا تھا، جو مطبوعہ نسخہ ہاتھوں میں ہے، وہ جابجا سے ناقص اور سقیم ہے، اس سلسلہ میں معارف میں بھی ایک تحریر چھپی تھی، اب یہ خبر مسرت کے ساتھ معلوم ہوئی ہے، کہ آج کل اس کے ایک نئے صحیح اور مکمل نسخہ کی تیاری عمل میں آرہی ہے، مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ سے جو اس نے سلطان مغرب کو ہدیہ دیا تھا، اور جو کتب خانہ قرویہ واقع فاس (مراکش) میں موجود تھا، اور شنقیطی کے مصحح نسخہ سے جو دار الکتب مصریہ میں تھا، اور احمد تیمور پاشا مرحوم اور احمد زکی پاشا مرحوم کے نسخوں سے مقابلہ کر کے نیا نسخہ تیار کیا گیا ہے، چنانچہ موجودہ مطبوعہ تیسری جلد کے ص ۲۲ سے ۶۰ صفحے ناقص پائے گئے۔ جو اضافہ کیے گئے اطمینان کی مزید بات یہ ہے کہ امیر شکیب ارسلان نے اس پر حواشی اور تعلیقات لکھے ہیں، اور نئے اسلوب سے متعدد فہرستیں اس میں شامل کی گئی ہیں۔

۵۰۰

یہ نسخہ چودہ جلدوں میں مکمل ہوگا، اور ایک ایک جلد کر کے شائع ہوگا، ہر جلد میں قریب قریب پانچسو صفحے ہوں گے، اور ہر جلد کی قیمت چار روپیے ہوگی، اور ہندوستان میں مکتبہ عربیہ اورینٹ ہوٹ بلڈنگ کرافٹ مارکٹ بمبئی نمبر ۳ سے ملے گی۔ (معارف ماہ فروری ۱۹۳۷ء)

(۳)

آئینی مجلسوں کے پچھلے انتخابات نے مسلمانوں کے سامنے عبرتوں کے دفتر کھول دیئے ہیں، اب یہ حقیقت بے نقاب ہوگئی، کہ کونسلوں کی ممبری قومی اور ملکی خدمتوں کا ذریعہ ہے، جاہ واعزاز کے حصول کا اب وہ پرانا وسیلہ نہیں رہی، ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوگیا، کہ اب شخصی انتخاب کی جدوجہد بالکل بے معنی ہے، جو کچھ ہے، وہ اب سیاسی جماعتوں کے افراد کی حیثیت سے ممکن ہے، اس نئے انتخاب کے بعد بڑے بڑے اشخاص کی حالت یہ ہے کہ

اکیلے پھر رہے ہیں یوسف بے کارواں ہوکر

لیکن ہم کو جس بات کی طرف اس وقت اشارہ کرنا ہے، وہ سیاسی رجحانات کے بجائے شخصی انتخابات کی بنا پر اخراجات کی وہ عظیم الشان میزان ہے، جس کو مسلمان قوم کبھی برداشت نہیں کرسکتی، ہم کو بہار اور یوپی صوبہ کے متعدد باہمت مسلمانوں کا حال معلوم ہے، جو مہاجنوں سے قرض لے کر یا اپنی جائداد اور مکانوں کو رہن رکھ کر یہ لڑائی لڑے ہیں، اب اگر وہ جیتے ہیں، تو بھی ہارے ہیں، اور اگر ہارے ہیں، تو اپنے ساتھ اپنے خاندان کو بھی لے ڈوبے ہیں۔

ضرورت اس کی ہے کہ آئینی مجلسوں کی رکنیت کو نام ونمود اور عزت وجاہ کا ذریعہ نہ سمجھا جائے اور نہ بنایا جائے، بلکہ وہ ملک کے سیاسی خادموں کی جماعت سمجھی اور بنائی جائے، اور قومی حیثیت سے اس اہم کے لیے سرمایہ جمع کیا جائے، اور قوم لائق ممبروں کو چن کر اپنی نمایندگی کا امیدوار قرار دے کہ مسلمانوں کی سیاسی تباہی کے ساتھ مالی تباہی بھی لازمی ہے،

اس الیکشن کی خاص حیثیت نے یہ بھی بتا دیا کہ بعض مسلمان اہل سیاست کا صوبوں میں چند مسلمان نشستوں کے اضافہ پر اصرار سراسر لاحاصل ہے، ہر اقلیت خواہ وہ کتنی ہی ...... کم ہو، کسی سمجھوتے کے بغیر پوری اکثریت کے مقابلہ میں ناچار ہے، اس لیے چند نشستوں کی کمی بیشی فیصلہ پر کوئی اثر نہیں رکھتی،

مارچ کی آخر تاریخوں میں مسلمانوں کی پرانی تعلیمی انجمن مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی علی گڑھ میں پنجاہ سالہ

جوبلی ہے، اس تقریب سے اس کانفرنس کے ساتھ بہت سے شعبوں کے الگ الگ اجلاس بھی ہوں گے، امید ہے کہ مسلمانوں کی معقول تعداد ان جلسوں میں شرکت کرے گی، خدا کرے یہ صرف جلسوں اور جلوسوں تک محدود ہو کر نہ رہ جائے، بلکہ اس میں مسلمانوں کی پچھلی پچاس برس کی تعلیمی جد و جہد پر صحیح تبصرہ ہو، اور آیندہ کے لیے کوئی مفید پروگرام تیار ہو۔

انگریزی تعلیم گاہوں میں یہ شکایتیں عام ہو رہی ہیں، کہ مسلمان طالب علم عربی بہت کم لے رہے ہیں، اور ان کی تعداد ہر سال گھٹ رہی ہے، اگر یہ کہا جائے، کہ اس جدید دور میں قدیم کے ساتھ نوجوانوں کی محبت کم ہو جانے کی وجہ سے یہ صورت حال ہے، تو دوسری طرف اس کے برخلاف یہ نظر آ رہا ہے، کہ سنسکرت پڑھنے والے ہندو طالب علموں کی تعداد میں علانیہ اضافہ ہو رہا ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ ہر شہر میں ایسی انجمنیں قائم ہوں، جو عربی پڑھنے والے طالب علموں کو وظیفہ دے کر ان کا دل بڑھائیں، ہم کو معلوم ہوا ہے، کہ الہ آباد میں اس قسم کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے، ایسی ہی انجمنیں ہر شہر میں قائم ہونی چاہییں۔

یہ بھی ممکن ہے، کہ صوبہ میں مسلمانوں کے جو بھی چند اسکول ہیں، ان میں عربی لینے والے طالب علموں کے ساتھ فیس کی خاص رعایت کی جائے، اور عربی کے معلموں کو چاہیے، کہ صرف و نحو کی تعلیم کے نئے آسان اصولوں سے واقف ہو کر انھیں نئے طریقوں سے تعلیم دیں، تاکہ وہ کم سے کم وقت میں کچھ نہ کچھ سیکھ لیں۔

مصر کی وزارت اوقاف نے ملک کے اہل قلم حضرات سے ایک میلاد نامہ کی فرمایش کی تھی، جس کا انتخاب مقابلہ سے ہوا، اس مقابلہ میں سب سے بہتر رسالہ شیخ عبد اللہ عفیفی کا قرار پایا ہے، اور شیخ ازہر نے حکم دیا ہے کہ پرانی طرز کے میلاد ناموں کے بجائے ہر جگہ اس کو پڑھا جائے، رسالہ گو نظم و نثر اور درود و سلام پر بدستور مشتمل ہے، تاہم روایتوں کی صحت اور افادیت کا پہلو اس میں ملحوظ رکھا گیا ہے، محمد علی مرحوم بھی اپنے ملک میں اسی قسم کا رسالہ چاہتے تھے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ سے جن کتابوں کی تعریف سنی تھی، اور وہ خود بھی ان کے مشتاق تھے، ان میں سے ایک کتاب "فتوح البلدان" کے مشہور مصنف احمد بن یحییٰ بلاذری المتوفی سنہ ۲۷۹ھ کی تصنیف "انساب الاشراف" ہے، ابن ندیم نے اس کا نام "کتاب الاخبار والانساب" لکھا ہے، اس زمانہ میں اس کے صرف ایک ہی مکمل نسخہ کا پتہ چلا ہے، اور وہ قسطنطنیہ میں ہے۔

فلسطین میں یہودی آبادی کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہاں ایک عبرانی یونیورسٹی بھی قائم ہوئی ہے، اس یونیورسٹی میں علوم مشرقیہ کا بھی ایک شعبہ ہے، جس کا انگریزی نام "اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز" ہے، اس شعبہ کی طرف سے ایس، ڈی، ایف گوئٹین (goitein) نے اس کتاب کی پانچویں جلد ۱۹۳۶ء میں چھاپ کر شایع کی ہے، باقی جلدیں بھی طبع ہوں گی، دلچسپ چیز یہ ہے کہ مصنف نے اس کا مقدمہ عبرانی میں لکھا ہے، اس جلد میں حضرت عثمانؓ اور مروان اور مختار و مصعب بن زبیر کے حالات ہیں۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ کی عام تاریخوں کے برخلاف سنہ کی ترتیب کے بجائے خاندانوں کی ترتیب سے حالات لکھے گیے ہیں، روایتوں کی سندیں دیکھنے سے افسوس ہوا کہ اس میں مدائنی وغیرہ کے ذریعہ سے واقعات نقل کیے گیے ہیں، ہندوستان میں یہ جلد بیس روپیے میں حبیب اینڈ کمپنی تاجرین کتب اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے ملے گی۔

(معارف ماہ مارچ ۱۹۳۷ء)

(۴)

مارچ کا آخری ہفتہ ہماری تعلیمی کانفرنس علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا تھا، ۲۶ سے لے کر ۲۹ تک دن رات کانفرنس کے کئی کئی شعبوں کے اجلاس ہوتے رہے، ان میں سے شعبۂ تعلیم ابتدائی، شعبۂ تعلیم ثانوی، شعبۂ تعلیم اعلیٰ، شعبۂ مدارس اسلامیہ، شعبۂ علوم و فنون اسلامی، شعبۂ اردو، شعبۂ اقتصادیات وغیرہ شعبوں کے الگ الگ جلسے الگ الگ صدر نشینوں کے زیر صدارت مختلف تاریخوں میں ہوئے، جہاں تک عالمانہ مقالوں اور فاضلانہ خطبوں کا تعلق ہے، کانفرنس کا یہ اجلاس بیحد کامیاب ہوا، اگر اہل کانفرنس ان مقالوں اور خطبوں کا ایک مجموعہ جلد از جلد شائع کر سکیں تو قوم کے ہاتھوں میں وہ آئینہ دیدیں گے، جس سے اس کو اپنے چہرہ کا ہر خط و خال نمایاں نظر آجائے گا۔

کانفرنس میں سب سے پہلی اور سب سے اہم تجویز مسلم یونیورسٹی میں ایک صنعتی کالج کے قیام کی تھی، جس کے لیے قوم سے تیس لاکھ کا مطالبہ کیا گیا تھا، مگر مجوز صاحب کے انداز سے معلوم ہوتا تھا، کہ وہ نہ صنعتی کالج قائم کرنا چاہتے ہیں، اور نہ سنجیدہ طور سے انھوں نے اس کو پیش کیا ہے، بلکہ مقصود یا تو چندہ تھا، یا قوم کے مطالبہ کی دفع الوقتی

اس لیے یہ تجویز صرف سنا دی گئی، اس کے عملی طریقوں اور مشکلوں پر گفتگو نہیں ہوئی۔

مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کے بدیر رواج پانے اور نئی تعلیم میں پیچھے رہ جانے کا حقیقی سبب مدتوں تک یہ بتایا جاتا رہا ہے، کہ علمائے کرام نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ لیکن چند سال کے بعد جب مسلمان صنعتی تعلیم میں پیچھے رہ جائیں گے، تو معلوم نہیں اس کا الزام کس کے سر دھرا جائے گا، کیونکہ معلوم رہے کہ علمائے کرام نے صنعتی تعلیم کے کسی شعبہ کی تعلیم کو ابھی تک حرام نہیں قرار دیا ہے، بایں ہمہ سرکاری منصب کے خواہش مندوں کی جماعت میں ابھی تک ادھر توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔

زمانہ روز بروز یہ ثابت کر رہا ہے، کہ کسی قوم کی ترقی کا معیار یہ نہیں ہے، کہ اس میں کتنے جج، کتنے ڈپٹی، کتنے انسپکٹر اور کتنے وکیل ہیں، یہ غلاموں کی ذہنیت تھی، اور ہے، کہ ہم غلام آپس میں اس پر فخر کرتے ہیں، کہ ہم میں سے کتنوں کو بادشاہ کی طرف سے زریں طوق اور زریں کمر اور زریں تمغے ملے ہیں، ترقی کا معیار یہ ہے کہ ہم میں کتنے عالم، کتنے محقق، کتنے مجاہد، کتنے کارفرما پیدا ہوئے ہیں، ہم میں زندگی کی طاقت کتنی پیدا ہوئی ہے، اور ہماری زندگی کے مختلف شعبوں میں کتنی چہل پہل اور عملی رونق آئی ہے۔

کانفرنس نے اس سلسلہ میں ایک اچھا کام یہ کیا ہے، کہ مسلمانوں کے پچھلے پچاس سال کے تعلیمی کاروبار اور آگے کے پروگرام پر اہل فکر اصحاب سے مبسوط اور مدلل مضمون لکھوائے ہیں، ان میں سے بعض بعض مضمون بہت اچھے ہیں، اور اس قابل ہیں، کہ ان کی روشنی میں ہم آئندہ کا پروگرام طے کر سکیں۔

ہم کو مسلمانوں کی زندگی کی ہر روش میں یہ نظر آ رہا ہے، کہ ان مسلمانوں اور ان کے رہنماؤں میں زمانہ کے اثرات کا بعد بڑھتا جاتا ہے، قوم کے نوجوان کہیں اور جا رہے ہیں، اور ان کے بوڑھے رہنما کہیں اور جانا چاہتے ہیں، اور دونوں کے ذوق، میلان اور منزل مقصود کے تخیل میں اتنا فرق پیدا ہو گیا ہے، کہ دونوں کا ہم سفر رہنا سخت مشکل بلکہ محال ہوتا جاتا ہے، یہی سبب ہے، کہ نوجوان اپنے اکثر رہنماؤں کے ساتھ عقیدت اور ان کی اطاعت چھوڑ رہے ہیں، اور رہنما اپنی قوت و طاقت کھو رہے ہیں، اب موقع ہے کہ علمائے روشن ضمیر آگے بڑھیں، اور نوجوانوں کی رہنمائی کا صحیح فرض انجام دیں۔

علی گڑھ کانفرنس میں امسال ایک علمی و تعلیمی نمائش بھی تھی، علمی حصہ میں بہت سے شاہی فرامین اور

و فارسی کی قلمی کتابیں، اور خوشنویسوں کے ہاتھوں کے قطعے، اور مصوروں کے ہاتھوں کی تصویریں تھیں، اردو کی قلمی کتابیں ہمارے دوست ڈاکٹر سید حفیظ صاحب (الہ آباد) کی، اور فارسی کتابیں مولوی ظفر حسن صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمۂ آثار قدیمہ آگرہ کی تھیں، ان میں سے دو کتابیں خاص کر ذکر کے قابل ہیں، ایک شہزادہ دارا شکوہ کا فارسی دیوان جس میں شہزادہ کا تخلص قادری تھا، اور دوسرا تزک عالمگیری، معلوم نہیں یہ دوسرا نسخہ کیا تھا،

بہت دنوں سے جی چاہتا تھا کہ اسلامیہ اسکول اٹاوہ کو جس کی تعریفیں اکثر کانوں سے سنا کرتے تھے، اپنی آنکھوں سے دیکھیں، علی گڑھ سے واپسی میں ۳۰ر مارچ کو اٹاوہ اترے، اسکول کو دیکھا، اس کے تینوں بورڈنگ دیکھے، اس کا کتب خانہ اور تاریخی نمائش خانہ دیکھا، وہاں کے استادوں سے ملنا ہوا، لڑکوں کا رہنا سہنا دیکھا، خوشی ہوئی کہ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا، مولوی بشیر الدین صاحب جیسے انتھک، کام کے دھنی، منیجر، اور مولوی سید الطاف حسین صاحب جیسے نیک، سادہ اور محنتی ہیڈ ماسٹر اگر ہمارے دو چار اسلامی اسکولوں کو بھی مل جاتے، تو ہماری تعلیمی درماندگی بہت کچھ کم ہو جاتی،

اہل علم کو یہ سن کر خوشی ہوگی، کہ دائرۂ معارف نعمانیہ حیدر آباد دکن کی طرف سے مولانا ابو الوفا قندھاری نے قاضی ابو یوسف کی کتاب "الآثار" تصحیح و تعلیق کے بعد مصر سے چھپوا کر شائع کی ہے، کتاب الخراج کے بعد قاضی صاحب کی یہ دوسری کتاب اہل علم کے حلقہ تک پہنچی ہے،

(معارف ماہ اپریل ۱۹۳۷ء)

(۵)

ذی حجہ ۱۳۵۵ھ کے معارف میں "ذبح عظیم" پر جو مضمون شائع ہوا ہے، اس کو پڑھ کر میرے ایک خیر خواہ دوست نے مجھے لکھا ہے، کہ آپ نے "ذبح عظیم" کی تفسیر رویائے تمثیلی مان کر "روحانی قربانی" کرنے میں غلطی کی ہے، اس سے بعض اسلامی مسائل پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے، جب میں نے اس نظر سے مضمون مذکور پڑھا، تو مجھے بھی یہی غلطی محسوس ہوئی، اور ظاہر ہوا کہ میرا اصلی مقصود واضح نہیں ہوا، بلکہ نقص تعبیر سے مضمون مذکور میں تضاد سا پیدا ہو گیا ہے، یعنی یہ کہ ایک طرف بعض مفسرین کی تفسیر کے مطابق "ذبح عظیم" سے

سنت اضحیۂ اسلام کو مراد لینا صحیح بتایا ہے، اور آگے بڑھکر اس سے روحانی قربانی مراد لی ہے، میں اپنی اس غلطی سے شرمندہ ہوں، خدا معاف فرمائے،

میرا اصلی مقصود یہ تھا کہ "ذبح عظیم" کی صحیح تفسیر جانور کی وہی قربانی ہے، جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ذبیح بیٹے کے بدلہ میں کی تھی، اور جو ملت ابراہیمؑ میں سنت قرار پائی، مگر یہ قربانی درحقیقت جس طرح ان مقدس باپ بیٹوں کی ربانی اطاعت و فرماں برداری اور جاں سپاری کی تمثیل تھی، ایسے ہی آج بھی اسلام میں یہ قربانی مسلمانوں کے انہی جذبات کی تمثیل ہے، یہی وجہ ہے کہ قربانی کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ والی یہ دعا پڑھتے ہیں:

ان صلوتی ونسکی ومحیای	میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا،
ومماتی للّٰہ رب العالمین	اور میرا مرنا اللّٰہ کے لیے ہے، جو عالم کا
وبذٰلک امرت وانا	پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں
اول المسلمین۔	اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے، اور میں
	فرماں بردار ہوں، میں پہلا مسلمان ہوں،
عام مسلمان کہتے ہیں	(اور میں مسلمانوں میں سے ہوں)

کیونکہ اس راہ کی اولیت و پیشوائی حضرت ابراہیمؑ کے لیے ہے، اور عام مسلمان اس میں ان کے تبع اور پیرو ہیں۔

اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی قربانی کی غرض وغایت مسلمانوں کی دلی کیفیت یعنی تقویٰ کو قرار دیا ہے، فرمایا

لن ینال اللّٰہ لحومھا ولا	خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں
دماھا ولکن ینالہ التقویٰ منکم	پہنچتا، بلکہ تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے،

ہمارے یہاں تاریخ ہند کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اس کی پہلی جلد تاریخ سندھ پر مشتمل ترتیب پا چکی ہے، اب غزنویہ کا دور زیر تالیف ہے، بمبئی کے ایک مرحوم مسلمان ہیڈ ماسٹر کے ترکہ سے اس کی تیسری جلد کے لیے پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی کے ذریعہ سے مرحوم کے عزیزوں نے پانچسو روپیہ دینا منظور کیا ہے، جس

میں سے ڈھائی سو کا چک دفتر میں وصول ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو مغفرت اور ان کے عزیزوں کو اس کا اجر عطا فرمائے،

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد اسلام کی تاریخ کا سب سے درخشاں عہد حضرات تابعین کا ہے، سیر الصحابہ کے بعد دار المصنفین کے رفیق مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب نے تابعین کے سوانح پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے، جو اس سال پریس میں چھپنے کو جا رہی ہے۔

سلف امت نے خدا ان پر رحمت فرمائے، اپنے پچھلوں کے لیے علم و فضل کی جو یادگاریں چھوڑی ہیں، حق یہ ہے کہ وہ اسلام کا معجزہ ہیں، علمائے اسلام میں جس قدر اپنے بزرگوں کے تبرکات کی قدر بڑھتی جاتی ہے، یہ "کنز مخفی" اپنے گوشوں سے نکل نکل کر وقف عام ہو رہا ہے، افسوس ہوتا ہے کہ زمانہ کی ناقدری سے جب ان علوم میں خزاں کا دور ہے، ان کی کتابوں کی اشاعت کا موسم بہار ہے۔

اسلام کے مسائل مالیہ میں ایک مدت تک صرف قاضی ابو یوسف کی کتاب "الخراج" لوگوں کے ہاتھوں میں رہی، کچھ سال ہوئے کہ اسی بحث پر سنہ ۱۳۴۷ء میں یحییٰ بن آدم قرشی المتوفی سنہ ۲۰۳ھ کی کتاب الخراج، مطبعہ سلفیہ مصر سے چھپ کر شائع ہوئی، اس کے بعد دائرۃ المعارف حیدر آباد سے قاضی ابو یوسف اور امام زفر کے شاگرد ہلال بن یحییٰ بن مسلم رائی کی کتاب الوقف منظر عام پر آئی، اور اب ابو عبید قاسم بن سلام المتوفی سنہ ۲۲۴ھ کی کتاب الاموال شائع ہوئی ہے، ازہر کے ایک فاضل عالم محمد حامد الفقی نے اس کی تصحیح کی ہے، اور اس پر مفید حاشیے لکھے ہیں، اسلام کے مالی مسائل پر ایسی وسیع اور مفید تصنیف کوئی نہیں شائع ہوئی، تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے کیسے کیسے اچھے اور اچھوتے مضمونوں پر کیسی عمدہ عمدہ کتابیں لکھی ہیں۔

مارچ کے شذرات میں انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے مسلمان طالب علموں میں عربی زبان کی تعلیم کی نسبت جو کچھ لکھا گیا تھا، اس کی نسبت ہم سے پوچھا گیا ہے، کہ عربی صرف و نحو کو آسان طریقہ سے پڑھنے کی کیا صورت ہے، اس کا مفصل جواب تو مستقل مضمون کا طالب ہے، مگر مختصر یہ ہے کہ صرف و نحو کو نظری کے بجائے عملی حیثیت سے پڑھایا جائے، جس کا ایک اسلوب خاص مولانا حمید الدین صاحب کی اسباق النحو اور ہماری

دروس الادب میں بتایا گیا ہے، دار العلوم ندوۃ اور مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں اس کا کافی کامیاب تجربہ کیا جا چکا ہے۔

(معارف ماہ مئی ۱۹۳۷ء)

(۶)

۲۰ اپریل ۱۹۳۷ء کو کلکتہ سے ایسوشی ایٹڈ پریس نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں ایک عجیب و غریب عربی کتاب کے واحد نسخہ کے وجود کی خبر دی ہے، جس کا پتہ شمس العلماء ہدایت حسین صاحب نے لگایا ہے، اس کتاب کی صفت یہ ہے کہ چند جدولوں میں لکھی ہوئی ہے، اگر ایک جدول کے الفاظ داہنے سے بائیں پڑھیے تو ایک خاص علم کی کتاب ہو جائے گی، اگر اوپر سے نیچے پڑھیے تو دوسرے فن کی کتاب ہوگی اگر ایک جدول کے الفاظ چھوڑ کر پڑھیے تو تیسرے فن کی کتاب ہو جائے گی، یہ بھی خبر ہے، کہ فاضل موصوف کتاب کے اس یگانہ نسخہ پر کوئی تحقیقی مضمون کلکتہ میں پڑھیں گے۔

اس سلسلہ میں یہ جاننا بھی دلچسپ ہوگا، کہ اس کتاب کے قلمی نسخے جا بجا ملتے ہیں، ابھی اس کا ایک قلمی نسخہ اسلامیہ اسکول اٹاوہ میں دیکھا ہے، اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے، کہ یہ پرانے زمانہ میں ہندوستان میں عنوان الشرف کے نام سے چھپ بھی چکی ہے، اور اس کا مطبوعہ نسخہ دسنہ لائبریری (ضلع پٹنہ) میں موجود ہے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اردو میں "ہماری زبان کا نام" کے عنوان سے جو تقریر کی گئی تھی، وہ اخباروں میں شائع ہو چکی ہے، اس تقریر میں دلائل کے ساتھ یہ تجویز پیش کی گئی تھی، کہ ہندوستان کی اس عام اور مشترک زبان کا موزوں نام "ہندوستانی" ہے، جو اس زبان کے مختلف پرانے ناموں میں سے ایک مشہور نام ہے، جہاں تک اخباروں کی تحریروں اور اشخاص کی اطلاعوں اور گفتگوؤں کا تعلق ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تجویز کے ہمدردوں اور معاونوں کی خاصی کثرت ہے، یہ تقریر مستقل رسالہ کی شکل میں الگ بھی چھپ چکی ہے، جن صاحب کو ضرورت ہو، وہ ایک آنہ کا ٹکٹ بھیج کر دفتر دار المصنفین سے منگوا سکتے ہیں۔

بہار ہندوستان میں پہلا صوبہ ہے، جہاں ایک انگریز حاکم کی بد دماغی اور جہالت سے ہندوستانی رسم الخط عدالتوں سے برطرف ہوکر ہندی رسم الخط حکماً جاری کیا گیا تھا، اور تقریباً باون ۵۲ برس تک یک لخت ہندوستانی رسم الخط یہاں قانوناً ممنوع رہا، ہندوستانی زبان جاننے والے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس سے سخت تکلیف میں مبتلا رہے، ان کو عدالت کے ہر حکم اور نوشتہ سے واقفیت کے لیے ایک ہندی داں کی تلاش ناگزیر ہوتی تھی، یہی حاکم جب بدل کر صوبہائے متحدہ میں گیا، تو وہاں بھی انھوں نے اردو ہندی جھگڑے کا بیج بویا۔

بہار کے ہندوستانی جاننے والے اور خاص طور سے مسلمان ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہے، کہ یہ ممانعت کسی طرح دور ہو، اور ان کو بھی اپنے رسم الخط میں لکھنے کی اجازت مل جائے، آخر نصف صدی کے بعد چند سال ہوئے کہ بڑی کوششوں کے بعد صرف پٹنہ کمشنری کے لیے یہ اجازت حاصل ہوسکی، اب نئے آئین کے تحت اس صوبہ میں جو وزارت قائم ہوئی ہے، اس نے پورے صوبہ میں نہ صرف ہندوستانی رسم خط کی اجازت دیدی ہے، بلکہ یہ لازمی کردیا ہے، کہ ہر عدالتی کاغذ میں ایک ہی عبارت دونوں رسم خط میں لکھی جایا کرے، تاکہ دونوں میں ایک جاننے والے بھی سرکاری حکم سے آسانی کے ساتھ باخبر ہوسکیں، امید ہے کہ اس تجویز کو دوسرے صوبوں میں بھی قبول کیا جائے گا، تاکہ ہر خط کے جاننے والوں کو یکساں آرام پہنچے۔

ہم لوگ ابھی تک اردو اور ہندی کے جھگڑوں میں پھنسے ہیں، اس سلسلہ میں پٹنہ ہائی کورٹ کا ایک فیصلہ ذکر کے قابل ہے، تاکہ دوسرے صوبوں میں بھی وہ نظیر کا کام دے، پٹنہ ہائی کورٹ نے چند سال ہوئے یہ فیصلہ صادر کیا ہے، کہ پٹنہ ہائی کورٹ کی زبان ”ہندوستانی“ ہے، اور ہندوستانی کی تشریح کی گئی ہے، کہ وہ زبان جو عام طور سے یہاں بولی جاتی ہے، اور جو یہاں کی عدالتوں میں اب تک مروج ہے، یہ فیصلہ بالکل بجا اور درست ہے،

ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ہندوستانی زبان و ادب کے ایم، اے کے درجے جب سے کھلے ہیں، انگریزی تعلیم یافتوں کو اپنی زبان سے جو بے گانگی تھی وہ نسبتہً کم ہورہی ہے، اور اس زبان کے طالب علموں کی تعداد سال بہ سال بڑھ رہی ہے، ہم کو ایک یونیورسٹی کا حال معلوم ہے، جہاں پچھلے سال گیارہ طالب علم تھے،

اسال چھبیس ۲۶ تھے، اور ان کی واقفیت کا معیار بھی ہر سال بڑھ رہا ہے،

لیکن یہ کیسی بد قسمتی ہے، کہ وہی شہر آگرہ، لکھنؤ، دہلی، جو ہندوستانی زبان کے مرکز ہیں، اس زبان کی اعلیٰ تعلیم و سند سے محروم ہیں، شیراز کے پیر دانا کا یہ شکوہ شاید ہمیں کے حسب حال ہو،

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

(معارف ماہ جون ۱۹۳۷ء)

(۷)

"ہماری زبان کا نام" کے عنوان سے میری جو تقریر اخباروں میں اور الگ رسالہ کی شکل میں چھپی ہے، اور جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہماری مروجہ زبان کا صحیح نام "ہندوستانی" ہے، اس کے متعلق پروفیسر امرناتھ جھا (الہ آباد یونیورسٹی) نے اپنے ایک انگریزی مضمون لیڈر میں لکھا ہے، جس کو سرچ لائٹ پٹنہ نے اپنی ۵ رجون ۱۹۳۷ء کی اشاعت میں نقل کیا ہے، موصوف کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ اس تحریک کے ہمدرد اردو اور ہندی کو ملا کر ایک نئی زبان بنانا چاہتے ہیں۔ اور یہ دھوکہ ان کو ہندوستانی اکاڈمی کے بعض کارکنوں کے اس تخیل سے ہوا ہے، کہ وہ اردو اور ہندی کو آسان کر کے دونوں کو ملانا چاہتے ہیں، حالانکہ اس تحریک کو ہندوستانی اکاڈمی کے بعض کارکنوں کے تخیل سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

موصوف کا دعویٰ ہے، کہ صوبہائے متحدہ کے شہروں کی زبان اردو، اور دیہاتوں کی زبان ہندی ہے، اگر غیر فصیح اردو اور کچی زبان کو کوئی اپنی اصطلاح بنا کر ہندی کہدے، تو ہم کو اعتراض نہیں، لیکن اگر ہندی سے مراد وہ زبان ہے جس میں ہندی رسالے اور مضمون اور اشعار آجکل لکھے جا رہے ہیں، تو دعویٰ کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ ہمارے دیہاتوں کی بولی نہیں، اور نہ دیہاتی ان کو سمجھ سکتے ہیں، صوبہ کے مختلف حصوں کی دیہاتی بولیاں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، اور وہ صرف دہقانی کچی بولیاں ہیں، جو ادب اور شعر اور علم و فن کی زبان نہیں، اور نہ ہو سکتی ہے۔

یہ کچھ اردو اور ہندوستانی ہی کی خصوصیت نہیں، دنیا کی ہر زبان کی شہری اور دیہاتی زبانوں میں بہت

فرق ہوتا ہے، لیکن اس فرق سے وہ دو زبانیں نہیں بن جاتیں، دیہاتی انگریزی اور شہری انگریزی ایک نہیں، دیہاتی گوروں اور لندن اور آکسفورڈ و کیمبرج کے باشندوں کی زبانیں یقیناً یکساں نہیں، مگر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا، کہ وہ دو زبانیں ہیں، اگر آج آپ کسی دیہاتی بولی کو ادبی و علمی زبان بنانے کی کوشش کریں گے، تو شاید آپ کا یہ خیال ہوگا، کہ اب ملک کی ایک زبان بن گئی، مگر یہ سراسر علمی دھوکہ ہے، تجربہ بتائے گا کہ چند سال بھی اس مصنوعی زبان پر گذرنے نہ پائیں گے، کہ شہر اور دیہات کی ضرورتوں اور تمدنوں اور خیالات کے اختلاف کی وجہ سے وہ پھر اپنی یکسانی کھو دے گی، اور ایک غیر فصیح کچی بولی اور دوسری فصیح معیاری زبان بن جائے گی، ادبیات کی تاریخ میں اس واقعہ کی مثالیں کم نہیں۔

بہار گورنمنٹ نے اپنے حالیہ گزٹ میں صوبہ بہار کی زبان "ہندوستانی" قرار دی ہے، اور اجازت دی ہے، کہ عدالتوں اور دفتروں میں وہ اردو کیتھی ہندی، ناگری اور رومن رسم الخطوں میں لکھی جاسکتی ہے، اب یہ اردو جاننے والوں کا کام ہے کہ عدالتوں، ڈاکخانوں اور سرکاری دفتروں میں اردو کے رواج کو بڑھائیں، اور اردو فارموں اور کاغذوں کو خاص طور سے کام میں لائیں، تاکہ یہ ثبوت بہم پہنچے کہ اس صوبہ میں اردو جاننے والوں کی تعداد کتنی بڑی ہے،

شہزادہ دارا شکوہ نے سر اکبر کے نام سے سنسکرت سے فارسی میں اپنشد کا جو ترجمہ ۱۰۶۷ھ میں کیا تھا، اس کا ایک جدید الخط نسخہ اس وقت بک رہا ہے، چونکہ دار المصنفین میں اس کا نسخہ پہلے سے موجود ہے اس لیے اہل شوق کو اطلاع ہے، کہ جو صاحب چاہیں اس کو خرید فرمالیں، نسخہ کی ضخامت پانچ سو صفحوں کی ہے، دو روپیہ جز (۱۶ صفحے) کے حساب سے قیمت ہونی چاہیے، اب خریدار اور بائع کے درمیان جو طے ہوجائے، فرمایش دفتر کے پتہ سے آئے،

امسال دار المصنفین کی طرف سے سیرۃ النبیؐ جلد ششم کے علاوہ تین کتابیں اور شایع ہو رہی ہیں، مقالات شبلی کا چھٹا حصہ تاریخی مقالات پر مشتمل اسی مہینہ میں شایع ہوچکا ہے، تابعین کی سیر چھپ رہی ہے، اور ہیوم کی اہم فلسفیانہ کتاب کا نہایت سلجھا ہوا ترجمہ زیر طبع ہے، یہ ترجمہ پروفیسر عبد الباری ندوی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا رہین منت ہے۔

دمچگان یونیورسٹی امریکہ نے اسلامی فنون صناعی میں خاص طور سے دلچسپی لی ہے، آرس اسلامیکا مشہور اسلامی صناعی کا رسالہ اسی کی طرف سے نکلتا ہے، اب یونیورسٹی مذکور نے اسلامی فنون صناعی کی تاریخ و تحقیقات کا ایک شعبہ قائم کیا ہے، اور اس کی طرف سے اس شعبہ کا نصاب ہمارے پاس بھیجا گیا ہے تعلیم کی مدت دو سال ہے، تعلیم کی فیس مقامی طالب علموں کے لیے پچپن اور دوسروں کے لیے پچہتر شلنگ پہلے سال اسلامی فنون اور اسلامی آرٹ کی ترقی کی تاریخ آغاز سے لیکر اٹھارہویں صدی تک عربی، ایرانی، ترکی اور ہندی ملکوں میں اسلامی فن تعمیر کی تاریخ اور ان فنون میں طرز تحقیق کی تعلیم دی جائے گی۔

پچھلے مارچ میں جرمنی کی ہالے یونیورسٹی کے علوم شرقیہ کے پروفیسر بادر کا انتقال ہو گیا، وہ لسانیات کے ماہر تھے، وہ یورپ کی تقریباً جملہ زبانوں کے جاننے کے علاوہ ساری سامی زبانوں سے واقف تھے، اور تورانی زبانوں خصوصاً چینی زبان میں خاص مہارت رکھتے تھے، اس حیرت انگیز وسیع لسانی واقفیت کے سبب سے وہ راس شمرہ کی کھدائیوں میں بعض نئے خطوں کے کتبوں کے برآمد ہونے پر ان کو حل کر سکے، ماسوف علیہ کو امام غزالی کی احیاء العلوم سے خاص دلچسپی تھی، اس کے متفرق ابواب کے ترجمے اکثر شائع کرایا کرتے تھے، اسلامی علم مرایا و مناظر پر بھی بعض اچھے مضمون لکھے تھے، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے شریک ناشر بھی تھے، اور فلک، حاء، حفص الفرد وغیرہ عنوانوں پر اس میں مقالے لکھے تھے، "حروف تہجی" کی ابتدا پر انکی ایک جرمن تالیف اس وقت مطبع میں ہے،

ابن ندیم کی کتاب الفہرست کا نیا نسخہ جرمن پروفیسر فیوک نے تیار کر لیا ہے، اس نسخہ کی تکمیل میں مدینہ منورہ کے نسخہ کی نقل بھی شامل ہے، اور شاید ٹونک کا ہندی نسخہ بھی شریک کار رہا ہے، امید کہ یہ نسخہ پہلے سے زیادہ مکمل ہو کر شائع ہوگا،

اس وقت جرمنی میں حسب ذیل کتابیں چھپ رہی ہیں۔

۱۔ الٰہی نامہ فرید الدین عطار، مرتبہ ڈاکٹر رٹر
۲۔ بیان مذہب الباطنیہ وبطلانہ لمحمد بن حسن الدیلمی، مرتبہ پروفیسر اشٹروٹمان۔
۳۔ کتاب اخبار القضاۃ للقاضی وکیع، مرتبہ پروفیسر شاخٹ،

۴۔ استانبول کی عربی قلمی کتابیں علم حدیث پر (جرمن زبان میں) مرتبہ پروفیسر وائمس وائلز،

(معارف ماہ جولائی ۱۹۳۷ء)

(۸)

افسوس ہے کہ ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کی دوپہر کو ڈاکٹر سر راس مسعود کا بھوپال میں بعارضۂ تپ میعادی انتقال ہوگیا، باہر والوں کو ان کی بیماری کی کوئی خبر نہ تھی، یکایک پہلی اگست کے اخباروں سے ان کی وفات کی اطلاع ملی، مسلمانوں کے لیے عموماً اور ان کے دوستوں کے لیے خصوصاً یہ سانحہ بہت ہی المناک ہے، وہ ہماری قوم میں تعلیمی مسائل کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے، سر سید کے پوتے اور جسٹس سید محمود کے بیٹے تھے، تعلیم سے فارغ ہوکر وہ پہلے پٹنہ میں ہڈ ماسٹر ہوئے، وہاں سے کٹک پروفیسر ہوکر گیے، پھر حیدرآباد میں ناظم تعلیمات اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کے وایس چانسلر اور آخر میں ریاست بھوپال کے وزیر تعلیم ہوئے، ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے، ۴۸ برس کی عمر پائی، جاپان کا تعلیمی نظم ونسق اور انتخاب زریں (اردو اشعار کا انتخاب) وغیرہ بعض رسالے اور مضامین ان کی علمی اور ادبی یادگار ہیں، مرحوم نے دو۲ جوان لڑکے پہلی بیوی سے چھوڑے ہیں، بڑا تعلیم سے فارغ ہوکر اب یورپ سے واپس آگیا ہے،

مرحوم بڑے وجیہ، کشیدہ قامت، سرخ وسپید، ہنس مکھ، اور ملنسار تھے، جس مجلس میں ہوتے سب پر چھا جاتے، باتوں کی دھنی اور زبان کے میٹھے تھے، ہر شخص سے جھک کر ملتے تھے، ایک ذاتی واقعہ ہے، مگر بیان کے قابل ہے، بارہ۱۲ تیرہ۱۳ برس ہوئے جب وہ حیدرآباد میں ناظم تعلیمات تھے، تو میرا حیدرآباد جانا اور ایک ایسے دوست کے یہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا جن سے پہلے گو ان سے بہت میل ملاپ تھا، مگر یکایک بیچ میں ایسی کچھ رنجی ہوگئی تھی، کہ ملنا جلنا اور بات چیت تک بند ہوگئی تھی، میں جب ان سے جاکر ملا، تو انھوں نے پوچھا، کہاں ٹھہرے ہو، میں نے جگہ بتائی، تو وہ چپ سے ہوگیے، میں مطلب سمجھ گیا، دو۲ تین۳ دن کے بعد دیکھتا کیا ہوں کہ وہ بے تکلف وہاں چلے آرہے ہیں، میرے ان دوست کو اچنبھا سا ہوگیا، اور اس دن وہ ان کے حسن خلق کے قائل ہوگیے، چند سال ہوئے کہ کابل کے سفر میں، میں اور وہ ساتھ تھے، دن رات یکجا رہنے کا اتفاق ہوا، مرحوم کی مجلسی خوبیاں بھولنے کے قابل نہیں، ان کی وفات سے ایک بڑے خاندان

کی یادگار مٹ گئی، اور تعلیمی مسائل کی ایک قابل ذکر ہستی فنا ہو گئی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس با اخلاق کو اپنے اخلاق ربانی سے نوازے۔

ہندوستانی کا لفظ دھیرے دھیرے ہندوستان کی ادبی فضا کو جیتتا چلا جاتا ہے، ۹ر جون کو تیرواڑہ (مدراس) میں مسلم یوتھ کانفرنس کی صدارتی تقریر میں مولوی عبدالحق صاحب نے فرمایا "اردو یعنی ہندوستانی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کا عظیم الشان نتیجہ ہے۔" کانفرنس نے تجویز منظور کی کہ "ایسے استادوں کی ایک جماعت تیار کی جائے، جو جنوبی ہندوستان میں ہندوستانی زبان کی تعلیم دے سکیں۔"

"ہمایوں" لاہور کے شریک مدیر اگست کے پرچہ میں لکھتے ہیں:-

> "اردو کے بجائے ہندوستانی کا نام استعمال کرنے کے حامیوں کی یہ دلیل قابل توجہ ہے، کہ جب ہم خود ہندوستانی کہلاتے ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ اپنی زبان کے لیے اس لفظ کے استعمال کو عار سمجھیں، مسلمانوں کو حق نہیں ہے، کہ وہ اسے ایک ایسے نام (یعنی ہندوستانی) سے محروم کرنے پر اصرار کریں، جس سے اس کے ہندوستانیوں کا سرمایہ مشترک ہونے کا پتہ چلتا ہو۔"

ہمارے نزدیک "ہمایوں" کا اس راہ میں یہ پہلا قدم ہندوستانی طرفداروں کے لیے "فال ہمایوں" ہے، کیونکہ "ہر چہ از پنجاب می خیزد بر دل می ریزد"

گاندھی جی نے اپنے ایک بیان میں اعلان کیا ہے، کہ "اردو ہندی اور ہندوستانی تینوں سے ایک ہی زبان مراد ہے، اور یہ وہ ہے جو شمالی ہند میں ہندو مسلمان عام طور سے بولتے ہیں۔" ان کا یہ اعلان جو یقیناً سچائی پر مبنی ہے، ان ہندوؤں کی آنکھوں کو کھول دے گا، جو ہندی کے معنیٰ کالیداس کی زبان سمجھتے ہیں، جو کبھی ہندوستان میں بولی نہیں گئی، اور نہ کبھی وہ ملک کی زبان تھی، اور نہ ہو سکتی ہے۔

ہندوستانی اکاڈیمی (الہ آباد) کے طرز پر صوبہ بہار میں بھی ایک ادبی سوسائٹی کے قیام کا خیال

سر فخرالدین مرحوم کی وزارت تعلیم کے اخیر زمانہ میں پیدا ہوا تھا، مگر اس کے بعد وہ زندہ نہ رہے، اور ان کے مرتے ہی یہ تجویز بھی مرگئی، مولوی محمد حسین صاحب مرحوم نے مہلت نہ پائی، سید عبدالعزیز صاحب نے اپنی توجہ عربی مدرسوں کی اصلاح کی طرف کی، ان کے لیے جدید نصاب بنوایا، اور قوت کے ساتھ اس کو جاری کیا، یہ ان کا یادگار کارنامہ رہے گا، اب تعلیم کی باگ اس صوبہ میں ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں آئی ہے، جو خود بھی ادیب ہے، اور ادب سے فطری ذوق بھی رکھتا ہے، کیا ہم یہ امید باندھیں کہ اس کے عہد میں ایک "بہار اکاڈیمی" قائم ہو کر اپنی بہار دکھائے گی، سننے میں آیا ہے کہ وزارت کے دل میں اس کا کچھ کچھ خیال ہے،

انگلستان کے مشہور مستشرق ریورنڈ پروفیسر مارگولیوتھ صاحب جو اپنے علم سے زیادہ اپنے تعصب میں مشہور ہیں، چالیس سال کی محنت شاقہ کے بعد کیمبرج یونیورسٹی سے وظیفہ پر الگ ہو رہے ہیں، اور ان کی جگہ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر گب مقرر ہوئے ہیں، خدا کرے کہ نئے پروفیسر صاحب مسلمانوں کے علم اور تعلیم کے لیے مفید ہوں۔

فرائلائن لشٹن اسٹیٹر ایک یہودن فاضلہ نے جس نے "عورت ایام العرب میں" ایک چھوٹی سی کتاب پہلے لکھی تھی، اب آکسفورڈ یونیورسٹی سے ایک قدیم عرب ادیب محمد بن حبیب بغدادی (متوفی ۲۴۵ھ) کی مشہور کتاب "المحبر" کو ایڈٹ کرکے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی ہے، کتاب مذکور عرب جاہلیت کے حالات پر نہایت دلچسپ کتاب ہے، اس کا ایک ہی نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں تھا، اور اب گب سیریز میں شاید جلد چھپے، محمد بن حبیب کی ایک اور نادر تالیف کتاب المنمق ہے، جس کا ذکر گو ابن ندیم کے مطبوعہ نسخہ میں نہیں، مگر یاقوت صاحب معجم الادباء کے پیش نظر نسخہ میں ہے، اس کا ایک عمدہ نسخہ لکھنؤ میں مولوی ناصر حسین صاحب کے کتب خانہ میں ہے۔

(معارف ماہ اگست ۱۹۳۷ء)

(۹)

۲۸، ۲۹ اگست ۱۹۳۷ء کو پٹنہ میں انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کے کئی خاص اہتمام جلسے ہوئے، خاص

جلسوں میں مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ انجمن ترقی اردو، مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دار المصنفین کے نمایندے شریک ہوئے، اور ہندوستانی زبان اور بہار میں سرکاری تعلیم گاہوں میں ہندوستانی کے ذریعۂ تعلیم پر بحثیں ہوئیں، اور تجویزیں منظور ہوئیں، جو اخباروں میں چھپ چکی ہیں۔

اس جلسہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے، کہ اس میں سب سے پہلی دفعہ ہندوستانی کی قومی و تعلیمی حیثیت پر غور کیا گیا، اور اس کو عمل کے قابل سمجھا گیا، اور ہندوستانی زبان کی مشتبہ حقیقت کو ان لفظوں میں ظاہر کیا گیا۔

> "ہندوستانی سے مراد اس ملک کی وہ زبان ہے، جو ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ سے بنی ہے، جو شمالی ہند کے باشندے عام طور سے بولتے ہیں، اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے رہنے والے سمجھتے ہیں، جو عربی، فارسی اور سنسکرت کے نامانوس لفظوں سے خالی ہو، اور جو فارسی، ناگری یا کسی دوسرے خط میں لکھی جائے۔"

جلسہ کی دوسری اہمیت انجمن ترقی اردو کے ناظم مولوی عبد الحق صاحب اور ساہتیہ سمیلن کے صدر بابو راجندر پرشاد کا وہ متفقہ بیان ہے، جس پر دونوں جماعتیں اگر ایمانداری سے عمل کریں تو اردو ہندی کا جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے،

متفقہ اعلان

انجمن ترقی اردو بہار کے ایک جلسہ میں جو ۲۸ر اگست ۱۹۳۷ء کو پٹنہ میں منعقد ہونے والا تھا، تا کہ ہندوستانی زبان کے متعلق مختلف مسائل پر آپس میں اور دوسرے احباب سے تبادلۂ خیالات کیا جائے، ہم چاہتے تھے کہ جو غلط فہمیاں بد قسمتی سے اردو ہندی اور ہندوستانی کے نزاع کے سلسلہ میں پیدا ہو گئی ہیں، وہ دور ہو جائیں، اور ہمیں خوشی ہے، کہ اب اس بحث کے حق میں جو مختلف سوالات اٹھائے گیے تھے، ان کے بارے میں ہمیں مختلف امور میں بحیثیت مجموعی اتفاق ہے۔

ہمیں اتفاق ہے، کہ ہندوستانی زبان ہندوستان کی مشترک زبان ہونی چاہیے، اور اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جانی چاہیے، اور دونوں رسم الخط تمام سرکاری اور تعلیمی مقاصد کے لیے

تسلیم کر لینے چاہییں، ہندوستانی سے مراد ہماری وہ زبان ہے، جس میں زیادہ سے زیادہ اجزاء اس زبان کے لیے جائیں، جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی جاتی ہے، اس زبان میں الفاظ کے انتخاب کا معیار یہ ہونا چاہیے، کہ ان کا عام بول چال میں کس حد تک رواج ہے، ہماری یہ بھی رائے ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کو یہ حیثیت ادبی زبان کے پوری پوری ترقی کرنے کا موقع دینا چاہیے، ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں، کہ ہندی اور اردو کے ادیبوں کی اعانت سے ہندوستانی زبان کے بنیادی الفاظ کا ایک لغت تیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس قسم کے لغات کی تدوین کے لیے عملی تجاویز اختیار کرنے اور دوسرے اہم مسائل مثلاً اصطلاحات علمیہ کے انتخاب کے لیے ہماری تجویز ہے کہ ایک چھوٹی سی نمائندہ کمیٹی بنائی جائے، جس میں اردو اور ہندی دونوں کے با اثر رکن شریک ہوں، اور جو دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ہندوستانی زبان کو ترقی دینے کے قابل ہوں، اور اس طرح دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں زیادہ خوشگواری پیدا ہو جائے۔

بنگال کسی زمانہ میں ہندوستانی زبان کا بڑا مرکز تھا، مرشد آباد اور ڈھاکہ کی ادبی کوششیں بھلائی نہیں جا سکتیں، پھر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جو کچھ ہوا، وہ بنگال کے احاطہ سے باہر نہیں، پچھلے زمانہ میں جب صوبہ وار قومیت کے تعصب میں بنگال سب سے آگے تھا، اس نے ہندوستان سے اپنے پرانے تعلق کے رشتہ کو کاٹنے کی بڑی کوشش کی، اور بنگالی زبان کے ساتھ کسی دوسری مشترک زبان کے خیال کو اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، مگر اب ہندوستان کی چوپائی ہوا نے پوروا کو شکست دیدی ہے، اور دن بہ دن یہ خیال وہاں بھی پھیلتا جاتا ہے، کہ اگر ہم کو پورے ہندوستان سے اپنا تعلق رکھنا ہے، تو ہندوستان کی عام اور مشترک زبان ہندوستانی سے اپنا تعلق پھر جوڑنا پڑے گا، خیال کی اس تبدیلی کی ایک بہت بڑی سند اس وقت ہمارے سامنے ہے، بنگال کی موجودہ حکومت کے وزیروں نے آج کل جب ڈھاکہ میں قدم رکھا، تو مشرقی بنگال و آسام کی انجمن اردو نے ان کا خیر مقدم ایک اردو سپاس نامہ کے ذریعہ سے کیا، اور وزیروں نے اس کو قبول کیا، اور شاید اسی زبان میں اس کا جواب بھی دیا۔

اس سپاس نامہ میں ایک پارہ یہ بھی ہے۔

"ہم بہ مسرت اظہار کرتے ہیں، کہ اب ملک (بنگال) میں صحیح احساس پیدا ہوگیا ہے، کہ ہم بنگلہ زبان کے ساتھ اردو سے بھی رابطہ رکھ سکتے ہیں، اور یہ رابطہ نہ صرف ہندوستان کے سب مسلمانوں سے ارتباط و اتحاد کا سبب ہے، بلکہ اس طرح سارے ہندوستان کے باشندوں سے ہم متحد و مرتبط ہو سکتے ہیں"

خیال کی یہ تبدیلی بہت مبارک ہے،

یہ انجمن بنگال کی بہت پرانی انجمن ہے، ۱۹۰۶ء میں نواب مرحوم ڈھاکہ نے مولانا شبلی مرحوم کے ہاتھوں سے اس کی بنیاد ڈلوائی تھی۔

(معارف ماہ ستمبر ۱۹۳۷ء)

(۱۰)

خوشی کی بات ہے، کہ ہمارے ملک کی موجودہ فضا ایک مشترک دیسی زبان کے لیے جس کا پسندیدہ نام ہندوستانی پڑ رہا ہے، بہت سازگار ہو رہی ہے، ڈاکٹر تارا چند اور پنڈت جواہر لال کے محققانہ مضمونوں نے جو بہت سوچ سمجھ کر لکھے گیے ہیں، غلط فہمیوں کے تہ بہ تہ پردوں کو چاک کر دیا ہے، ہمارے صوبہ کی اسمبلی میں اسمبلی کی زبان پر جو تقریریں ہوئیں، ان سے اچھی طرح پتہ لگتا ہے، کہ ہوا کا رخ کدھر ہے؟ افسوس ہوگا، اگر "زبانی ملاپ" کے لیے ہم ہندو مسلمان اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائیں۔

ہماری زبان کے نومشق اخبار نویسوں اور مضمون نگاروں میں اپنی قابلیت کی زی دھاک بٹھانے کے لیے عربی و فارسی کے موٹے موٹے لفظوں کا شوق ترقی پر ہے، ان میں سے بعض بعض تو ایسے ہیں، جو ان لفظوں کے صحیح معنی بھی نہیں جانتے، آپ سن کر ہنسیں گے، کہ دلی کے ایک عربی کے عالم اڈیٹر نے ایک زندہ انسان کی حد سے بڑھ کر تعریف کرتے کرتے "فقید الشرق" لکھ دیا، اور وہ سمجھے کہ ہم نے مبالغہ کی حد کر دی، اور شاید وہ اس کے معنی یہ سمجھے ہوں کہ مشرق کی زمین میں اس کی مثال نہیں، مگر اس غریب کو یہ معلوم نہیں، کہ یہ کسی زندہ کی تعریف میں نہیں، بلکہ مردہ کی تعریف میں استعمال کیا جاتا ہے، اور جس کا مطلب یہ ہے

کہ "جو مشرق کے ہاتھ سے جاتا رہا" کئی سال ہوئے کہ دو عرب کے عالم اڈیٹروں میں "جالیہ" کے لفظ کے ہندوستانی ترجمہ پر دو دو باتیں اخباروں میں پڑھی تھیں، حالانکہ ان دو میں سے کسی کو معلوم نہ تھا، کہ اس کے نئے معنی "نوآباد" کے ہیں، یعنی جو لوگ اپنا اصلی وطن چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا بسیں۔

ابھی حال کے اخباروں میں مصر کے شاہ فاروق کی ملکہ فریدہ خانم کے بے پردہ نکلنے کا ذکر آتا رہا ہے، اس خبر کی سُرخی یہ لکھی جاتی رہی "ملکۂ فریدہ نقاب برداشتہ رہیں گی۔" نقاب برداشتہ شاید آج فارسی میں بھی نہ بولتے ہوں، کیا اس کو ہم اپنی زبان میں یوں نہیں کہہ سکتے کہ ملکۂ فریدہ پردہ نہیں کریں گی، یا ملکۂ فریدہ بے نقاب رہیں گی۔

عربی اخباروں کے ذریعہ نئی باتوں کے لیے نئے عربی لفظ بڑی آسانی سے ہم اس لیے قبول کر لیتے ہیں، کہ ہم اپنے دماغ پر اپنی زبان کے لیے نئے لفظ بنانے کے لیے زور ڈالنا نہیں چاہتے، آجکل فلسطین کے لگاؤ سے "انتداب فلسطین" بے تکلف ہمارے اخبار لکھ رہے ہیں، مگر انہیں کیا معلوم کہ ہندو تو ہندو اچھے خاصے پڑھے لکھے مسلمان بھی اس لفظ کے معنی نہیں جانتے۔ ہمارے ہاں سید جالب مرحوم نے حکم برداری کا لفظ اس کے لیے چلایا تھا، اور وہ چل نکلا تھا، کہ انتداب نے آکر اس کا خاتمہ کر دیا۔

آج ہماری زبان کا بناؤ اور بگاڑ ہمارے اہل قلم کے اور ان میں بھی سب سے زیادہ ہمارے اخباروں کے اڈیٹروں کے ہاتھوں میں ہے، وہ اپنے روزانہ اور ہفتہ وار لٹریچر کے ذریعہ بہتوں کو بنا یا بگاڑ سکتے ہیں، وہ زبان کی مملکت کے بادشاہ ہیں، ان کے بننے سے سب بن سکتے ہیں اور ان کے بگڑنے سے سب بگڑ سکتے ہیں، یہ جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا مقصد کسی پر اعتراض نہیں، بلکہ ایک عام غلط رجحان کے خلاف دوستوں کو یاد دہانی ہے۔

ہمارے اخبار نویسوں کا ایک عام رجحان یہ ہے، کہ جب وہ انشا پردازی کا زور اور کسی مقصد کی اہمیت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، تو موٹے موٹے لفظوں کی ہیبت اور بڑی بڑی ترکیبوں کی عظمت سے ہم کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ انشا پردازی کا کمال ان میں نہیں، بلکہ اس میں ہے کہ وہ اپنے

مطلب کو خوبصورتی کے ساتھ کتنے وسیع رقبہ تک پہنچا، اور کتنی بڑی تعداد کو سمجھا سکتے ہیں، ہمارے اخباروں کی سرخیاں اکثر ایسی ہوتی ہیں، جن کے معنی قاموس اور برہان قاطع دیکھے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتے، مبعوثین، مندوبین، زعیم، بطل حریت، قہرمان سیاست، سیاس، صحافی، معدن زغال، حزب العمال کو کتنے اردو جاننے والے سمجھ سکتے ہیں۔

ہمارے خیال میں اخبار نویسوں کی زبان کا بہترین نمونہ مولوی وحید الدین سلیم مرحوم (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور مسلم گزٹ لکھنؤ) اور سید جالب مرحوم (ہمدم لکھنؤ) کی تحریریں ہیں، ان لوگوں نے بہت سے نئے لفظ بنائے، اور چلائے، نمایندہ کا لفظ مولوی وحید الدین سلیم مرحوم کا چلایا ہوا ہے، ماسٹر پیس کے لیے اختراع فائقہ وغیرہ کی جگہ شاہکار کا لفظ فارسی سے لیکر معارف نے چلایا، اور وہ چل گیا، کھرا سکہ وہی ہے، جو بازار میں چل جائے، کھوٹے سکوں سے کسی خزانہ کی دولت نہیں بڑھ سکتی ہے،

یہ شبہہ نہ ہو کہ معارف کا دامن ان داغوں سے پاک ہے، یا ہم اپنے عیبوں سے واقف نہیں، لیکن الہلال کا جادو جو برسوں تک رہا، اب اتر رہا ہے، اور ہم خود اپنے کو اور اپنے رفیقوں کو بھی ہشیار کر رہے ہیں، اسی سلسلہ میں جی چاہا کہ اپنے ہم پیشہ دوسرے اہل قلم دوستوں کو بھی ٹوکا جائے، گو یہ ہم کو معلوم ہے، کہ یہ کتنے خطرہ کی بات ہے، اور شیش محل میں بیٹھ کر دوسروں پر ڈھیلے پھینکنا احتیاط کے کس قدر خلاف ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اگر ہمارے اخباروں کو اپنے سیاسی اور اصلاحی خیالات عوام تک پہنچانا ہے اور معمولی حرف پہچاننے والوں کو بھی اخبار پڑھنے کی عادت ڈلوانا ہے، تو ضروری ہے کہ وہ سطح سے نیچے اتریں اور قابلیت کے اظہار سے زیادہ فائدہ کا خیال کریں۔

(معارف ماہ اکتوبر ۱۹۳۷ء)

(۱۱)

ہندوستان میں مسلمانوں کی جو تاریخ مختلف زبانوں میں تاریخ والوں نے لکھی، وہ حقیقت میں مسلمانوں کی نہیں، بلکہ مسلمان بادشاہوں کی ہے، یہی سبب ہے کہ اس تاریخ سے مسلمانوں کے علوم و

فنون، تمدن اور معاشرت کے حالات کا پتہ چلانا نہایت ہی مشکل ہے، اہل علم اور اہل کمال کے سوانح یہاں بہت ہی کم لکھے گئے، اس لیے اس ملک کے مسلمانوں کی علمی و تمدنی تاریخ کی ترتیب اور بھی مشکل ہے، ہماری تاریخ کی اس روشنی میں وہی ذرے چمک سکے جو بادشاہوں کے دامن دولت سے لپٹے رہے۔

پچھلے معارف میں "لاہور کے فلکی آلات ساز خاندان" پر جو مضمون نکلا تھا، اس کے کسی فرد کا نام بھی تاریخوں میں اب تک نہیں ملا، وہ کل پیتل کے ریاضی آلات کے کتبوں سے لے کر جمع کیے گئے تھے، اور اپنے جانتے یہ سمجھا تھا کہ اب اس خاندان کے کسی فرد کا نام نہیں چھوٹا، لیکن اس مضمون کو پڑھکر حیدرآباد دکن کے ایک شائق علم سید مبارز الدین صاحب رفعت نے مجھے اطلاع دی کہ ناندیڑ دکن میں مولوی شاہ برہان اللہ حسینی صاحب سجادہ نشین درگاہ قندھار (دکن) کے پاس الہداد کے پرپوتے، عیسیٰ کے پوتے اور محمد مقیم کے بیٹے حامد اسطرلابی کا ایک بنایا ہوا، سطرلاب ہے، جس پر یہ نام کھدا ہوا ہے۔

"عمل اقل العباد حامد بن محمد مقیم ابن عیسیٰ ابن الہداد اسطرلابی
لاہوری ہمایونی، تاریخ ۳ شہر شوال ۱۰۹۸ھ"

اس سے معلوم ہوا ۹۷۵ھ سے لے کر ۱۰۹۸ھ یعنی کم سے کم سوا سو برس تک یہ خاندان ریاضی آلات کے بنانے میں ممتاز رہا، لیکن ہماری تاریخ کی زبان اس کے تعارف سے بالکل خاموش ہے۔

اسی طرح ہماری تاریخ کے کچھ وہ اوراق بھی ہیں جو پرانی عمارتوں اور قبروں پر نقش ہیں، لیکن اب جب ہماری بڑی بڑی عمارتیں پرانی ہوکر زمین کے برابر ہورہی ہیں، ان کے پتھر اور نقش کے کتبے جو ہماری تاریخ کے ورق ہیں، ایک ایک کرکے کھوئے چلے جاتے ہیں، اور ہم کو احساس تک نہیں ہورہا ہے، دوسری قومیں آج زمین کے طبقوں کو الٹ الٹ کر اپنے بزرگوں کی نشانیاں نکال رہی ہیں اور ہم ہیں کہ ان نشانیوں کو بھی بچا کر رکھ نہیں سکتے، جو ابھی تک خدا کے فضل سے زمین کے نیچے دفن نہیں ہوگئی ہیں،

سندھ میں عربوں کی تین سو برس تک کی حکومت رہی، لیکن کیا عجیب بات ہے، کہ اس زمانہ

(۵۹۶ء ، سنہ ۴۰ھ) تک کی ایک یادگار کا بھی پتہ ہم کو نہیں لگ سکا، اس لیے اس زمانہ کی تاریخ کے کھوئے ہوئے ورق اب کسی طرح نہیں ملتے، حالانکہ اس سرزمین کے طبقوں کو کھود کر ہمارا محکمۂ آثار قدیمہ مسیحؑ سے سینکڑوں برس پہلے کی تہذیب کا پتہ لگا رہا ہے، سندھ کا گزیٹیر اس بارہ میں ہر صوبہ کے گزیٹیر سے زیادہ ناقص ہے۔

دارالمصنفین میں تاریخ ہند کی پہلی جلد سندھ کی تاریخ لکھوائی گئی ہے، اس کے لیے بہت چاہا کہ محکمۂ آثار کی کوششوں سے اگر کچھ پرانے معلومات مل جائیں، تو تاریخ کے سادہ ورق بھر دیئے جائیں، مگر ہم کو اس میں ذرہ کامیابی نہیں ہوئی، ضرورت ہے کہ آثار قدیمہ کا محکمہ ادھر توجہ کرے، اور اب بھی عربی و فارسی کی جو یادگاریں اور تاریخی کتبوں کے جو پتھر جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں، ان کو تلف ہونے سے بچایا جائے، اور ان کے کتبوں کے فوٹو محفوظ کیے جائیں، اور ان کے مضامین کو حل کرکے چھاپا جائے۔

اس سلسلہ میں لاہور کے معارف اسلامیہ کا ادارہ جو کچھ کر رہا ہے، وہ ہماری قدر کا مستحق ہے، اس کے لائق صدر پرنسپل محمد شفیع صاحب نے خود تکلیف اٹھا کر سندھ کی بعض بعض پرانی آبادیوں اور ویران کھنڈروں کو جا کر دیکھا اور جہاں تک بن سکا، ان کے کتبوں کے چربے اتارے اور ان کے فوٹو اورینٹل کالج کے رسالہ میں چھاپے، مولوی محمد عبداللہ صاحب چغتائی کو ادارہ نے اخراجات دکر مغربی ہند بھیجا، تو وہ وہاں سے سَو سے زیادہ ایسے کتبوں کے چربے اتار کر لائے، جو اب تک چھپے نہ تھے، ان سے اندازہ ہوگا، کہ ہمارے تاریخی خزانہ کے کتنے جواہر ابھی تک ہمارے التفات کے منتظر ہیں۔

سر شیخ عبدالقادر ممبر انڈیا کونسل جو ہماری زبان کے ایک پرانے خادم ہیں، ابھی انگلینڈ سے واپس آئے ہیں، انھوں نے اس موقع پر اپنی زبان کے موزوں نام کے متعلق اخباروں کو یہ بیان دیا ہے:

> ”کئی موقعوں پر ہندو مسلمان اظہار کر چکے ہیں، کہ ملک کی واحد زبان ہندوستانی ہے، چند روز بیشتر بہار کی دو پارٹیوں میں مصالحت کی اطلاع چھپی تھی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دونوں پارٹیاں اردو اور ہندی کو بالکل ایک سمجھتی ہیں، ایسے فیصلوں کی ہمت افزائی

کرنی چاہیے، تاکہ مستقل حل دریافت ہو سکے، میں بھی ہندوستانی کو ملک کی مشترکہ زبان سمجھتا ہوں، کیونکہ یہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے متحدہ اقدامات سے بنی ہے"۔

پچھلے معارف میں ہم نے اردو اخباروں کی مشکل پسندی اور عربی و فارسی کے موٹے موٹے لفظوں کے استعمال کے خلاف جو کچھ لکھا تھا، خوشی ہوئی کہ اس کا کسی نے برا نہ مانا، بلکہ بہت سے دوستوں نے اس کی تائید کی، آپ سنیں کہ ایک اخبار میں ایک بڑے مذہبی مدرسہ کے فاضل ایک الحاد نگار کی پیروی میں لکھتے ہیں: "ستھری ذہنیت کی تخلیق کرتی ہے"۔ حالانکہ نہایت آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ "ستھری ذہنیت پیدا کرتی ہے"۔ ابھی ایک مشہور اخبار میں پروپگنڈے کے لیے دعایت کا لفظ نظر سے گذرا، جس کو شاید بڑے بڑے عربی داں بھی نہ سمجھیں، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس بولی میں ہمارے عوام کی سیاسی اور اصلاحی تربیت کیونکر ہو سکتی ہے،

میرا مختصر سفر دکن

اور

اعلیٰحضرت خسرو دکن و برار کی بارگاہ میں میری باریابی اور سرفرازی اور عطائے شاہی میں اضافہ

اکتوبر کے آخر میں مجھے مدراس جانے کی ضرورت ہوئی، واپسی میں صرف دوستوں سے ملنے کی خاطر چند روز کے لیے راستہ میں حیدرآباد ٹھہر گیا، حیدرآباد مجھے علمی اور قومی ضرورتوں کے سبب سے بارہا جانے کا اتفاق ہوا، مگر میرا یہ سفر بالکل بے غرضانہ تھا، اعلیٰحضرت کی بارگاہ میں جہاں مجھے کئی بار باریابی کی سعادت حاصل ہو چکی ہے، اس دفعہ زمانۂ قیام کے کم ہونے کے سبب سے باریابی کا خیال بھی نہ تھا۔

۲۹؍ اکتوبر کی صبح کو دوستوں نے مدراس میں الوداع کہا، اور گاڑی دکن کی سمت روانہ ہوئی، ۳۰؍ اکتوبر کی صبح کو حیدرآباد کے اسٹیشن پر پہنچی، حسب معمول مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور مولانا مناظر احسن صاحب

گیلانی کے یہاں قیام ہوا، اسی کی رات کو محب گرامی جناب ہوش بلگرامی کے یہاں جو میرے پرانے دوست ہیں کھانا تھا، ان کے قلم میں جہاں ادبی نزاکتیں بھری ہیں، ان کے دسترخوان میں لکھنؤ، رام پور اور دکن کی ساری نفاستیں یکجا تھیں۔

اخباروں میں گو میرے آنے کی اطلاع چھپ گئی تھی، مگر اعلیٰحضرت کی بارگاہ میں معمول کے مطابق اپنی حاضری کا معروضہ نہیں گذرانا تھا، اور نہ اس کا خیال تھا، مگر وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ کا نقشہ دیکھیے، کہ اعلیٰحضرت نے اخباروں میں میری آمد کی اطلاع ملاحظہ فرمائی، تو از راہ ذرہ نوازی ۲۵ شعبان المعظم کی رات کو ۹ بجے خاصہ مرحمت فرمایا، اور سہ شنبہ (۲۷ شعبان) کو ۱۱ بجے سعادت اندوزی کا حکم فرمایا، اس غیر متوقع سرفرازی سے مجھے اور میرے ساتھ میرے دوستوں کو بہت خوشی ہوئی، ۳۹ گھنٹوں کے انتظار کے بعد وہ وقت آگیا، جب میں کنگ کوٹھی کے پھاٹک کے سامنے جاکر کھڑا ہوا، اعلیٰحضرت کی سادگی اور سادہ پسندی کا حال معلوم تھا، اس لیے ظاہری لباس اور پوشاک میں کسی قسم کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا،، چوبدار نے اطلاع کی، اور ٹھیک ۱۱ بجے یاد فرمایا گیا، پردہ کا بادل جیسے ہی ہٹا، آصفی خاندان کا چاند سامنے نظر آیا، حسب معمول ایوان کے ایک چھوٹے سے برآمدہ میں جو ہر قسم کے ظاہری تکلف سے بے نیاز تھا، ایک کرور انسانوں کا حاکم نہایت ہی سادہ لباس میں ایک کرسی پر جلوہ افروز تھا، سلام مسنون کے بعد سامنے کی دوسری کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ ہوا۔

اعلیٰحضرت نے گفتگو شروع فرمائی، اور مسلمانوں کی مذہبی حالت اور مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کی ضرورت اور اس سے مسلمان والدین کی بے پروائی پر نہایت دردمندانہ خیالات ظاہر فرماتے رہے، تقریر کا سلسلہ آج کل کے بعض باطل فرق اسلامیہ کی طرف منعطف ہوا، اور دیر تک ان کی گمراہی اور بے راہ روی پر افسوس فرماتے رہے، پھر آجکل کے علما، اور مشائخ کی سستی، بے عملی اور طریق سلف سے انحراف پر تاسف ظاہر فرمایا،

خاکسار نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے ان باتوں کی مزید تشریح خدمت شاہانہ میں عرض کی، اور جابجا موقع سے قرآن پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے اپنے معروضہ کو مؤید کیا، اعلیٰحضرت کی زبان مبارک سے بار بار تحسین و آفریں کے حوصلہ افزا الفاظ بلند ہوئے، اور نہایت بشاشت اور توجہ کے ساتھ میرے معروضات

سماعت فرماتے رہے۔

میں جب کبھی کوئی آیت کریمہ یا حدیث شریف پیش کرتا، فوراً توجہ شاہانہ کے آثار روئے مطلع انور پر جھلکنے لگتے، ایک موقع پر جب میں نے وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ، پڑھا، اور اس کی تشریح کی، تو چہرۂ انور پر اثر کی ایک خاص کیفیت طاری ہوئی، اور دوبارہ اس کو پڑھوایا، اسی طرح وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کی تشریح جب گذارش کی تو محظوظ ہوئے، رمضان المبارک کی اہمیت، روزوں کی عظمت اور اس فرض کی طرف امراء کی غفلت پر تاسف ظاہر فرمایا، آخر میں نے اعلیٰحضرت کی ان فارسی تحریروں کی طرف اشارہ کیا، جو آج کل حیدرآباد کے اخباروں میں شائع ہوتی رہیں، تو ارشاد فرمایا کہ میں تو سعدیؔ و حافظؔ کی سادہ عبارت پسند کرتا ہوں، اور اس کی پیروی کرتا ہوں، آج کل کی نئی فارسی پسند نہیں، خاکسار نے گذارش کی، آجکل کی نئی فارسی تو فرانسیسی قالب میں ڈھلتی جارہی ہے، اور یورپین مفرس لفظوں کی بہتات سے ایک نئی زبان ہورہی ہے، یہ بھی ارشاد ہوا کہ سیرۃ نبویؐ کبھی کبھی پڑھا کرتا ہوں، گفتگو کے بیچ بیچ میں بار بار یہ خیال میرے دل میں گذر رہا تھا کہ اس وقت ایک مملکت عظمیٰ کا سلطان وقت کس بے تکلفی سے ایک باریاب کو اپنی ہم کلامی کی عزت بخش رہا ہے، اور علم و فن کی قدردانی کا کیسا عملی ثبوت دے رہا ہے، اور یہی وہ مثالیں ہیں، جن پر اسلام کی تاریخ کو ناز ہے۔

مجھے اپنی زندگی میں کئی دفعہ ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اسلامی فرمارواؤں کی بارگاہوں میں بار پانے کے موقعے ملتے رہے ہیں، ان میں سب سے پہلے ہز ہائنس سلطان جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ والیہ عالیہ بھوپال میں یہ مذہبی جوش اور ذات پاک رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غیر معمولی شیفتگی دیکھی تھی، اور یا اعلیٰحضرت سلطان العلوم خسرو دکن آصف سابع خلد اللہ ملکہٗ کے اندر وہ مذہبی عقیدت اور ذات قدسی صفات سرور کائنات علیہ الف تحیات کے ساتھ اور آپؐ کی ایک ایک چیز کے ساتھ وہ گہری عقیدت دیکھی جو کہیں نہیں دیکھی جب کبھی اعلیٰحضرت سے آقا و مولیٰ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ فرماتے، لب و لہجہ سے سننے والے کو محبت کی چاشنی معلوم ہوتی۔

میں نے ایک موقع سے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کے ایمان، حضرت امام زین العابدین کی محویت نماز، اور حضرت سلطان المشائخ معین الدین اجمیری، سلطان الاولیاء نظام الدین دہلوی اور حضرت سید احمد گیسو دراز رحمہم اللہ تعالیٰ کے احوال اور کفار و مشرکین میں ان کے اثر کے واقعات عرض کیے، تو فرمایا کہ یہ تھے اللہ والے۔

ملاقات کا سلسلہ سوا گھنٹہ تک جاری رہا، ۱۲ بج کر ۱۰ منٹ پر رخصت فرمایا، اور ارشاد ہوا کہ ”میں مل کر بہت مخطوظ ہوا“۔

اسی دن کی شام کو میری واپسی کا وقت تھا، ساڑھے چار بجے دائرۃ المعارف نے مجھے پارٹی بھی دی تھی، اکثر عمائد تشریف لائے تھے، چائے کے بعد میں نے دائرۃ المعارف کی اہمیت پر مختصر تقریر کی، نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر سیاسیات و تعلیمات نے جوابی تقریر کی، اور میرے اور دار المصنفین کے حقیر خدمات کو بے حد سراہا،

نماز کے بعد سر مہاراجہ یمین السلطنت بہادر سے ملنے کے لیے ان کی جاگیر میں الوال گیا، جو حیدرآباد سے ۱۲ میل پر ہے، مولانا عبد الباری، مولانا مناظر احسن اور حکیم الشعراء امجد ساتھ تھے، سر مہاراجہ نے اپنی شرافت طبع اور وضع کی پابندی کی بنا پر جس کی خاندانی امراء میں وہ آخری مثال ہیں، تا لب فرش پیشوائی فرمائی۔ وہاں سے واپسی پر دیر ہو جانے کے سبب سکندرآباد میں ریل پر سوار ہوا، اور دو رات اور ایک دن تک وہی خواب دیکھتا رہا، جو دکن کی سرزمین کے مختصر قیام کے زمانہ میں دیکھا تھا، ۳۰؍ شعبان المعظم کو اعظم گڈھ پہنچا، اور بدستور اپنے کاموں میں مصروف ہو گیا،

رمضان المبارک کی تیسری تاریخ تھی، کہ ڈاک کے ہرکارہ نے ایک زرد رجسٹری لاکر ہاتھ میں دی، کھولنے کے ساتھ آنکھیں کھل گئیں، کہ یہ اعلیٰحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ کے دست خاص سے لکھا ہوا فرمان تھا، جس میں دار المصنفین کے سابقہ تین سو ماہوار کے وظیفہ کے ساتھ سو روپیہ ماہوار کے مزید اضافہ کا حکم تھا، اور سیرۃ نبویؐ کی تکمیل کے بعد ایک شاہی صلہ کی بشارت تھی، آفتاب جلالت کی اس ذرہ نوازی سے آنکھیں پر نور ہوئیں، اور دل مفتخر اور مسرور، اس فرمان مبارک میں ذات قدسی صفات

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن ادب کی ایک مثال یہ ہے کہ لفظ "سیرۃ نبوی" کو بھی سطر سے اوپر کرکے لکھا گیا ہے، تاکہ حب آداب سلاطین تیموری ظاہر باطن کا آئینہ ہو، یہ فرمان دار المصنفین کے تاریخی نوادر میں شامل ہوگا، اور آئندہ نسلوں کو شاہانِ اسلام کی علم نوازی کا نمونہ دکھاتا رہے گا،

یہ شاہانہ امداد و سرپرستی جو دستِ غیب سے ہماری قسمت میں آئی، ہمارے لیے سعادت کا سرمایہ اور عزت کی دستاویز ہے، علم و فن کی یہ قدر شناسی اور علم و فن کے خدمت گذاروں پر یہ شاہانہ نوازش آج ساری دنیا میں صرف خانوادۂ آصفی کی تاریخ پیش کرسکتی ہے، دعا ہے کہ اللہ عز و جل اس کو علم و فن اور دین و ملت کی سرپرستی کے لیے ہمیشہ قائم رکھے، اور اس کے اقبال کا آفتاب ہمیشہ یونہی چمکتا رہے۔

تا جہاں باشد و ایں گنبد گرداں باشد
دہر فرماں بر عثمان علی خاں باشد

(معارف ماہ نومبر ۱۹۳۷ء)

(۱۲)

اس دفعہ مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ تحقیقات علمیہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا، ایک وسیع اور بلند دومنزلہ عمارت کے اوپر نیچے کے مختلف کمروں میں مختلف زبانوں اور مختلف فنون کے طالب تحقیق اپنے کاموں میں مصروف تھے، ان میں ایک شعبہ اسلامی علوم و فنون کی تحقیقات کا بھی تھا، اس میں تین صاحب کام کرتے ہیں، مولوی محمد حسین صاحب محوی، اردو میں، مولوی محمد یوشع صاحب ایم۔ اے، فارسی میں، اور مینیار صاحب عربی میں، ان لوگوں کا درجہ لکچرر، ریڈر اور پروفیسر کا حسب مرتبہ ہوتا ہے، اس صیغہ کے انچارج مینیار صاحب ہیں، جو بالفعل کسی ڈگری کے حصول کے لیے انگلستان گیے ہوئے ہیں، اور ان کی غیر موجودگی میں ایک ہندو فاضل اس کی نگرانی کرتے ہیں۔

اسلامی شعبہ میں جو کچھ کام ہو رہا ہے، وہ مجھے دکھایا گیا، مولانا محوی عربی، فارسی کے خوش مذاق عالم اور اردو کے اچھے شاعر ہیں، انھوں نے چھ سات برس کے اندر کئی کتابوں کا ترجمہ اور تصحیح کی ہے، اور مقدمے اور تبصرے لکھے ہیں، اخیر زمانہ میں اظفری تخلص کا ایک تیموری شاہزادہ تھا جو دلی کے لال قلعہ سے بھاگ کر

لکھنؤ، پٹنہ، بنگال، اڑیسہ ہو کر مدراس چلا گیا تھا، اور وہیں رہ گیا تھا، اس نے اپنے سفر کے حالات ایک کتاب میں لکھے تھے، جس کا نام واقعات اظفری ہے، محوی صاحب نے اس کا ملخص ترجمہ کیا ہے، یہ ترجمہ چھپ چکا ہے، اس کے علاوہ دلی کے ایک شاعر میر محمدی بیدار کا دیوان، مقدمہ اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے، بیدار کا یہ دیوان ۱۹۳۵ء میں چھپ کر شائع ہو چکا تھا، اب کیا عجیب بات ہے، کہ اس کے دو برس بعد ۱۹۳۷ء میں ہندوستانی اکاڈیمی الٰہ آباد نے اسی دیوان کے کسی دوسرے قلمی نسخہ کو غیر مطبوعہ سمجھ کر جناب جلیل احمد صاحب قدوائی کے مقدمہ اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے، اگر ہمارے علمی اداروں میں آپس میں علمی روابط ہوں، تو اس قسم کی محنت اور سرمایہ کی بربادی سے ہم محفوظ رہیں۔

مولوی محمد یوشع صاحب ایک نہایت مفید کام کر رہے ہیں، عصامی نامی ایک شاعر نے ۷۵۰ھ میں فتوح السلاطین کے نام سے ہندوستان کی اسلامی تاریخ نظم میں لکھ کر سلطان علاء الدین بہمنی کے دربار میں پیش کی تھی، موصوف نے اس کتاب کے قلمی نسخے بہم پہنچا کر اس کی تصحیح سے فراغت پائی ہے، اور پریس میں جانے کے لیے تیار ہے، مگر جہاں تک ہم کو اندازہ ہوتا ہے، اس شعبہ کے اعلیٰ ذمہ دار یا تو آمدنی کی کمی کے سبب سے یا کسی اور وجہ سے اپنی کتابوں کی اشاعت میں پورا حوصلہ نہیں دکھا رہے ہیں، چند اور مسودے بھی تصحیح کیے ہوئے اشاعت کے منتظر دفتری الماریوں میں محفوظ پڑے ہیں۔

انگریزی اسکولوں میں عربی تعلیم کی اصلاح و ترقی کے لیے الٰہ آباد کے چند بزرگوں نے ایک انجمن عربی صوبۂ متحدہ کی بنیاد ڈالی ہے، اس کے لائق ناظم مولوی خلیل الرحمٰن صاحب (مترجم اخبار اندلس) ہیں، ناظم صاحب نے اپنی محنت و کوشش سے جو اعداد و شمار بہم پہنچائے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبۂ متحدہ کے ۶۷ سرسٹھ اسکولوں میں سے ۲۹ انتیس اسکولوں میں جو زیادہ تر اسلامیہ اسکول ہیں، عربی کی تعلیم دی جاتی ہے، اور ۳۰ء میں چاروں درجوں کے عربی پڑھنے والے لڑکوں کی تعداد صرف ۲۲۹ دو سو انتیس ہے، میٹرک کے امتحان میں کل ستہتر اور انٹرمیڈیٹ میں نو لڑکے عربی لے کر بیٹھے، تعداد کی کمی بیحد افسوسناک ہے، اور مسلمان والدین کی توجہ کے لائق ہے، ضرورت ہے کہ عربی لینے والے طالب علموں کے وظیفہ کا انتظام کیا جائے، اور اسکولوں کے عربی کورس اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے، انجمن مذکور نے اپنی روداد میں جو سفارشیں کی ہیں، وہ بہت حد تک صحیح ہیں، اور مسلمانوں کی سخت توجہ کے لائق ہیں۔

شاہ دکن

اور

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اعلیحضرت شاہ دکن نے دار المصنفین اور ناظم دار المصنفین کی جو تازہ سرفرازی فرمائی ہے، اس پر دار المصنفین کو مبارکباد اور اعلیحضرت کے شکریے کے بہت سے خطوط آئے، ان میں سے پروفیسر سید نواب علی ایم اے سابق وزیر تعلیم ریاست جوناگڑھ ورکن انتظامی دار المصنفین کا عنایت نامہ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے، اس لیے اس کے ذوق سے معارف کے ناظرین محروم نہیں کیے جا سکتے۔

مکرمی السلام علیکم

نومبر کا معارف کل ملا، حیدر آباد کے سفر وسیلۃ الظفر کے حالات پڑھکر مسرور ہوا، شب کو جب سحری کے لیے اٹھا، تو ذیل کا قطعہ دل سے زبان تک آیا، اور ایک روحانی سرور حاصل ہوا،

خدا کا شکر ہے اب سرحد تکمیل کو پہنچا
وہ دینی کارنامہ شبلی فردوس منزل کا
سلیماں کا قلم دکھلا رہا ہے جلوۂ سیرت
تماشائے کرم دیکھو دکن کے شاہ باذل کا
گہر بیزی اِدھر ہے اور اُدھر ہے گہرباری
عجب عالم نظر آتا ہے اس پاکیزہ محفل کا
جو طالب حق کے ہیں وہ جال میں اب پھنس نہیں سکتے
کہو مستشرقوں سے اب اٹھائیں دام باطل کا
وہ دن آئے الٰہی جلد جب سیرت مکمل ہو
نظر آجائے اعظم گڈھ سے جلوہ ماہ کامل کا

(معارف ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء)

* * *

شذرات

(بابت ماہ جنوری ۱۹۳۸ء تا ماہ دسمبر ۱۹۳۸ء)

۷ جنوری ۱۹۳۸ء کو شبلی منزل میں دار المصنفین کی مجلس عاملہ کا جلسہ دار المصنفین کے صدر نشین نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی صدارت میں منعقد ہوا، باہر سے مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی بھی اس کی شرکت کے لیے تشریف لائے تھے، پروفیسر عبد الباری صاحب ندوی اپنی علالت کے سبب سے شریک نہ ہو سکے، مجلس نے حسب معمول سال بھر کے معاملات کا فیصلہ کیا، اور دار المصنفین کی مالی حالت کا جائزہ لیا، اور اس کو اطمینان کے قابل پایا، ارکان نے دار المصنفین کے رفقاء سے بار بار مل کر ان کو استفادہ کا موقع دیا

ملک کے سیاسی افق پر آجکل کلچرل اٹانومی کی کدورت کا جو غبار چھایا ہوا ہے، وہ آہستہ آہستہ چھٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے، لیکن ہندو مسلمان اہل سیاست کی باہمی آویزش شاید صرف انتخابی نشستوں اور چند فی صدی حقوق کی کمی بیشی پر آکر ختم ہو جائے، یا وزیروں کے انتخاب کی مہم کو سر کرنے سے وہ دور ہو جائے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آزاد ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت صرف نشستوں، وزارتوں اور فی صدی نوکریوں کے تصفیے سے نہیں ہو سکتی، ہماری ہمیشہ سے پکار یہ ہے، اور اسی کو ہم ہندوستان میں مسلمانوں کی حفاظت کی ضمانت جانتے ہیں، کہ مسلمان سب کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی میں حصہ لیں، اور ملک کی اکثریت ان کی کلچرل اٹانومی (تمدنی و مذہبی خودمختاری) کا حق تسلیم کرے، اور مسلمانوں کی تعلیم، اوقاف، مساجد اور شخصی قانون و عدالت کے محکمے ان کے ہاتھوں میں سپرد کر دے، اس تجویز کی تفصیلات پر معارف اور ہمارے بعض خطبوں میں تفصیلیں آچکی ہیں۔

یہ بات افسوس کے قابل ہے، کہ ہمارے بعض آزاد سیاسی نوجوان اپنی زبان اور قلم سے مذہب کو صدمہ پہنچا کر ملک کی آزادی کی راہ میں جو ان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے، خود مشکلیں پیدا کر رہے ہیں، اور کانوں

کی اس روش سے کلی نفرت دلا رہے ہیں، جس طرف وہ مسلمانوں کو پوری بے تابی کے ساتھ بلا رہے ہیں، اگر وہ خدا کے لیے نہیں، تو کیا اپنی ملکی آزادی ہی کی خاطر اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی کر سکتے ہیں، خدا جانے کتنے مسلمان ہیں، جو ملک کی آزادی کے ان ہی کی طرح خواہاں ہیں، مگر اس کے لیے وہ اپنے مذہب کو قربان کرنا نہیں چاہتے، کاش یہ سیاسی نوجوان "مذہب میں عدم مداخلت" پر اتنا ہی عمل کرتے جتنا انگریز اپنی مملکت میں کرنے کا دعویٰ کرتا ہے،

ایک عربی شاعر کہتا ہے:

وظلم ذوی القربی اشد مضاضة علی النفس من وقع الحسام المهند

اور رشتہ داروں کا ظلم تیز تلوار کے زخم سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے،

اس لیے اس مسلمان کے قلم اور زبان سے جس کا رشتہ اسلام کے ساتھ خواہ نام ہی کا کیوں نہ ہو، قائم ہے، مذہب اور اسلام کے خلاف ایک حرف سننا بھی ہم پر غیروں کے پورے دفتر سے زیادہ شاق گذرتا ہے، اور گذرنا چاہیے، ہم کو ایسے نوجوانوں کی خدمت میں بے باکانہ عرض کرنا ہے، کہ وہ اپنے کو کھو کر کچھ پا نہیں سکتے،

مدینہ منورہ کے سب سے محفوظ، سب سے منظم، سب سے نادر کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت کے مدیر شیخ ابراہیم حماری آج کل ہندوستان آئے ہوئے ہیں، اور اس وقت دار المصنفین میں مقیم ہیں، یہاں سے پٹنہ ہو کر کلکتہ اور وہاں سے سیدھے حیدرآباد دکن جائیں گے، موصوف کے سفر کا مقصد کتب خانہ اور اس کے ملازموں کے لیے امداد حاصل کرنا ہے، اس کتب خانہ میں اس وقت گیارہ ہزار قلمی کتابیں ہیں، وہ تمام اہل علم جو مدینہ منورہ گیے ہیں، اس کتبخانہ کی اہمیت اور شیخ مذکور کی خدمات سے پوری طرح واقف ہیں، اس کتبخانہ کے مصارف جنگ عظیم تک ترکی اوقاف سے ادا کیے جاتے تھے، مگر افسوس کہ:

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

اس کتب خانہ کے لیے واقف مرحوم نے یورپین ترکی میں بہت سی جائدادیں وقف کی تھیں، جو اس جنگ عظیم میں ترکوں کے ہاتھوں سے نکل گئیں، اس پر بھی ترکی حکومت اس وقت

جب تک مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کے بار سے سبکدوشی نہیں حاصل کر لی، ادا کرتی رہی، اور اب یہ پورا خزانہ مسلمانوں کے دست کرم کا محتاج ہے،

(معارف ماہ جنوری ۱۹۳۸ء)

(۲)

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب ترجمان القرآن حیدر آباد (جن کے سنجیدہ مذہبی مضامین نوجوانوں کے خیالات کے درست کرنے کے لیے بیحد مفید ہوتے ہیں) اب حیدر اباد دکن سے پنجاب (جمال پور متصل پٹھان کوٹ) چلے آئے ہیں، امید ہے کہ زندہ دلوں کے ملک میں پہنچ کر وہ اس کی نئی زندگی کا باعث اور اس کے بڑھتے ہوئے مذہبی انتشار کے لیے تسکین کا موجب ہوں گے، رسالہ بھی یہیں سے نکلے گا

اب یہ رسالہ صرف ایک رسالہ نہ ہوگا، بلکہ دار الاسلام نام ایک مذہبی مرکز کا نقیب بھی ہوگا، اس مرکز کے لیے ایک نیک دل مسلمان نے بہت بڑی زمین وقف کر دی ہے، مسجد، اقامت گاہ اور بعض فروعی مکانات بھی اس میں تعمیر کر دیے ہیں، اور اس کو ان لوگوں کے لیے جن کو مذہبی تحقیقات کا شوق اور خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کی آرزو ہے، خاص کر دیا گیا ہے، دعا ہے کہ یہ دار الاسلام اپنے حقیقی معنوں میں مسلمانوں کے لیے دار الاسلام ثابت ہو۔

رسالہ کے لائق مدیر کئی نمبروں سے مذہب اور سیاست پر زور قلم صرف کر رہے ہیں، اس سلسلے میں انھوں نے میری ایک آدھ ناتمام تقریر اخباروں میں پڑھ کر اس کی تردید میں ان موشگافیوں اور نازک استنباطوں سے کام لیا ہے، جو کہنے والے کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں، اس دور میں جب کہ پروپگنڈا ایک فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اس قسم کی باتیں خلاف توقع نہیں، لیکن مدیر ترجمان القرآن کو اس بلائے عام سے بالا تر سمجھتا ہوں، اس لیے میں ان کی تسکین کے لیے یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ میرے گذشتہ بیس برس کی تحریروں اور تجویزوں سے واقف ہوتے تو ان پر ظاہر ہو چکا ہوتا، کہ "سلطنت در سلطنت" کی اصطلاح گو نئی ہو مگر خیال

نیا نہیں ہے، مجھے ان کے مقالات اور اصل مقصد سے پورا اتفاق ہے، اختلاف ہے، تو ان کی تحریر کے نتائج اور طریق کار سے،

اس سلسلہ میں انھوں نے میری مرعوبیت کے ثبوت میں ایک ہندو صاحب قلم کے خط سے جس کو اس نے گاندھی جی کے نام بھیجا تھا، اور جس کو میں نے اس سے پہلے نہیں پڑھا تھا، یہ اقتباس نقل کیا ہے، کہ میں نے یوم سیرت کی ایک مطبوعہ تقریر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "سوامی محمدؐ" لکھا ہے، مدیر ترجمان القرآن ماشاء اللہ روایت کے ساتھ درایت کے بھی ماہر ہیں، وہ میری طرز تحریر سے واقف ہیں، وہ سننے کے ساتھ فیصلہ کر سکتے تھے، کہ سبحانک ھذا بھتان عظیم، پھر میری مطبوعہ تقریر سیرت جس کا نام رسول وحدت ہے، ناپید بھی نہیں ہے، کہ وہ واقعہ کی تحقیق نہیں کر سکتے تھے، اور مجھے دوستوں کی غلط فہمی سے محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے، بہرحال حکایت بالا سراسر خلاف واقعہ ہے، رسالہ موجود ہے، ہر شخص دیکھ سکتا ہے، البتہ اس رسالہ کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں ہوا ہے، ممکن ہے کہ کسی ہندی ترجمہ میں ایسا ہو، سو مجھے اسکی خبر نہیں، اور نہ مجھ پر اس کی ذمہ داری ہے۔

کئی مہینے ہوئے کہ ہمارے دار العلوم ندوۃ العلماء کے دو عالم مولوی حافظ محمد عمران خاں ندوی منصرم دار العلوم اور مولوی سعد الدین صاحب ندوی مدرس دینیات جامعہ ملیہ دہلی اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے مصر گئے ہیں، اور جامع ازہر میں داخل ہوئے ہیں، ازہر میں اس سے پہلے بھی ندوہ کے طالبعلم گئے ہیں، مگر ان دونوں بہادروں کا کارنامہ یہ ہے، کہ انھوں نے اپنی جرأت اور خودداری اور جامع ازہر کے ہندی وفد کے ارکان اور سکریٹری کی سفارش سے دار العلوم ندوہ کی سند فضیلت کو کالج کی سند منوا کر وہاں تخصص (ڈاکٹریٹ) کے درجہ میں داخلہ کی اجازت حاصل کی ہے، اور یہ وہ رتبہ ہے، جو اس سے پہلے کسی بیرونی درسگاہ کو حاصل نہیں ہوا۔

ہمارے خیال میں جامع ازہر کی ریاست کے لیے یہ موزوں ہوگا کہ وہ اپنے ارکان وفد کے مشورہ سے ہندوستان کی مشہور عربی درسگاہوں کی سندوں کو معیار مان کر ان کے مطابق وہاں کے فارغ طلبہ کو اپنے یہاں داخلہ کی اجازت دیدے، ابھی دیوبند کے ایک فارغ عالم حیدر آباد دکن سے جارہے ہیں،

امید ہے کہ ان کے داخلہ کے وقت کوئی قاعدۂ عام بن سکے ،

اردو ، ان صوبوں میں بھی جہاں وہ مادری زبان نہیں ، ایک عام ملکی ہندوستانی زبان کی حیثیت سے آگے بڑھ رہی ہے ، دسمبر کے آخر اور جنوری کے شروع میں سندھ کے دارالسلطنت کراچی میں ایک کامیاب اردو کانفرنس منعقد ہوئی ، جس میں سندھ کے اندر اس زبان کی اشاعت کے مسئلہ پر غور کیا گیا ، اس وقت سندھ میں سات اردو ہفتہ وار اخبار نکل رہے ہیں ، اور پچاس اردو اسکول چل رہے ہیں ،

وہاں اردو اخباروں میں **الحبیب** اخبار دو سال سے کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے ہم کو ان صوبوں میں ہندوستانی زبان کے اخباروں کی ضرورت صرف ادبی ہی نقطۂ نظر سے نہیں ہے ، بلکہ اس لیے بھی ہے ، کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہندوستان کی مسلمان قوم ملک کے موجودہ رجحان دستور کے مطابق صوبوں میں بٹ کر اپنی مشترکہ ملکی اہمیت کھو بیٹھے گی ، اس لیے ضرورت ہے کہ سندھ ، بمبئی ، مدراس ، متوسط اور سرحد میں اس زبان کے اخباروں کی پوری پوری مدد کی جائے ، اور ان کی ہمت بڑھائی جائے ،

احاطۂ مدراس میں بنگلور گویا ایک بین الاقوامی شہر ہے ، اور اسی سے وہاں ہندوستانی زبان کو کافی فروغ ہے ، وہاں ایک مسلم اردو لائبریری پچیس ۲۵ برس سے قائم ہے ، اس لائبریری کا اتنی عمر پا جانا اس کی قوت حیات کی دلیل ہے ، اب اس کے ارکان کوشش کر رہے ہیں ، کہ اس کی اپنی عمارت ہو جائے ، اہل مدراس و میسور کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے ، شرط ہمت اور عزیمت ہے ، امید ہے کہ مدراس اور میسور کے مسلمان ادھر توجہ کریں گے ۔

(معارف ماہ فروری ۱۹۳۶ء)

(۳)

مولانا عبد العلیم صدیقی قادری میرٹھ کے ایک پرجوش مبلغ عالم ہیں ، بریلی میں عربی و مذہبی درسیات کی تکمیل کی ہے ، اور ایف ، اے تک انگریزی پڑھی ہے ، خلافت کی تحریکات کے زمانہ میں ساتھ کام کرنے والوں میں تھے ، پھر ان کو تبلیغ کا شوق پیدا ہوا ، اور اپنے لیے ہند و چین کے جزیروں اور ساحلی شہروں کا میدان پسند کیا ، جو اسلامی ملکوں میں درحقیقت سب سے زیادہ قابل امداد اور عیسائیوں اور قادیانیوں

کی زد میں ہیں، موصوف انگریزی زبان میں اچھی تقریریں کرتے ہیں، اور لوگوں پر ان کا اثر ہوتا ہے، سنگاپور و جاوا سے لے کر چین وجاپان کے سواحل بلکہ افریقہ کے دور افتادہ مقامات میں انکا سال بسال دورہ ہوتا رہتا ہے، ان کے کاموں کی روداد اخباروں میں تو پڑھتے ہی رہے، مگر ادھر ان کے چند مسلمان کیے ہوئے یورپین مسلمانوں کو دیکھا، اور حیرت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کس طرح کس کی قسمت میں کوئی سعادت رکھتا ہے، موصوف کی یہ تبلیغی کوششیں علماء کے لیے قابل تقلید اور عام مسلمانوں کے شکریہ اور اعتراف کے قابل ہیں۔

اسی بات کو اللہ تعالیٰ کس کی قسمت میں کوئی سعادت کس طرح غیر متوقع طور پر رکھتا ہے، دوسری مثال علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ایک نوجوان گریجویٹ ہیں، اب سے چند سال پہلے جب یونیورسٹی میں جانا ہوتا تھا، ایک نوجوان مسلمان طالبعلم حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری ملا کرتے تھے، جو غالباً مظفر نگر کے کسی مردم خیز گانوں کے باشندے تھے، موصوف کو تبلیغ سے بڑی دلچسپی تھی، اور ان سے اکثر اسی سے متعلق باتیں ہوا کرتی تھیں، چند سال سے ان کا پتہ نہ تھا، اس ہفتہ کی ڈاک سے دفعۃً ان کا خط سنگاپور سے آیا، کہ وہ مولانا صدیقی کی امداد اور ان کے کاموں کی تکمیل کے لیے سنگاپور پہنچ گیے ہیں، اور ارادہ رکھتے ہیں، کہ ملایا، سیام، فرانسیسی ہند چینی، فلپائن، بورنیو، جاوا، اور سماترا کا دورہ کر کے تبلیغی نظام کو استوار کریں گے، اور وہاں سے آگے بڑھ کر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے لیے جرمنی کا قصد رکھتے ہیں، ہمارے خیال میں اگر وہ اسی مقدس کام کی عظمت کے لیے پی، ایچ، ڈی اور ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں، کہ ہماری یونیورسٹیوں کے مسلمان ڈاکٹروں کو مذہب کا نام اور کام اپنی شان ڈاکٹری سے فروتر محسوس ہوتا ہے، تو موصوف کا یہ عزم مبارک، ورنہ حقیقت تو یہ ہے، کہ ان کا یہی کام مسلمانوں کی نگاہوں میں ہزار ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں سے بہتر ہے،

سنگاپور سے اس وقت دو اسلامی پرچے انگریزی میں نکل رہے ہیں، ایک کا نام ”جینوین اسلام“ (اصلی اسلام) اور دوسرے کا ”وائس آف اسلام“ (صدائے اسلام) ہے، اب انصاری صاحب نے پہلے رسالہ کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے، امید ہے کہ وہ اب اسلام کی خدمت میں اور زیادہ سرگرم ثابت ہوگا۔

اس سلسلہ میں سماترا کے دو معزز عیسائی نوجوان ابھی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ہیں، اور وہ مذہبی

تعلیم کے نہایت شائق ہیں، تاکہ وہ اپنے ملک میں دین اسلام کی اشاعت کا کام انجام دے سکیں، اور اس غرض کے لیے دار العلوم ندوہ میں ان کی تعلیم کا خیال ہے، کم از کم پندرہ پندرہ روپیہ ماہوار ان کا خرچ ہوگا، اگر ہمارے دو مسلمان صاحب استطاعت بھی توجہ کریں، تو یہ رقم وہ بخوبی دے سکتے ہیں، کیا ہمارے بے شمار ناظرین میں سے دو نیک دل مسلمان بھی ایسے ہیں، جو اسلام کی یہ خدمت بخوشی بجالائیں،

کئی مہینے ہوئے کہ جاپان سے پروفیسر **برلاس** صاحب کا ایک مضمون "جاپان میں اشاعتِ اسلام" کے واقعات و حالات کے متعلق موصول ہوا تھا، مگر چین و جاپان کی لڑائی نے طبائع کو ایسا غیر ملتفت بنا دیا ہے، کہ ادھر توجہ نہ دی جا سکی، اب جب کہ اس لڑائی کا سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آتا، تو مجبوراً اس کو آیندہ نمبر میں دے دیا جائے گا، اور تصوّر کیا جائے گا، کہ اب لڑائی نہیں ہے، اور ہم کو حالات پر غور کرنا ہے،

کلکتہ سے ایک "خادم اسلام" اپنے بے نام و نشان خط میں لکھتے ہیں:

"اس وقت پنجاب میں تین بڑے فتنے ہیں، قادیانی تحریک، منکرین حدیث کی تحریک اور عنایت اللہ مشرقی کی تحریک، آپ کا اسلامی فرض ہے، کہ آپ ان فتنوں کی تردید میں رسالہ معارف میں مضامین شائع کریں"،

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دوست معارف کے پرانے ناظرین میں سے نہیں، ورنہ انہیں معلوم ہوتا، کہ معارف نے اپنے رنگ میں ان تینوں سلسلوں کے متعلق اپنا فرض ادا کیا ہے، اور ان شاء اللہ آیندہ بھی ادا کرے گا، البتہ مناظرہ کا شوق اس کو نہیں، اور نہ اس کے لیے اس کا قلم موزوں ہے، تاہم اپنے نادیدہ دوست کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہم کو ہمارا فرض یاد دلا دیا ہے۔

انگریزی کے اسلامی مذہبی ہفتہ وار اخبار ٹرتھ لاہور کے لائق اور سرگرم عمل اڈیٹر نے اپنے چند معاصروں سے جن میں معارف کا نام بھی ہے، ٹھیٹھ اسلام کے وہ سادہ اور مختصر عقائد دریافت کیے ہیں، جو فرقہ بندیوں سے بالاتر ہوں، اور خود انھوں نے اپنی طرف سے یہ لکھا ہے، کہ اصل عقیدہ تو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، یعنی خدا کی توحید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و خاتمیت، ہے،

باقی کتب، ملائکہ، قیامت، اور جنت و دوزخ کی تشریح حقیقت چونکہ قرآن میں نہیں ہے، اس لیے ہر شخص اپنے فہم و بصیرت کے مطابق جو کچھ سمجھے بشرطیکہ اصول اسلام کے خلاف نہ ہو درست ہے۔

اس میں شک نہیں، کہ فرقہ آرائیوں نے مسلمانوں کے عقائد مشترک کی دھجیاں اڑادی ہیں، جن دو کلموں لا الٰہ الا اللہ و محمد رسول اللہ پر ہمارے مسلمانوں کا پورا اتفاق ہے، اگر ان کی جزئیاتی تشریح کیجائے تو شاید دو مسلمان فرقے بھی باہم متفق نہ نکلیں، ہمارے خیال میں یہ سب جھگڑے امویوں کے اخیر زمانہ سے عقل و حکمت کے مدعیوں اور علم کلام کے مناظروں کی بدولت، عجمیوں اور عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے اثر سے اسلام میں پیدا ہو گئے ہیں، اور اب تک چلے جا رہے ہیں، علاج یہ ہے کہ ہم تفصیل سے ہٹ کر سلف صالحین کے اجمال کی طرف، اور کیف و کم کی تشریح اور نادیدہ خواب کی تعبیر سے پرہیز کر کے عقائد کی تکثیر کے بجائے ان کی شدت یقین کی طرف رجوع کریں، اور کہدیں کہ ہم ایمان لائے خدا پر، خدا کے رسولوں پر، خدا کے فرشتوں پر، خدا کی کتابوں پر، اور قیامت اور اعمال کی جزا و سزا پر، اسی طرح اور انہی معنوں میں جس طرح اور جن معنوں میں خدا نے فرمایا ہے، یعنی اس نے جتنا اجمال کیا ہے، اس اجمال کو اور جتنی تشریح کی ہے، اتنی ہی تشریح کو قبول کریں، اس سلسلہ میں حضرت امام مالک کا یہ جواب ہمارے سامنے ہے، الاستواء معلوم و کیفہ مجہول، والایمان بہ واجب والسوال عنہ بدعۃ۔ کیا اس اجمال پر اپنے بہانہ جو فلسفی نفس کو قانع بنانے کی کوشش کریں گے۔

(معارف ماہ مارچ ۱۹۳۶ء)

(۴)

ہم نے پچھلے پرچہ میں ملایا کے دو نو مسلم نوجوانوں کی تعلیم کے لیے دو وظیفوں کے دیئے جانے کی جو صدا لگائی تھی، وہ ملت کے دو بزرگوں کے کانوں تک پہنچی، لیکن چونکہ اظہار نام کے تفاخر کے بجائے اخلاص کے پردے میں ستر حال کا حکم ہے، اس لیے اسی اخفا کے ساتھ شکریہ کا فرض بھی ادا کیا جاتا ہے، ہماری قوم میں یہی چند ہستیاں ہیں، جو ہر آواز پر لبیک کہتی ہیں، خدا ان کی عمر و عمل میں برکت دے۔

یہ دونوں طالب العلم ۶؍ اپریل کی شام کو لکھنؤ مدرسہ ندوۃ العلماء میں پہنچ گیے، ندوۃ العلماء میں اس قسم کے اور بھی متعدد طالب العلم آئے ہوئے ہیں، جو اردو نہیں جانتے، ان کی مذہبی تعلیم کا کام بہت مشکل ہے، پھر بھی ندوہ اپنی مالی بے مائگی کے باوجود دین کی خدمت کا خاموش جذبہ رکھتا ہے، اور اپنے کام میں لگا رہتا ہے، اے کاش کہ ہماری قوم میں اس "چپ کی داد" دینے کا شوق ہوتا۔

ہم نے جب کبھی اپنی قوم کی غیرت کے لیے ان کے دوسرے ہم وطنوں کے قابل رشک کارناموں کا حوالہ دیا ہے، تو ہمارے بعض حساس دل بزرگوں نے اس میں اپنی قومی توہین سمجھی ہے، اور یہ بات ایک حد تک درست بھی ہے، مگر جب غیروں میں وہ چیز نظر آتی ہے، جو اپنوں میں چاہیے تھی، تو رشک وغبطہ کے بوجھ سے خیال کا توازن قائم نہیں رہتا،

ہائے چپ بھی رہا نہیں جاتا۔

مسلمانو! تمہارا بھی کوئی گردکل ہے، اور تم اس کے لیے سال میں کیا نذرانہ دیتے ہو، ایک لاکھ پچاس ہزار، پچیس ہزار، کچھ،

آجکل نئی وزارتیں اپنے اپنے صوبہ میں ابتدائی تعلیم کے خاکے بنا رہی ہیں، جو خاکہ بنے گا، وہ عمل میں آئے گا، اور اس وقت مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی، وردھا اسکیم، اور سی پی کے ودیا مندر کی تجویز، سب کے سامنے آچکی ہے، حکومتوں کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے، کہ وہ اپنی مجوزہ اسکیم کو مذہبی تعلیم سے خالی رکھیں، یہ بات تو اب بھی ہے، یعنی سرکاری ادارے مذہبی تعلیم سے خالی ہیں، مگر چونکہ پہلے تعلیم جبری نہ تھی، اور نہ ساتویں برس سے سرکاری تعلیم میں جٹ جانا سب پر قانون کے رو سے واجب تھا، اس لیے گھروں پر ابتدائی مذہبی تعلیم پاکر مسلمان بچے سرکاری مدرسوں میں جاسکتے تھے، اور جاتے تھے، مگر اب اس جبری تعلیم اور مقررہ عمر میں ایسا ہونا بہت مشکل ہے، اس لیے اب یہ معاملہ ہمارے لیے بے حد قابل غور ہے،

دوسری طرف یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، کہ ملک کی دوسری قومیں جو ناخواندگی کے عیب کو سو فی صدی مٹا ڈالنے کے لیے کوشاں ہیں، وہ آپ کا انتظار کیے بغیر چل کھڑی ہونگی، اور کچھ دنوں

کے بعد ہمارے ان کے درمیان فی صدی کی خواندگی کا جو فرق پیدا ہو جائے گا، وہ پھر مٹائے نہ مٹے گا، اس لیے اس وقت مسلمان مذہبی تعلیم کا بہانہ جبری تعلیم سے رہائی پانے کے لیے کام میں نہ لائیں، بلکہ ایک عزم والی قوم کی طرح اٹھیں، اور مذہبی اور ملکی دونوں فرضوں کو ایک ساتھ ادا کریں، ان میں سو فی صدی آدمی مذہبی تعلیم اور خواندگی دونوں حاصل کرکے دکھادیں، یہ عزم کے سامنے مشکل نہیں۔

لیکن اگر حکومتیں مذہبی تعلیم کے بارے سبکدوشی چاہیں، تو کیا مسلمانوں سے یہ فرض ساقط ہوجائیگا اس وقت ضرورت اس کی ہوگی کہ مسلمان کسی ادارہ کے ماتحت ابتدائی مذہبی تعلیم کا جال پورے ملک میں پھیلادیں، اس کے لیے سرمایہ ہو، کتابیں بنائی جائیں، چھاپی جائیں، اردو خط اور قرآن پاک کی تعلیم کی مشکلوں کو عملاً حل کیا جائے، اس کے لیے ابتدائی اور مذہبی تعلیم کے ماہر مل کر بیٹھیں، اور کوئی نظام بنائیں، اور اس پر عمل کی راہیں نکالیں۔

ایک بات اس موقع پر صاف کہدینی ہے، ہندو بننے کے لیے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں، لیکن مسلمان بننے کے لیے کچھ جاننے کی ضرورت ہے، ہندو مت ایک سلبی حقیقت ہے، اور اسلام ایجابی، اگر ہندو اپنی نسبت کچھ نہ جانے گا، تب بھی ہندو ہی رہے گا، لیکن اگر مسلمان اپنی نسبت کچھ نہیں جانے گا، تو وہ مسلمان نہیں رہے گا، اس لیے مذہبی تعلیم کا فقدان ہندو کی ہندویت میں خلل انداز نہیں، لیکن مسلمان کے مسلمان ہونے میں خلل انداز ہوگا، حتیٰ کہ چند نسلوں کے بعد (خاکم بدہن) مسلمان نام کا مسلمان بھی باقی نہیں رہے گا، اس لیے

ع گر گردن است چارۂ مجنوں کنوں کنید

حلقہ بھوانہ ضلع جھنگ (پنجاب) سے جمعیۃ تعلیم الاسلام کے ناظم پنجاب کے عربی مدرسوں کی حالت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، لکھتے ہیں:

> ”مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مدارس عربیہ کے موجودہ نظام اور مروجہ عربی نصاب سے بہت بیزار اور متنفر ہو رہا ہے، یا ہو چکا ہے، خاص کر پنجاب کا انگریزی تعلیم یافتہ اور امرا کا طبقہ عربی تعلیم و تعلم سے کوسوں دور بھاگتا، اور اسے بیکار و مہمل تصور کرتا ہے،

(العیاذ باللہ العظیم) اور موجودہ طریق کار سے سخت بدظن ہے، اور اس کے ساتھ زندقہ و الحاد اور نئے فتنوں کا شباب اور غیر مذاہب کا تبلیغی پروپگنڈا زوروں پر ہے، بنابریں اس وقت نہایت ہی اشد ضرورت ہے، کہ مشاہیر حضرات علمائے عظام ہندوستان میں عربی مدارس کے تحفظ و بقا و مستقبل میں استحکام کے لیے موجودہ نصاب تعلیم میں حسب ضرورت ترمیم فرمائیں، اور نظام تعلیم کی ترقی و تنظیم کے لیے کوئی بہترین لائحہ عمل تجویز فرمائیں"۔

یہ متن کسی شرح کا محتاج نہیں، کیا ہمارے عربی مدارس کے علماء اور مدرسین کسی ایک مرکز پر اب بھی جمع ہو کر کچھ سوچنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

(معارف ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء)

(۵)

ماتم اقبال

ڈاکٹر اقبال وقعت الواقعہ، آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کش مکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیائے فانی کو الوداع کہا، صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت، اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی، ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے دہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کا ہر پرواز بال جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی، لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غمخوار شاعر اب عرش الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جارہے ہوں گے، خداوندا! اس کے دل شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غمخواری فرما، اور اپنی ربانی نوازشوں

سے اس کے قلب حزیں کو مسرور کر،

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لیے ایک نیا پیام لاتا تھا، وہ توحید خالص کا پرستار، دین کامل کا علم بردار اور تجدید ملت کا طلب گار تھا، اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام علیہ السّلام کا عشق پیوست تھا، اور اس کی آنکھیں جسم اسلام کے ہر ناسور پر اشکبار رہتی تھیں، اس نے مستقبل اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا، اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہوگئی،

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آسکتا نہیں،

کہنے کو تو ہم میں ملت کے غم خواروں کی کمی نہیں، اور نہ امت کے دوستداروں کی قلت، مگر واقعہ یہ ہے، کہ نئی تعلیم نے اپنے ساٹھ ستر برس کے طویل عرصہ میں دو ہی سچے غم خوار پیدا کیے، ایک محمد علی مرحوم، اور دوسرا اقبال مرحوم، دونوں مرحوموں پر خدا کی بڑی رحمت ہو، ان کے دلوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا، اور رسول رحمت (صلی اللّٰہ علیہ وسلم) کے ساتھ سچا عشق، نئے زمانہ کی جھوٹی آب و تاب اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں، آفتاب اسلام کی ضیاباری کے مقابلہ میں ان کے سامنے جدید تہذیب و تمدن اور زمانۂ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی مہ نخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی، خدا ان کی قبروں کو اپنے نور سے بھر دے،

اقبال کی قومی شاعری بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوئی، بیسویں صدی کے اس پیغام رساں نے اپنے اڑتیس برس کے شاعرانہ پیغاموں سے ملت کے نوجوانوں میں نئی امنگ بھر دی، اور نئے سفر کے قطع منزل کے لیے ان میں نئے سرے سے ہمت پیدا کر دی، اقبال کا یہ دعویٰ حرف حرف سچا تھا،

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یاد رہیں گی، وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر انشاء اللّٰہ رہیگا، ان کی شرحیں لکھی جائیں گی، تشریحیں کی جائیں گی، نظریے ان سے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا، اس کی

دلیلیں ڈھونڈی جائیں گی، قرآن پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا، اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں انشاء اللہ ہمیشہ زندہ رہیگا، اور اقبال زندۂ جاوید،

اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں، یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو کلام الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے آشنا تھے، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہوکر، اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا، یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا،

وفد کابل جن تین ممبروں سے بنا تھا، افسوس ہے کہ اس میں یکے بادیگرے دو چل دیے، سر راس مسعود اور اقبال، اب صرف ایک رہ گیا ہے، اور معلوم نہیں کہ وہ بھی کتنے دنوں کے لیے ہے، آہ

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند

مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اسی وقت پہچان لیا تھا، جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغِ شہرت نے پر و بال نہیں پیدا کیے تھے، چنانچہ انھوں نے پیش گوئی کی تھی، کہ حالی و آزاد کی جو کرسیاں خالی ہوں گی، ان میں سے ایک اقبال کی نشست سے پُر ہو جائے گی، افسوس کہ آج اڑتیس برس کے بعد وہ کرسی خالی ہو گئی، اور اب اس کے بھرنے کی کوئی صورت نہیں۔

اقبال ہندوستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال، فضل و کمال کا پیکر اقبال، حکمت و معرفت کا دانا اقبال، کاروان ملت کا رہنما اقبال رخصت رخصت، الوداع الوداع، سلام اللہ علیک و رحمتہ الی یوم التلاق،

(معارف ماہ مئی ۱۹۳۸ء)

(۶)

میں دو مہینوں سے دفتر سے دور ہوں، اس مہینہ کے شذرات کے صفحے لکھ کر ۹ر جون کو دفتر بھیجے گئے تھے،

مگر افسوس ہے کہ وہ ڈاک میں ضائع ہوگیے، جس کی اطلاع ۱۸ر کی شام کو مجھے ہوئی، اب ۱۹ر کی پچھلی رات کو یہ صفحے لکھ کر دوبارہ بھیجے جارہے ہیں، اس اتفاقی بلکہ جبری تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔

خوشی کی بات ہے، کہ مسلمانوں کو ابتدائی تعلیم کی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے، مختلف صوبوں میں اس کے لیے جد و جہد کا آغاز ہو رہا ہے، صوبہ بہار میں جہاں آج کل میرا قیام ہے، بعض نوجوان اس کے لیے کچھ محنت بھی اٹھا رہے ہیں، لیکن ضرورت اس کی ہے، کہ کسی خاص نظام اور کسی ایک خاص نصاب اور طریقۂ تعلیم کی یکسانی کے ساتھ اس کام کو چلایا جائے،

صوبۂ بہار کے وزیر تعلیم آنریبل ڈاکٹر محمود صاحب نے اپنے صوبہ میں اردو اور ہندی کی ابتدائی تعلیم پھیلانے اور ہندوستانی زبان کو باقاعدہ تعلیمی زبان بنانے کی جو کوششیں کی ہیں، وہ بہت کچھ قدر کے قابل ہیں، نوجوان طالب علم جہالت کے خلاف جہاد کرنے میں مصروف ہیں، ہندی اور اردو دونوں کی چند ہفتوں میں تعلیم کے نقشے بن گیے ہیں، جن کے ذریعہ سے تعلیم دی جارہی ہے، ہندوستانی زبان کے لیے لغت اور قواعد کی کتابوں کے بنانے کا کام انجمن ترقی اردو اور ہندوستانی اکاڈیمی کے سکریٹریوں کے سپرد ہوا ہے، اور معلوم ہوا کہ یہ دونوں صاحب اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔

مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے جو اب تک صرف عربی کتابوں کو چھاپتی تھی، اپنی ترقی کا دوسرا قدم بڑھایا ہے، اس نے ایک عربی اور اسلامی علوم و فنون کی اکاڈیمی کی شکل اختیار کی ہے، اور اس غرض سے ۹ر ۱۰ر ۱۱ر جولائی ۱۹۳۸ء کو حیدرآباد میں وہ اپنا ایک اجلاس کر رہی ہے، جس میں ملک کے ممتاز علماء اور محققین علوم اسلامیہ اپنے اپنے تحقیقی مقالے پیش کریں گے، خدا کرے کہ اس کی ترقی کا یہ نیا قدم مسعود و مبارک ہو۔

لاہور کا ادارۂ معارف اسلامیہ جو ہر دوسرے سال اپنا اجلاس کرتا ہے، امسال میں دہلی میں دسمبر میں اپنا اجلاس کرے گا۔ امید ہے کہ ملک کے مختلف گوشوں سے اہل علم اس میں شرکت کریں گے، ادارہ کے متعلق کئی سال سے کوششیں ہو رہی تھیں، کہ وہ لاہور کے علاوہ وقتاً فوقتاً اپنے قدوم سے دوسرے شہروں کی بھی رونق بڑھائے، ادارہ کا یہ موجودہ فیصلہ تعریف کا مستحق ہے، اور جب وہ دہلی تک قدم رنجہ فرما چکا ہے،

تو پھر آیندہ اس کو لکھنؤ اور پھر اعظم گڈھ تک آنے میں کیا زحمت ہو سکتی ہے۔

یورپ کی اورینٹل کانفرنس کا آیندہ اجلاس ۵ - ۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو بلجیم میں ہو رہا ہے، حسب معمول اس دفعہ بھی اس کے نو شعبے ہوں گے، اسلامیات، یہودیات، عیسائی مشرق، مصریات، شوریات، وسط ایشیا، مشرق بعید مع جاوا، ہندیات اور سامی قومیں اور زبانیں، شعبۂ اسلامیات کے صدر ڈاکٹر **وتمک** مقرر ہوئے ہیں۔

یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ جامعہ مصریہ کی انجمن تالیف و اشاعت (لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر) نے ہمارے ہندی حیدر آبادی دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے خواہش کی ہے، کہ وہ عربی میں مسلمانوں کی ابتدائی سیاست خارجہ پر ایک کتاب لکھیں، موصوف نے یہ خواہش منظور کر لی ہے، اور امید ہے کہ سال کے ختم تک ان کا یہ کام انجام کو پہنچے، یہ کتاب انکی شائع شدہ فرانسیسی کتاب سے الگ ہوگی۔

جاپان میں اسلام کا آفتاب اپنی کرنیں پھیلا رہا ہے، جاپان کے شہر کوبے میں ہندوستانی تاجروں کی کوشش سے ایک مسجد تیار ہو چکی ہے، کوبے کی مسجد کے ارکان یہ کوشش کر رہے تھے، کہ جاپان کی حکومت مسجد کو مسلمانوں کی عبادت گاہ تسلیم کر لے، مگر اب تک کامیابی نہیں ہوئی تھی، امسال ارکان مسجد نے وفد کی صورت میں پایۂ تخت میں آکر سلسلۂ جنبانی کی، اور مزید کوشش کے لیے راستہ صاف کر دیا۔

پروفیسر برلاس دہلوی نے جو اس وفد میں شریک تھے، اس وفد کا مختصر حال لکھ کر آیندہ مفصل لکھنے کا وعدہ کیا ہے، موصوف لکھتے ہیں کہ کوبے میں مسجد بن جانے کے بعد ٹوکیو میں مسجد کی ضرورت زیادہ محسوس ہونے لگی، مگر ٹوکیو میں نہ مسلمانوں کی اتنی تعداد ہے، اور نہ ان کے پاس اتنا سرمایہ ہے، کہ وہ تنہا مسجد بنا سکیں، چند ہمدرد جاپانی مدبرین کو اس کا احساس ہوا، تو انھوں نے بعض مخیر جاپانی حضرات سے روپیہ جمع کر کے سوا لاکھ ین کی لاگت سے ایک مسجد اور اسی سے ملحق ایک مدرسہ تعمیر کرانا شروع کیا، اب دونوں مکمل ہو چکے ہیں، اور مئی میں ان کا باقاعدہ افتتاح ہوا، افتتاح کی رسم مسٹر ٹویامہ ایک جاپانی مدبر نے ادا کی، اور فیتہ کاٹ کر مسجد میں پہلا قدم انہی نے رکھا، ان کے ساتھ تاتاری اور دوسرے مسلمان

تکبیر کہتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے، اور نفل نماز شکرانہ ادا کی، باہر شامیانہ میں جلسہ ہوا، جس میں جاپانی معززین اور نمایندوں میں سے بڑے بڑے لوگوں نے تقریریں کیں، مسلمانوں کو اس بات پر تعجب ہوا، کہ اس اسلامی تقریب میں ٹرکی، ایران، اور افغانستان کے نمایندے شریک نہیں ہوئے، شاید اس کی وجہ مسجد کی سیاسی حیثیت ہوگی۔"

ٹوکیو میں قربان علی ایک تاتاری لیڈر ہیں، جو نیم مذہبی اور نیم سیاسی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے حامیوں میں بیس پچیس تاتاری ہیں، باقی چار پانچ سو تاتاری جو ٹوکیو اور جاپان کے دوسرے شہروں میں رہتے ہیں، ان سے سخت نالاں تھے، مئی کے وسط میں وہ گرفتار ہو گیے، اور ان کی جگہ عبدالرشید ابراہیم تاتاری کو دے دی گئی، اب ٹوکیو کی مسجد سے تاتاریوں نے جو ترک موالات کر رکھا تھا، وہ دور ہو رہا ہے، کوبے کے ہندوستانی مسلمانوں سے بھی اس مسجد میں شریک ہونے کی خواہش کی گئی تھی، انھوں نے یہ جواب دیا ہے، کہ مسجد اگر کلیۃً مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے، تو وہ شرکت کر سکتے ہیں، مدبرین جاپان نے اس کا وعدہ کر لیا ہے، اب زمانہ اس کے ایفا کا انتظار کریگا۔

(معارف ماہ جون ۱۹۳۸ء)

(۷)

ابتدائی تعلیم کی جو اسکیم وردھا اسکیم کے نام سے مشہور ہے، اور جس کو ہمارے دوست ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے ترتیب دیا ہے، اس پر غور کرنے کے لیے شملہ میں ایک مرکزی کمیٹی بیٹھی تھی، اس میں ڈاکٹر صاحب نے ان اعتراضوں کا جواب دیا ہے، جو اس اسکیم پر کیے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے ایک فقرہ یہ بھی کہا،

> "اس اسکیم میں مذہبی تعلیم کی گنجائش پوری رکھی گئی ہے، جس کا انتظام نہایت غور کے بعد طے کیا گیا ہے، کہ اسکول کے اوقات کے علاوہ ہو، اور ہر فرقہ اپنی ضرورت کے مطابق اس کا انتظام کرے۔" (ملت۔ دہلی)

ہم کو اس اسکیم کے بانیوں کی اس کشادہ دلی سے بڑی خوشی ہوئی، لیکن یہ نہیں بتایا گیا، کہ اسکول کے اوقات کے علاوہ جو تعلیم دی جاتی ہے، اس کی اہمیت تعلیم میں کیا رہ جاتی ہے، پھر یہ نہ معلوم ہو سکا، کہ اس

خارج از اوقات کی تعلیم کے مصارف کا بار کون اٹھائے گا، آخر اس دنیا میں دین کا یہ اچھوت پن کب تک قائم رہے گا۔

مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت اور اس کی ضرورت اور تیاری پر جو شذرہ معارف میں لکھا گیا تھا، اکثر صوبوں کے مسلمانوں نے اس کی سچائی کو تسلیم کیا، اس سلسلہ میں سی پی کے ایک دردمند مسلمان کے خط کا اقتباس دیا جاتا ہے:

> ”یہاں کی یونیورسٹی میں مسلمانوں کا پتہ نہیں، صوبہ بھر میں اردو کا ایک پروفیسر ہے، اور ایک ہائی اسکول، حالانکہ اس صوبہ میں آٹھ نو لاکھ مسلمان بستے ہیں، یونیورسٹی کی مہر میں ناگ دیوتا بطور نشان علم کے استعمال کیا گیا ہے، بی، اے کے کورس میں اعثم کوفی[1] کی تاریخ کا اردو ترجمہ جو کہ سیفی پریس دہلی سے شائع ہوا ہے، لازمی نصاب کے طور پر رکھا گیا ہے، ودیا مندر جبری تعلیم کی اسکیم ہے، مگر اس میں اردو کا کوئی انتظام نہیں، اب مسلمان یا تو ہندی اور مرہٹی پڑھیں گے، یا جبری تعلیم کے حد قانون کی خلاف ورزی میں قابل تعزیر قرار دیئے جائیں گے،

اوپر اس دردمند مسلمان نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں غور یہ کرنا ہے، کہ اس میں کس کا کتنا قصور ہے، جب تک مسلمان اپنے عمل سے یہ ثابت نہ کر دیں، کہ ہندوستان اور ہندوستان کی چیزیں صرف ہندوؤں کی نہیں، بلکہ مسلمانوں کی بھی ہیں، جب تک ہم کو اپنے ہم وطنوں کی چیرہ دستی کی شکایت نہیں کرنی چاہیے، مسلمانوں کو اس وقت جوش عمل، استحکام و قوت، اور عزم صادق کی ضرورت ہے، مخالفت اور دشمنی کی اسپرٹ سے نہیں، بلکہ اپنے صحیح حق کو حاصل کرنے اور ملک میں اپنی صحیح پوزیشن کو قائم کرنے کے لیے اردو زبان سے قطع نظر کرنا ہمارے لیے قطعاً محال ہے، ورنہ ہندوستانی مسلمانوں کی واحد قومیت کے پرخچے اڑ جائیں گے۔

یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی، کہا جاتا ہے کہ سرکاری تعلیم اور سیاسی معاملات میں مذہب کو

---

[1] معارف: تاریخ کی یہ کتاب بالکل ہی غیر معتبر ہے، اس کو نصاب سے فوراً خارج ہونا چاہیے۔ سید سلیمان،

دخل نہیں، آمنا وصدقنا، مگر پھر یہ کیا ہے، کہ سیاسی و تعلیمی شعاروں میں ہندو مذہبی تخیل کی الوہیت کا ترانہ گایا جاتا ہے، اور نشان بنائے جاتے ہیں، اب یا تو یہ کہدیا جائے، کہ یہ سراسر ہندو مذہبی تخیل تم کو زبردستی قبول ہی کرنا پڑے گا، یا مشترکہ متحدہ ہندوستان اپنے لیے آپ اپنے ملکی شعار بنائے گا، اور ملکی ترانہ گائے گا۔

اب تک دو ہی قسم کے مسلمان سمجھے جاتے ہیں، ایک وہ جو اپنے دین و ملت سے ٹوٹ کر کانگرس میں مدغم ہوگیے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو مسلمانوں کے وہمی حقوق اور فرضی امتیازات کا خواب دیکھتے ہیں، لیکن بھولنا نہیں چاہیے کہ ایک تیسرا فریق بھی ہے، جو اپنی دعاؤں میں ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الآخرۃ حسنۃ کہکر دونوں کی بھلائیوں کا خواستگار ہے، ملکی آزادی کی پوری جد وجہد کے ساتھ اس کو اپنے دین و ملت کے ساتھ بھی اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ محبت ہے، اور اسی کی خاطر وہ ہر کام کرتا ہے، اگر واقعی طلب گار آزادی مسلمانوں میں ایسے لوگ موجود ہیں، تو ان کو اٹھ کر اپنا خاکہ اسی طرح پیش کرنا چاہیے، جس طرح کانگرسی وزارتیں کر رہی ہیں، اور جیسے یہ آزاد حکومتیں اپنی سیاسی تجویزوں کو عمل میں لا رہی ہیں، آزاد مذہبی مسلمان بھی اپنے خاکہ کو مسلمانوں کے لیے عمل میں لانے کی کوشش کریں، بلکہ کیا اچھا ہوگا، کہ اسلامی صوبوں کی وزارتیں دار القضا اور مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم وغیرہ کی تجویزوں پر غور کریں، اور ان کو عمل میں لائیں، تاکہ اس باب میں غیر اسلامی صوبے بھی ان کے نقش قدم پر چل سکیں۔

انگریزی خواں علماء کی ضرورت روز بروز جیسی بڑھ رہی ہے، وہ تو معلوم ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ علماء، انگریزی خواں ہونے کے بعد علماء نہیں رہتے، ایک گریجویٹ ڈاکٹر پی۔ ایچ۔ ڈی عالم و فاضل مشرقی کو جو بحمد اللہ پرانی درسگاہ کے سند یافتہ بھی ہیں، ہیٹ اور انگریزی لباس پر ٹوکا تو جواب ارشاد ہوا، کہ اس کے بغیر رعب نہیں بیٹھتا، پوچھنے کو جی چاہا کہ آپ کی فرنگیت کا، یا آپ کی علمیت کا، حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ہماری ہی مرعوبیت کا نتیجہ ہے، کہ ہمارے عالم انگریزی پڑھ کر عالم نہیں رہتے، بلکہ اس نسبت کو اپنے لیے تحقیر اور اپنے حق میں توہین سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ یہ اعزاز، یہ تنخواہ اور یہ بلند کرسی اسی کی بدولت پا رہے ہیں۔

بہر حال بات کہنی کچھ تھی، اور رہ گو کچھ گئی، ایک اسلامی ریاست کو تین ایسے انگریزی داں علما کی ضرورت ہے، جو تبلیغ و اصلاح کا کام کر سکیں، تنخواہ ستر روپے ملے گی، اگر کچھ لوگ ایسے ہوں جو دلی ولولہ کے ساتھ اس کام کو انجام دے سکیں، جنھوں نے یہ کام کیا ہو، یا ان میں کرنے کی اہلیت ہو وہ درخواستیں ہمارے پاس بھیجدیں۔

(معارف ماہ جولائی ۱۹۳۸ء)

(۸)

سیرۃ النبیؐ کی پانچویں جلد تین برس ہوئے کہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی، اس وقت سے لوگوں کا تقاضا تھا کہ وہ بھی جلد سے جلد چھوٹی تقطیع پر چھپ جائے، چنانچہ اب بڑی مسرت سے اطلاع دی جاتی ہے، کہ وہ چھوٹی تقطیع پر چھپ کر تیار ہے، جن صاحبوں کے پاس چھوٹی تقطیع کی سیرت کی پہلی جلدیں ہیں۔ وہ یہ جلد بھی منگوالیں، یہ حسب دستور دو قسم کے کاغذوں پر چھپی ہے، پہلی قسم کی قیمت صہ/ ہے، اور دوسری قسم کی ہیہ/، ضخامت ۳۹۴ صفحوں کی ہے۔

سیرت کی چھٹی جلد جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے، ابھی تک زیر طبع ہے، اس وقت تک سوا چار سو صفحے چھپ چکے ہیں، سو صفحے ابھی اور چھپنے ہیں، امید ہے، کہ دو تین مہینوں میں یہ چھپکر تیار ہو جائے، اس کے شروع میں اسلام کے فلسفۂ اخلاق پر ایک مفصل مقدمہ ہے۔

مسند احمد بن حنبل حدیث کی سب سے بڑی کتاب ہے، چھ ضخیم جلدوں میں چھپی ہے، اس کی ترتیب راوی صحابیوں کے ناموں پر ہے، اس لیے اس میں کسی حدیث کی تلاش میں بڑی دقت ہوتی تھی ہندوستان میں اہل حدیث کانفرنس نے اس کی ابواب پر ترتیب کی کوشش کا کئی دفعہ ارادہ کیا، مگر کامیابی نہیں ہوئی، حالانکہ پہلے بزرگوں میں سے کوئی یہ کام کر چکا ہے، اب یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مصر کے ایک عالم نے جو ساعاتیؒ کے نام سے مشہور ہیں، اس کام کو بڑی محنت سے انجام دیا ہے، اور ہر مضمون کی حدیث کو الگ الگ کیا ہے، متن کے نیچے آدھے حصہ میں حدیث کی شرح بھی کرتے گئے ہیں، سیرت کی حدیثوں کو بھی

الگ جمع کیا ہے، اس وقت تک پانچ جلدیں ہندوستان آچکی ہیں، الفتح الربانی کتاب کا نام رکھا ہے،

تفسیروں میں محدث ابن کثیر کی تفسیر ایک خاص حیثیت رکھتی ہے، نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اس کو اپنی تفسیر فتح البیان کے حاشیہ پر چھپوایا تھا، مگر اس کی اس ضمنی حیثیت سے فائدہ پوری طرح نہیں پہنچتا تھا، اب مصر میں یہ علیحدہ مستقل طور سے چھاپی گئی ہے، ہندوستان میں ابنائے غلام رسول سورتی، جاملی محلہ بمبئی نمبر ۳ سے ملے گی،

ابنائے شرف الدین بھنڈی بازار نے عربی ٹائپ کا ایک عمدہ چھاپہ قائم کیا ہے، اور فارسی و عربی کی بعض کتابیں نہایت صفائی اور خوبی سے چھاپ کر شائع کی ہیں، منجملہ ان کے ایک مقدمۂ ابن صلاح ہے، طبقات ابن سعد بھی بعض ضروری تصحیح و تحشیہ کے بعد یہ مطبع چھاپ رہا ہے،

مجلس احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد دکن جو فقہ حنفی کی امہات کتب کو چھاپنے کا کام بڑی محنت سے انجام دے رہی ہے، ابھی حال میں اس نے امام محمد کی مشہور کتاب جامع کبیر کو چھاپ کر شائع کیا ہے، کتاب کے مسودہ مصحح مولانا ابوالوفا صاحب قندھاری مدرس مدرسہ نظامیہ نے جس طرح ٹونک جاکر ستائیس ۲۷ دنوں میں اس کتاب کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا، اور مصر و قسطنطنیہ سے اس کے عکسی نسخے منگوا کر مقابلہ اور تصحیح و تحشیہ کی خدمت انجام دی، وہ علمائے سلف کی محنتوں کو یاد دلاتی ہے، کتاب ابنائے غلام رسول، جاملی محلہ بمبئی نمبر ۳ سے ملے گی۔

خوشی کی بات ہے کہ ایران میں بھی ہماری بعض مستند ہندوستانی کتابوں کے ترجمے شروع ہو گئے ہیں، اس سلسلہ میں مولانا حالی کی حیات سعدی، اور مولانا شبلی کی شعر العجم کے فارسی ترجمے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، اور شاید شمس العلماء آزاد کی سخندان پارس کا بھی، امید ہے کہ اس سے دونوں ملکوں کے درمیان وہ علمی تعلق پھر پیدا ہو جائے گا، جو سو ڈیڑھ برس سے منقطع ہو گیا ہے،

ایران میں آجکل قدیم عربی و فارسی کتابوں کی تصحیح و اشاعت کا شوق بھی پیدا ہو رہا ہے، محاسن اصفہان، تتمۃ یتیمۃ الدہر، حدود العالم (جغرافیہ) التوسل الی الترسل، تحفۂ سامی اور بہت سی مفید کتابیں چھپ کر عام ہو چکی ہیں، کتاب خانۂ دانش طہران نے ہمارے پاس بعض کتابیں اس غرض سے بھی بھیجی ہیں،

کہ اہل شوق ان کو خرید سکیں، ان کی فہرست معارف میں شائع ہوگی،

بمبئی کے بعض پرجوش مسلمانوں نے جن میں حاجی قاسم علی جیراج بھائی کا نام خاص طور سے ذکر کے قابل ہے، اسلام پر مفید انگریزی و اردو و گجراتی کتابوں کا سلسلہ ایک ادارہ کی طرف سے قائم کیا ہے، جس کا نام "مسلم مشن اینڈ لٹریری ٹرسٹ" رکھا ہے، ابھی حال میں "محمد صلعم" کے نام سے انگریزی میں ایک کتاب ۳۰۰ صفحوں کی ضخامت میں شائع کی ہے، جس پر ہز ہائینس آغاخان نے مقدمہ لکھا ہے،

بچوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت اس لیے نہیں ہے، کہ اس سے ... ہر بچہ کو لکھنے پڑھنے اور کچھ کمانے کا ڈھنگ آجائے گا، بلکہ اس لیے ہے، کہ اس عمر میں تعلیم کا نقش ان کے دل پر ہمیشہ کے لیے قائم رہ جائے گا، مسلمان بچوں کو اس عمر میں مذہبی تعلیم سے خالی رکھنا عملاً انکے مذہب سے ارتداد کے ہم معنی ہے، جس جبری تعلیم کے نفاذ کی اسکیم میں یہ پہلو نظر انداز ہوگا، اس کے معنیٰ یہ ہیں، کہ یا تو اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اس جبری تعلیم سے محروم رہیں، یا یہ ہے کہ مسلمان آئندہ عملاً مسلمان نہ رہیں۔

اس مشکل کا حل صرف اختلاف اور شور و غوغا نہیں ہے، بلکہ سنجیدگی کے ساتھ معاملہ پر غور کرنا اور پوری مستعدی کے ساتھ پورے ملک میں مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی ایک اسکیم مرتب کرنا اور اس پر عمل کرنا، یہ یاد رہے کہ اگر ہم اس نیم آزاد حکومت سے اپنی اسکیم نہیں منوا سکے، تو پھر پوری آزاد حکومت سے منوانے کی طاقت ہم میں کہاں سے آجائے گی، جو کچھ کرنا ہے، سفر کی پہلی ہی منزل میں کرنا چاہیے، تاکہ آئندہ غلط روایت کی دلیل نہ پیدا ہونے پائے۔

(معارف ماہ اگست سنہ ۱۹۳۸ء)

(۹)

ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی ملی جلی زبان کا نام ہندوستانی رکھا گیا، اور جس کو کانگریس نے بار بار دیس کی عام زبان کے نام سے پکارا، اور جس کی تعریف یہ کی گئی، کہ جو شمالی ہندوستان میں عام طور سے

بولی جاتی ہے، اور جو عربی اور سنسکرت کے نامانوس لفظوں سے پاک ہے، راجندر عبدالحق معاہدہ میں یہی لفظ ہیں، گاندھی جی نے یہی کہا، اور جواہر لال نہرو نے یہی بتایا، مولانا ابوالکلام آزاد نے یہی فرمایا، اور ہم کو اطمینان ہوگیا، کہ کانگریس کے "ہائی کمانڈ" کے حکم کے آگے اب کسی کانگریسی وزارت کے ممبر کو سرتابی کی جرأت نہ ہوگی، ڈاکٹر کھرے کی نظیر بھی سامنے تھی،

مگر معلوم ہوا کہ وردھا کے پایۂ تخت سے ناگپور جتنا قریب ہے، لکھنؤ اس سے بہت دور ہے، اس لیے "ہائی کمانڈ" کی سرتابی کی جو سزا ناگپور میں مل سکتی ہے، وہ لکھنؤ میں نہیں مل سکتی، یوپی گورنمنٹ کے عہدیدار اور ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی کے افسر ہندوستانی کے بجائے علانیہ ہندی کے رواج پر تلے ہوئے ہیں، خصوصیت کے ساتھ انریبل سمپورنانند جی وزیر تعلیم کے رویہ کی سخت شکایت ہے، کہ وہ صاف صاف کانگریس کے حکم کو توڑ رہے ہیں، اور اپنی پبلک تقریروں میں وہ کچھ کہہ رہے ہیں، جو ان جیسے وفادار کانگریسیوں کو نہیں کہنا چاہیے۔

اس وقت ہمارے سامنے ہمارے وزیر تعلیم کی وہ تقریر ہے، جو بنارس میں انھوں نے ۱۹؍ اگست ۱۹۳۸ء کی شام کو ناگری پرچارنی سبھا کے ایڈریس کے جواب میں فرمائی، اور جس میں یہ ارشاد ہوا:

> "ہندی نہ صرف شمالی ہند کی مادری زبان ہے، بلکہ وہ ہندوستان کی "لنگوا فرانیکا" ہے، یہ ایسی ہونی چاہیے، جس کو آسانی سے نہ صرف بنگال اور گجرات کے لوگ بول اور سمجھ سکیں، بلکہ وہ بھی جو دکنی ہند میں رہتے ہیں، اگر ہم یہ چاہتے ہیں، کہ یہ ہندی جس کو ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے، ہمارے دکھنی بھائی بھی آسانی سے سیکھ لیں، تو یہ ضروری ہے کہ ہم بہت کافی بڑی تعداد میں سنسکرت الفاظ استعمال کریں۔
>
> (اسٹیٹمین ۲۱؍ اگست ۱۹۳۸ء)

اب یوپی کانگریس کی زبان حال ہفتہ وار ہندوستان کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"مدراس کی کانگریسی وزارت نے طے کر لیا ہے، کہ مدراس میں مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبان کی ابتدائی تعلیم لازمی کر دی جائے گی، کیونکہ اس وقت یہی ایک زبان

ہے، جو ہندوستان کی مشترکہ زبان کہی جا سکتی ہے، ہندوستانی زبان سے وہ زبان مراد ہے، جو سنسکرت اور عربی و فارسی کے بھاری لفظوں سے خالی ہے، تمام شمالی ہند اور دکن میں بولی اور سمجھی جاتی ہے، اور اردو ہندی دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے"۔

(۲۸؍ اگست ۱۹۳۸ء)

کیا یہ دونوں ٹکڑے کسی ایک سبھا کے ذمہ داروں کے بیان ہیں،

کہیں یہ حکم رہے کہیں وہ ارشاد رہے،

اگر یہ دلیل صحیح ہے کہ دکھن کے ہندوؤں کے سمجھنے کے لیے سنسکرت لفظوں کو کافی بڑی تعداد میں اس زبان میں ملانا چاہیے، تو یہ دلیل کیوں غلط ہوگی، کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کافی بڑی تعداد میں عربی و فارسی کے لفظ ملائے جائیں، واقعہ یہ ہے، کہ کانگریس کو اس کے نادان دوستوں نے جتنا نقصان پہنچایا ہے، اتنا اس کے دشمنوں نے نہیں،

بمبئی کے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کا تذکرہ ان صفحوں میں کئی دفعہ آیا ہے، اس کی عمر کا یہ چھٹا سال ہے، اس نے اتنے عرصہ میں کئی رسالے اور کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے ایک مشہور صوفی ابوسعید خزاز (سنہ ۲۸۶ھ) کی عربی صوفیانہ کتاب "کتاب الصدق" ہے، جو پچھلے سال چھپ کر نکلی ہے، ایسوسی ایشن کے لائق سکریٹری آصف فیضی صاحب پوری تن دہی سے اس کو چلا رہے ہیں، مقدمۂ ابن خلدون کا انگریزی ترجمہ بھی جس کو پروفیسر داؤد پوتا کر رہے ہیں، اسی کی طرف سے چھپنے والا ہے۔

ہمارے فاضل دوست پرنسپل محمد شفیع صاحب (لاہور) اپنے اورینٹل میگزین کے ذریعہ سے ہمیشہ مفید کتابوں سے روشناس کراتے ہیں، ابھی حال میں انھوں نے آداب الحرب کے نام سے ہم کو اسلامی فن جنگ کی ایک فارسی کتاب سے آشنا کیا ہے، جو اسلامی ہند میں سلطان التمش کے زمانہ میں لکھی گئی تھی، اس کا ایک نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں اور دوسرا انڈیا آفس میں ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی فنی ترقی کا یہ گوشہ اب تک چھپا تھا۔

مصر کی ایک اطلاع سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ مولوی حافظ عمران خاں صاحب جو جامع ازہر کے

درجۂ تکمیل میں تعلیم پا رہے ہیں، پہلے سال کے امتحان میں اول آئے ہیں، ۲۷ شریک امتحان طلبہ میں سے ۱۹ پاس ہوئے، جن میں یہ اول ہیں، ان میں ایک حافظ صاحب ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں کامیاب واپس لائے۔

(معارف ماہ ستمبر ۱۹۳۸ء)

(۱۰)

حاتمِ یوپی کی وفات

ہمارے صوبہ کے حاتم نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر نے ستمبر کی آخری تاریخوں میں اپنے وطن بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں وفات پائی، مرحوم کئی سال سے لگاتار بیمار تھے، بخار اور کھانسی کی تکلیف تھی، ضعف کبھی بڑھ جاتا، کبھی گھٹ جاتا، اور آخر اتنا بڑھا کہ پھر نہ گھٹا، چوہتر ۷۴ برس کی عمر میں دنیا کے ہر اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر اور ہر سرد و گرم کو آزما کر دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو کر ۲۸ ستمبر ۱۹۳۸ء کو اس پری بھری دنیا کو الوداع کہا۔

مرحوم شروانی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور جیسا کہ وہ فرمایا کرتے تھے، سر سید کی گودوں میں کھیل کر جوان ہوئے تھے، عربی و فارسی کی تعلیم پائی تھی، اور انگریزی اتنی جانتے تھے کہ اخبار پڑھ اور گفتگو سمجھ لیتے تھے، فارسی کے شاعر تھے، مرزا اسنجر طہرانی سے اصلاحیں لی تھیں، فارسی کا پورا دیوان مرتب تھا، ان کی غزلیں اور نظمیں کئی دفعہ ان کی زبان سے سنیں، اور شاید ایک دو دفعہ معارف میں بھی چھپیں، تقریر شگفتہ اور پرمذاق کرتے تھے۔

مولانا شبلی مرحوم کے دوستوں میں تھے، اسی کا اثر یہ تھا کہ وہ مولانا کے کاموں اور تحریکوں سے دلچسپی رکھتے تھے، ندوہ کی طرف ان کا التفات مولانا ہی کے دم قدم اور قلم کے اشاروں سے ہوا، اور دار المصنفین کی طرف ان کی چشم کرم بھی اسی نسبت کی مرہون ہے، دار المصنفین اپنی چوبیس ۲۴ برس کی عمر میں حیدر آباد و بھوپال کی سرکاروں کے علاوہ اگر کسی محسن کے فیض سے مستفید ہوا ہے، تو وہ بھیکم پور کے اسی رئیس کی ذات تھی، مرحوم نے دار المصنفین کی مسجد

پانچ ہزار کے خرچ سے بنوائی، اور اس کے لیے دری کا فرش اور پردے بنوا کر بھیجے،

علی گڈھ کالج، ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی، اسلامیہ اسکول اٹاوہ، الہ آباد یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی دار العلوم ندوۃ العلماء، دار العلوم دیوبند، غرض اس صوبہ کا کوئی علمی و تعلیمی ادارہ ایسا نہیں، جو ان کے چشمۂ فیض سے سیراب نہیں، بلکہ سن کر حیرت ہوگی کہ جمعیۃ العلماء اور کانگریس تک ان کے خوان نعمت سے مستفید تھے، وہ ہر قوم اور ہر فرقہ کے نیک کاموں کی امداد میں حصہ لیتے تھے، مسلمان، ہندو، عیسائی، پارسی کی کوئی تخصیص نہ تھی، غرض جو آیا وہ اپنے نصیب کا حصہ پا گیا،

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مور و ملخ گرد آیند!

مرحوم اپنی ذاتی دولتمندی کے باوجود بے حد سادہ زندگی بسر کرتے تھے، ایک دفعہ انھوں نے اپنے ململ کے کرتے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تین آنے گز کا ہے، اور رانی کے گانوں کا بنا ہوا ہے، لیکن اس ذاتی کفایت شعاری سے بچا ہوا سرمایہ بے تکلف سال دو سال میں قوم اور ملک کے کسی کام کے نذر کر دیتے تھے، وہ اکثر ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

نہ کس می دہاند نہ کس می دھد
خدا می دھاند و خدا می دھد

مرحوم سے آخری ملاقات پچھلے جاڑوں میں بھیکم پور میں ہوئی، وہ خود بھی اپنی زندگی سے مایوس تھے، اور ایسے ہی کلمات ان کی زبان پر تھے، دیر تک حج کے واقعات اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے حالات بیان فرماتے رہے، زندگی کے اختتام اور کسی نیک عمل کے قبول کی حسرت ظاہر کی، میں نے تسلی دی، کہ حاتم کی بیٹی دربار رسالت میں اپنے باپ کی فیاضی کی بدولت عزت کی مستحق ٹھہری، پھر کوئی سبب نہیں، کہ آپ کی تمام عمر کی فیاضی کے کام دربار الٰہی میں قبولیت کے مستحق نہ ٹھہریں۔

افسوس کہ ہمارے صوبہ کا یہ حاتم ہم سے رخصت ہو گیا، ہر نیک تحریک کا مددگار، ہر اچھے کاموں کا معاون، ہر ضرورت پر ہر ایک کے کام آنے والا جاتا رہا، خداوند رحیم و کریم کی بارگاہ بے نیاز میں دعا ہے، کہ

وہ مرحوم کے اعمال نیک کو قبول فرما کر اس کو اپنی مغفرت کی دولت سے مالا مال کرے، اور مرحوم کے خرد سال جانشین کو عمر و اقبال اور توفیق خیر سے بہرہ مند فرمائے۔

۱۔ ۲۔ ۳/ اکتوبر کو پٹنہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہوا، کانفرنس اپنی اکیاون ۵۱ سال کی عمر میں پٹنہ میں یہ پہلی دفعہ ہوئی، اور حق یہ ہے کہ یہ ساری کامیابی ایک محترم خاتون کے سبب ہوئی، اور حافظ کا وہ مصرع جس میں اکبر نے حسب زمانہ اصلاح دی۔ ع

زنے از پردہ بروں آید و کارے بکند

اتنے دنوں کے بعد حرف حرف پورا اترا۔

کانفرنس میں مہمان بھی آئے تھے، نمایندے بھی تھے، تجویزیں بھی پیش ہوئیں، آنریبل فضل حق کا خطبۂ صدارت بھی بہت اچھے خیالات کا حامل تھا، محترمہ لیڈی انیس امام کا استقبالی خطبہ بھی دلچسپ تھا، گفتگو میں ہما ہمی اور دونوں میں سرگرمی بھی پوری تھی، مگر اس عطر کی زمین تعلیم کے بجائے سیاست تھی، اور وہ بھی وہ سیاست جس میں عاقبت اندیشی کی جگہ صرف جذبات کی نمائش ہو۔

مسلمان ایسے دور سے گذر رہے ہیں، جب ایک طرف ایک متفقہ پروگرام اور سالہا سال کی پہونچی ہوئی تجویزیں ہیں، اور دوسری طرف ہنگامی تجاویز، پراگندہ خیالات اور تعمیر ملت کے بجائے صرف ذاتی کامیابی کی دھن ہے، یہ الفاظ نہایت درد و کرب کے ساتھ قلم سے نکل رہے ہیں، دل چاہتا ہے کہ پورا مسلم ہندوستان یکجا ہو کر پہلے اپنا تعلیمی مقصد متعین کرتا، پھر اس پر اپنی ملت کی تعمیر کرتا۔ ع

مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی تو ہو۔

(معارف ماہ اکتوبر ۱۹۳۸ء)

(۱۱)

علمی حلقوں میں یہ خبر غم و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی، کہ جھنڈا ضلع حیدرآباد سندھ کے مشہور عالم پیر احسان اللہ راشدی

شاہ صاحب، جو قلمی کتابوں کے بڑے عاشق تھے، چوالیس ۴۴ برس کی عمر میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو اس دنیا سے چل بسے، مرحوم حدیث و رجال کے بڑے عالم تھے، اور ان کے کتب خانہ میں حدیث و تفسیر و رجال کی نایاب قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، ان کے شوق کا یہ عالم تھا، کہ مشرق و مغرب، مصر و شام و عرب و قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں ان کے کاتب اور ناسخ نئی نئی قلمی کتابوں کی نقل پر مامور رہتے تھے، مرحوم ایک خانقاہ کے سجادہ نشین اور طریق سلف کے متبع اور علم و عمل دونوں میں ممتاز تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنے انوار رحمت کی بارش فرمائے۔

ہمارے عربی مدرسوں کی مالی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی جاتی ہے، ہمارے نئے تعلیم یافتوں کے پاس اول تو اپنے اسرافات سے کچھ بچتا نہیں، دوسرے وہ ان مدرسوں کی ضرورت کے قائل بھی نہیں، ابتک سہارا اسلامی ریاستوں کا تھا، تو وہاں اب ایک تو ملکی و غیر ملکی کا سوال پیدا ہو گیا ہے، دوسرے یہ کہ غیر مسلموں کی شورش سے وہاں کے ارباب اقتدار اتنے سہمے ہیں، کہ دین و مذہب اور اسلام کے نام سے کوئی بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، ان مدرسوں کا سب سے بڑا سہارا مسلمان تاجر تھے، مگر پراونشلزم کا برا ہو۔ کہ اس نے ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اب ہر جگہ یہ سوال ہے، کہ صوبہ سے باہر کیوں دیا جائے، رہ گئے عوام وہ دیتے ہیں، اور دے سکتے ہیں، مگر ان سے آنہ آنہ جمع کرنا خود ایک مستقل کام ہے، حکومتِ وقت اول تو دینے سے رہی، اور جس کو دیتی بھی ہے، اسے پوچھیے کہ وہ کس طرح لے رہا ہے، یہ ہے اس قوم کے عربی و مذہبی مدرسوں کا حال جو اپنے دین و ملت اور اسلامی تہذیب و تمدن اور کلچر کی تباہی کے درد سے بے تاب ہے۔

ہم کو یہ صاف کہنا ہے کہ ان مدرسوں کی جتنی ضرورت آج ہے، کل جب ہندوستان کی دوسری شکل ہوگی اس سے بہت بڑھ کر ان کی ضرورت ہوگی، وہ ہندوستان میں اسلام کی بنیاد اور مرکز ہوں گے، لوگ آج کی طرح کل بھی مبتلا عہدوں اور ملازمتوں کے پھیر اور ارباب اقتدار کی چاپلوسی میں لگے ہوں گے، اور یہی دیوانے ملا آج کی طرح کل بھی ہشیار ہوں گے، اور رہیں گے، اس لیے یہ مدرسے جہاں بھی ہوں، جیسے بھی ہوں، ان کو سنبھالنا اور چلانا مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض ہے۔

ان عربی مدرسوں کا اگر کوئی دوسرا فائدہ نہیں، تو یہی کیا کم ہے، کہ یہ غریب طبقوں میں مفت تعلیم کا ذریعہ ہیں، اور ان سے فائدہ اٹھا کر ہمارا غریب طبقہ کچھ اونچا ہوتا ہے، اور اس کی اگلی نسلیں کچھ اور اونچی ہوتی ہیں، اور یہی سلسلہ جاری رہتا ہے، غور کی نظر اس نکتہ کو پوری طرح کھول دے گی۔

ان مدرسوں کے نقائص سے بھی واقفیت ہے، لیکن ان نقائص سے انکار ان مدرسوں کے چلانے والوں کو بھی نہ رہا، وہ پرانا ڈھچر بدلنا بھی چاہتے ہیں، مگر اس کے لیے خرچ اور مصارف ہیں، جن کا سامان ہماری بے توجہی سے نہیں ہوتا، بڑے عربی مدرسوں میں سائنس پڑھانے کے لیے سب تیار ہیں، مگر کئی ہزار کا سامان اور سو سوا سو کا سائنس ماسٹر کہاں سے آئے، اور دوسرے تغیرات کے لیے بھی احساس ہے، مگر قوم کی بے حسی کا رونا ہر جگہ ہے۔

نصاب کی اصلاح کا خیال بھی عربی مدرسوں میں اب عام ہے، ضروری اور غیر ضروری علوم پر بھی نظر ہے، تنقید کے شور و غل سے پرانے علوم کی طرف سے توجہ تو ہٹ گئی، مگر نئے علوم کی تعلیم کا سامان نہ ہو سکا، غرض یہ بھی گیا، وہ بھی گیا، اب قدیم منطق و فلسفہ اور قدیم ہیئت و ریاضیات کا شوق نہیں رہا، اور نئی منطق، نیا فلسفہ، نئی ہیئت اور نئے ریاضیات و طبعیات کی تعلیم بھی نہ دی جا سکی، نتیجہ یہ ہے کہ اب ہمارا مولوی ان سے بھی عاری نکل رہا ہے، اور ان سے بھی، مگر کیوں؟

(معارف ماہ نومبر ۱۹۳۸ء)

(۱۴)

غمِ کمال

آخر اس عیسیٰ نفس کو بھی موت آ گئی، جس نے بیمار ترکی کو شفا اور اس کو موت کے پنجہ سے چھڑا کر زندگی بخشی تھی، دنیا نے اس کا ماتم کیا، اور عجیب تر یہ ہے، کہ انھوں نے بھی اس کا ماتم کیا، جنھوں نے اس کو تختۂ دار پر چڑھانے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی تھی، لیکن اس کی تلوار نے ہر بیڑی کو کاٹا، اور ہر زنجیر کے ٹکڑے کیے، اور پرانی ترکی کو جلا کر اس کی راکھ سے ایک نئی ترکی بنا کر کھڑی کی، ۱۹۲۰ء میں کون خیال کر سکتا تھا، کہ اتحادیوں کے پنجۂ ستم سے بچ کر یہ بیمار صحیح سلامت نکل آئے گا، مگر اس کی تدبیروں نے آخر ہر تدبیر کو شکست دی، ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا۔

قاہری با دلبری پیغمبری است

ایسا سیاسی پیغمبر اگر کوئی ہوا ہے، تو وہ مصطفیٰ کمال اتاترک تھا، جو تاج و تخت، خدم و حشم، باڈی گارڈ، اور محافظوں

کے دستہ کے بغیر ملک پر حکمرانی کرتا تھا، اس نے اسلام کے اس سیاسی رنگ کا دھندلا سا منظر پیش کیا تھا جس کے دیکھنے کو خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمانوں کی آنکھیں بے تاب تھیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی مغفرت و رحمت کے فتوحات سے سرفراز فرمائے۔

ہندوستان کی اسلامی دنیا گذشتہ مہینہ ایک اور صدمۂ عظیم سے دوچار ہوئی، یہ مولانا شوکت علی صاحب کی ناگہانی موت کا سانحہ ہے، یہ وہ شخصیت ہے جس نے تیس ۳۰ برس تک مسلمانوں کی خدمت کی، وہ نہ عالم تھے، نہ مقرر تھے، نہ دولت مند تھے، وہ جیسا کہ خود کہا کرتے تھے، سپاہی تھے، ان تھک کام کرنے والے، نڈر، پُردل ——— اور پرامید، وہ کبھی کسی حال میں ناامید نہیں ہوتے تھے، ان کی تقریر چند فقروں کی ہوتی تھی مگر وہ فقرے لوگوں میں ——— روح پھینک دیتے تھے، وہ اپنے ساتھیوں کو بھی کبھی مایوس نہیں ہونے دیتے تھے، یہ انہی کا کام تھا، کہ ۱۹۲۰ء سے مرتے دم تک سارے ہندوستان کو چھان مارا تھا، تیس ۳۰ برس کی جانکاہ محنت کے بعد موت نے سپاہی کی کمر کھول دی، اور وہ ابدی آرام کے لیے دائمی نیند سو گیا، جامع مسجد کی سیڑھیاں اس کا خواب گاہ بنیں، چشم اعتبار اس کے لوح مزار پر یہ شعر کندہ پائے گی۔

زباں دان محبت بودہ ام دیگر نمی دانم ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا
حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم سر شوریدہ بر بالین آسایش رسید اینجا

ندیم گیا، جو صوبۂ بہار میں علم و ادب کا پرانا خدمت گذار ہے، وہ ایک سال سے مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی سابق رفیق دار المصنفین کے ہاتھوں میں ہے، وہ چاہتے ہیں، کہ اس رسالہ کے ذریعہ اپنے صوبہ کی علمی و ادبی خدمت کریں اس رسالہ کے استحکام اور پریس کے قیام کے لیے انھوں نے یہ تجویز پیش کی ہے، کہ پچیس پچیس روپے کی یکمشت رقم دو سو ۲۰۰ آدمی ادارۂ ندیم کی نذر کریں، اور ادارہ ندیم تا عمر اپنا ماہوار رسالہ اور مطبوعات ان کی خدمت میں پیش کرتا رہے گا۔ اس تجویز پر عمل کر کے متعدد صاحبوں نے اس کی ہمت افزائی کی ہے، مگر ابھی تک مطلوبہ تعداد پوری نہیں ہوئی ہے، امید ہے، کہ صوبہ بہار کے اہل ہمت اس ادارہ کی امداد کر کے اپنے صوبہ میں علمی و ادبی کام کرنے والوں کا حوصلہ بڑھائیں گے۔

ہمارے پرانے مصنفین اور اہل قلم میں ایک نام مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری مصنف البرامکہ و نظام الملک طوسی کا ہے، موصوف سے میری پہلی ملاقات ۱۹۰۴ء میں اس وقت ہوئی تھی، جب لکھنؤ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ تھا، جناب مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی ندوہ میں ٹھہرے ہوئے تھے، اتنے میں ان کی ملاقات کو مولوی عبدالرزاق صاحب آئے، شاہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ "یہ مولوی عبدالرزاق المتخلص بہ البرامکہ ہیں" واقعی موصوف البرامکہ کے مصنف ہی کی حیثیت سے معروف ہیں، اور ایک زمانہ تھا کہ المامون کے بعد البرامکہ ہماری ادبی کتابوں میں سرفہرست تھی۔

ایک زمانہ سے موصوف کا نام ہماری علمی دنیا سے اس طرح غائب ہے، کہ اکثر لوگ یا تو ان کو بھول گیے، یا یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ اس دنیا سے چل بسے، لیکن بحمد اللہ کہ موصوف ابھی تک زندہ اور علمی کاموں میں مصروف ہیں، وہ ایک زمانہ سے ریاست بھوپال میں تحصیلداری وغیرہ کی خدمتوں پر رہے، اور اب اعلیحضرت فرمانروائے بھوپال نے ان کو اپنے یہاں صیغۂ تاریخ بھوپال کا مہتمم مقرر فرمایا ہے، مولوی صاحب موصوف نے اس خبر کے ساتھ بجا طور سے یہ مصرع لکھا ہے۔

عید ہوئی ذوق ولے شام کو

ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کا اجلاس اس سال دسمبر کی آخری تاریخوں میں دلی میں ہو رہا ہے، امید ہے کہ اہل علم مختلف گوشوں سے آکر شریک ہوں گے، اور اپنے علمی مقالات پڑھیں گے، دارالمصنفین کی طرف سے ناظم کے علاوہ شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین اس میں شریک ہوں گے۔

(معارف دسمبر ۱۹۳۸ء)

شذرات

(بابت ماہ جنوری ۱۹۳۹ء تا ماہ دسمبر ۱۹۳۹ء)

قوموں کی ترقی کا اصول ہمیشہ ایک رہا ہے، چند سچی حقیقتوں پر مستحکم یقین، اور اس یقین کے مطابق عمل، اور کامیابی کے لیے مسلسل جد و جہد، سعی و محنت اور اس راہ میں جو تکلیف و مصیبت پیش آئے، اس کو ہنسی خوشی جھیل لینا، زمانہ کی اصطلاحیں بدلتی رہیں گی، لیکن اصطلاحوں کے بدلنے سے حقیقتیں نہیں بدلتیں، اسلام کی اصطلاح میں اس مستحکم یقین کا نام ایمان، اس کے مطابق عمل کا نام عمل صالح اور مسلسل جد و جہد اور سعی و محنت کا نام جہاد اور اس کے لیے پامردی کا نام صبر و ثبات ہے، دنیا میں جب کسی قوم کو کامیابی ہوئی ہے، تو اسی اصول کے مطابق ہوئی ہے، اور جب ہوگی تو اسی اصول کے مطابق ہوگی۔

جانی اور مالی ایثار اس جد و جہد کی لازمی حقیقتیں ہیں، جن کو قرآن پاک کی اصطلاح میں جہاد فی المال اور جہاد بالنفس کہتے ہیں، دنیا کی کوئی تحریک اس مالی اور جانی جہاد کے بغیر نہ کامیاب ہوئی ہے، نہ ہوگی، مذہبی تحریکوں کو جانے دیجئے، آج سیاسی اور اقتصادی تحریکوں کا دور ہے، ان میں سے کون سی تحریک کی گاڑی، ان دو پہیوں کے بغیر چل رہی ہے، روس کا انقلاب، جرمنی اور اٹلی کا فسزم، اسپین میں جمہوریت اور آمریت کا تصادم، فلسطین کی شہادت گاہ، ان میں سے کہاں ان دو کے بغیر کامیابی نصیب ہوئی ہے، یا ہوگی، پھر ہندوستان کے مسلمان اس عرصۂ حیات میں کچھ انوکھی مخلوق نہیں کہ ان کے لیے دنیا کا اصول بدل جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے لیے اپنے قانون قدرت کو توڑ ڈالے گا۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں اپنے قومی و سیاسی ایمان کے لیے کون سی چند حقیقتوں اور سچائیوں کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا ہے، اور اس کے حصول کے لیے وہ کون سی سرفروشی اور قربانی کر رہے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ سلبی اور ہنگامی حقیقتیں کبھی دائمی سربلندی کا جوش و خروش نہیں بخش سکتیں، سکھوں

اور مرہٹوں کی قوتوں کی جوانامرگی کے اسباب بتانے والے بہت کچھ بتا سکتے ہیں، لیکن میرے نزدیک تو اس کا جواب یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت سے کینہ اور دشمنی یا مسلمانوں سے عداوت ہی فرض کر لیجئے، ان دونوں قوموں کا ایسا ہنگامی جذبہ تھا، جو پورا ہو جانے کے بعد خود بخود ختم ہو گیا، اور بقا اور استحکام حاصل نہ کر سکا، آریہ سماج تحریک کا حشر بھی اس سے زیادہ نہیں۔

اب مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے کہ اگر کسی قوم سے مخالفت اور آزردگی ہی ان کی قومی و سیاسی کوششوں کا محور قرار پائے، تو ان کا یہ جذبہ کہاں تک اونچا لے جا سکتا ہے، اور ان کی سعی و محنت، جدوجہاد اور جوش و خروش کو کب تک قائم رکھ سکتا ہے، جو طوفان اور سیلاب دم کے دم میں آتا ہے، وہ اسی طرح دم کے دم میں چلا بھی جاتا ہے،

ہمارے سامنے اسلام خود ایک بہت بڑی حقیقت اور صداقت ہے، وہ مذہب بھی ہے، سیاست بھی ہے، اقتصاد بھی ہے، معاشرت بھی ہے، اس کے مذہبی و سیاسی و اقتصادی و اجتماعی پیغاموں کو پھیلانا، مساوات اور عدل قائم کرنا، اسلامی احکام کی تبلیغ کرنا۔ دنیا سے سود، بدکاری، شراب خواری، قمار بازی، اور ظلم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنا، اور ملک میں ایک نیا سیاسی و اقتصادی نظام قائم کرنا، اس کے وہ فرائض ہیں، جن سے مسلمان غافل ہیں، اور غیر مسلمان اس کے لیے آج دنیا میں کٹ مر رہے ہیں، یہ نہیں کہا جاتا کہ جس کے لیے وہ آج کٹ مر رہے ہیں، وہ عین اسلام ہے، بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں اسلامی نظام کی جھلک ہے، اب یہ خود ہمارا کام ہے، کہ ہم آگے بڑھیں اور اپنا مکمل سیاسی و اقتصادی نظام دنیا کے سامنے پیش کریں، اور اس کے لیے کم از کم وہ جذبہ دکھائیں جو اسپین میں جمہوریت اور فسزم کے حامی دکھا رہے ہیں، وہاں قومیں نہیں لڑ رہی ہیں، بلکہ ایک ہی قوم کے دو حصے دو مختلف نظریوں کی خاطر جان و مال کی بازی لگا رہے ہیں۔

مسلمانوں نے اسلام کے آغاز میں جو لڑائیاں لڑیں، ان کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ کسی ایک مذہب کو زبردستی پھیلانے کے لیے تلواریں نیام سے نکالی گئی تھیں، لیکن آج سوشلزم اور فسزم کے باہمی مقابلہ میں جو تلواریں نیام سے باہر ہیں، کیا وہ بھی کسی خاص مذہب کو زبردستی پھیلانے کی خاطر نہیں ہیں، سوشلزم کے حامی یہ کہیں گے، کہ قوم میں طبقوں کی جنگ عوام کی بھلائی کے لیے چھڑتے ہیں، تو ہم اسلام کے حامی بھی کہتے ہیں، کہ ہم نے لوگوں کی بھلائی کی خاطر تلواریں اٹھائیں، اور شہنشاہیوں کو مٹایا۔ سود خواروں کا قلع قمع کیا، سونے چاندی کے ٹھیکہ داروں کو نیست و

نابود کیا، دنیا میں عدل و مساوات کی حکومت قائم کی، اور انسانوں کو انسانوں کا معبود بننے سے روکا۔

آج زمانہ بدل گیا ہے، تو اصطلاحیں بدل گئی ہیں، لیکن حقیقت اپنی جگہ پر ہے، آج پھر اسلام کو اسی فرض کو ادا کرنا ہے، اگر آج کے کلمہ گو مسلمانوں میں اس کے اس ادائے فرض کے سپاہی بننے کا ولولہ نہیں، تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ کسی اور قوم کو زندگی کے میدان میں لائے، اور اس سے اسلام کا یہ فرض ادا کرائے۔

دنیا آج اپنی نجات کی راہ فسزم، نازی ازم، سوشلزم، کمیونزم، بالشوازم میں ڈھونڈ رہی ہے، حالانکہ اس کا ایک ہی راستہ ہے، "اسلامزم" لیکن وہ اسلام وہ نہیں، جو آج عملاً مسلمانوں میں ہے، بلکہ وہ جو قرآن و سنت میں ہے، آج کی وہ کون سی مشکلیں ہیں، جن کا حل ان میں نہیں، ضرورت نئی نظر اور نئی قوت کی ہے۔

(معارف ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۹ء)

(۲)

دار المصنفین نے اپنا جھونپڑا ایسی جگہ ڈالا ہے، جہاں وہی پہنچ سکتے ہیں، جو اخلاص میں پورے ہیں، شرک کا یہاں موقع نہیں، اور نہ "بیک کرشمہ دو کار" کا اصول کارگر، وہ ریلوے لائن سے پرے، پُر رونق شہروں سے دور، کھیل تماشوں سے بے تعلق، تاریخی دلچسپیوں سے محروم، اور شہری ہنگاموں اور غل و شور سے دور ہے، پھر بھی اگر کوئی یہاں پہنچ جاتا ہے تو خلوص کے سوا کوئی اس کا رہبر نہیں، یہ دلی، لکھنؤ، لاہور اور کلکتہ نہیں، جہاں "بزم اغیار میں گاہے سر راہے گاہے" ملاقات کا اتفاق ہو جائے، پھر بھی ایسے مخلصوں سے کوئی مہینہ خالی نہیں جاتا کہ وہ نہ آتے ہوں۔

موسیٰ جار اللہ کچھ دن ہوئے کہ روس کے مشہور مصلح عالم موسیٰ جار اللہ یہاں تشریف لائے تھے، میں نہ تھا، میری ان کی ملاقات سنہ ۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ میں ہوئی تھی، اس کے بعد وہ کئی دفعہ ہندوستان آچکے، مگر ملنے کی نوبت نہیں آئی، اس کا سبب بھی وہی اعظم گڈھ کا سیدھی ریلوے لائن سے دور ہونا ہے، مگر بہرحال، انھوں نے خود زحمت اٹھائی اور دار المصنفین میں تشریف فرما ہوئے، ہمارے رفقاء نے ان کی پذیرائی کی، اور ان کی ملاقات اور انکی چند روزہ صحبت سے فیض اٹھایا۔

سرور خاں گویا اس مہینہ ہمارے کابل کے دوست سرور خاں گویا نے اپنی ملاقات کی مسرت بخشی، یہ کابل کے مشہور سردار عبد القدوس خان کے نواسہ ہیں، اور خود بھی ممتاز ادیب اور شاعر ہیں، عربی و انگریزی سے واقف اور فارسی ادبیات کے ماہر ہیں، انجمن ادبی کابل کے ممبر اور وہاں کی نوجوان ادبی تحریکات کے روح رواں ہیں، دو برس ہوئے کہ فردوسی

کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان کے نمائندہ ہو کر ایران گیے تھے، یہ اور ہزاکسلنسی صلاح الدین سلجوقی سفیر دہلی اور شاہ پہلوی سے ملے تھے۔ آجکل یہ مکمل تاریخ آل سبکتگین بیہقی کی تصحیح اور اس کے نسخوں کی تلاش میں ہیں، اس کا ایک حصّہ مدت ہوئی کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، مگر پوری کتاب اب تک نہیں چھپی ہے، بلکہ ملتی بھی نہیں، سرورخاں نے اس کا معتدبہ حصہ پیدا کر لیا ہے، مگر ابھی تک اس کے مکمل نسخہ کی تلاش جاری ہے۔

وہ پشاور اور لاہور ہو کر دہلی آئے، دہلی سے علی گڑھ گیے، اور مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ کی سیر کی، یہاں سے حبیب گنج جا کر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے خزانہ کتب کو پڑتالا، وہاں سے رام پور جا کر ریاست کے سرکاری کتب خانہ کو دیکھا، پھر لکھنؤ پہنچ کر مولوی سید ہاشم صاحب ندوی معتمد دائرۃ المعارف حیدرآباد کے ساتھ دو دن ندوہ میں قیام کیا، اور وہاں کے کتب خانہ کو دیکھا بھالا، اس کے بعد وہ دارالمصنفین اعظم گڈھ آئے، یہاں تین روز ٹھہرے اور یہاں کا کتب خانہ دیکھا، یہاں سے بنارس ہو کر پٹنہ گیے، اور وہاں کے مشہور علم دوست رئیس مولوی ریاض حسن خاں خیالی کے مہمان ہوئے، اور خدابخش خاں کے مشہور کتب خانہ کو دیکھا، پٹنہ سے وہ کلکتہ ہو کر شانتی نکیتان پہنچے ہیں، وہاں سے وہ حیدرآباد جائیں گے، امید ہے کہ حیدرآباد کے علم دوست حضرات ان مہمان عزیز کا شاندار خیر مقدم کریں گے۔

دائرۃ المعارف کی نئی مطبوعات

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے امسال چند نہایت اہم کتابیں شائع کی ہیں، جن میں ایک اصول روایت میں خطیب بغدادی کی کتاب "الکفایہ" ہے، اور دوسری فلسفہ میں ابوالبرکات بغدادی کی کتاب "المعتبر" کی پہلی جلد، تیسری ابن جوزی کی "صفۃ الصفوۃ" کی چوتھی جلد علمائے صوفیہ کے حالات میں، چوتھی حدیث میں "سنن کبریٰ" بیہقی کی نویں جلد، اور پانچویں ابن ہیثم کے آٹھ رسالوں کا مجموعہ (علم نور و مناظر میں) یہ سب کتابیں اسلامی علوم و فنون کی تاریخ میں نہایت اہم اور اساسی تصنیفات ہیں،، دائرہ نے ان کو چھاپ کر اپنے نئے کارناموں کی بہترین مثال پیش کی ہے۔

ریاست کے خلاف آریوں کی شورش

حیدرآباد دکن کی ریاست کے خلاف آریہ سماج نے جو شور و غل برپا کر رکھا ہے، وہ اس درجہ بے معنی ہے، کہ خود ہندو اصحاب اس کی بے ہنگی کا جابجا اظہار کر رہے ہیں، یہ کیسی عجیب بات ہے، کہ خود حیدرآباد کی ہندو رعایا خاموش ہے، اور پنجاب، دہلی، شولاپور اور پونا کے آریہ شورش پیدا کر رہے ہیں، اگر

بات اتنی ہے، کہ ریاست نے اجازت کے بغیر باہر کے مقرروں کی تقریروں کو روک دیا ہے، جس میں ہندو مسلمان سب داخل ہیں، یہاں تک کہ میں بھی جب دو برس ہوئے حیدراباد گیا تھا، تو حیدراباد میں کوئی مذہبی تقریر اجازت کے بغیر نہ کرسکا، اور اسی لیے سکندراباد جاکر تقریر کی، ریاست کا مقصد یہ ہے، کہ باہر کے مقررین اگر ریاست کی صلح و آشتی اور امن و امان کی فضا کو اپنی تقریروں سے مکدر نہ کریں۔

آریہ سماجیوں کی تقریریں جتنی غیر ذمہ دارانہ اور فتنہ انگیز ہوتی ہیں، وہ ہندوستان بھر میں ان کے اپدیشکوں کی تقریروں سے ظاہر ہے، مسلمانوں، عیسائیوں اور سناتن دھرمیوں کے بزرگوں کی نسبت ان کے ناشائستہ کلمات ایسے ہوتے ہیں، جن کی ایک چنگاری سارے ملک کے خرمن امن کو جلا کر خاک سیاہ کرسکتی ہے، اور اس کی مثالیں بارہا ملک میں دیکھی جاچکی ہیں، اس لیے ہر حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسی فتنہ انگیزیوں کو جہاں تک ہوسکے اپنے ملک میں روکے۔

حیدراباد ہندوستان کا وہ خطہ تھا، جو ہندو مسلم اتحاد کا سنگم تھا، مگر افسوس ہے کہ پنجاب، دلی اور مہاراشٹر کے مقرروں نے وہاں جا جا کر اس "مورتی کھنڈن" میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، اور اگر وہ اب تک ٹوٹ نہیں سکا ہے، تو یہ اس کی غیر معمولی مضبوطی اور استحکام کا نتیجہ ہے۔

حیدراباد کی بے تعصبی اور رواداری کی .... مثال دیکھنی ہو، تو وہاں کے مندروں، مذہبی ہندو اوقاف اور جاگیروں کو جاکر دیکھیے، .... کہ محکمۂ امور مذہبی میں ہندو مددگار . .... کا تقرر خاص ہندو معبدوں اور مندروں کی دیکھ بھال کے لیے الگ سے ہوتا ہے، اس پر یہ بات بھی جاننے کے قابل ہے، کہ حیدراباد ہندوؤں کا نہیں اچھوتوں کا دیس ہے، جس سے آریہ ہندوؤں سے کوئی تاریخی اور مذہبی تعلق نہیں ہے۔

(معارف ماہ فروری سنہ ۱۹۳۹ء)

(۳)

سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چھٹی جلد بحمد اللہ کہ چھپ کر تمام ہوگئی، یہ ۶۱۲ صفحوں میں ختم ہوئی، شروع میں ایک مقدمہ ہے، جس میں اسلام کے فلسفۂ اخلاق کی پوری تشریح ہے، اس کے بعد حقوق، فضائل، رذائل اور آداب

کے عنوانوں اور ذیلی عنوانوں میں اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہے،

مولانا مسعود علی ندوی کا حج!

مہتمم دار المصنفین مولانا مسعود علی صاحب ندوی امسال حج کے لیے تشریف لے گئے تھے، خدا کا شکر ہے کہ وہ ۲۷ ذیحجہ ۱۳۵۸ھ کو بخیر و خوبی ہندوستان واپس تشریف لائے، اس مقدس سفر میں انھوں نے برکتوں اور سعادتوں کے حصول کی پوری توفیق پائی، دار المصنفین ان کی بخیریت واپسی پر ان کو مخلصانہ مبارکباد پیش کرتا ہے،

بہار کی ہندوستانی کمیٹی اپنا کام مستعدی سے انجام دے رہی ہے، مولوی عبد الحق صاحب کی نگرانی میں ہندوستانی لغت اور ڈاکٹر تارا چند کے تحت علمی اصطلاحوں کا کام ہو رہا ہے، یہ پہلا موقع ہوگا، جس میں ہندوستان کی تاریخ جو ہندو مسلمانوں کی لڑائی کی اصلی جڑ ہے، اس طرح پڑھائی جائے گی، کہ مسلمانوں کو شکایت کا موقع نہ رہے۔

اعلیحضرت حضور نظام سابع خلد اللہ ملکہٗ

کا

ارشاد گرامی بدعات محرم پر

محرم کے خونیں واقعات سے کس مومن کا دل خون نہیں، اور جگر گوشہ فاطمہ زہراؓ اور اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم کے مصائب کی یاد سے کس مسلمان کا جگر شق نہیں، لیکن ضرورت اس کی ہے کہ غم کو غم کی حیثیت دی جائے، اور تولائے اہل بیتِ کرام کے صحیح آثار پائے جائیں، جاہل مسلمانوں نے ان واقعات کو لہو و لعب کا ذریعہ بنا لیا ہے، اور اس نام سے وہ کچھ کیا جاتا ہے، جس سے اسلام اپنے پیرووں سے شرمسار ہے، اور صحیح یہ ہے کہ ہند کے کفرستان میں مسلمان محرم میں وہ کچھ کرتے ہیں جو ایسے موحدین کے لیے زیبا نہیں۔

ان منہیات اور بدعات کے خلاف علمائے حق نے ہمیشہ آوازیں بلند کی ہیں، اور ان کو صفائی کے ساتھ خدا اور رسول کی ناراضی کا ذریعہ ظاہر کیا ہے، مگر ان کی باتوں کو لوگوں نے سمعِ قبول سے نہیں سنا، ایران میں اعلیحضرت شہنشاہ پہلوی نے ان بدعات کا بزور قلع قمع کیا ہے، اور عزاداری کے غلط اور خلاف شرع طریقوں سے اپنی رعایا

کو باز رکھا ہے۔

ہندوستان میں اس شاہانہ فرض کو صحیح طور سے اعلیٰ حضرت حضور نظام سابع خلد اللہ ملکہٗ نے ادا فرمایا ہے، اور خود اپنے قلم گوہر بار سے اس مختصر فرمان کو لکھ کر شائع فرمایا ہے۔

ہم بھی اس غرض سے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمان شاہ دکن کے اس ارشاد گرامی سے فیض اٹھائیں، معارف میں اس کو شائع کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔

ارشاد گرامی کے آخر میں جس ربع صدی پہلے کی اصلاح کی طرف اشارہ ہے، وہ، وہ اصلاح ہے، جو شہنشاہ پہلوی کے دور سے بھی پہلے خود اعلیٰحضرت نے اقلیم دکن میں نافذ فرمائی تھی،

صحیح تعریف عزاداری حسین ؑ

آہ! مثل قرون اولیٰ فی زماننا وہ نفوس زکیہ (یعنی بزرگان دین) کہاں جو "فلسفۂ شہادت" کے صحیح معنیٰ و مفہوم سے واقف ہو کر "اور شہادت کبریٰ" کی عظمت کو سمجھ کر اور تعلیم حسینی سے درس لے کر ایسی "ہستی ذیشان" پر جس نے جان و مال اور سارے کنبہ کو صرف "بقائے اعلائے حق" کے خاطر قربان کر دیا تھا، اس پر ساری عمر آہ و بکا کرتے رہے، برخلاف اس کے آجکل دوران ایام عزا میں جو بدنما منظر چو طرف نظر آتے ہیں، وہ یا تو "محض رسمی" طور پر دکھائی دیتے ہیں، یا "اجرت" وصول کرنے کے خاطر انجام پاتے ہیں، یعنی وہ طبقہ یا تو ماتم کرنے والا ہوتا ہے، یا منبر کے سامنے بیٹھ کر لکھنوی ذاکر کے کلام کی داد اچھل اچھل کر دینے والا ہوتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ رونے کا منہ بنانے والا یا آواز نکالنے والا ہوتا ہے، جبکہ ایک قطرہ آنسو آنکھ میں دکھائی نہ دیتا ہو۔

اس کے سوا یہ بھی دیکھا گیا ہے، کہ جھٹکہ کے ٹٹو کو کرایہ پر لاکر گلی کوچہ میں گشت کرا کے "ذوالجناح" کی تحقیر کی گئی ہے۔ یا بازاروں میں کاغذ کے تابوت کو گشت کرا کے ندی کے قریب یا چٹ میدان میں زیر زمین دفن کر کے اس کی بے حرمتی کی گئی ہے، یا سر بازار سر پیٹ کر ماتم کی وقعت کو تباہ کیا گیا ہے، یا بعض وقت ما و شما کو "اکابر دین متین صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کی تمثیل" بنا کر گناہ کبیرہ کا ارتکاب کیا گیا ہے، اور ایسے مذموم حرکات کر کے گروہ بدمعاشاں نے اپنے مذہب کی اپنے ہاتھوں سراسر تحقیر، غیر مذاہب کے آنکھوں میں کرائی ہے۔

دوسری طرف ابھی تک ان جہلاء کو نہ مذہب کے ما لہٗ وما علیہ پر دسترس حاصل ہے، اور نہ اس کی اصلی خوبی کو سمجھنے کی ان کے سروں میں صلاحیت موجود ہے، کیونکہ ظاہر ہے، کہ جس طبقہ سے ان کا تعلق ہے، وہ محض "بازاری" ہے، ورنہ اگر یہ بات پیدا نہ ہوتی، تو کیا مجال کہ ایسے مذموم حرکات اس سے سرزد ہوتے، لاحاشاہ،

بہرحال اب بھی وقت باقی ہے، کہ ٹھنڈے دل سے ان امور پر غور کرکے اور ان بدعتوں کو یکلخت چھوڑ کر، کوئی دوسرا بہتر راستہ "فلاح دارین" کا اختیار کیا جائے، جو نتیجۃً باعث نجات اپنے لیے ہو، ورنہ یاد رہے، کہ وہ زمانہ...... دور نہیں ہے، جبکہ "عقول ناقدہ" ان پر ایسی گرفت کریں گے کہ اس وقت ان ہفوات کا تنقید کی زد پر ٹکنا امر محالات سے ہو جائے گا، کیونکہ دیکھا گیا ہے، کہ آجکل کی دہریت کے زمانہ میں کوئی چیز جو کہ مذہب سے منسوب ہو وہ جب تک "دلائل عقلی ونقلی" کی کسوٹی پر نہ کس لی جائے، اس کو بے چون وچرا، تسلیم کرانے کے لیے "روشن دماغ" تیار نہیں ہیں، اور واقعی بھی یہی ہے، کہ جب تک آب دریا خس وخاشاک سے پاک وصاف نہیں ہوتا، وہ گروہ تشنگاں کے لیے جاذب نظر نہیں بن سکتا۔

ف۲، بہرحال جہاں تک ممکن ہے، جس طرح سے ربع صدی قبل سے عیش وعشرت، کھیل کود اور مزخرفات کو محرم کے حدود سے خارج کرکے اس کو صحیح روشنی میں "دنیائے اسلام" کے سامنے پیش کیا گیا ہے، اسی طرح تمام بدعتوں کو بھی دکن کی حد تک ملیامیٹ کرکے صحیح معنوں میں "عظمت ایام عزا" کو برقرار رکھا جانا ضروری ہے، کہ منجملہ دیگر فرائض کے ہر مسلم فرمانروا کے ذمہ "حفاظت شعائر دین متین" بھی (از زد بے حرمتی) کی گئی ہے، جس کی گواہی نص قرآنی سے ملتی ہے۔

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ،

سبحان اللہ! اس سے بڑھکر معاملۂ زیر بحث کی اور کیا توضیح وتشریح ہو سکتی ہے۔

(معارف ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۹ء)

(۴)

زخم چشم

وسط مارچ میں اڈیٹر معارف کو سفر میں زخم چشم پہنچا، یہ فقرہ حقیقت ومجاز دونوں پہلوؤں سے صحیح ہے، اللہ تعالیٰ کا احسان تھا، کہ یہ واقعہ دلی اور لکھنؤ کے مابین پیش آیا، جس کی وجہ سے دلی اور لکھنؤ دونوں شہروں کے آنکھوں

کے خاص طبیبوں کا علاج فوراً ہی ممکن ہو سکا، اور خطرہ کا فوراً انسداد ہو گیا، ع

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

آنکھوں کی شدید سرخی ہلکی ہو چکی ہے، لیکن ابھی تک لکھنے پڑھنے میں پوری احتیاط برتی جاتی ہے، امید ہے کہ احباب جواب خط نہ ملنے کے اس عذر گناہ کو قبول فرمائیں گے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے قدیم طلبہ نے سب سے پہلی دفعہ لکھنؤ سے باہر ایک دوسرے شہر بلکہ دوسرے صوبۂ بہار (پھلواری ضلع پٹنہ) میں اس مرتبہ اپنا اجلاس منعقد کیا ہے، ان سطروں کے لکھوانے تک اجلاس کی روداد معلوم نہ ہو سکی، مگر امید ہے کہ ان پرجوش نوجوان بھائیوں نے عربی تعلیم و عربی مدرسوں اور خاص طور سے ندوہ کی اصلاحی تحریک پر عاقلانہ اور عادلانہ تجویزیں منظور کی ہونگی۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم کے گفتار و کردار میں ابھی تک توازن پیدا نہیں ہوا، جس طرف کی کوئی ہوا چلتی ہے، اسی طرف سب کے سب ایک دفعہ جھک پڑتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ قوم کی مختلف ضرورتیں ہیں، اور ہر ضرورت اپنی جگہ پر شدید ہے، اب آجکل سیاسیات کی جو صحیح یا غلط آندھی چل رہی ہے، اس میں سب اڑے چلے جا رہے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اب صرف یہی ایک چیز ایسی ہے، جو قوم کو جلا یا مار سکتی ہے، حالانکہ جماعت کی حیثیت بالکل ایک فرد کے مانند ہے، جس طرح ایک زندہ آدمی کو اپنے زندہ رہنے کے لیے ہوا، پانی، غذا اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے، اسی طرح جماعت کو بھی اپنی زندگی کے لیے ایمانی و اخلاقی طاقت، مالی قوت، جہاد کی روح اور صحیح تعلیمی مقصد بہت سی غذاؤں کی ضرورت ہے، ان میں سے کسی ایک چیز کو لے کر دوسری چیزوں سے غفلت برتنا قومی خودکشی ہے۔

ورم اور موٹاپے دونوں میں جسم کا کچھ حصہ بڑھ جاتا ہے، لیکن ورم اس کا نام ہے، کہ بدن کا کوئی ایک عضو یا اس عضو کا کوئی حصہ بڑھ کر بدن میں عیب یا درد پیدا کر دے، اور موٹاپے خصوصاً صحت و تندرستی کے موٹاپے میں بدن کے سارے اعضاء میں متوازن نشو و نما ہوتا ہے، قوموں کا زندگی کے کسی ایک پہلو پر اتنا زور دینا کہ دوسرے پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں، قومی صحت کی فربہی نہیں، بلکہ بیماری کا ورم ہے۔

آجکل اسلامی تہذیب و تمدن اور زمانۂ حال کے سب سے ممتاز اور دل پسند لفظ کلچر کی حفاظت کی بڑی دھوم ہے،

مگر معلوم ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدن اور کلچر کی حفاظت کا کام کہاں انجام پاتا ہے، یونیورسٹیوں، کالجوں، لیگوں اور کانگریسوں میں نہیں، بلکہ ٹوٹے پھوٹے عربی مدرسوں کی فرسودہ چہار دیواری میں یہی وہ حصار تھے، جہاں سے فرنگی تہذیب و تمدن کے شدید حملوں کا مقابلہ کیا گیا، اور اب بھی وہی قلعے ہیں، جہاں سے اس کی آیندہ حفاظت کا انتظام کیا جا سکتا ہے، اس لیے ان عربی مدرسوں کی ظاہری تباہ حالی کو کم نگاہی سے نہ دیکھیے، بلکہ یقین کیجیے کہ ہندوستان کے اسلامی مدرسے ہی ہندوستان میں اسلامی تعلیم و تمدن کے مضبوط مورچے ہیں، جن کو اسلامی کلچر کی تباہی کا رونا ہے، ان کو چاہیے کہ پلیٹ فارموں کی درد بھری تقریروں کو چھوڑ کر اپنی بھری جیبوں کو ان قلعوں کی تیاری اور ان کے استحکام پر صرف کریں۔

جن لوگوں کو عربی مدرسوں کے پرانے طرز تعلیم اور نصاب پر شدید اعتراضات ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارا بڑے سے بڑا عربی مدرسہ بھی ہر قسم کی ضروری اصلاح کے لیے تیار ہے، نصاب کی خرابیاں اب دلیلوں کی محتاج نہیں رہیں، ندوۃ العلماء نے اس کے متعلق جو لٹریچر پیدا کیا ہے، اس سے بڑھکر وہ لٹریچر ہے جس کو زمانہ کے ہاتھوں نے لکھ کر پیش کر دیا ہے، ضرورت اس کی ہے، کہ تمام اہم عربی مدرسوں کے ارکان ایک جگہ مل کر بیٹھیں، اور اس مسئلہ پر غور کریں۔

اوپر ہم نے جو مختصر سی درخواست پیش کی ہے، ہم کو معلوم ہے کہ اس حالت کو پہنچ جانے پر بھی ان کا قبول ہونا مشکل ہے، کیونکہ سب کچھ ہو جانے پر بھی جماعتی انانیت کی بو ہمارے دماغوں سے نہیں نکلی ہے، اور جب تک پوری جماعت مل کر اس مسئلہ کو طے نہ کریگی، یہ مسئلہ ناطے شدہ رہے گا۔

ادھر گرمیوں میں دو مہینے مئی اور جون اڈیٹر معارف کا قیام دار المصنفین سے باہر رہے گا، اس لیے معارف سے متعلق جملہ خط و کتابت اڈیٹر کے بجائے دار المصنفین سے کیجائے، تاکہ جواب میں تاخیر نہ ہو۔

شاہانہ التفات نامہ

اتحاد بین المسلمین کی زبردست خواہش

دار المصنفین کی خدمات کی تحسین

مارچ ۱۹۳۶ء کے معارف میں "بدعات محرم" پر اعلیٰحضرت آصف سابع خلد اللہ ملکہ، کی ایک تحریر دلپذیر بصیرت افزائے معارف ہوئی تھی، اور معارف نے اس پر ایک مختصر مقدمہ لکھنے کی سعادت پائی تھی، یہ مقدمۂ تحریر جب اعلیٰحضرت کی نظر اشرف سے گذرا تو پسند فرمایا، اور اپنے دست خاص مبارک سے یہ التفات نامہ رقم فرما کر خاکسار اڈیٹر کو اوج اقبال بخشا۔

اس التفات نامہ میں جو بات خاص لحاظ کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے خاطر انور میں مختلف اسلامی طبقوں کے درمیان اتحاد کا کتنا عمیق جذبہ ہے، ساتھ ہی خدام علم کی عزت و توقیر جو مسلمان بادشاہوں کا خاصہ رہی ہے، اس رقمۂ کریمہ کی سطر سطر سے کس طرح ہویدا ہے۔

توقیع خسروی

۱۵ صفر ۱۳۵۸ھ

مولوی سید سلیمان صاحب ندوی

السلام علیکم۔ میری نظر سے معارف کا پرچہ گذرا بابت مارچ ۱۹۳۹ء جو کہ ماہانہ اعظم گڈھ سے نکلتا ہے، اس میں میرے مضمون "صحیح عزاداری حسینؓ" کو نہ صرف طبع کیا گیا، بلکہ چند سطور بطور مقدمہ اس کے متعلق لکھے گیے، اور مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہوش بلگرامی کے ذریعہ کہ مولوی صاحب میرے دوسرے مضمون زیر عنوان "شان ماہ محرم الحرام" کو بھی اپنے پرچہ میں آیندہ جگہ دینے والے ہیں، اور اس کے متعلق اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کریں گے۔

سبحان اللہ! اگر اس قسم کے علماء و فضلاء و فقہاء طبقۂ اسلام میں دکھائی دیں جو کہ وسعت نظر سے کام لے کر اپنے مذہب و عقائد کے نکتہ و اسرار کو عوام پر ظاہر کرتے رہیں، تو کیا کہنا، کہ ان کی یہ مذہبی خدمت قابل اور منصف مزاج گروہ کے ہاں ضرور قدر کی نظر سے دیکھی جائے گی، اور دوسری دنیا میں ان کو کچھ نہ کچھ اس کا اجر مل کر رہے گا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیعُ اَجْرَ المُحسِنِینَ۔

مجھے یہ بھی سن کر افسوس ہوا کہ آج کل مولوی صاحب کی آنکھ خراب ہوگئی ہے، جس کی وجہ سے تالیف و تصنیف کے کام میں ہرج واقع ہو رہا ہے، مگر اس کے ساتھ اس قسم کا کام جو اب تک انجام پایا ہے، وہ کچھ کم نہیں ہے، بلکہ قوم و ملت کی بہت کچھ خدمت کی گئی ہے، اس سے بحث نہیں، کہ اس کے قدرداں بھی اس زمانہ میں کوئی ہے یا نہیں۔

"آصف سابع"

(معارف ماہ اپریل ۱۹۳۹ء)

(۵)

ایک مجاہد کا ماتم

مولانا محمد عرفان صاحب معتمد خلافت بمبئی کی ناگہانی وفات کی خبر اخباروں کے ذریعہ آپ تک پہنچی ہوگی، مرحوم ہزارہ سرحد کے رہنے والے تھے، اور سلسلۂ خیرآباد کے عالم معقولات اور مدرس تھے، ۱۹۲۰ء کی قومی تحریکات نے درس وتدریس کی مسند سے اٹھا کر قوم وملت کے عملی کاموں سے ان کو وابستہ کردیا، ان کی سب سے مخلصانہ خدمت ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں ملکانوں کے فتنۂ ارتداد کے موقع پر ان کی جاں بازی، ایثار، اور محنت سے ان کے علاقوں میں بیسیوں میل پیادہ اور بھوکے پیاسے سفر کرنا اور ایک گانوں سے دوسرے گانوں میں مارے مارے پھرنا ان کی زندگی کا اہم کارنامہ ہے۔ اس کے بعد انھوں نے جمعیۃ العلماء دہلی سے وابستہ ہوکر جمعیۃ کے کاموں کو کچھ زمانہ تک انجام دیا، اور شریف حجاز اور ابن سعود کی لڑائی کے زمانہ میں حجاز جاکر حالات کی تحقیقات کے لیے نامزد ہوئے، پھر ۱۹۲۶ء میں موتمر اسلام کی شرکت کے لیے گیے، اور وہاں سے واپسی پر مجلس خلافت کے کاموں میں مصروف ہوگیے، اور اسی مصروفیت میں ان کی زندگی کے آخری سال بسر ہوئے، ان کی عمر اس وقت پچاس سے زیادہ نہ ہوگی، بلند وبالا، مضبوط اور قوی تھے، ایک دفعہ وہ قومی تحریکوں کے سلسلہ میں قید بھی ہوئے تھے، اور اسی قید میں انھوں نے یہ سعادت پائی، کہ حافظ قرآن ہوگیے۔

مرحوم نہایت دوست پرور، ہنس مکھ، ظریف اور فیاض تھے، صوبہ سرحد سے وہ مدتوں جلاوطن رہے، جلاوطنی کا دور ختم ہوا تب بھی وطن جاکر اپنی خدمات کی وسعت کو انھوں نے محدود کرنا پسند نہیں کیا، تمام عمر مجرد رہے، اور اسی طرح پوری عمر گذار دی، ایک طرف وہ فقیر بے نوا تھے، دوسری طرف صد درجہ غیور اور شریف، غالب کا مصرع آج ہی صادق آیا ہے۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

سیرۃ النبیؐ جلد ششم سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد جو ابھی شائع ہوئی ہے، اخلاق پر مشتمل ہے، اس میں پہلے تفصیل کے ساتھ اسلام کے فلسفۂ اخلاق کی تشریح کی گئی ہے، پھر حقوق، فضائل، رذائل اور آداب کی ایک ایک کر کے تفصیل ہے، اس کتاب کے ایک باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی طریقۂ تعلیم کی دلچسپ و دلپذیر تشریح ہے، اور پوری کتاب اس لائق ہے، کہ مسلمان آج جب وہ انقلاب کے دروازہ پر کھڑے ہیں، اس کا مطالعہ کریں، اور سمجھیں کہ قوموں کی ترقی و تنزل میں ان کے قومی اخلاق کو کہاں تک دخل ہے۔

یہ بات بے خطر کہی جا سکتی ہے، کہ دنیا میں کوئی قوم سلطنت و حکومت کی اہل ثابت نہیں ہو سکتی، جب تک اس قوم کے اکثر افراد اخلاق عالیہ سے متصف نہ ہوں، عزم و استقلال، انصاف و دیانت وغیرہ وہ صفتیں ہیں، جن کے بغیر سلطنت و حکومت کا تخیل کرنا بھی مضحکہ خیز ہے، اگر ہماری "قومی حکومت" ناکام ثابت ہوئی، تو دیکھئے گا کہ اس کی ناکامی کے وجوہ ان اوصاف سے معرا ہونا ہوں گے۔

امسال سیرت کی اس جلد کے علاوہ چند اور کتابیں دارالمصنفین سے چھپ کر شائع ہو رہی ہیں، تاریخ اسلام کی پہلی جلد میں آغاز اسلام سے خلافت راشدہ تک کے تفصیلی واقعات ہیں، (اس کی دس جلدیں انشاء اللہ بہ ترتیب شائع ہوں گی) تاریخ دولت عثمانیہ دو جلدوں میں (شروع سے اس وقت تک کے تفصیلی حالات) تاریخ اخلاق اسلام کی پہلی جلد جس میں اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ قرآن پاک اور احادیث کی اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتوں سے نقد و نظر ہے۔

نقوش سلیمانی ایک اور کتاب نقوش سلیمانی کے نام سے زیر طبع ہے، اس میں اڈیٹر معارف کی وہ تمام تقریریں اور تحریریں اور مقدمے یکجا ہوں گے، جو ہندوستانی ادب و زبان کے تعلق "وقتاً فوقتاً" اس کے قلم اور زبان سے نکلے، امید ہے کہ یہ پچھلی چوتھائی صدی کی ادبی تحریکوں کا کامیاب مرقع ہوگا، ضخامت ۴۰۰ صفحوں کے قریب ہوگی۔

سیرت سید احمد شہیدؒ ۱۸۵۷ء کے مشہور ہنگامہ سے کچھ پہلے ہندوستان میں مولانا اسمٰعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کی تحریک سے مجاہدین کا جو گروہ پیدا ہوا تھا، اور اس گروہ نے ہندوستان میں اسلامی عقائد و اعمال کی اصلاح کا جو کام کیا تھا، اس کی پوری تاریخ اب تک نہیں لکھی گئی تھی، اور جو لکھی بھی گئی تھی۔ وہ زمانۂ حال کے مذاق سے بہت دور تھی،

اس کمی کو محسوس کرکے ہمارے نوجوان ندوی فاضل مولوی سید ابوالحسن علی صاحب مدرس دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ نے جو اسی خاندان کے چشم و چراغ ہیں، بڑی تحقیق اور محنت سے "سیرت احمد شہید" کے نام سے ایک نہایت دلچسپ روح افزا اور ایمان پرور کتاب لکھی ہے، جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے، ضرورت ہے کہ وہ لوگ جو مسلمانوں کے سیاسی ذوق کو سمجھنا چاہتے ہیں، اس کتاب کو پڑھیں، اور ماضی کی یاد سے مستقبل کا فائدہ اٹھائیں، کتاب میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی اور اڈیٹر معارف کے مقدمے اور دیباچے بھی شامل ہیں،

(معارف ماہ مئی سنہ ۱۹۳۹ء)

۶

چار سلیمانوں کی رباعی قاضی محمد سلیمان صاحب مصنف "رحمۃ للعالمین" کی وفات سے مثلث ہو گئی تھی، شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کی رحلت سے وہ فرد بن گئی تھی، اب اخیر اپریل سنہ ۱۹۳۹ء میں مولانا سلیمان اشرف صاحب (استاذ دینیات مسلم یونیورسٹی) کی موت سے مصرع ہو کر رہ گئی، دیکھنا یہ ہے کہ یہ مصرع بھی دنیا کی زبان پر کب تک رہتا ہے۔

بہت آگے گیے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔

مولانا سید محمد سلیمان اشرف صاحب مرحوم بہار کے ایک مردم خیز دیہات کے رہنے والے اور شرفائے سادات کے خاندان سے تھے، ان کے والد مرحوم حکیم عبداللہ صاحب اور ان کے اعمام محترم مولانا عبدالقادر صاحب، مولوی عبدالرزاق صاحب، مولوی عبدالغنی صاحب و مولانا عبیداللہ صاحب اہل علم و فقر تھے، مولانا مرحوم نے درس کا بڑا حصہ مولانا محمد احسن صاحب استھانوی بہاری سے حاصل کیا تھا، اور کچھ دن دارالعلوم ندوہ میں بسر کیئے تھے، اور آخر میں منطق و فلسفہ کی آخری کتابیں مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رام پوری ثم الجونپوری سے پڑھی تھیں، جو پورب میں خیرابادی سلسلہ کے خاتم تھے، مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مرحوم کو حقیقت یہ ہے کہ اپنے استاذ کے ساتھ عقیدت ہی نہیں، بلکہ عشق تھا، ان کے حالات وہ جب کبھی سناتے تھے تو ان کے طرز بیان اور گفتگو کی ہر ادا سے ان کی والہانہ عقیدت ترادش کرتی تھی۔

مرحوم خوش اندام، خوش لباس، خوش طبع، نظافت پسند، سادہ مزاج اور بے تکلف تھے، ان کی سب سے بڑی

خوبی ان کی خودداری اور اپنی عزت نفس کا احساس تھا، ان کی ساری عمر علی گڈھ میں گذری، جہاں امرا اور ارباب جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا، مگر انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی، اور نہ ان میں سے کسی سے دب کر ملے، جس سے ملے برابری سے ملے، اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح محفوظ رکھکر علی گڈھ کے سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی ان کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکیں، علی گڈھ کے عشرت خانہ میں ان کی قیام گاہ ایک درویش کی خانقاہ تھی، یہاں جو آتا جھک کر آتا، اگر مجلس سازگار ہوئی تو دعائیں لے کر گیا، ورنہ الٹے پاؤں ایسا واپس آیا، کہ پھر ادھر کا رُخ نہ کیا۔

وہ نہایت فیاض، کشادہ دست، اور سیر چشم تھے، دو تین سال کے علاوہ ان کی ساری عمر تجرد کی حالت میں گذری، کوئی اولاد نہ تھی، خاندان کے عزیزوں سے طبیعت کو چنداں مناسبت نہ تھی، جو کچھ تھا، احباب کے نذر تھا، استادزادوں اور دوستوں اور دوستوں کی اولادوں کے ساتھ وہ کچھ کیا، جس کو اس زمانہ میں مشکل سے کوئی دوسرا کر سکتا ہے، انتہا یہ ہے کہ مرتے دم جو کچھ چھوڑا وہ بھی نذر احباب،

ان کی مجلس سدا بہار تھی، وہ خود سدا بہار تھے، فکر و غم کا ان کے ہاں گذر نہ تھا، اپنی ضعیف والدہ کی اطاعت اور اپنے دیوانہ بھائی کی رفاقت اور خدمت میں عمر اس طرح گذاری کہ اس کی نظیر مشکل ہے، ان کی مجلس میں پچھلے علما کے حالات اور ان کی خوبیوں کے تذکرے اکثر رہا کرتے، کبھی کبھی کسی علمی مسئلہ پر اظہار خیال ہوتا، ان کی تقریر و وعظ میں بڑی دلچسپی اور گرویدگی تھی، ادھر ۲۰ بیس برس سے تقریر چھوڑ دی تھی، ایک دو جگہیں مخصوص تھیں، جہاں وہ سال میں ایک دفعہ میلاد پڑھا کرتے تھے، ان کے مذہبی خیالات علمائے بریلی کے مطابق تھے، اور ان کے بڑے مداح تھے، پھر بھی ان کی ملاقات اور میل جول ہر خیال کے لوگوں سے تھا، وہ کسی سے مناظرہ نہیں کرتے تھے، اور جب کرتے تھے، تو گتھ جاتے تھے، طبیعت میں ظرافت اور لطافت تھی، غصہ بھی جلد آ جاتا تھا، اپنے مزاج کے خلاف ایک حرف نہیں سن سکتے تھے۔

تحریر و تالیف کا بھی ذوق تھا، خسرو کی ایک مثنوی پر مقدمہ لکھا ہے، حج کے مسائل اور عربی کے فضائل پر دو رسالے لکھے ہیں، ایک کتاب مبین نام عربی فیلالوجی پر لکھی تھی، جس پر ہندوستانی اکیڈمی نے ۵۰۰ پانچسو کا انعام دیا تھا، اور بھی متفرق مضامین لکھے تھے، یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کے درس کے علاوہ عصر کے بعد قرآن پاک کی

تفسیر پڑھایا کرتے تھے، خاص خاص شوقین طالب علم اس میں شریک ہوتے تھے۔

ان کی وفات سے دو تین ہفتہ پہلے ان سے علی گڈھ میں ملاقات ہوئی تھی، کمزور و نحیف تھے، مسلسل بخار نے ان کو نیم جان کر دیا تھا، پھر بھی حسب دستور بعد عصر اپنی قیام گاہ کے برآمدہ میں مونڈھے پر بیٹھے تھے، احباب آس پاس حلقہ باندھے تھے، اور وہ مصروف خوش کلامی تھے، میں نے عمر پوچھی تو ٹال گئے، میں نے اپنی عمر کے اندازہ سے ان کی عمر کا اندازہ لگا کر عرض کیا کہ عجب نہیں کہ آپ کی پیدائش سنہ ۱۸۷۰ء کی ہو، ہنسکر بولے، مجھے تو اپنی عمر آپ معلوم نہیں، اور آپ کو معلوم ہے، یہاں تک کہ سنہ بھی بتا دیا، اس انکار پر بھی میرا قیاس یہی ہے، کہ ان کی پیدائش کا سال قریب قریب یہی ہوگا، اور اس وقت ان کی عمر ساٹھ پینسٹھ کے بیچ میں ہوگی، دیکھنے میں تنومند اور صحیح معلوم ہوتے تھے، مگر اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے، اخیر ملاقاتوں میں اپنے وطن کے بعض دوستوں کی بے وقت موت اور عزیزوں کی محبت کی محرومی سے بیحد متاثر تھے، رحمۃ اللہ علیہ،

(معارف ماہ جون سنہ ۱۹۳۹ء)

(۷)

مئی اور جون سنہ ۱۹۳۹ء کے معارف میں "بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق اور تہنید" پر جو دو مضمون نکلے تھے، بحمد اللہ کہ انھوں نے اہل علم کی نظر میں اعتبار پایا، نواب صدر یار جنگ مولانا شروانی اور ڈاکٹر عبد الستار صدیقی نے اپنے کرم ناموں میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے مزید کرم یہ کیا ہے، کہ استدراک کے طور پر پہلے مضمون پر بہت کچھ اضافہ کیا ہے، یہ تحریریں اگلے معارف میں ناظرین کے سامنے آئیں گی۔

سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد پر جو ابھی ابھی نکلی ہے، جن دوستوں نے اظہار خیال کیا ہے، ان میں سب سے اہم ہمارے دوست مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کا بیان ہے، وہ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اسلام کے فلسفۂ اخلاق پر اتنا جامع بیان اردو کیا عربی میں بھی نہیں" اسی لیے موصوف نے یہ ارادہ کیا ہے، کہ سیرت کی اس جلد پر ایک تبصرہ لکھ کر تالیف اور مولف دونوں کو ممنون کریں، خدا کرے یہ وعدہ جلد وفا ہو، تاکہ غالب کی طرح ہمیں اپنے جینے کو اس کی بے اعتباری کی دلیل نہ ٹھہرانی پڑے،

لکھنؤ میں شیعہ سنی بحث نے جو خطرناک صورت حال پیدا کی ہے، اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے، لکھنؤ شیعہ

اصحاب کی راجدھانی تھی، وہاں صدیوں سے علانیہ مدح صحابہ جرم تھی، اور یہ جرم وراثۃً حکومت برطانیہ کے عہد تک ممنوع ہوتا چلا آتا رہا، سنیوں نے غالباً ۱۹۰۵ء سے اس کے خلاف احتجاج شروع کیا، اور آخر چونتیس پینتیس برس کی جدوجہد کے بعد اب کامیاب ہوئے، اور اتنا حق ملا، کہ سال میں ایک دن وہ علانیہ مدح صحابہ کر سکتے ہیں، گو کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی برسر بازار رسم مدح خوانی اور اس کے لیے سڑکوں اور بازاروں میں جلوس نکالنا بدعات میں ایک اور نئی بدعت کا اضافہ ہے، تاہم ہم اس لیے اس کی مخالفت نہیں کرتے کہ پچھلی شیعہ حکومت کے ایک ناجائز اور ظالمانہ سرکاری حکم کا منسوخ ہونا شیعہ سنی اتحاد کی راہ کے عوائق و موانع کو کم کرنا ہے، کیونکہ اباحت پر قدغن لگا کر اس کو فقہا کی نظر میں واجب العمل بنا دیا گیا تھا۔

شیعہ اصحاب نے اس کے جواب میں "تبرا" کی دلآزار تحریک جاری کر رکھی ہے، اور لطف یہ کہ اس کی اتنی عظمت بڑھائی ہے کہ اس کو کلام الٰہی کا ہم پایہ بنایا ہے، یعنی وہ تبرا نہیں کہتے، بلکہ تبرا شریف کی تلاوت کرتے ہیں، اس کے جواز کا استدلال ان آیتوں سے ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے کفار پر لعنت فرمائی ہے، لیکن شاید سارے احکام الٰہی میں یہی ایک حکم ہے، (اگر یہ حکم ہے) جس پر سادات بنی فاطمہ رضی اللہ عنہم سے پہلے سلاطین بنی امیہ نے عمل کیا، اور شیعوں میں سلاطین آل بویہ دیلمی نے اپنے عہد میں ان کی تقلید کی، کیا عجیب بات ہے، کہ آج محبان اہل بیت کرام کو سنت اہل بیت کی پیروی پر نہیں، بلکہ دشمنان اہل بیت کی پیروی پر اصرار ہے، کیا اچھا ہو، اگر دونوں گروہ اپنی اپنی بدعتوں سے از خود احتراز کریں، اور ہر قسم کے ایسے جلسوں اور جلوسوں کو یک قلم موقوف کر دیں، جن کی اصل شریعت محمدیہ میں نہیں، کہ یہ اختلاف فی الدین نہیں اختلاف فی البدعات ہے۔

مسلمان اخباروں میں اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کی غرض سے ہندوستان میں اسلامی تمدنی دائرے (اسلامی کلچرل زون) قائم کیے جانے کی تحریک جاری ہے، ہم نے اب تک اس کو اس قابل نہیں سمجھا تھا، کہ اس پر اظہار خیال کیا جائے، مگر دیکھا جا رہا ہے، کہ اس دائرہ کے تمام نقطوں پر غور کے بغیر اس کو واقعی اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کا تعویذ سمجھا جا رہا ہے، حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں کے اعتراف شکست کی کوئی اور تجویز نہیں ہو سکتی، اس سے ہزار درجہ بہتر پاکستان کی تحریک ہے، جس کے کوئی معنی تو ہیں،

اسلامی تمدنی منطقہ کی تحریک کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا قدم جہاں تک آگے

بڑھا ہے، اس کو پیچھے لوٹا لیا جائے، اور کسی ایک جگہ ٹھہر کر قدم جمایا جائے۔ یہ سطریں بہار کے ایک گاؤں میں بیٹھ کر لکھی جا رہی ہیں، اس لیے یہی صوبہ اس وقت مثال میں پیش ہے، اس صوبہ میں مسلمان چودہ^{۱۴} فی صدی کے قریب ہیں، ان کی پوری آبادی ۴۲ لاکھ کے قریب ہے، اور ان کی بڑی تعداد پورنیہ میں ہے، اور اس کے بعد دربھنگہ میں ہے، اور پھر پٹنہ، مونگیر اور گیا میں ہے، حالانکہ اس صوبہ کے اسلامی تمدن کے مرکز یہی تینوں اضلاع ہیں، اور پورنیہ اور دربھنگہ میں مسلمان زیادہ تر کاشتکار اور زمیندار ہیں، اب کیا پورنیہ اور دربھنگہ کے مسلمان پٹنہ اور مونگیر اور گیا میں آجائیں، ایسی حالت میں کیا یہاں کے ہندو ان مہاجر مسلمانوں کے لیے زمین اور کھانے کمانے کے لیے جائدادیں دیں گے، اور ان اضلاع کے ہندو یہاں سے نکل کر پورنیہ کی خراب آب و ہوا میں رہنا پسند کریں گے۔ اور اگر پورے صوبہ کے مسلمان بنگال یا یوپی کو ہجرت کر جائیں، تو کیا یہ صوبے ان کو جگہ دے سکتے ہیں، اور اگر دیں بھی تو اسلام کا قدم جہاں تک آگے بڑھ چکا ہے، اس سے پیچھے ہٹنے کی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے، کیا یہ ایسی غلطی کا اعادہ نہ ہوگا، جو مسلمانوں نے سسلی، جنوبی فرانس، اسپین، مالٹا، اور کریٹ وغیرہ رومی جزیروں میں کی ہے، کہ جہاں سے ان کی سیاسی طاقت کم ہوگئی، وہاں سے انھوں نے ہجرت اختیار کر لی، اور اسلام کے قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹاتے رہے، جس کا نتیجہ آج آنکھوں کے سامنے ہے،

(معارف ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۹ء)

(۸)

دار المصنفین کی ضرورت کا خاکہ جب پہلی دفعہ کاغذ پر کھینچا تھا، تو اردو میں ایک مکمل اور مفصل تاریخ اسلام کی یاد سب سے پہلے آئی تھی، خدا کا شکر ہے کہ پچیس^{۲۵} برس کے بعد یہ آرزو پوری ہوئی، اور دار المصنفین کے کئی رفیقوں نے مل کر سات آٹھ برس کی محنت میں اس سلسلہ کو لکھ کر پورا کیا، امسال اس سلسلہ کی دو^{۲} جلدیں ناظرین کے سامنے آئیں گی، ایک تو سب سے پہلی جلد جس میں شروع سے لے کر خلفائے راشدین کے زمانہ تک کی پوری تاریخ ہوگی، یہ جلد چھپ کر پوری ہو رہی ہے، یہ سلسلہ اپنی تحقیق و تفصیل کے لحاظ سے اس قابل ہوگا، کہ کالجوں میں اسلامی تاریخ کے نصاب میں کارآمد ہو سکے۔

تاریخ اسلام کے سلسلہ کی جو دوسری جلد چھپ کر مکمل ہو رہی ہے، وہ ٹرکی کی تاریخ ہے، یہ دو^{۲} جلدوں میں ہوگی،

اور دولت عثمانیہ کے آغاز سے لے کر جمہوریہ ٹرکی کے اس عہد تک کے حالات پر مشتمل ہوگی، پہلی جلد عثمان خاں سے شروع ہوکر سلطان سلیم تک ختم ہوئی ہے، اور یہی اس وقت مطبع میں ہے۔

مورخ بلاذری کی انساب الاشراف کا ذکر کئی سال ہوئے معارف میں آیا تھا، اب اس کتاب کا دوسرا حصہ جو بنو امیہ کے ارکان و افراد کے حالات کو شامل ہے، بیروت کی عبرانی یونیورسٹی کے ادارۂ مشرقیات کی طرف سے چھپ کر شائع ہوا ہے، یہ دیکھ کر تعجب ہوا، کہ یہ تاریخ بھی جو اسلام کی ابتدائی تاریخ کے واقعات پر مشتمل ہے، وہی مخنف اور محمد بن سائب کلبی وغیرہ کی روایتوں پر مبنی ہے، جن کی حیثیت تاریخ میں داستان گو سے زیادہ نہیں، ہندوستان میں یہ کتاب جیب کمپنی بک سیلر، اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے نو روپے (لعہ) میں ملے گی۔

مجلس احیائے معارف نعمانیہ حیدرآباد دکن کا ذکر کئی دفعہ آچکا ہے، یہ مجلس چند علم دوست مخلص علما کی تنہا کوششوں سے چل رہی ہے، جن میں مولانا ابوالوفا صاحب قندھاری مدرس مدرسہ نظامیہ حیدرآباد دکن کا نام خاص امتیاز رکھتا ہے، یہ مجلس ہندوستان، مصر، شام، قسطنطنیہ وغیرہ کے کتب خانوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر حنفی فقہ کی قدیم بنیادی کتابوں کو نکال اور ان کو صحیح کر کے ان پر حاشیہ لکھ کر، بڑے اہتمام سے مصر میں چھپواتی ہے، اس سے پہلے چار اہم کتابیں وہ چھپوا چکی ہے، اب اس نے اس سلسلہ کی پانچویں اور چھٹی کتاب شائع کی ہے، اور یہ دونوں قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہیں۔

پانچویں کتاب الرد علیٰ سیر الاوزاعی ہے، امام اوزاعیؒ نے سیر (یعنی اسلام کے جنگی قوانین) پر جو کتاب لکھی تھی، قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نقطۂ نظر سے اس پر اعتراضات کیے ہیں، اور اپنے اختلافات لکھے ہیں، چھٹی کتاب ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ ہے، یہ دونوں امام قاضی صاحب کے استاد تھے، شاگرد نے اپنے دونوں استادوں کے فقہی اختلافات پر یہ کتاب لکھی ہے۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا دار الترجمہ جو خدمتیں انجام دے رہا ہے، ان سے علم کا کون طالب و شائق واقف نہیں، خصوصیت سے جب سے یہاں کی نظامت کی باگ ہمارے فاضل دوست مولوی ایس ایم صاحب برنی کے ہاتھوں میں آئی ہے، اس سال دار الترجمہ کی طرف سے، سو کتابیں تاریخ، فلسفہ، سائنس، طب، معاشیات، نفسیات، نباتات، تعمیرات وغیرہ مختلف علمی شاخوں پر شائع ہوئی ہیں، اور دار المصنفین کو وصول ہوئی ہیں، ہم دارالترجمہ

کی اس کامیابی پر اس کو دل سے مبارک باد دیتے ہیں۔

کتب خانۂ شیخ الاسلام کے لیے قالین

دو برس کی بات ہے، کہ ہم نے معارف میں مدینہ منورہ کے مشہور کتب خانۂ شیخ الاسلام کے فاضل مدیر شیخ ابراہیم حمدی کی آمد کی اطلاع دی تھی، خدا کا شکر ہے کہ موصوف پچھلے سال ہندوستان سے خوش خوش واپس گیے، اس کتب خانہ کے لیے موصوف کو ایک قالین کی ضرورت تھی، جس کے بچھانے کا حجاز میں عام رواج ہے، وہاں کا پرانا رومی قالین سو برس کے استعمال سے بیکار ہوگیا تھا خوشی کی بات ہے، کہ ہندوستان نے مرکز اسلام کی اس ضرورت کو بھی پورا کیا، ہمارے ملک میں مرزاپور اور بنارس کے اطراف میں دیسی قالین بننے کے اچھے اچھے کارخانے ہیں، جن میں سے ایک بھدوہی (ریاست بنارس) میں ہے، جس کے مالک ماسٹر دین محمد صاحب بی، اے ہیں، موصوف کو جب کتب خانہ کی اس ضرورت کا علم ہوا تو انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے اپنی طرف سے بلدۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ نذر گذرانا قبول کیا، اور بحمداللہ کہ ۲ دو برس کی محنت شاقہ میں بڑے اہتمام سے نہایت خوش نما اور پائدار قالین جس کی لاگت ۱۵۰۰ پندرہ سو روپیے کے قریب ہوگی، تیار کردیا ہے، اور اب وہ عنقریب مدینہ منورہ روانہ ہوگا۔ جزاہ اللہ خیر الجزاء،

(معارف ماہ اگست سنہ ۱۹۳۹ء)

(۹)

جامع ازہر مصر میں ایسے طالب علموں کے لیے جن کی مادری زبان عربی نہیں، ایک ہلکا سا مختصر نصاب بنادیا گیا ہے، جس میں کامیاب ہونے کے بعد ان کو سند اغراب (غیر عربوں کی سند) دیدی جاتی ہے، ہندوستانی کے طالب علم عام طور سے اسی قسم کی سند یا اس سے بھی کم درجہ کی سند لے کر ہنسی خوشی واپس چلے آتے ہیں، حالانکہ اس کی حیثیت میٹرک کی بھی نہیں۔

اب جامع ازہر کی اعلیٰ تعلیم تین کالجوں پر منقسم ہے، ایک شرعی، دوسری ادبی، اور تیسری دعوت وارشاد کی ان میں جو طالبعلم علم کی تکمیل کرکے فارغ ہوتے ہیں، وہ سند عالی پاتے ہیں، اور بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اس شعبۂ تکمیل میں اب تک دو تین ہندوستانیوں کے سوا کسی نے جگہ نہیں پائی، ۲ دو برس ہوئے کہ ہمارے مدرسہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ۲ دو فاضل حافظ محمد عمران خاں بھوپالی اور سعد الدین انصاری (معلم جامعہ دہلی) نے اس اعلیٰ تعلیم میں داخلہ کی غیر معمولی

اجازت پائی۔

اب ہمارے ناظرین کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوگی کہ حافظ محمد عمران خاں نے نہ صرف یہ کہ اپنے شعبہ میں کامیابی حاصل کی، بلکہ اپنے درجہ میں خود مصریوں کے مقابلہ میں بھی وہ اول آئے، ان کے درجہ میں کل چونتیس ۳۴ طالب علم تھے، ان میں سے صرف آٹھ ۸ کامیاب ہوئے، جن میں حافظ محمد عمران خاں ندوی کا نام سب سے اول ہے، ہم اس کامیابی پر دارالعلوم ندوہ کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

حافظ محمد عمران خاں نے جن علوم کے تحریری امتحان میں جو نمبر پائے ان کی تفصیل یہ ہے، علوم القرآن میں ۵۰ میں ۲۵، علوم الحدیث میں ۵۰ میں ۳۸½، موازنۂ مذاہب میں ۴۰ میں ۲۱½، عربی تقریر میں ۴۰ میں ۲۵، انگریزی میں ۴۰ میں ۲۸½، اور ان علوم کے زبانی امتحان میں علوم القرآن میں ۲۰ میں ۱۳، علوم الحدیث میں ۲۰ میں ۱۴، موازنۂ مذاہب میں ۲۰ میں ۱۰، اور انگریزی میں ۲۰ میں ۱۷، اور مجموعی حیثیت سے ۷۱ فی صدی۔

حافظ صاحب موصوف مزید تعلیم کے لیے یورپ بھی جانا چاہتے تھے، مگر جنگ کے سبب سے اب وہ واپس آرہے ہیں، غالباً ۱۵ر ستمبر تک وہ ہندوستان واپس آجائیں، وہ دارالعلوم سے فراغت کے بعد، دارالعلوم کے شعبۂ اہتمام و انصرام کا کام انجام دیتے تھے، ہماری آرزو ہے کہ وہ واپس آکر، دارالعلوم کے بیش از بیش کام انجام دیں، اور دین وملت اور قوم وملک کو ان کے وجود سے بہتر سے بہتر فائدے پہنچیں۔

چودھویں صدی ہجری کے شروع میں ندوۃ العلماء اور اس کا دارالعلوم، ہماری مذہبی تعلیم کی تاریخ میں ایک انقلابی تحریک تھی، اگرچہ عربی مدرسوں کی طرف سے اس کی دعوت کا خیر مقدم سرد مہری سے کیا گیا، مگر غور سے اگر دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا، کہ آہستہ آہستہ اس کی آواز نے ملک کے اس سرے سے اس سرے تک اپنا پورا اثر ڈالا، درس نظامیہ کے تبرک اور افادہ کا پرانا تخیل اب اتنا بدل گیا ہے، کہ اب اس کے ابطال کے لیے کسی دلیل کی بھی ضرورت نہیں، اور اب بلا استثناء ہر مدرسہ اس کی اصلاح کے لیے مضطرب اور بے چین ہے، لیکن جو چیز افسوس کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ اس اصلاح کے لیے جس سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سے سب کا ہاتھ خالی ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی عظیم الشان عمارت لکھنؤ میں دریائے گومتی کے کنارے موجودہ مسلمانوں کی غفلت

کا مجسم ماتم ہے، یہ عمارت ریاست بہاولپور کے شاہی خاندان کی ایک خاتون مرحومہ کی فیاضی کی مرہون منت ہے، اس عمارت کی تکمیل کے لیے تقریباً پچیس ۲۵ ہزار کی ضرورت اور ہے، کاش، ریاست بہاولپور کے عباسی فرمانروا کے کانوں تک میری یہ آواز پہنچ سکتی، کہ ان کی تھوڑی سی توجہ سے ان کے اسلاف کرام کی یادگار پایہ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے،

درسگاہ کے علاوہ کتب خانہ کی عمارت کی سخت ضرورت ہے، تقریباً تیس ۳۰ ہزار کتابوں کا سرمایہ اپنی عمارت نہ ہونے کے سبب سے نہایت بے ترتیبی سے ناموزوں حالت میں پڑا ہے، چھوٹے بچوں کے لیے دارالاقامہ کی نہایت ہی سخت ضرورت ہے، جس کے بغیر درسگاہ کا بڑا حصہ ان کے رہنے سہنے میں گھرا ہوا ہے، کیا ہمارے مسلمان اہل کرم ان میں سے کسی ضرورت کی طرف توجہ کر سکتے ہیں، واجرھم علی اللہ،

(معارف ماہ ستمبر ۱۹۳۹ء)

(۱۰)

امسال دارالعلوم ندوہ سے دس ۱۰ طالب علموں نے فراغت پائی، ان میں سے دو سرحد کے آزاد علاقہ کے، ایک نیپال کے، ایک کشمیر کے، چار بہار کے، اور دو اودھ کے تھے، ان فارغ شدہ طالب علموں کا وداعی جلسہ ۸؍ اکتوبر ۱۹۳۹ء کی دوپہر کو بڑی کامیابی کے ساتھ ہوا، طلبہ نے تقریریں کیں، اور نظمیں پڑھیں، اور رخصت ہونے والوں کو بڑی محبت سے رخصت کیا، جلسہ میں بعض ایسی تقریریں ہوئیں جو بڑی موثر اور دلپذیر تھیں، نظموں میں ایک نظم پونہ کے ایک طالب علم نے کسی اور زبان میں پڑھی تھی جو ایسی صاف تھی کہ اس کو مہاراشٹرہ کے بجائے لکھنؤ کا کلام کہا جا سکتا ہے،

ان طالب علموں کے دور دراز وطنوں کا جائزہ لیجئے، تو معلوم ہوگا کہ ہر عربی درسگاہ دنیائے اسلام کی اخوت و محبت کا آئینہ ہوتی ہے، دیس دیس کے لوگ آتے اور سالہا سال ایک ساتھ گذار کر واپس جاتے ہیں، اور ایک دوسرے کی محبت اپنے ساتھ یادگار لے جاتے ہیں۔

ہم کو خوشی اس سے ہوئی، کہ ان طالب علموں میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ پہنچ کر دین کی خدمت کا عہد کیا، اللہ تعالیٰ ان کو مزید توفیق دے کہ اسلام کے لیے ان کا وجود بہتر سے بہتر ثابت ہوسکے، اور ان کے ذر

مسلمانوں کے انتشار پراگندگی کا علاج ہو سکے، اور قوم اور ملک اور وطن کے مجازی لفظوں سے اونچے ہو کر دین حق کی وسیع حقیقت کے عالمگیر حدود تک ان کی نگاہیں پہنچیں۔

ان عربی درسگاہوں کی تعلیمی زبان اردو ہی ہے، اس سے قصد و ارادہ کے بغیر یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے، کہ دور دور صوبوں اور ملکوں کے لوگ یہاں آکر اردو زبان سمجھنے اور بولنے لگتے ہیں، دار العلوم میں اس سے آگے بڑھ کر یہ کوشش کی جاتی ہے، کہ وہ ایسی اردو سیکھ جائیں، جس میں لکھ پڑھ بھی سکیں، اس کا اثر یہ ہے، کہ اس ملک کی زبان کشمیر و نیپال و سرحد اور ترکستان اور چین تک برابر پہنچ رہی ہے، اور ذرا کوشش ہو تو یہ ہندوستانی زبان نہ صرف ہندوستان کی بلکہ ایشیا کی بین الاقوامی زبان ہو سکتی ہے، اور یہ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے فخر اور خوشی کا سرمایہ ہے۔

افسوس ہے کہ اتنی کھلی ہوئی حقیقت ہمارے ہم وطنوں میں سے کسی طبقہ کی سمجھ میں نہیں آتی، جو ہزاروں برس سے ہندوستان کی چہار دیواری میں اس طرح بند ہیں، کہ اس کے باہر وہ جھانکنا بھی نہیں چاہتے، ہندوستان پر مسلمانوں کا بڑا احسان یہ ہے، کہ انھوں نے ہندوستان کو دنیا کا حصہ بنا دیا، اور ہندوستان سے دنیا کو اور دنیا کو ہندوستان سے مالا مال کر دیا۔

لیکن اس روشنی کے عہد میں بھی جب ساری دنیا ایک گھر کی حیثیت میں ہو گئی ہے، اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے، کہ پھر ہندوستان کو ساری دنیا سے الگ کر دیا جائے، اس کوشش کا نمونہ وہ تحریک ہے، جس کا منشا یہ ہے کہ ہندوستان کی مصنوعی عام زبان وہ ہندی بنائی جائے جس کی بنیاد خالص سنسکرت پر ہو، اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ دکن، مدراس، اور بنگال کے ہندوؤں کی صوبہ وار زبانیں چونکہ سنسکرت مادہ سے بنی ہیں، اس لیے سنسکرتی ہندی ہی ان کی عمومی ملکی زبان ہو سکتی ہے۔

الٰہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر جھا نے ۱۲ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو گوالیار میں مہاراجہ گوالیار کی موجودگی میں ایک مجلس میں اس پر تقریر فرمائی ہے کہ سنسکرتی ہندی ہی ہندوستان کی عمومی زبان بن سکتی ہے، اور اسی پرانی دلیل کو دوبارہ دہرایا ہے، ہمارے نزدیک لائق پروفیسر نے یہ تقریر ایک آنکھ بند کر کے ارشاد فرمائی ہے، اور یہ سمجھ لیا ہے، کہ آٹھ کروڑ مسلمان جو نظریہ اور تھیوری کے طور سے نہیں، بلکہ عملاً اردو کو ہندوستانی زبان بنا چکے ہیں، ہندوستان

میں موجود نہیں، پھر انھوں نے دکن اور مدراس کی طرف تو دیکھا، مگر بلوچستان، سرحد، کشمیر، سندھ اور پنجاب کی طرف غور نہیں فرمایا، کیا ان کی زبانیں ہندوستان کی عمومی زبان میں کوئی حصہ نہیں رکھتیں،

اور سنسکرت کے ساتھ مدراس کا نام لے کر تو غضب ہی کیا گیا ہے، مدراس بلکہ دکن و میسور تک کا پورا علاقہ جو ڈراوڑی قوموں اور زبانوں کا مسکن ہے، آریہ قوم اور سنسکرت زبان سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتیں، ان ملکوں میں ہندی کے خلاف جو تحریک چل رہی ہے، اس کا منشا بھی یہی ہے، کہ ہندوستان کے یہ پرانے اور اصلی باشندے یہ نہیں چاہتے کہ سنسکرتی ہندی کو اپنی زبان بنا کر آریہ ہندوؤں کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالیں، اور اپنے کو ہندوستان سے فنا کر دیں، اور ہندوستانی اردو سے ان کو یہ ڈر نہیں۔

پروفیسر سکسینہ کا ایک مضمون

اس کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی کے سنسکرت ریڈر پروفیسر سکسینہ کا ایک تازہ مضمون اسی محدود اور تنگ ذہنیت کا نمونہ ہے، اردو تو اردو ہندوستانی تک سے ان کو اس لیے اختلاف ہے، کہ وہ آسان اردو کے معنی میں ہے، اور اسی لیے سرکار بہار کی ہندوستانی کمیٹی کی ممبری سے انھوں نے استعفا دیدیا ہے اور اپنا استعفا اخباروں میں چھپوایا ہے، موصوف اپنے پیشہ اور خدمت کے لحاظ سے بے شبہ سنسکرت کے عالم ہیں مگر کیا سنسکرت کے ان عالموں کو عربی اور فارسی کے عالموں کے اس ایثار، صلح پسندی اور رواداری سے کچھ سبق نہیں مل سکتا، جو اپنے اپنے رتبہ سے نیچے اتر کر ہندوستانی کی خدمت کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں، اسی قسم کی محدود اور تنگ ذہنیتیں ہر دور میں ہندوستان کی بربادی کا سبب ہوئی ہیں، اور آگے بھی ہوں گی، اور حقیقت یہی ہے، جیسا کہ سر تیج بہادر سپرو نے اپنی کشمیر کی بہادرانہ تقریر میں کہا ہے، کہ "اردو ہندو اور مسلمانوں کی مادری زبان ہے، جو بزرگوں کی ہزار سالہ محنت اور محبت کی یادگار ہے، جو لوگ اس زبان کو مٹانا چاہتے ہیں، وہ ہزار سالہ محنت اور محبت کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔"

(معارف ماہ اکتوبر ۱۹۳۹ء)

(۱۱)

مولانا محمد یوسف کوکن

خیر و برکت کا مہینہ اب ختم کے قریب ہے، دار المصنفین کی مسجد حسب دستور امسال بھی قرآن پاک کے ترانوں سے معمور رہی، اس سلسلہ میں ذکر کے قابل ایک رفیق دار المصنفین مولوی محمد یوسف صاحب عمری (دار السلام عمرآباد مدراس)

کا محراب سنانا ہے، ان کو یہیں آکر حفظ قرآن پاک کا شوق پیدا ہوا، اور اپنے عام روزانہ علمی مشاغل کے ساتھ اس مقدس فرض کو انجام دیا، اور آخر اس سال سب سے پہلی دفعہ انھوں نے پورے قرآن پاک کے سنانے کی سعادت پائی، والحمد للہ!

حیات شبلی دار المصنفین، اور مولانا شبلی کی وفات پر اس سال ۱۸ر نومبر کو پورے پچیس ۲۵ سال گذر جائیں گے بعض مخلص احباب کی تحریک تھی، کہ اس موقع پر دار المصنفین کی نقرئی جوبلی منائیں، یا معارف کا ایک یادگار شبلی نمبر نکالیں، کچھ دنوں تک یہ تجویز خیال میں رہی، اور آخر جی نہ چاہا، کہ پیروی عام کو اپنی زندگی کا دستور العمل بنائیں۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ خیال پختہ ہوگیا، کہ مولانا شبلی مرحوم کے سوانح حیات مکمل کرکے چھاپ دیئے جائیں، چنانچہ اس کام کو میں نے خود شروع کر دیا ہے، اور پورے جوش اور انہماک کے ساتھ یہ کام انجام پا رہا ہے، کوشش ہے کہ دسمبر تک اس کی پہلی جلد لکھ کر تمام ہو جائے۔

کتاب کا نام "حیات شبلی" ہوگا، اور دو ۲ جلدوں میں تمام ہوگی۔ پہلی جلد ان کی زندگی کے واقعات اور کارناموں پر ہوگی، اور دوسری ان کی تصنیفات کے تبصرہ پر، یہ پہلا موقع ہے، کہ عصر جدید کے ایک ایسے عالم کے سوانح حیات مرتب ہوں گے، جس نے قدیم وجدید کو پیوند کرنے کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے،

شوال سے دار العلوم ندوۃ العلماء کا تعلیمی سال شروع ہو جائے گا، یہ بات افسوس کے ساتھ دیکھی جا رہی ہے، کہ اعلیٰ گھرانوں سے عربی تعلیم بالکل فنا ہوگئی ہے، اور گویا مذہبی تعلیم اور مذہبی علوم کے زندہ اور باقی رکھنے کی خدمت کا سارا بوجھ غریبوں کے کندھوں پر رہ گیا ہے، کیا کھاتے پیتے گھرانوں نے امت محمدیہؐ کے دفتر سے اپنا نام کٹا لیا ہے، یا یہ وہ سمجھتے ہیں، کہ رزق کا دروازہ صرف رومن حروف کی تعلیم کے ذریعہ ہی کھل سکتا ہے، حالانکہ صاف نظر آرہا ہے، کہ یہ جدید تعلیم اس دروازہ کے کھولنے سے بھی عاجز ہے۔

مسلمان حیرت سے سنیں کہ ہمارے ہندو ہم وطنوں کے سامنے اب یہ تجویز ہے کہ اسکول کے ابتدائی درجوں میں معمولی سنسکرت کی تعلیم لازمی کر دی جائے، دوسری طرف ہم مسلمان ہیں، کہ روز بروز اپنی مذہبی زبان سے دور ہوتے جاتے ہیں، سارے عربی مدرسوں کا جائزہ لے لیجئے، شاید ہی کسی دولتمند رئیس یا ایسے اعلیٰ شریف گھرانے کے لڑکوں کو آپ عربی تعلیم میں مصروف پائیں گے، اگر ایک دو ہوں بھی تو ان کا شمار نہیں ہیں ہے،

تاریخ دولت عثمانیہ تاریخ اسلام کا جو عظیم الشان سلسلہ دار المصنفین میں لکھا جا رہا تھا، اس کی پہلی جلد چھپ کر شائع ہوگئی، اب اس کی دوسری جلد طبع کر جا رہی ہے، امید ہے کہ ۱۹۴۰ء کے آخر تک وہ بھی شائع ہو جائے، اس کے ساتھ دولت عثمانیہ کی نہایت مکمل تاریخ جو زیر طبع تھی، اس کی پہلی جلد بھی تیار ہوگئی ہے، ہماری زبان میں یہ پہلا موقع ہے، کہ اسلام کی اس زندہ سلطنت کی کوئی مستند اور سنجیدہ تاریخ شائع ہو رہی ہے۔

اس وقت دنیا جس کشمکش میں مبتلا ہے، اس کی نسبت یہ کہنا چاہئے، کہ یہ قوموں کے سیاسی بحران کا عہد ہے، اگر غور سے دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا، کہ یورپ کی اس تنگ قومیت کا نتیجۂ بد ہے، جس نے ہر انسانی نسل کو دوسری انسانی نسل کا دشمن بنا دیا ہے، اور یہیں سے اسلام کی اس عالمگیر اخوت کی قدر معلوم ہوگی، جس نے رنگ، نسل، خون، اور جغرافیہ کی تقسیموں کو انسانی حقوق کی تقسیم کا ذریعہ نہیں ٹھہرایا ہے،

روس اور جرمنی اپنے سیاسی اور اقتصادی مسلک کے لحاظ سے دو مختلف مذہب رکھتے ہیں، اور ابتک ان دو مذہبوں کے ماننے والوں میں علانیہ اختلاف تھا، مگر یہ اختلاف اصول کی تبدیلی کے بغیر، زمین کے دو حصوں کی تقسیم میں متحد ہوگیا، اب کیا ہمارے انجان نوجوان سوشیالسٹ بالشوازم اور ہٹلرزم کے درمیان تطبیق کی کوشش کریں گے۔

لکھنؤ میں شیعہ سنی اختلاف جس نوبت پر پہنچ گیا ہے، شاید یہی وہ مقام ہے، جہاں پہنچکر عارف روم نے ارشاد فرمایا ہے۔

نور حق کے بر تو گردد منجلی
اے گرفتار ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

اگر حقیقت میں سنیوں کو شیعوں کے فعل سے اس قدر تکلیف ہے، تو ان کا پہلا فرض یہ ہے، کہ محرم کے ان تمام بدعات سیئہ سے جو اسلام کی رسوائی کا باعث ہیں، یک قلم الگ ہو جائیں، ورنہ یہ کیا ہے، کو شیعوں سے نفرت کرنا، اور شیعیت کے مراسم خود ادا کرنا جو باتفاق علمائے سنت ناجائز اور ناروا ہیں،

اور متعدد بار اس کے فتاوی شائع ہو چکے ہیں۔

تقلیس اس کے بجائے عوام کی دلچسپی اور فائدہ کے لیے ان تمام اکھاڑوں اور فوجی کرتبوں کی نمائش کو جس کا موقع محرم قرار دیا گیا ہے، عیدین کے موقع پر رواج دینا چاہیے، جو عین سنت اور صحابۂ کرام کے مسلک کے مطابق ہے، اور جس کا اصطلاحی نام تقلیس ہے، عہد اول میں یہ تقلیس عیدین کے موقع پر کی جاتی تھی صحابہؓ کرام شریک ہوتے تھے، اور خود رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت کرام دیکھتے تھے، اور خوش ہوتے تھے،

(معارف ماہ نومبر ؁۱۹۳۹ء)

(۱۲)

خدا کا شکر ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف قوم کی توجہ پھر منعطف ہو رہی ہے، شوال میں طلبہ کے داخلہ کی درخواستیں بھی غیر معمولی آئیں، لیکن مالی حالت کی مجبوری سے ۴۵ طالب علموں کے وظائف کی درخواستوں میں سے صرف بارہ طالب علموں کو لیا جا سکا، بہت سے ایسے غریب طالب علموں کی درخواستیں تھیں جن کو نامنظور کرتے ہوئے کارکنوں کو سخت صدمہ ہوا، مگر افسوس کہ چادر سے زیادہ پاؤں پھیلا کر بھی وہ ان کی مدد نہ کر سکے، یعنی ندوہ کے پاس صرف اڑتیس ۳۸ طالب علموں کی گنجائش تھی، اور اس وقت اس سے دونے کا بوجھ اس نے اٹھا لیا، اور درخواستوں کا سلسلہ ان سطروں کے لکھتے وقت جاری ہے، ایک طالب علم پر سات روپیہ ماہوار کا خرچ ہے،

ہم میں اہل وسعت تو اپنے بچوں کو عربی نہیں پڑھواتے، عربی پڑھنے والے زیادہ تر غریب والدین کے بچے ہوتے ہیں، جو اپنا خرچ خود پورا نہیں کر سکتے، کیا یہ مناسب نہ ہوگا، کہ اس ضروری کام میں اہل ثروت اپنی جیبوں سے اور غریب اپنے جگر گوشوں سے مدد کریں، اور اس طرح علم دین کی تعلیم وتعلم کا فرض باہمی تعاون سے انجام پائے،

الندوہ کا دور جدید الندوہ جس نے ؁۱۹۰۳ء سے لے کر ؁۱۹۰۹ء تک علمی، تعلیمی اور مذہبی خدمات مولانا شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی ادارت میں بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیئے، اور آج کے معارف کے چلانے والے اسی مکتب کے پڑھے ہوئے ہیں، اب کامل تیس ۳۰ برس کے بعد پھر اس کو نکالنے کا سامان کیا جا رہا ہے، علاوہ

دوسرے علمی، تعلیمی، تعمیری اور اصلاحی مقاصد کے خود ندوۃ العلماء کی آواز کو جو سالہا سال سے دب چکی ہے، اور جس کی اب بھی ضرورت اتنی ہی ہے، دوبارہ بلند کرنے کا خیال ہے، اور علمائے کرام کو دوبارہ ان کے بھولے ہوئے فریضہ کو یاد دلانے کا عزم ہے، ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیق الا باللہ، ضخامت ۲ جزو قیمت ع ہوگی، پتہ مینجر الندوہ، بادشاہ باغ، لکھنؤ۔

کلیات شبلی اردو مولانا شبلی مرحوم کے اردو دیوان کا ایک نیا اڈیشن جو ان کے ہر قسم کے اردو قصیدوں، قطعوں، مثنویوں اور اخلاقی و سیاسی نظموں پر مشتمل ہے، اس وقت چھپ رہا ہے، اس کے شروع میں مولانا کی اردو شاعری پر ایک تبصرہ ہوگا، تقطیع موزوں رکھی گئی، اور کاغذ بھی دبیز لگایا گیا ہے، ہر حوالہ طلب نظم کے حوالے بھی ہر نظم کے ساتھ اس کی تمہید میں لکھ دیے گیے ہیں، ضرورت ہے کہ یہ اڈیشن ہر مسلمان نوجوان کے ہاتھوں میں رہے۔

ہندوستانی زبان ہندوستانی کی تجویز کانگریس نے پیش کی تھی، اور زبان کے جھگڑے میں اس کا یہ فیصلہ متفقہ ہے، مگر کیا عجیب بات ہے، کہ جب صوبہ بہار کی تعلیمی وزارت نے اس خیال کو عمل میں لانے کی کوشش شروع کی، تو اس کی مخالفت پنڈت مدن موہن مالوی سے لیکر ہندو سبھا پٹنہ کے ممبروں تک نے شروع کردی، ہندوستانی کا بت بنا کر اس کی ہولی جلائی گئی، اس زبان میں چھپے ہوئے رسالوں اور کتابوں کا بائیکاٹ اور اس کی وجہ سے دھرم ناس ہونے کا ڈر بتایا جانے لگا، اور بات اتنی سی ہے کہ کسی نومشق نے راجہ دسرت کو بادشاہ اور اجودھیا کی پرجا کو رعیت لکھدیا، یہ ہے ہمارے دیس کے بھگتوں کی دیس پوجا، اور اس کے ذریعہ سے ملک کی آزادی کا خیال،

مسلمانوں کو تنگ خیال سمجھنے والے ہندو دوست ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈالیں، اور صرف ایک زبان ہی کے معاملہ میں اپنی دورنگی چال ملاحظہ فرمائیں، کہ جب کانگریس کے چوپال میں بیٹھیں تو ہندوستانی کا گیت گائیں، اور جب کونسل کی اسپیکری اور تعلیمی وزارت کی کرسیوں پر بیٹھیں تو اردو اور ہندی کا فیصلہ آبادی کے حساب سے کتابوں کے دام بانٹیں، اور دیہاتی لائبریریاں بنائیں، اور گھر جاکر نج کے طور پر سنسکرتی ہندی کے پڑھانے اور اس کو ملک کی بولی ٹھہرانے کی تجویزیں سوچیں، اور پرزور تقریریں کریں،

کہیے یہ حکم رہے کہیے وہ ارشاد رہے،

انجمن ترقی اردو کا اجلاس

ہمارے مخدوم مولوی عبدالحق صاحب اردو کی جو جوانمردانہ خدمت کر رہے ہیں، وہ اردو کے ہر حامی کے شکریہ کی مستحق ہے، دسمبر کے آخر میں وہ دلی میں انجمن ترقی اردو کا ایک عام اجلاس کر رہے ہیں، جس میں زبان کی ترقی کے ہر مسئلہ پر گفتگو ہوگی، ضرورت ہے کہ ہم اس وقت صرف کچھ کہنے کے لیے نہیں، بلکہ کچھ کرنے کے لیے اکٹھے ہوں، اور زبان کی خدمت صرف زبان سے نہیں بلکہ عمل سے بھی کرکے دکھائیں،

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس

انہی دنوں میں کلکتہ میں مسلم تعلیمی کانفرنس کا اجلاس ہوگا، ہم کو امید ہے، کہ بنگال کے مسلمان اس کانفرنس میں سیاست کی خاطر نہیں، بلکہ تعلیم کی خاطر کچھ کریں، اور بنگال کے مسلمانوں کے سامنے ان کی علمی، تعلیمی، تمدنی اور ادبی مستقبل کی ایسی تجویزیں پیش کریں، جن سے بنگال ہندوستان کا ٹکڑا بن جائے، کیا عجیب بات ہے، کہ قریب قریب مسلمانوں کی آدھی تعداد بنگال میں آباد ہے، اور وہ زبان کی بے گانگی کے سبب سے ہندوستان کی ساری اسلامی تحریکوں سے ایک لخت بے خبر ہے، کیا یہ سوچنے کی بات نہیں؟

سیرۃ النبیؐ کی چھٹی جلد کی چھوٹی تقطیع کی مانگ ہو رہی ہے، مگر لڑائی نے کاغذ کو اتنا گراں کر دیا ہے، کہ کوئی بڑی کتاب کاغذ کے کافی ذخیرہ کے بغیر چھپنی مشکل ہے، معلوم نہیں ایک کاغذ پہ کتنے جز چھپنے کے بعد وہ کاغذ پھر نہ مل سکے، اس لیے ہم کاغذیوں سے خط و کتابت کر رہے ہیں، جس وقت کاغذ کی طرف سے اطمینان ہوا وہ چھپنی شروع ہو جائے گی۔

دارالمصنفین کی تاریخ

بعض احباب کی تحریک ہے، کہ دارالمصنفین کے پچیس[۲۵] سال کے کارناموں کی ایک مختصر تاریخ مرتب کر دی جائے، جس میں اس کے تخیل، نظام، قیام اور ہر رفیق کے مختصر حالات اور اس کی تصانیف کے نام اور ہر فن وار دارالمصنفین کے مطبوعات اور اس کے آئندہ کاموں کا پروگرام ہو۔

(معارف ماہ دسمبر ۱۹۳۹ء)

شذرات

(بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء تا ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء)

معارف کا پہلا پرچہ جولائی سنہ ۱۹۱۶ء میں نکلا تھا، آج سنہ ۱۹۴۰ء کا آغاز ہے، یعنی معارف کی زندگی کا اب چوبیسواں سال ہے،، اس کا بچپن یورپ کی بڑی جنگ میں گذرا اور اب اس کی جوانی یورپ کی ایک اور بڑی لڑائی میں گذر رہی ہے،

۲۴ برس کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہے، مگر انہی ۲۴ برسوں میں خدا جانے کتنے کاغذ کے پتلے رسالوں کی صورت میں عرصۂ وجود میں آئے، اور فنا ہوئے، اس حالت میں معارف کی ۲۴ برس کی ایسی زندگی جس میں ایک مہینہ کے لیے بھی اس نے کبھی کوئی ارادی یا جبری تعطیل نہیں منائی، اللہ تعالےٰ کے ہزار ہزار شکریہ کی مستحق ہے،

ان ۲۴ برسوں میں انقلابات کے کئی طوفان اٹھے، اور سیاسیات کی کئی آندھیاں آئیں، مگر اس پر بھی خدا کا شکر ہے، کہ جس راستہ کو سمجھ بوجھ کر ایک دفعہ صحیح مانا، اب تک اسی راستہ پر قدم ہے، دین کی راہ سے علم کی، یا یوں کہیے کہ علم کی راہ سے دین کی خدمت زندگی کا پہلا مقصد تھا، اور آج بھی وہی ہے، والحمد للہ، اس کے سوا جو چیزیں معارف میں آجاتی ہیں، ان کی حیثیت حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے احماض کے سوا کچھ اور نہیں۔

انجمن ترقی اردو کا اجلاس دہلی میں

دسمبر سنہ ۳۹ء کے آخر ہفتہ میں ہماری ادبی اور تعلیمی دو کانفرنسیں، دو شہروں میں ہوئیں، پہلی کانفرنس انجمن ترقی اردو کی طرف سے دہلی میں ہوئی، جس کی صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر تعلیم حیدرآباد دکن نے فرمائی، نواب صاحب ممدوح نے اپنے والد بزرگوار نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی سے علم وفن اور اردو ادب کی محبت ورثہ میں پائی ہے، ان کی متانت، سنجیدگی، دینداری، اور ساتھ ہی وسعت نظر اور وسعت قلب اس نئے دور میں عدیم المثال ہے، وہ ہندوستان کی واحد اردو یونیورسٹی،

کے وائس چانسلر اور دارالمصنفین کے نائب صدر نشیں ہیں، ان کا خطبۂ صدارت، ان کے سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ تھا، اور ہندوستان کی قوموں میں اتحاد و محبت کا پیام۔

تجاویز

کانفرنس میں زبان کی ترقی اور اصلاح کی کئی تجویزیں منظور ہوئیں، جن میں سب سے اہم دہلی اور صوبہ یوپی و بہار کی یونیورسٹیوں میں اردو کے ذریعہ تعلیم کا مسئلہ تھا، اور دوسری ایک اصلاحی کمیٹی کا قیام جو زبان کے ادبی و لغوی مسئلوں کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرے، ایک اور تیسری تجویز بھی خاص اہمیت رکھتی ہے، یعنی انجمن کے مرکز میں اردو مطبوعات کے ایسے کتب خانہ کی فراہمی جس میں سال کے تمام مطبوعات ایک جگہ ہوں، اور اس کی صورت یہی ہے کہ انڈیا آفس لائبریری کی طرح انجمن کے دفتر میں اردو کی ہر مطبوعہ کتاب کا ایک نسخہ لازماً بھیجا جائے، انجمن کی طرف سے اگر اس کا باقاعدہ اعلان ہوتا رہے، تو ممکن ہے مصنف اور پبلشر اس ضرورت کی طرف توجہ مبذول کریں۔

مسلم تعلیمی کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں

مسلم تعلیمی کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں ہوا، اس کی صدارت کی کرسی پر حیدرآباد دکن کے سب سے بڑے جاگیردار نواب کمال یار جنگ بہادر جلوہ افروز تھے، موصوف گو پہلی بار ہندوستان کی پبلک میں ظاہر ہوئے ہیں، مگر ان کی سنجیدہ رائیں اور گہرے خیالات توجہ سے سننے کے قابل تھے، ان کا خطبہ گو لفظوں میں مختصر مگر معنی میں وسیع تھا، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک خاص تعلیمی اسکیم پر جو ان کی قومی و مذہبی ضروریات کے مطابق بنائی گئی ہو، بہت زور دیا۔

ان کی یہ تجویز ان مسلمان اہل فکر کے لیے جو مسلمانوں کے مستقل اور علیحدہ تعلیمی نظریہ کے حامی ہیں، بہت کچھ دلچسپی کا باعث ہے، مگر افسوس ہے، کہ ان کی تجویز کے مطابق جو سات شخص اس کام کے لیے چنے گیے، ان میں سے ایک دو کے سوا بقیہ کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا، کہ وہ اولاً کہاں تک اس مقصد سے متفق ہیں، اور ثانیاً کہاں تک وہ اس کی اہلیت رکھتے ہیں، اور اس پر بھی یہ افسوس یہ ہے، کہ اتنی بڑی اہم تجویز بھی صوبہ وارانہ اسپرٹ سے خالی نہیں۔

اس سال کانفرنس کے اردو شعبہ کے اجلاس میں بنگال کے مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا خوشگوار ذہنی انقلاب محسوس ہوا، یعنی وہ اردو کو بہ حیثیت ایک عام ہندوستانی زبان کے ماننے اور بنگال میں اس کے پھیلانے

کے لیے خواہش مند نظر آتے تھے، اور ان کو محسوس ہوتا تھا، کہ صرف زبان کی بے گانگی ان کو باقی اسلامی ہندوستان سے ایک طرح سے منقطع کردیا ہے، انھوں نے خود ہی اس کی تحریک کی، کہ وہ بنگالی زبان کو بھی سندھی، ملیالم اور پشتو کی طرح عربی خط میں لکھیں، اور اس کی سند میں انہوں نے سو برس پہلے کی ایک ضخیم منظوم بنگالی کتاب شہادت نامہ پیش کی، جو بنگلہ زبان اور عربی خط میں تھی۔

کانفرنس کے شعبۂ اسلامیات کی صدارت چودھری عزیز الحق وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی نے کی، موصوف نے جب سے یونیورسٹی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے، اس بات کی کوشش میں ہیں، کہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ و علوم کی ایک نئی کرسی قائم کریں، ان کا خطبہ ان کے اس خیال کا آئینہ تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی انگریزی تفسیر

ہمارے فاضل دوست مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی جو کئی سال سے انگریزی میں قرآن پاک کا ترجمہ کرنے اور اس پر مفید حواشی لکھنے میں مصروف تھے، اپنے اس مقدس فرض سے بحمد اللہ سبکدوش ہو گیے، یہ انگریزی کا پہلا ترجمہ ہے، جو خالص اہل سنت گروہ کے خیالات کے مطابق کیا گیا ہے، فاضل مترجم تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکا، اب دیکھنا یہ ہے، کہ اس کی اشاعت کی خوش نصیبی کس خوش قسمت کو حاصل ہوتی ہے، لیکن سلسلۂ آصفیہ سے بڑھ کر اس کا استحقاق کس کو ہے۔

(معارف ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء)

(۲)

سیرۃ النبی جلد ششم پر تبصرہ

پچھلے پرچہ سے سیرۃ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کی چھٹی جلد پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے، ایک ذمہ دار صاحب قلم کے قلم سے جو تبصرہ بصیرت افروز ہو رہا ہے، وہ خاکسار مؤلف کی پوری چوتھائی صدی کی خدمت کا ایک ایسا معاوضہ ہے، جس کے لیے وہ سراپا سپاس گذار ہے، یہ تبصرہ بجائے خود اس تاریک زمانہ میں جس کو روشنی کا زمانہ کہا جاتا ہے، فکر و عمل کے لیے چراغ راہ ہے، ضرورت ہے کہ اہل نظر اس کو بار بار پڑھیں اور اس کی تہ تک پہنچیں۔

خاکسار مؤلف کی بڑی خواہش تھی، کہ علوم اسلامیہ اور اخبار محمدیہ کے ماہرین میں سے کوئی صاحب ہمدردی اور دردسوزی سے غور فرماتے، کہ مؤلف جس راستہ پر جس طرح چل رہا ہے، وہ کہاں تک صحیح ہے، اور کہاں تک اس

میں اصلاح کی گنجائش ہے، مولف کی دیرینہ خواہش کی یہ پہلی تکمیل ہے، صاحب تبصرہ نے اپنی لطیف و نازک طرز تحریر میں مولف کو جن گوشوں کی طرف توجہ دلائی ہے، وہ پہلے سے بھی نظر میں تھے، اور اب وہ اور زیادہ انشاء اللہ تعالیٰ قابل توجہ رہیں گے۔

زمانہ کے دست شاطر نے ہمارے علماء کے سامنے اب بالکل نئی بساط بچھائی ہے، نئے خیالات اور نئے مسائل کی نئی مشکلات ہمارے سامنے ہیں، ضرورت تو یہ تھی کہ اہل فکر اور عاقبت بین علماء آپس میں ملکر ان مشکلات کا حل سوچتے، اور ان کی راہیں کھولتے، لیکن جب اس وقت یہ صورت نہیں تو شخصی طور سے جس سے جو کچھ ہو سکتا ہے، اس کو کرتا ہے سیرۃ نبویؐ کی جلدیں ان ہی حالات و خیالات کو سامنے رکھکر ترتیب پا رہی ہیں، السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ۔

سیرۃ جلد ہفتم

چھٹی جلد کے بعد ساتویں جلد کا مرحلہ ہے، اور سب کو معلوم ہے کہ اس جلد کا موضوع معاملات ہوگا، معاملات سے مقصود اسلام کے وہ مسائل ہیں، جن کی حیثیت قانون کی ہے، اس میں سب سے پہلی چیز خود سلطنت اور آداب سلطنت ہیں، جس پر قانون کے چلانے کی ذمہ داری ہے، پھر اسلام کے ہر قسم کے قوانین معاشرتی تمدنی، اجتماعی، اقتصادی کی تشریح کا کام ہے، یہ ہمارے لیے مباحث کا نیا راستہ ہوگا، اور اسی لیے اس کے طے کرنے کی مشکلیں بھی نظر کے سامنے ہیں۔

سیرۃ النبیؐ کا عربی ترجمہ

ہمارے ناظرین کو یہ سن کر بڑی خوشی ہوگی، کہ مصری یونیورسٹی کے ایک فاضل پروفیسر عبدالوہاب عزام نے جو وہاں فارسی اور اردو کے استاذ ہیں، ہماری سیرۃ النبیؐ کے عربی ترجمہ کی اجازت ہم سے چاہی ہے، جس کو ہم نے خوشی سے منظور کیا ہے، موصوف نے اس سلسلہ میں جو خط لکھا ہے، اس کی چند سطریں یہ ہیں:

> ”میں نے آپ کی سیرۃ نبویہ کا ترکی ترجمہ پڑھا تو میں نے اس کو اس لائق پایا، کہ خود قرآن پاک کی زبان میں اس کا ترجمہ کیا جائے، اس لیے میں نے اور چند ہندوستانی بھائیوں نے مل کر یہ ارادہ کیا ہے، کہ ہم عربی میں اس کا ترجمہ کریں،

اس ضروری کام کے لیے خود میرا ارادہ تھا، کہ مصر جاکر ان مجلدات کا عربی میں ترجمہ کر دوں، مگر نظر یہ آتا ہے

کہ یہ تمنا دل کی دل ہی میں رہے گی، اس لیے اس خیال کی تکمیل کا اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا، خدا اس کو انجام تک پہونچائے۔

سیرۃ نبیؐ کا انگریزی ترجمہ

سیرۃ کے انگریزی ترجمہ کا خیال بھی مدتوں سے ہے، اور کئی صاحبوں نے اس کی اجازت مانگی، اور دی گئی، مگر پورا کسی نے نہیں کیا، اسی اثنا میں خود اپنے ہی یہاں اس کام کو شروع کیا گیا، مگر کچھ ایسے اسباب ہوئے، کہ پھر یہ کام رُک گیا، اب لاہور کے ایک ممتاز صاحب دل و صاحب قلم خواجہ عبدالوحید (سکریٹری اسلامک ریسرچ سوسائٹی) نے ہمت کی، اور اس کے دیباچہ کا انگریزی ترجمہ خدام الدین کے انگریزی پرچہ اسلام میں شائع کیا، اور اب ہمت کر رہے ہیں، کہ پوری کتاب کا انگریزی ترجمہ کریں، خدا کرے یہ کام بھی تکمیل کو پہنچے۔

الفاروق کا انگریزی ترجمہ

مولانا شبلی مرحوم کی الفاروق کے انگریزی ترجمہ کا خیال بھی کئی صاحبوں نے کیا، لیکن آخر اس کی اولیت کا فخر اسی کو حاصل ہوا، جس نے اس کام کو سب سے پہلے شروع کیا تھا، یعنی مولوی ظفر علی خاں صاحب، انھوں نے ۱۸۹۹ء ہی میں جب الفاروق نکلی تھی، اور وہ حیدرآباد میں تھے، شمس العلماء مولانا سید علی بلگرامی اور مولوی عزیز مرزا مرحوم کی تحریک سے اس کو شروع کیا تھا۔ مگر ایک ہی جلد کا کر کے رہ گیے تھے، اب وہی پہلی جلد شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور کے بکڈپو سے چھپ کر شائع ہوئی ہے، کتاب صاف ستھری چھپی ہے، چار روپے قیمت ہے، اور وہیں سے مل سکتی ہے۔

خلفائے راشدین کا ترجمہ

سیر الصحابہ کے سلسلہ کی پہلی جلد خلفائے راشدین ہے، اس کے بیرونی ترجمہ کا قرعۂ فال ایک ایسے اسلامی ملک کے نام نکلا ہے، جس کی ہمت کا یہ پہلا امتحان ہوگا یعنی مالدیپ، اس چھوٹے سے جزیرے میں ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے چند فارغ التحصیل علماء ہیں، ان میں سے ایک محمد حسن صاحب مالدیپی ہیں، موصوف نے ایک خط لکھ کر اس کے ترجمہ کی اجازت مانگی ہے، اور کام شروع کر دیا ہے، خدا ہمت دے۔

(معارف ماہ فروری سنہ ۱۹۴۰ء)

(۳)

سفرِ حیدرآباد

۲۵ر جنوری سنہ ۱۹۴۰ء سے ۲۵ر فروری سنہ ۱۹۴۰ء تک پورا ایک مہینہ حیدرآباد دکن، پونہ، اور بمبئی کے سفر میں گذرا، حیدرآباد اس دفعہ گو ڈیڑھ ہی برس کے بعد جانے کا اتفاق ہوا، مگر اس ڈیڑھ ہی برس میں حیدرآباد کی علمی وادبی و تعلیمی ترقیوں میں غیر معمولی اضافہ پایا، اور یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے، کہ اعلیٰحضرت سلطان العلوم کے عہد حکومت کا ہر سال علمی وادبی ترقیوں کا ایک پورا دور ہوتا ہے۔

کلیۂ فنون

اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں سب سے پہلی ملاحظہ طلب چیز جامعہ عثمانیہ کا کلیہ فنون (آرٹس کالج) ہے، یہ پہاڑی مضبوط اور پھول جیسی خوبصورت عمارت تیشۂ کوہ کن اور حسن شیریں دونوں کی ایک ساتھ تصویر ہے، عمارت کے نیچے کا حصہ طالب علموں کے اجتماعات کے لیے ہے، اور اوپر کی منزلیں تعلیم کی ہیں، مشرقیات اور شعبۂ دینیات کے شعبے ایک طرف ہیں، دوسری طرف سنسکرت، تامل، تیلگو، کنڑی وغیرہ زبانوں کے کمرے ہیں، دوسرے علوم کے کمرے بھی پہلو بہ پہلو ہیں، ایک پوری منزل کتب خانہ کی ہے، جو نئی طرز پر طبقہ بہ طبقہ لوہے کی الماریوں اور ستونوں پر قائم ہے، ناظر کتب خانہ ہمارے دارالعلوم ندوہ کے ایک تعلیم یافتہ گریجویٹ ہیں۔

مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا مناظر احسن کی قیام گاہ

جامعہ عثمانیہ کے قریب ہی ایک نیک دل مسلمان نے بڑی محنت سے ایک مسجد بنوائی ہے، اسی کے گرد ہمارے دوستوں مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کی قیام گاہیں ہیں، مولانا عبدالباری صاحب تو گویا مسجد کے حجرہ ہی میں قیام پذیر ہیں، ایک فلسفی کو مسجد میں قیام پذیر دیکھ کر دین و دنیا کے اجتماع کا وہ اگلا سا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، جس کی نسبت عرب شاعر نے کہا ہے۔

ما احسن الدین والدنیا اذا اجتمعا

درویش عالم مولانا سید مناظر احسن گیلانی کالج کے درس کے بعد مسجد میں چند خوش نصیبوں کو قرآن پاک کا درس اور سکندرآباد کی جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیتے ہیں، موصوف کی آواز اور بیان میں تاثیر کا دریا موجیں مارتا ہے، وہ تقریر نہیں کرتے، اپنے دل کے ٹکڑے بکھیرتے ہیں، اور یہ آواز دیتے ہیں۔

من قاش فروش دل صد پارۂ خویشم

صدر شفا خانہ طبیہ اور نظامیہ طبیہ کالج

شہر کے اندر اس سال کی نئی ترقیوں میں صدر شفا خانہ طبیہ اور نظامیہ طبیہ کالج ہے، جو شہر کے مشہور مرکزی مقام چار مینار کے پیچھے واقع ہے، واقعہ یہ ہے، کہ میں اس کے تمام شعبوں کو اور اس کے اہتمام و انتظام کی خوبیوں کو دیکھکر ششدر رہ گیا، اس کے ناظم مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے لائق شاگرد حکیم مقصود علی خاں ہیں، اور دوسرے اطبا اور اساتذہ بھی زیادہ تر مسیح الملک مرحوم ہی کے تلامذہ اور ان کے خاندان کے مستفیدین میں ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے، کسی ستارہ شناس نے آسمان طب کے سارے منتشر ستاروں کو ایک مرکز پر جمع کر لیا ہے۔

اس شفا خانہ اور طبیہ کالج کی اہمیت و عظمت کو سمجھنے کے لیے اتنا کافی ہے، کہ کسی میڈیکل کالج کو اپنے سارے اہتمام و انتظام اور وسعت کے ساتھ صرف اتنے فرق کے ساتھ تصور کر لیجئے، کہ ڈاکٹروں کی جگہ اطبا ہیں، اور انگریزی دواؤں کی جگہ یونانی دوائیں اور علاج کے طریقے ہیں، ہر چیز نہایت صاف ستھری، عمارت نہایت بلند اور خوبصورت، دوائیں، دواؤں کے بنانے کے کمرے، مریضوں کے کمرے، پڑھائی کے کمرے، ہر چیز سلیقہ اور ستھرائی کے ساتھ نظر آئی۔

اساتذہ کے لکچر سنے، ان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھا، کتب خانہ دیکھا، تعلیمی شعبوں میں ایک نیا شعبہ تاریخ طب کا بھی ہے، جس میں تاریخی تحقیقات سے بتایا جاتا ہے، کہ بہت سی وہ باتیں جو نئی سمجھی جاتی ہیں، وہ پرانی قدیم طب کے گوشوں میں بھی پڑی ہوئی ہیں، غرض قدیم و جدید کی وہ خوشگوار آمیزش یہاں نظر آئی، جو مرحوم اجمل خاں کی طبی زندگی کی انتہائی خواہش تھی، اس کو دیکھ کر یہ جی چاہا، کہ جس طرح طب قدیم کی تجدید کا وہ خواب جو حکیم صاحب مرحوم نے دیکھا تھا، سرکار آصفیہ کے زیر سایہ پورا ہوا، ایسے ہی مولانا شبلی مرحوم نے قدیم اسلامی علوم کی تجدید کا جو خواب دیکھا تھا، وہ بھی خدا کرے اسی سرکار کے زیر سایہ پورا ہو۔

انجمن ترقی اردو کے دلی منتقل ہو جانے کے بعد یہاں انجمن کی ایک شاخ قائم ہو گئی ہے، جو چند سرگرم کام کرنے والوں کے ہاتھوں میں ہے، اس کی طرف سے اردو کا ایک جلسہ ہوا، جس میں اردو کی موجودہ صورت حال پر میں نے تقریر کی، اور بتایا کہ ملک میں اس کی ترقی کے لیے کہاں کہاں کیا کیا ہو رہا ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو

یہاں اردو کا ایک اور ادارہ بھی دیکھا، جس کا نام "ادارۂ ادبیات اردو" ہے، اس کے چلانے والے زیادہ تر جامعہ عثمانیہ کے نوجوان گریجویٹ ہیں، جن کی سربراہی پروفیسرز عبدالقادر سروری، عبدالمجید صدیقی وغیرہ کر رہے ہیں، دو تین ہی سال کے عرصہ میں اس ادارہ نے سو کے قریب کتابیں شائع کر دی ہیں، کچھ کتابوں اور اردو کے قدیم اخباروں کا سرمایہ بھی جمع ہو گیا ہے، اردو کے ہر دور کے شاعروں، مصنفوں اور ادیبوں کے مرقعے بھی رکھے ہیں، اردو کی تاریخ کے نقشے بھی نہایت خوبصورتی سے بنائے ہیں،

مدرسۂ نظامیہ

حیدرآباد میں علوم عربیہ کی ایک قدیم درسگاہ مدرسۂ نظامیہ ہے، جس کو مولانا انوار اللہ خاں صاحب نے آج سے چالیس پچاس برس پہلے قائم کیا تھا، آجکل اس کی نظامت مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی مفتی عدالت عالیہ کے ہاتھوں میں ہے، وزیر تعلیمات سرکار عالی نواب مہدی یار جنگ بہادر کی تحریک اور مفتی صاحب کی فرمائش سے میں نے اس مدرسہ کے اساتذۂ کرام اور طلبہ کے سامنے ڈیڑھ گھنٹہ تک علوم اسلامیہ اور عربی نصاب تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح و تجدید پر تقریر کی، علماء نے میرے مقصد سے اتفاق کیا، اور تحریک کو پسند فرمایا، ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً۔

سفر پونہ اور دکن کالج پونہ

پونہ میں میری کشش کا مرکز میرے قدیم فاضل دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر کی ذات گرامی ہے، اتنے دنوں میں پونہ بھی بہت کچھ بدل چکا ہے، جب میں وہاں دکن کالج میں ۱۹۱۳ء و ۱۹۱۴ء میں اسسٹنٹ پروفیسر تھا، وہاں ایک اردو ہائی اسکول تھا، یعنی وہ اسکول جہاں لڑکوں کو انگریزی علوم کے ساتھ اردو کی تعلیم دی جاتی ہے، اب یہ اردو ہائی اسکول، اردو ٹریننگ کالج ہو گیا ہے، اب اس کی خاص عمارت ہے، زمین ہے، مسجد ہے، مسلمان استاذوں کا اسٹاف ہے، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اردو کی تعلیم پہلے سے زیادہ ترقی پا رہی ہے، اور مسلمان اب اردو کے لیے پہلے سے زیادہ کوشاں ہیں، اس کالج کے ہال میں ایک شام کی پارٹی کے بعد میں نے "مسلمانوں کے حقوق" کے تحفظ پر نہیں، بلکہ خود مسلمانوں کے تحفظ پر تقریر کی، اور دکھایا کہ اسلام کے دشمن جو کچھ کر رہے ہیں، وہ تو کر رہے ہیں، مگر خود اسلام کے دوست اس کے ساتھ کیا کر رہے ہیں، اور "اسلامی کلچر" کو ہم خود اپنے ہاتھوں تباہ کر رہے ہیں، یا غیر تباہ کر رہے ہیں،

بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ

پونہ میں ہندوؤں کے دو ادارے دیکھے، ایک بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ جس کا مقصد قدیم

ہندوستان سے متعلق علوم وفنون وتاریخ کی تحقیقات ہے، اس کی اچھی خاصی عمارت ہے، کتب خانہ ہے، دفتر ہے، مہمان خانہ ہے، یہ مہمان خانہ سرکار آصفیہ کے تیس ہزار کے عطیہ سے بنا ہے، انگریز گورنمنٹ بھی اس کی سرپرستی کرتی ہے، دس بارہ برس سے یہاں بھارت کے مختلف نسخوں سے ایک صحیح نسخہ کی اشاعت کا کام ہو رہا ہے، بعض فارسی تاریخیں بھی اس کی طرف سے چھپی ہیں۔

بھارت اتہاس سمشودھک منڈل دوسرے ادارہ کا نام "بھارت اتہاس سمشودھک منڈل" ہے، اس کا مقصد دکن اور مہاراشٹر اور خاص طور سے سیواجی اور پیشواؤں کے تاریخی مواد کو جمع کرنا ہے، اس ادارہ نے بڑی کوشش سے سلاطین دکن کے فرامین، تصویریں، مرقعے، سکے، اور مرہٹہ سرداروں کی یادگاریں جمع کی ہیں، تاکہ دکن اور مہاراشٹر کی تاریخ لکھنے والوں کو ہر قسم کا سامان تحقیق ہاتھ آسکے، ایک مرہٹہ فاضل کو فارسی کے فرمانوں اور تحریروں کو پڑھتے دیکھ کر تعجب ہوا، تعجب اب ہے، ورنہ پہلے تو سارا فارسی دفتر ان ہی کے ہاتھوں میں تھا۔

سفر بمبئی بمبئی دس سال کے بعد جانا ہوا، اس عرصہ میں بمبئی بہت کچھ بدل چکا ہے، یہ عشرہ محرم کا زمانہ تھا، بمبئی کے مسلمان تعزیہ داری نہیں کرتے، یا بہت کم کرتے ہیں، ان کا دستور یہ ہے، کہ محرم کے دس دنوں میں ہر محلہ کے مسلمان مل کر راتوں کو مجلس کرتے ہیں، سارے ہندوستان سے واعظ اور مقرر آتے ہیں اور ایک ایک محلہ میں دس راتوں یعنی پورے عشرۂ محرم میں محرم کے واقعات اور اس کے تعلق سے مواعظ بیان کرتے ہیں، گو یہ مجلسیں بھی اصلاح کے قابل ہیں، پھر بھی یہ دیکھ کر خوشی ہوئی، کہ اہل بدعت کے بجائے اہل سنت علماء کا اثر بھی بمبئی میں پھیل رہا ہے۔

اسماعیل کالج بمبئی سے پندرہ میل دور دس برس سے اسماعیل کالج قائم ہے، اس کے پرنسپل ہمارے دوست ڈاکٹر بدل الرحمٰن صاحب ہیں، میں نے اس کالج کو آج سے دس برس پہلے اس وقت دیکھا تھا جب اس کا آغاز تھا، یہ دیکھ کر مسرت ہوئی، کہ کالج کے احاطہ میں اب ایک مسجد بھی بن گئی ہے، جس میں مسلمان طلبہ پانچ وقت نماز پڑھتے ہیں، میں جمعہ کی نماز میں شریک ہوا، ایک طالب علم ہی نے خطبہ پڑھا، نماز کے بعد طلبہ کے اصرار پر میں نے ایک چھوٹی سی تقریر کی، جس میں ان کو یہ بتایا ہے، کہ دنیا کی قوموں نے جب کبھی ترقی کی ہے، تو اس کی

قوت پرواز لے دو۲ ہی پر ہوتے ہیں، ایمان اور عمل، جب تک ہمارے نوجوان ان دونوں سے بے پروا ہیں، وہ ترقی کا خواب نہیں دیکھ سکتے، گویا آیت کریمہ یا ایھا الذین اٰمنوا اٰمنوا (اے ایمان والو! ایمان لاؤ) کی تفسیر اور اقبال مرحوم کے اس شعر کی تشریح کی،

ع یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم،

اسی کالج کے ہال میں دوسری تقریر اردو زبان کی تاریخ پر ہوئی، جو ایک گھنٹہ تک جاری رہی، اس میں تفصیل کے ساتھ اردو کی جائے پیدائش سندھ، پنجاب، اور گجرات کا بیان ہوا، اور دکن اور گجرات میں شروع سے آج تک اس زبان کے لیے جو کچھ ہوا، اس پر مختصر تبصرہ کیا گیا، اور بتایا گیا، کہ یہ کالج احاطۂ بمبئی میں اردو کی خدمت کا کام کیونکر کر سکتا ہے۔

پروفیسر نجیب اشرف ندوی
اور
اشاعت اردو

احاطۂ بمبئی کی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہمارے عزیز پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی ہیں، عزیز موصوف پوری دلچسپی اور کوشش سے بمبئی اور مضافات بمبئی میں اس زبان کے پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں، اور اس وقت تک اطراف میں اردو کے بارہ۱۲ اسکول چلا رہے ہیں، اور بالغوں کی تعلیم کے لیے مستعدی سے کام کر رہے ہیں، اس کے اثرات دور دور تک پھیل رہے ہیں، یہاں تک کہ گوا کے قریب ساونت باڑی میں اردو کا ایک خاص اسکول جس میں دینیات و اسلامیات کی تعلیم بھی ہوتی ہے، دو۲ دردمند بھائیوں کی مخلصانہ محنت سے جن میں سے ایک انجنیر اور دوسرے ڈاکٹر ہیں، بڑی خوبی سے چل رہا ہے،

انجمن اسلام بمبئی میں
تقریر،

انجمن اسلام بمبئی میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے ایک شاندار جلسہ ہوا، جس میں میں نے اردو زبان کی وسعت اور عالمگیری پر ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر کی، اس تقریر کے بعض بعض حصے بمبئی کے اخباروں میں چھپ چکے ہیں، آپ یہ سن کر تعجب کریں گے، کہ بمبئی میں جو مرہٹی، گجراتی اور کنڑی بولیوں کا صدر مقام ہے، اس وقت اردو کے چالیس۴۰ اخبار اور رسالے نکلتے ہیں، جن میں چودہ۱۴ روزانہ اخبار ہیں۔

روزنامہ ہندوستان

حکیم مولوی حبیب احمد صاحب ندوی اور مولوی رئیس احمد صاحب جعفری ندوی نے اپنے روزنامہ

ہندوستان کے دفتر میں دوستوں کو چائے پر مدعو کیا، چائے کے بعد مولوی رئیس احمد صاحب نے دارالعلوم ندوہ کی موجودہ ضرورتوں کی طرف متوجہ کیا، آخر میں میں نے عربی مدرسوں کی ضرورت پر ایک مختصر تقریر کی۔

مولانا فضل حق رام پوری افسوس ہے، کہ پچھلے دو مہینوں میں ہماری قدیم تعلیم کے خزانہ کے دو انمول موتی کھو گیے، ایک مولانا فضل حق صاحب رام پوری جو مدرسۂ عالیہ رام پور میں مدرس اعلیٰ تھے، موصوف نے نصف صدی تک علوم اسلامیہ کی تدریس کا فرض انجام دیا تھا، ۸۱ برس کی عمر میں دار فانی کو الوداع کہا۔

مولانا معین الدین اجمیری ۱۰ محرم ۱۳۵۹ھ کی دوپہر کو مولانا معین الدین اجمیری نے جن کو سلسلۂ خیرآباد کا خاتم کہنا چاہیے، وفات پائی، مرحوم مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور عمر بھر درس و تدریس میں گذار دی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے احاطۂ مزار میں شاہجہانی مسجد کے زیر سایہ فضل و کمال کا یہ خزانہ زیر خاک کیا گیا، رحمہما اللہ تعالیٰ، میر احدی اجمیری نے خوب کہا:

ہے سنہ تیرہ سو انسٹھ، عشرۂ ماہ محرم ہے　　ہمیں اس ابتدائی ماہ میں بے انتہا غم ہے
امام الوقت مولانا معین الدین کی رحلت ہے　　بپا اجمیر میں امسال اف دوہرا محرم ہے

(معارف ماہ مارچ ۱۹۴۰ء)

(۴)

نیشنل اسکول مولانا شبلی مرحوم نے آج سے ستاون ۵۷ برس پہلے ۱۸۸۳ء میں اپنے وطن اعظم گڈھ میں انگریزی کا ایک اسکول اس غرض سے قائم کیا تھا، کہ اس ضلع کے لوگ جو نئی تعلیم سے نا آشنائے محض تھے، ان کے لیے گھر بیٹھے تعلیم کا سامان ہو، اس وقت تک اعظم گڈھ میں صرف ایک عیسائی مشن اسکول کے سوا کوئی دوسرا اسکول نہ تھا، مولانا نے اپنے اس اسکول کا نام نیشنل رکھا تھا، اور اسی نام سے انہوں نے اپنے مکتوبات اور بعض قصیدوں میں اس کا ذکر کیا ہے، جب تک مولانا نے ندوہ کو ہاتھ میں نہیں لیا تھا، ان کی ہر قسم کی تعلیمی کوششوں کا یہ مرکز تھا، اس کے لیے کثیر رقمیں اپنے پاس سے، اپنے دوستوں سے، اپنے عزیزوں سے اور اپنے خاندان کے بزرگوں سے حاصل کیں، یہاں تک کہ یہ ہائی اسکول کے درجہ تک پہنچ گیا۔

مولانا جب اور طرف متوجہ ہوئے تو یہ اسکول بعض ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گیا، جنھوں نے

اس کی سیرت تو سیرت اس کی صورت تک مسخ کر ڈالی، اور اس کا نام جارج ہائی اسکول رکھ دیا۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں اپنے بھائی مولوی محمد اسحٰق صاحب وکیل کی وفات کے بعد جب مولانا نے پھر اعظم گڈھ میں قیام کیا، تو پھر اس اسکول کو اپنے ہاتھ میں لیا، مگر ابھی اس تبدیلی، تغیر و اصلاح پر چند ہی مہینے گذرے تھے، کہ نومبر سنہ ۱۹۱۴ء میں انہوں نے وفات پائی۔ اس دوہرے سانحہ نے ان کے پس ماندوں میں اس اسکول کی ترقی کے لیے ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا، اور یہ اسکول جو ہائی اسکول سے بھی نیچے گر چکا تھا، سنبھل کر پھر آگے بڑھا، اور اس کا نام شبلی جارج ہائی اسکول رکھا گیا، اور اب اسی نام سے روشناس ہے،

اس وقت سے اسکول کا کام چند ایسے مخلص کارکنوں کے ہاتھوں میں تھا، جنھوں نے پوری محنت اور خلوص سے اس کی ترقی کے لیے کام کیا، اس کی شاندار عمارت بنوائی، بہت سے نئے کمروں کا اضافہ کیا، بعض نئے کلاس کھلے، اسٹاف بھی قابل، محنتی اور اخلاص شعار جمع ہو گیا، جس نے اپنی انتھک کوششوں سے اسکول کے نام کو روشن کیا، اور افسران تعلیم کی نگاہوں میں اس کی یہ وقعت بڑھائی کہ اب یہ ہائی اسکول سے بڑھ کر انٹرمیڈیٹ کالج بن رہا ہے۔

اس اسکول کے ترقی کر کے کالج بن جانے کے ولولہ سے جو اس شہر میں تعلیمی ترقی کا پہلا نمونہ ہے، پورے ضلع میں خوشی و مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی ہے، مولانا مسعود علی ندوی کی پرجوش رہنمائی میں شہر کے ممتاز وکلا، اور کارکن پورے ضلع کا دورہ کر رہے ہیں، اور اس بات کا عہد کیے ہوئے ہیں، کہ جولائی تک اس کالج کی عمارت انشاء اللہ بن کر تیار ہو جائے گی۔

شبلی کالج کی نئی عمارت کے سنگ بنیاد کا جلسہ

اس سلسلہ میں ۳۰؍ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کو کالج کی نئی عمارت کے سنگ بنیاد رکھنے کی تاریخ مقرر ہوئی، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جن کو مولانا شبلی مرحوم کے علمی و تعلیمی کارناموں سے دلچسپی بلکہ عشق ہے، ان کو اس کے لیے مدعو کیا گیا، اور وہ علی گڈھ سے زحمت فرما کر اعظم گڈھ تشریف لائے، اور اپنے مبارک ہاتھوں سے اس نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا، اس سنگ بنیاد کے جلسہ میں موثر نظمیں پڑھی اور دلنشیں تقریریں کی گئیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی آمد، اس سلسلہ میں مولانا ممدوح نے تین روز دار المصنفین میں قیام فرمایا، اور دار المصنفین میں جو نئی تعمیراتی ترقیاں ہوئی ہیں، ان کو ملاحظہ فرمایا، باہر سے آنے والے دوسرے مہمانوں میں مولانا عبدالباری صاحب ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ تھے، جن کو جامعہ عثمانیہ نے خاص اس غرض سے اعظم گڈھ بھیجا تھا، مولوی اکرام اللہ خاں ندوی لٹریری اسسٹنٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ اور مولوی حافظ محمد عمران خاں ندوی ازہری نائب مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ تھے

پروفیسر مارگولیوتھ انگلستان کے مشہور مستشرق پروفیسر مارگولیوتھ نے ۸۲ برس کی عمر میں وفات پائی، یہ نسلاً یہودی تھے، پھر عیسائی ہوگئے تھے، اس سے ظاہر ہے کہ ان کو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ سے اکہری نہیں، بلکہ دوہری عداوت تھی، ان کی عمر بھر کا سرمایہ اسلام پر اور پیغمبر اسلامؐ پر مہذب غارت گری ہے، اور یہی سبب ہے کہ خود یورپ کے سنجیدہ طبقہ میں بھی وہ احترام کی نظر سے نہیں دیکھے گئے، ان کی سب سے بڑی کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، جس کو دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم بے چین ہوگئے، اور اپنی سیرت نبوی کی اسکیم کی بنیاد ڈالی، جس نے شائع ہو کر بحمد اللہ ملک میں سیرت پاک کی تالیف و تدوین اور نشر و اشاعت کا عام ذوق پیدا کر دیا،

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

پچھلے پرچہ میں مدرسہ نظامیہ حیدرآباد کی عمر قیاس سے چالیس پچاس سال لکھی گئی تھی، مگر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدرآباد سے مطلع فرماتے ہیں، کہ اس کی عمر کا یہ ۶۵ واں سال ہے، اللّٰھم زد فزد۔

مولانا بدر الدین استاد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا جو مضمون آثار کشمیر پر پچھلے معارف میں چھپا ہے، اس میں لکھا ہے کہ ان کو کشمیر میں اورنگ زیب عالمگیر کی کوئی یادگار نظر نہیں آئی، ڈاکٹر صاحب ممدوح لکھتے ہیں کہ مولانا نے وہاں جمعہ کی نماز جس جامع مسجد میں پڑھی ہوگی، کشمیر میں وہی عالمگیر کی یادگار ہے، اور بہت بڑی یادگار، جس کو دیکھ کر اس مذہب پرست بادشاہ کی بے اختیار یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

گذشتہ مارچ میں دکن سے لوٹ کر مجھے لاہور و پشاور و بہاولپور کا سفر کرنا پڑا، اور بعض بعض مقامات

پر تقریریں بھی کیں، موقع ملا، تو اگلے پرچہ میں اس سفر کی تفصیل آپ کی نظر سے گذرے گی۔

(معارف ماہ اپریل ۱۹۴۰ء)

(۵)

گذشتہ مارچ میں ابھی دکن کے سفر سے کمر کھولی تھی، کہ شمال کے سفر کو آمادہ ہونا پڑا، طلب دو تعلیمی مرکزوں سے تھی، اسلامیہ کالج پشاور، اور صادق ایجرٹن کالج بھاول پور، لاہور ان دونوں سفروں کا سنگم تھا، ۷؍ مارچ سے سفر کا آغاز ہوا، اور ۲۳؍ کو ختم ہوا، یہ دن لکھنؤ، پشاور، لاہور، بھاول پور اور امرتسر میں گذرے۔

لاہور سے آگے بڑھنے کے ساتھ ایک نئے تمدن، نئی زبان اور نئے لباس سے سابقہ پڑنے لگتا ہے، لیکن اٹک سے پار ہونے کے ساتھ تو ہندوستان کی دنیا ہی بدل جاتی ہے، اور ہمالیہ کا سایہ دور سے دکھائی دینے لگتا ہے، پتھریلی زمین اور جمی ہوئی مٹی کے ٹیلے اور دریا پر دریا ملتے ہیں، خشک و تر میووں کے ڈھیر ہر جگہ نظر آتے ہیں، مضبوط اور قوی ہیکل انسان ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں، مگر ان مضبوط سینوں میں مہمانوں اور نو واردوں کے لیے موم سے نرم دل ہوتے ہیں۔

سفر پشاور لاہور سے ۸؍ مارچ کو صبح ۸ بجے چل کر رات کو ۸ بجے گاڑی پشاور پہنچی، اسلامیہ کالج کے نائب سکریٹری اور ندوی احباب اسٹیشن پر موجود تھے، چونکہ کالج کا بلاوا آیا تھا، اس لیے کالج ہی کے احاطہ میں مولوی نور الحق صاحب ندوی ازہری ناظم دینیات کالج کے بنگلہ میں اترا، پشاور کئی بار جا چکا ہوں، اور کالج کے اساتذہ کی خدمت میں بھی پہلے سے نیاز حاصل تھا، اس لیے ۹-۱۰-۱۱ تین دن احباب کی ملاقات، دوستوں کی بات چیت، علمی سوال و جواب، اسلامیہ کالج کے شعبۂ دینیات و طب کی ترتیب نصاب، اور طلبہ اور عام مسلمانوں کے سامنے چند تقریروں میں گذرے۔

اسلامیہ کالج پشاور اسلامیہ کالج پشاور صوبہ سرحد کا واحد اسلامی کالج ہے، اور شہر پشاور سے چار میل دور باہر واقع ہے، بڑا احاطہ ہے، جس میں کالج کی عمارت، مختلف بورڈنگ، مسجد، کتب خانہ، استادوں کے بنگلے، اور دوسری عمارتیں ہیں، اور خود اس کی اچھی خاصی آبادی اور مستقل چہل

پہل ہے، تین سو طلبہ تعلیم پاتے ہیں،

تقریب یہ تھی کہ سرکار نظام نے کالج کو ابھی حال میں ڈیڑھ لاکھ کی رقم اس غرض سے دی تھی، کہ وہاں عثمانیہ بورڈنگ ہاؤس قائم کیا جائے، اس بورڈنگ کی رسم افتتاح ادا کرنے کے لیے سر اکبر حیدری صدر اعظم سرکار نظام تشریف لا رہے تھے، اسی موقع پر کالج نے اپنی اس تجویز کے لیے یہی تاریخ مقرر کی، کہ کالج کے ماتحت ایک ایسا شعبہ کھولا جائے، جس میں بعض پڑھے لکھے نوجوانوں کو مختصر عربی، دینیات اور طب کی تعلیم دی جائے، جو گاؤں میں پھیل کر اور علاج و معالجہ کے ذریعہ اپنی روزی کمائیں، اور مسلمانوں کی مذہبی خدمت کریں۔

۹ر مارچ کی صبح کو کالج کی مسجد میں طلبہ اور اساتذہ کے سامنے "اسلامی کالجوں کے اصلی خصوصیات" پر تقریر کی، اس کے بعد کالج کے میدان میں آکر کالج کا علم لہرایا، اس موقع پر اس موقع کے مناسب تھوڑی تقریر کی۔

اس میں پوچھا کہ اگر کسی انجنیرنگ کالج میں انجنیرنگ کی اور طبی کالج میں طب کی تعلیم نہ ہو تو کیا اس کو انجنیرنگ کالج یا طبی کالج کہنا جھوٹ نہ ہوگا، اسی طرح اگر کسی اسلامی کالج یا اسلامی یونیورسٹی میں اسلام کی علمی و عملی تعلیم نہ ہو، تو اس کو نام کا فریب کیوں نہ کہا جائے۔

۱۰ر مارچ کا دن مجوزہ شعبۂ دینیات کے نصاب کی ترتیب میں گذرا، اور شب کو ۹ بجے شہر کے مسلمانوں کے سامنے سیرت کے موضوع پر ایک تقریر ہوئی، جس کے آخر میں مسلمانوں کو "خیر الامم" کا جو لقب دربار الٰہی سے ملا ہے، اس کی تشریح کی گئی، اور بتایا گیا، کہ دنیا میں اور اس ملک میں ہر مسلمان کو یقین رکھنا چاہیے، کہ توحید کے علم بردار، قرآن پاک کے حامل اور خیر الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کی حیثیت سے دنیا میں ان سے اونچا اور ان سے بہتر کوئی نہیں،

خودی کا یہ راز درحقیقت قوموں کی زندگی کا راز ہے۔

۱۱ر کو ظہر کی نماز کے بعد طلبہ اور اساتذہ کا ایک اور مجمع ہوا، جس میں تقریر کا عنوان یہ تھا کہ سب سے بڑی اسلامی اکثریت والے صوبہ کے نوجوانوں کی حیثیت سے اس کالج کے نوجوان مسلمانوں

کا فرض کیا ہونا چاہیے ، ان کو اپنے ایمان وعمل میں اتنا آگے بڑھنا چاہیے کہ سارے ہندوستان کے مسلمان ان کے پیچھے چلیں۔

لاہور میں

اسی تاریخ کو شام کو پشاور سے چلا اور ۱۲ر کی صبح کو لاہور پہنچا، خواجہ عبدالوحید صاحب سکریٹری اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ ان کے مکان آیا، صرف ۲۴ گھنٹے قیام رہا، خدام الدین کے حلقۂ درس کے بعض احباب نے ملاقات اور گفتگو کا شرف بخشا، ڈاکٹر سید عبداللہ چغتائی مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، مولانا داؤد صاحب غزنوی، اور بہت سے احباب علم ودین، میزبان کے دسترخوان پر تھے، دیر تک علمی وقومی مسئلوں پر مبادلۂ خیال رہا، نماز ظہر کے بعد جلسہ منتشر ہوا،

عصر کے وقت پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے گھر پر لاہور کے بہت سے اہل علم وادب چائے کی دعوت پر جمع ہوئے، اور دیر تک علمی وادبی گفتگو کے چرچے رہے، پروفیسر سید عبداللہ اس وقت پنجاب کے سنجیدہ فکر نوجوانوں میں خاص ذکر کے قابل ہیں، اور امید ہے کہ ان کی تصنیفات سے پنجاب کی سنجیدہ نگاری کا پایہ بلند ہوگا، مغرب کی نماز پر اس جلسہ کا خاتمہ ہوا۔

رات کا کھانا پرانے دوست پروفیسر صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے یہاں تھا، مجلس میں ڈاکٹر تاثیر پرنسپل، اسلامیہ کالج امرتسر اور ایک اور نوجوان شاعر کے سبب سے جن کا نام یاد نہیں رہا، بڑی دلچسپی رہی، یعنی طعام کی لذت کے ساتھ کلام کی لذت بھی حاصل ہوئی، نوجوان شاعر نے اپنی نظمیں سادہ لہجہ میں سنائیں، ان کے کلام میں جوش اور گرمی تھی، لیکن طرز ادا اور طریق تعبیر انگریزی تھا، پھر پروفیسر تاثیر نے اپنا ایک "نالۂ نیم شبی" فارسی میں سنایا، صوفی تبسم صاحب نے اپنا صوفیانہ کلام پڑھا، اور آخر میں ایک غیر شاعر نے بھی دو چار شعر اپنے پڑھے، اس سخن درازی میں لیلائے شب کی زلفیں تابکمر پہنچ گئیں،

بھاولپور کا سفر

۱۳ر کی صبح کو بھاولپور کی روانگی ہوئی، یہ بھاولپور کو میرا پہلا سفر تھا، گو بھاولپور ٹھہرے بغیر، سفر کابل سے واپسی میں ادھر سے ایک دفعہ گذر چکا تھا، لاہور سے چند اسٹیشنوں کے بعد صحرائے سندھ کے گرد وغبار نے گاڑی کی فضا کو مکدر کر دیا، اس قدر گرد وغبار کی ارزانی شاید ہی کسی اور لائن میں ہو، تین بجے ملتان آیا، ستلج کا دریا گذرا، اور پھر بھاولپور کا شہر آیا، اسٹیشن پر افسران ومتعلقان تعلیم

موجود تھے، عباس منزل میں جو سرکاری مہمان خانہ ہے، قیام ہوا۔

صادق ایجرٹن کالج بہاول پور میں انگریزی کا ایک کالج صادق ایجرٹن کالج" ہے، اور دوسرا عربی کا سرکاری مدرسہ جامعہ عباسیہ ہے، جو ۱۹۳۵ء سے چل رہا ہے، اس مدرسہ کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس کا نصاب تعلیم ندوۃ العلماء کے اصول پر بنایا گیا ہے، یعنی معقولات کا بڑا حصہ خارج کر دیا گیا ہے،، قرآن پاک کے علوم بڑھا دیئے گئے ہیں، اور میٹرک تک انگریزی کا بھی اضافہ ہے۔

موجودہ وزیر تعلیم عالی مرتبت میجر شمس الدین محمد صاحب نے جب سے محکمۂ تعلیم کی عنان اپنے ہاتھ میں لی ہے، تعلیم کی اصلاح کے مسئلہ پر خاص توجہ مبذول فرمائی ہے، اسی سلسلہ میں جامعہ عباسیہ کی اصلاح کا خیال بھی ان کے سامنے تھا، اور اس کے لیے میری یاد فرمائی ایک سال سے جاری تھی، اس کا موقع اس سفر میں اس طرح پیش آیا کہ ۱۴ر مارچ کو صادق ایجرٹن کالج میں خطبہ اسناد (کانووکیشن ایڈریس) کے لیے بلایا گیا، جس کو میں نے قبول کر لیا، کہ "یک کرشمہ دو کار" تھا۔

عباس منزل پہنچ کر رات کو ۱۱ بجے تک خطبہ تیار کیا، ۱۴ر کو ۱۱ بجے دن کو صادق لائبریری ہال میں عطائے اسناد کا جلسہ تھا، اکثر وزرائے حکام، عمائد، اساتذہ اور تلامذہ موجود تھے، مسٹر اینڈرسن ریونیو منسٹر صدر جلسہ تھے، عطائے سند کے بعد میں نے اردو میں اپنا خطبہ پڑھا، جو اپریل کے "الندوہ" لکھنؤ میں شائع ہو گیا ہے، اس خطبہ کا ایک فقرہ عام طور پر زبانوں پر رہ گیا:

"تعلیم کا صحیح مقصد انسان کو بتانا نہیں، انسان کو بنانا ہے۔"

دوسرے دن رات کو میری تقریر کے لیے اسی ہال میں ایک اور عظیم الشان جلسہ ہوا، جس میں علماء، حکماء، حکام، معززین، کالج کے پروفیسر اور طلبہ شریک تھے، تقریر کا موضوع "خصائص اسلامی" تھا، ڈیڑھ گھنٹہ میں یہ تقریر ختم ہوئی، اور ایسا نظر آتا تھا کہ یہ دلوں میں گھر کر رہی ہے، مگر آج کل کی تقریروں کی تاثیر ہی کیا، اس کی اصلیت انسانی گراموفون سے زیادہ نہیں، اور ان کا حاصل "ایک ولولہ" کے سوا کچھ اور نہیں،

جمعہ کے دن جامع مسجد میں فضائل نبویؐ پر ایک وعظ ہوا، جس میں مسلمانوں کو اس نسبت نبویؐ کے شرف کی بنا پر اشرف الامم بتا کر، ان کو خیر الامم بننے کا شوق دلایا گیا، اور اولاد کو اسی رنگ میں تعلیم

دینے کا مشورہ دیا گیا، ہم کو تو مسلمانوں کی مرعوبیت دیکھ کر یہ ڈر لگنے لگا ہے، کہ وہ اپنی خیرالامی کے عقیدہ کو جو ان کے جسم کا خون ہے، کہیں دلوں سے نکال نہ بیٹھیں، جس کے بعد ان کو ہندوستان کے میدان سے شکست دے دینا ہر ایک کے لیے آسان ہو جائے گا۔

وسط جولائی تک اڈیٹر معارف کا قیام دار المصنفین سے باہر رہے گا، اس لیے اس درمیان میں ذاتی خطوط کے علاوہ "معارف" سے متعلق اور دوسری دفتری خط و کتابت براہ راست دفتر دار المصنفین سے کی جائے، تاکہ خطوط کے جواب میں تاخیر نہ ہو۔

(معارف ماہ مئی سنہ ۱۹۴۰ء)

(۶)

مولانا شبلی مرحوم کو پیشین گوئیوں کا دعویٰ نہ تھا، مگر ان کے نثر و نظم کے ذخیرہ میں اتنی پیشین گوئیاں ہیں، کہ ان کو جمع کیا جائے، تو ان کی خاصی تعداد ہو جائے، یورپ کے ملکوں کی طرف اشارہ کرکے وہ کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے، کہ ایک وقت آئے گا، جب یہ شیشے خود ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے، تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ دنیا کی قوموں کے حالات نگاہ کے سامنے رکھنے سے یہ بات کتنی صاف نظر آتی ہے، کہ ہر قوم کو دنیا میں اپنے وجود کو قائم رکھنے کے کتنی جدوجہد کتنی محنت، اور کتنے صرف جان و مال کی ضرورت پیش آتی ہے، یہ راز قرآن پاک کے ہر صفحہ میں نمایاں ہے، يُجَاهِدُوْنَ بِاَنْفُسِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ، اور اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ، وغیرہ سیکڑوں آیتیں ہیں، جو بتاتی ہیں کہ نفس اور مال کا مجاہدہ کامیابی کی پہلی شرط ہے، جس قوم نے اس شرط کو پورا کیا، وہی کامیابی کے میدان میں سب سے آگے نکلی۔

میں نے ایک دفعہ سنہ ۱۹۲۶ء میں خلافت کانفرنس دہلی کے صدارت نامہ میں جو جامع مسجد دہلی اور لال قلعہ کے درمیان والے میدان میں منعقد ہوئی تھی، یہ کہا تھا، کہ اگر شاہجہاں کی طرح لال قلعہ کے تخت طاؤس پر بیٹھنے کی ہوس ہے، تو پہلے بابر کی طرح بارہ برس ترکستان و افغانستان کے پہاڑوں سے سر ٹکراؤ، بدر و حنین کے بغیر فتوحات فاروقی سے لطف اٹھانے کا خیال خواب شیریں سے زیادہ نہیں۔

دنیا تو جدھر جا رہی ہے، جا رہی ہے، سوال یہ ہے، کہ مسلمان عیش و آرام کے بستر پر، اوج و اقبال کی چوٹی پر، چڑھنے کا جو خواب دیکھ رہے ہیں، وہ کہاں تک پورا ہو سکتا ہے، تغافل کی سرمستی، جان و مال کا بخل، عزم و ہمت کا فقدان، اور زندگی کے مقصد اعلیٰ سے محرومی، ہماری ساری جد و جہد کو ناکام بنا رہی ہے، ظاہر میں نظر آتا ہے کہ ہم دوڑ رہے ہیں، حالانکہ ہم اپنی جگہ کھڑے ہیں، اور سمجھ رہے ہیں، کہ دوڑ رہے ہیں، کیونکہ ہم دوڑ کی گفتگو اور دوڑ کی سمت متعین کرنے میں پوری طرح مصروف ہیں۔

سب جانتے ہیں، کہ اسلام نے فنون لطیفہ کی ہمت افزائی نہیں کی ہے، اس پر کتنے بے خبروں نے یہ کہا ہے کہ اسلام فنون لطیفہ کا دشمن ہے، اس نے زندگی کے تکلفات، تصاویر، اور عریاں شہوانی جذبات کی شاعری کو ناپسند کیا ہے، لیکن اس مسئلہ کو اس حقیقت کی نظر سے دیکھئے، کہ یہ اس قوم کا نظریہ ہے، جو جد و جہد اور سعی پیہم کے فلسفہ پر ایمان رکھتی ہے، اور جو حسن نظر اور تماشائے منظر کی دلدادہ نہیں، اور فنون لطیفہ کی تاریخ بتاتی ہے، کہ وہ قوموں کی جسمانی جد و جہد اور قلبی طمانیت و سکون کے بجائے ذہنی تعیش، اور عقلی لطف انگیزی کے زمانہ میں ترقی پاتی ہے، کسی قوم میں ان کا عروج اس کے دوڑ دھوپ کے عہد کی نہیں، بلکہ اس کے توقف اور سیر و تفریح کے عہد کی علامت ہے، اس لیے فنون لطیفہ اور ان کی ترقی کے لیے ساری محنت اور جان و مال کا صرف قوم کی صحت مزاج کی نہیں بلکہ بیماری کی نشانی ہے۔

زندگی قوت کا نام ہے، جو قوم قوت سے محروم ہے، وہ زندگی سے محروم ہے، اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ (دشمنوں سے مقابلہ کے لیے جو قوت تم سے ہو سکے وہ تیار رکھو) کا قرآنی فلسفہ اسی تعلیم کی طرف اشارہ کرتا ہے، اگلے مفسروں نے اپنے زمانے کی حالت کے مطابق قوت کی تفسیر تیراندازی کی مشق سے کی تھی، مگر قوت کی یہ تشریح زمانہ کی حالت کے لحاظ سے بدلتی رہے گی، اور قرآن پاک کے لفظ کا عموم اپنی وسعت کے دامن میں ہر اس چیز کو سمیٹتا رہے گا، جس سے دشمنوں کی طاقت کا مقابلہ کیا جا سکے۔

دوسرے اسلامی ملکوں کو چھوڑ کر صرف ہندوستان میں مسلمانوں کی ترقی و تنزل کے سارے مراتب کو پیش نظر رکھیے، تو معلوم ہوگا، کہ انھوں نے جیسے جیسے مجاہدانہ طور و طریق کو چھوڑ کر عیش و راحت کی زندگی سے خوگر ہونا شروع کیا، ہر میدان سے ان کا قدم ہٹتا گیا، اور بالآخر عیش و راحت کا وہ سامان بھی ان سے چھن گیا، جس کے

ہے وہ اپنا دین و دنیا سب کچھ قربان کر رہے تھے۔

ہم آج دوسری سربلند قوموں کی نقالی بھی کرتے ہیں، تو ان کے عیوب اور برائیوں میں کرتے ہیں، حالانکہ اگر ہم ان کی نقالی ہی کرنا چاہتے ہیں، تو ان کے ہنر اور محاسن میں کریں، ہم شراب خواری، قمار بازی، سود خواری، فیشن بازی، بے پردگی اور الحاد و بے دینی میں تقلید کرتے ہیں، اور انہی چیزوں کو ان کی قوت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کی قوت کا سرچشمہ ان کی جد و جہد، سعی و محنت، ایثار و قربانی، اتفاق ملی، اور حق کی خاطر ہر مصیبت کو جھیلنے کا ذوق ہے۔

بنی اسرائیل کو ایک بادشاہ کی تلاش تھی، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انتخاب کی دو شرطیں بتائیں، بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ، (علم اور جسم میں طاقت) فلسفۂ تاریخ اور نفسیات اجتماعی کی ہر تحقیق اس نتیجہ کو ظاہر کرے گی، کہ یہ دو طاقتیں ہر طاقت کی جڑ ہیں، اور شاہانہ اقتدار کی اصل بنیاد علم گو ہے علم کو شامل ہے، مگر سب سے بڑا علم ایمان ہے، ایمان کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے، یعنی چند غیر متزلزل حقیقتوں کا اقرار اور اس پر جماعتوں کا اعتقاد جازم اور اس اعتقاد جازم کے مطابق عمل اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، ذرا غور تو کیجئے، کہ آج مسلمانوں کے اندر ان کا کوئی متحدہ اعتقاد جازم باقی ہے، اور اس کے مطابق عمل کا جذبہ ان میں پیدا ہے۔

(معارف ماہ جون سنہ ۱۹۴۰ء)

(۷)

پچھلے مہینہ میں ملک میں کئی افسوس ناک موتیں ہوئیں، یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد جنہوں نے پورے ۳۷ برس تک ۔۔۔ دکن کے سیاسی و انتظامی معاملات کی سربراہی کی، وفات پائی، سنہ ۱۹۰۱ء میں وہ دولت آصفیہ کے پیش کار و صدر اعظم مقرر ہوئے، اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ برابر اس عہدہ پر فائز رہے، وہ راجہ ٹوڈرمل کی یادگار تھے، اصلی وطن لاہور اور پھر دہلی ہوا، اور یہاں سے آصف جاہ اول کے ساتھ ان کا خاندان دکن کو منتقل ہوا، اور ہمیشہ شاہان آصفیہ کے سیاسی و مالی مہمات میں کارپرداز رہا، مہاراجہ سرکشن پرشاد عربی، فارسی اور انگریزی تین زبانوں سے واقف تھے، اور تینوں میں باتیں کرتے

تھے۔ علمی مذاق صاف ستھرا تھا، شعر و سخن کا چسکا رکھتے تھے، تصوف میں وحدت الوجود کے عقیدہ کے نہایت سخت معتقد اور حامی تھے، اور اسی کو ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ سمجھتے تھے، سرکار رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بارگاہ میں کبھی کبھی عقیدت کا اظہار کرتے تھے، ان کی ایک نعت کو یہ شرف حاصل ہے، کہ مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کے پیچھے کتب خانہ شیخ الاسلام کی ایک دیوار پر آویزاں ہے۔ مرنج مرنجان، شریف، وضعدار اور پرانی شریفانہ خصوصیات کی اپنی آپ مثال تھے۔

حیدرآباد میں اودھ کے ایک مشہور و ممتاز مینائی خاندان کے فرد فرید نے بھی ہماری دنیائے فانی کو الوداع کہا، منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی کے خلف الرشید نواب اختر یار جنگ بہادر جنہوں نے دکن میں امیر مرحوم کی وفات کے بعد سے دکن کو شاہ دکن کی نوازشوں سے اپنا وطن بنا لیا تھا، اور معتمد امور مذہبی کی حیثیت سے سیکڑوں مفید خدمات انجام دیئے، اور ہر نیک کام کی امداد میں سبقت کی، اور اب چند سال سے پنشن پا کر عزت کی زندگی بسر کر رہے تھے، ہمیشہ کے لیے بزم حیات سے رخصت ہو گیے۔ اللہ تعالیٰ ان کے نیک خدمات کا نیک صلہ عنایت فرمائے۔

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنؤ داروغہ حیدر بخش کی مسجد کے نیچے کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان پر بیٹھا کرتے تھے، مگر خدا جانے کیا بات ہے، یہ چھوٹی سی معمولی حیثیت کی دکان نصف صدی تک لکھنؤ کے اہل علم و ادب کا مرکز بنی رہی، اور میں نے بھی چالیس برس اس چھوٹی سی دکان کو اسی طرح علم و ادب کے قدردانوں کا مرکز دیکھا، اس وقت جب لکھنؤ کا چوک بجلی اور گیس کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا، یہی دکان تھی جس پر پرانا مٹی کا چراغ جلا کرتا تھا، اور دنیا کو وضعداری کی روشنی دکھاتا تھا، افسوس کہ زبان و ادب کا یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی بجھ گیا۔

خواجہ صاحب گو خود غیر معمولی شاعر نہ تھے، مگر لکھنؤ کے بڑے بڑے شاعروں کی صحبت اٹھائے تھے، بحر مرحوم کے شاگرد تھے، نظم سے زیادہ نثر لکھتے تھے، اور لکھنؤ کی راجدھانی اور لکھنؤ کے جانِ عالم کی کہانی ان کا خاص موضوع تھا، لکھنؤ کی بول چال اور محاوروں اور روزمرہ کو بخوبی برتتے تھے، نیک مزاج، وضعدار اور قناعت پسند تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

بھوپال سے مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم۔ اے، سابق وزیر تعلیم و حال وزیر مالیات بھوپال کی وفات کی افسوسناک خبر آئی ہے، موصوف صاحب علم اور محبّ دین تھے، ان کے قلمی خدمات اور تحریری مجاہدات بھی خاص ذکر کے قابل ہیں، تاریخ ابو البشر، اثبات واجب الوجود اور دوسری مذہبی کتابیں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوئیں، عمر بھر علمی و تعلیمی کاموں کی مشغولیت کے باوجود اخیر عمر میں سرکار بھوپال کے مالیات کے صیغہ کو جس خوبی سے سنبھالا، دوست و دشمن ہر ایک نے اس کی تحسین کی، اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ رحمت سے اس علم و عمل کے مجسمہ کو سرفراز فرمائے،

فتنۂ نگار کے پچھلے ہنگامہ کو ابھی چند ہی سال گذرے ہوں گے، جب مہدی مرحوم کی زبان میں ایک "کافر ادب" نے اپنے دوبارہ ایمان اور توبہ و بازگشت کا اعلان کیا تھا، اور وعدہ کیا تھا کہ وہ آیندہ اس قسم کے مضامین لکھنے سے پرہیز کریں گے، اور اللہ تعالیٰ، رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ائمہ کے خلاف کچھ نہیں لکھیں گے، یہ وعدہ کم از کم ایک شریف انسان کا وعدہ تو ثابت ہوتا، لیکن افسوس کہ اس حیثیت سے بھی متوقع معیار پورا نہ ہو سکا، اس وعدہ کے کچھ ہی دنوں کے بعد سے وہ پھر اسی قسم کی جاہلانہ تحریروں کی اشاعت میں معروف ہیں، ماہ اب انتہا یہ ہے کہ جون نمبر میں علی الاعلان قرآن پاک کے من جانب اللہ اور کلام الٰہی اور وحی ربانی ہونے سے انکار کیا گیا ہے، قربان جائیے مسلمان نوجوانوں کی بے تعصبی کے کہ اس تحریر کا لکھنے والا اب تک مسلمان سمجھا جاتا ہے، اور شاید وہ خود بھی اپنے کو مسلمان سمجھنے پر مصر ہو، دیکھنا ہے کہ اس زمانہ کے بت شکن مجاہدین قلم اس نئی بنائے کفر و الحاد کے توڑنے میں کس کس طرح قوت صرف فرماتے ہیں، اور مسلمان اپنی دینی حمیت کا کیا ثبوت دیتے ہیں۔

(معارف ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء)

(۸)

مدیر نگار کی کیفیت علمی کا پردہ اب پہلی دفعہ فاش نہیں ہوا ہے، بلکہ اس سے پہلے بھی بار بار فاش

کیا جاتا رہا ہے، وہ کبھی مورخ، کبھی متکلم، کبھی ادیب اور کبھی شاعر بن کر لوگوں کے سامنے آتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پرانی شکل کے پہچاننے والے اب ان کی اس نئی شکل کو نہیں پہچان سکتے، مگر اہل نظر تاڑ جاتے ہیں، اور کہہ اٹھتے ہیں:

ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

ان کی ہمیشہ سے یہ حالت رہی ہے، کہ جب کبھی ان کو ہلدی کی کوئی گانٹھ ہاتھ آئی ہے، انھوں نے استفسارات میں پنساری کی دکان کھول دی ہے۔

مدیر نگار کی ہرزہ سرائیاں مدیر نگار کی ساری تصنیفات اور تحریریں ملک کے سامنے ہیں، ان میں سے کتنی ایسی ہیں، جو ان کی دماغی کاوشوں کی ملکیت ہیں، ان کی سنجیدہ تصنیفات میں صحابیات ایک تصنیف ہے، مدت کی بات ہے، لوگ بھول گئے ہوں گے، پھر یاد تازہ کی جاتی ہے، کہ یہ سراسر دارالمصنفین کی کتاب سیر الصحابیات کی غارت گری سے مرتب کی گئی ہے، تاریخ تمدن حدیث بھی آپ کے سرقات کی رہین منت ہے۔ ان کی ادبی تصنیفات میں شہاب کی سرگذشت بھی سنا ہے، کہ ایک انگریزی تصنیف کا پورا چربہ ہے، ان کے استفسارات کا اچھا خاصا الہلال مصر کے استفسارات کا سرقہ ہے، ان کے مسروقہ مضامین کی ایک فہرست سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے زمانہ میں چھپوائی تھی۔

ابھی حال میں تاریخ ہند پر رسالہ نگار میں ایک مسلسل کتاب نہایت فاضلانہ اور مدعیانہ تحقیق و تنقید کے ساتھ شائع کی گئی ہے، اور یہ باور کرانے کی ناجائز کوشش کی گئی ہے، کہ گویا یہ تحقیقات مدیر نگار کی ذاتی کاوش کا نتیجہ ہیں، اور اصل فارسی ماخذوں سے لکھی گئی ہے۔ حالانکہ یہ پورا سلسلہ الیٹ کی انگریزی کتاب تاریخ ہند کے اقتباسات یا تلخیصات کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے، اب جو چاہے، نگار کے صفحات کو کھول کر الیٹ کے صفحات سے مقابلہ کرکے اس عہد کے سب سے بڑے "دزدے بکف چراغ" کی دلاوری کو ملاحظہ کر سکتا ہے۔

یہ ہے وہ شخصیت عظمیٰ جو قرآن پاک اور کلامی مسائل پر مدعیانہ رائے دینے کی جرأت کرتی ہے، اور بخبر

نوجوانوں کو یہ یقین دلانا چاہتی ہے، کہ وہ جو کچھ لکھتی ہے، پورے ذمہ دارانہ غور و خوض کے بعد لکھتی ہے، حالانکہ اس کی سطحی واقفیت علم و فن کے ظاہری حروف و نقوش سے بھی آشنا نہیں، چہ جائے کہ قرآن پاک اور اسلام کے حقائق و اسرار کے فہم و استنباط کا دعویٰ.

اس علمی و ادبی شعبدہ باز نے اپنے مشہور خرافات کے بعد جس میں اس نے کمال تازہ تبحر و دانائیت سے قرآن پاک کو خدا کا نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام مان کر یہود و نصاریٰ کی سنی سنائی باتوں سے ماخوذ بتایا تھا، اب اپنے چند نادان دوستوں کے مشورہ سے اشاعرہ و معتزلہ کے کلامی مسائل کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے، یہ ہے ایک "کافر ادب" کی دوبارہ بزدلی کا مظاہرہ، افسوس کہ یہ شخص ایمان تو ایمان کفر میں بھی پورا پکا ثابت نہیں ہوتا.

بحث یہ نہیں کہ خدا کو متکلم اس لیے کہتے ہیں کہ صفت کلام اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، یا اس لیے کہتے ہیں، کہ وہ کلام کا خالق ہے، اور نہ یہ بحث ہے، کہ کلام الٰہی قدیم ہے یا حادث، علم کلام کی یہ دقیق بحثیں مدیر نگار کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں، بلکہ بحث یہ ہے کہ اس نے یہ کہا ہے.

> ”کلام مجید کو نہ میں کلام خداوندی سمجھتا ہوں، نہ الہام ربانی، بلکہ ایک انسان کا کلام جانتا ہوں، . . . . اس صورت میں الہام یا وحی سے مراد صرف وہ تاثرات ہوں گے، جو ایک انسان یا رسول کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں، اور جنھیں وہ مروجہ زبان میں نہایت کامیابی و خوش اسلوبی سے ادا کر دیتا ہے . . .
> . . . . کلام مجید میں اسرائیلیات کا حصہ کوئی تاریخی حیثیت نہیں رکھتا، اور نہ اسے کلام مجید میں درج ہونے سے صحیح کہا جا سکتا ہے، عہد نبویؐ میں اس قسم کی روایتیں توریت و انجیل کے حوالے سے یہود و نصاریٰ کی طرف سے عام طور پر بیان کی جاتی تھیں، اور چونکہ توریت و انجیل کے الہامی ہونے کا غلط خیال پہلے ہی سے قائم تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو محض اعتبار و بصیرت کے لیے بیان کر دیا، اس سے کوئی بحث نہیں، کہ وہ صحیح ہے یا غلط۔“

(نعوذ باللہ) یہ ہے موضوع بحث، جس سے اب مسلمانوں کے خوف سے کترانے کی خواہش کافرانہ بزدلی ہے، اور جس کا کوئی تعلق کلامی مسائل سے نہیں ہے،

حالانکہ مدیر نگار کے دعوے یہ ہیں:

(۱) کلام مجید رسول کا گھڑا ہوا کلام ہے، جو ان کی ذہانت و طباعی اور تاثرات کا نتیجہ ہے،

(۲) اس میں انبیائے بنی اسرائیل علیہم السلام کے قصے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود و نصاریٰ سے سن کر قرآن میں داخل کر لیے۔

تو گویا رسول اللہ نے قرآن کے خدا کے کلام الٰہی ہونے پر جس قدر تحدی کی ہے، وہ سب افترا علی اللہ ہے، کیا اس سے زیادہ جھوٹ کی کوئی مثال ہو سکتی ہے، اور کیا کسی مسلمان کی حمیت اسکو سننے کی تاب لا سکتی ہے عرب کے کفار اور موجودہ زمانہ کے نصاریٰ اس کے سوا اور کیا کہتے ہیں۔

(معارف ماہ اگست سنہ ۱۹۴۰ء)

(۹)

افسوس ہے کہ مصر کی ایک بہت بڑی ہستی سے دنیا خالی ہو گئی، عبدالحمید سعید بے مصر کے ان جواں مردوں میں تھے، جو مصر چھوڑ کر یورپ میں رہ پڑے تھے، اور یہ عہد کر لیا تھا، کہ جب تک مصر آزاد نہ ہو لے گا وہ مصر کی زمین میں قدم نہیں رکھیں گے۔ مصر اور انگلستان کے گذشتہ معاہدہ کے بعد وہ مصر واپس آئے تھے، میری اور ان کی ملاقات سنہ ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے دوسرے ارکان کے ساتھ اٹلی کے پایۂ تخت روم میں ہوئی تھی، وہ اپنے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے شوکت علی مرحوم سے ملتے جلتے تھے، اور انہی کی طرح قومی و مذہبی جوش و خروش سے بھرے ہوئے تھے، ایک بہت موٹا ڈنڈا جس کی موٹھ میں اہرام مصری کی شکل بنی ہوئی تھی، اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے، انہوں نے اس وقت تک شادی نہیں کی تھی، کہتے تھے، کہ غلاموں کی تعداد بڑھانے سے فائدہ کیا۔

وہ پہلے بالکل وطن پرور یا نیشنلسٹ تھے، مگر مصر آنے کے بعد ان کے حالات میں ایک نیا تغیر ہوا، انہوں نے عالمگیر اسلامی برادری (پین اسلامزم) کی تحریک مصر کے نوجوانوں میں شروع کی، انجمن **شبان المسلمین** کی بنیاد

ڈالی، اس کی شاخیں مصر کے اطراف میں پھیلائیں، اور اس کی کوشش کی، کہ دنیائے اسلام کے دوسرے حصوں میں اس کی شاخیں قائم ہوں، چنانچہ بمبئی میں اس کی ایک شاخ قائم ہے، چند سال ہوئے کہ انھوں نے اپنی محبت سے مصر کی شبان المسلمین کا ممبر خاکسار کو بھی بنایا، جامع ازہر کی طرف سے جو وفد ہندوستان آیا تھا، اس کے ایک رکن انجمن شبان المسلمین کے بھی نمایندہ تھے، اور مقصد یہ تھا کہ مصر و ہندوستان کی اسلامی برادریوں میں تعلقات مضبوط کیے جائیں۔

ان کی اس تحریک سے بڑا فائدہ یہ پہنچا، کہ مصری نوجوان جو غلط قسم کی وطن پروری یا قومیت پرستی کے سیلاب میں بہے جا رہے تھے، وہ پلٹے، اور اسلام کا سفینۂ نجات ان کو دکھائی دیا، وہ مصری پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے، انہوں نے اور ان کے رفقاء نے مصر کی حکومت پر بار بار زور ڈالا، کہ جب تک مصر کا سرکاری مذہب اسلام ہے، احکام اسلامی کے مخالف کوئی قانون اس پارلیمنٹ سے پاس نہیں ہو سکتا، ہندوستان کی طرح یورپ کی برکت سے دوسرے محکوم اسلامی ملکوں میں بھی "بدکاری" کو قانونی جواز کی سند مل گئی ہے، مرحوم پہلے شخص تھے، جنھوں نے اس کے خلاف پوری جد و جہد کی اور لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔

آجکل جب مسلمان عام طور سے وطن اور اسلام کے حقوق کے درمیان تطبیق کی کوئی راہ نہیں پا رہے ہیں، اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ایک کے حقوق کی پاسداری دوسرے کے حقوق کی ادائی سے دست کشی ہے، مرحوم کی شخصیت خاص طور سے اہمیت رکھتی تھی، اور مصر کے نوجوانوں کے درمیان صحیح رہنمائی کی کفیل تھی، اللہ تعالیٰ اس جوش عشق کے مجسمہ کو اپنی مغفرت سے بامراد کرے۔

ایران میں علمی سرگرمیاں،

ایران میں دوسری ترقیوں کے ساتھ علمی سرگرمیاں بھی بڑھ رہی ہیں، قدیم عربی و فارسی نسخوں کی تحقیق و تلاش اور تصحیح و تحشیہ کے بعد ان کی اشاعت کا شوق روز افزوں ہے، حال میں علامہ بیرونی کی مشہور کتاب "التفہیم فی صناعۃ التنجیم" نہایت خوبی سے چھاپی گئی ہے، حکیم نظامی گنجوی کا دیوان مع قصیدہ و غزل اور احوال و سوانح چھپا ہے، کلیم کا دیوان شائع ہوا ہے، رسائل بوعلی سینا، تاریخ بیہق مصیبت نامہ شیخ عطار، ذیل جامع تواریخ رشیدی، حافظ آبرو، تاریخ عالم آرائے عباسی، تاریخ بخاری، رسائل شیخ سہروردی، مقتول، تذکرۃ الشعراء نصرآبادی، دیوان حکیم سنائی، وغیرہ کتابیں بڑے اہتمام سے چھاپی گئی ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی مسرت کے قابل ہے، کہ جدید تالیفات میں سنجیدہ، خالص، اسلامی مذہبی لٹریچر کی تعداد بھی کم نہیں، زندگانی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ڈاکٹر محمد حسین ہیکل مصری کی عربی کتاب کا ترجمہ کردار و گفتار محمد صلعم (انگریزی سے ترجمہ) تاریخ حیات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم (کارلائل کے باب کا ترجمہ) عظمت محمد صلعم (عربی سے ترجمہ) وحی محمدی (سید رشید رضا کی کتاب کا ترجمہ) کلمات محمد (تالیف فارسی محمد جواد مشکور) زندگانی حضرت علی ؓ ابن ابی طالب (ترجمہ) اسرار حج تالیف ابراہیم رمضانی، تجوید القرآن تالیف محمد بن علی بن محمد حسینی، تاریخ القرآن مجتہد زنجانی، غزالی نامہ (سوانح و افکار امام غزالی) وغیرہ کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں، جن سے ایرانی نوجوان اہل قلم کی ذہنی سمت رفتار کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا شبلی مرحوم کو اپنی زندگی میں شاید اپنی کتاب شعر العجم کی اس مقبولیت کا خیال بھی نہ آیا ہوگا، ایک طرف وہ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کا آخری ماخذ بنے گی، اور دوسری طرف خود وہ ملک جس کی ادبی تاریخ اس میں لکھی گئی ہے، اس کی اتنی قدر کرے گا، کہ اس کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا اہتمام کرے گا، شعر العجم کی پانچویں جلد جو ان کی تحقیقات کا خلاصہ ہے، اور ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے، فارسی میں ترجمہ ہو کر طہران میں چھاپی گئی ہے، آقائی محمد تقی فخر داعی گیلانی نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔

مدیر نگار کے سرقات فتنہ نگار کی تردید و تجہیل میں متعدد مراسلے موصول ہوئے ہیں، لیکن ان کی اشاعت سے اس لیے پرہیز کیا گیا، کہ ان میں یہ سمجھا گیا، کہ اس فتنہ کا سر رشتہ کلامی بحثیں ہیں، حالانکہ اس کا منشا عیسائیوں اور آریوں کے اعتراضات کا سرقہ محض ہے، افسوس ہے کہ کفر میں بھی اجتہاد نہیں، سید عبد الرحمن صاحب ایم۔ اے رانچی سے لکھتے ہیں، کہ مدیر نگار کے سرقات کی بڑی فہرست ان کے پاس موجود ہے، جس کو وہ شاید کسی وقت بھیجیں گے۔

(معارف ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء)

(۱۰)

مولانا ابو بکر محمد شیث جونپوری

افسوس ہے کہ مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری نے دو ڈھائی برس کی سخت علالت کے بعد اپنے وطن جون پور میں ۲۳؍ شعبان ۱۳۵۹ھ مطابق ۲۶؍ ستمبر ۱۹۴۰ء کی رات کو ۳ بجے اس جہان فانی کو الوداع کہا، انا للہ و انا الیہ راجعون،

مرحوم جونپور کے ایک مشہور علمی خاندان کے فرد تھے، ان کے دادا مولانا سخاوت علی صاحب، مولانا شاہ عبد الحی صاحب دہلوی اور مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہید کے فیض یافتہ اور پورب میں توحید و سنت کے سب سے بڑے داعی، اور اس دور میں اسلامی علوم و فنون کے بہت بڑے مدرس تھے، جونپور میں بیٹھ کر تن تنہا سیکڑوں علمائے دین پیدا کیے، اور پورب کے خطہ میں ان کو جگہ جگہ پھیلا کر اس نازک موقع پر اسلام کی مورچہ بندی کی، وہ ہجرت کر کے بعد کو مدینہ منورہ چلے گیے تھے، اور وہیں وفات پائی، راقم کو بھی یہ فخر حاصل ہے، کہ اس کے دادا کے حقیقی بھائی انہی کی مجلس درس سے مستفیض تھے۔

مولانا کا پورا خاندان اس وقت سے اب تک علمائے دین کا خانوادہ ہے، جس کی سعی و کوشش سے پورب کی سرزمین کو بڑا فیض پہنچایا، مولانا مرحوم نے نیچے کی تعلیم گھر میں پا کر مولانا عبد اللہ صاحب غازیپوری سے مدرسہ احمدیہ آرہ جا کر علوم کی تحصیل کی، اور واپس آکر اپنے خاندانی مدرسہ کے اہتمام و انتظام کا اور ساتھ ہی ملک کے مختلف گوشوں میں جا کر ہدایت و ارشاد کا کام انجام دینا شروع کیا۔

موصوف سے میری ملاقات ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کے سلسلہ میں ہوئی، یہ ملاقات دوستی اور دوستی اتحاد کی اس منزل تک پہنچ گئی، جس کے بعد خیال کی دوئی کا کوئی مرتبہ نہیں رہتا، ایک دفعہ میں نے کہا اور انھوں نے مانا تھا، کہ ایک مذہب ہے، جس کے دو ہی پیرو ہیں، ایک وہ اور ایک میں، مقصود تقلید و عدم تقلید کے مسائل میں اعتدال سے تھا، اب جب ان کے مرنے سے دو ہفتے پہلے میں جونپور ان کی عیادت کو گیا، تو زبان سے ٹھیک طور پر بول نہ سکے، مگر غیر مفہوم آواز میں دو انگلیوں کو اٹھا کر اپنی طرف اور میری طرف اشارہ

کیا، کیا حسرت ناک منظر تھا، چلتے وقت کا سلام، اور فی امان اللہ اور فی حفظ اللہ کا ابدی پیام،

میں نے علماء میں ایسا شریف، ایسا نیک باطن، ایسا دور اندیش، ایسا فیاض، ایسا سادہ مزاج، اس پر ایسا مستقل مزاج، خوش اخلاق، شیریں گفتار، باغ و بہار، ایسا خشک اور ایسا تر آدمی نہیں دیکھا، ایسا متقی و پرہیزگار اور ساتھ ہی ایسا وسیع المشرب اور وسیع الاخلاق، وہ مذہبی تھے، اور سخت مذہبی، لیکن وہ بھی ان کو مانتے تھے جو مذہب کو نہیں مانتے تھے، وہ بے دینوں میں بھی ایسے ہی پیارے تھے، جیسے دینداروں میں، اور یہ ان کے حسن اخلاق کی بڑی کرامت تھی۔

وہ سنہ ۱۹۲۵ء سے لے کر سنہ ۱۹۴۰ء تک پندرہ ۱۵ برس مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں ناظم دینیات رہے، اس عرصہ میں کئی انقلاب آئے، مگر وہ اپنی جگہ پر تھے، ساتھ ہی انکے جبہ و دستار کی شان میں وہ بلندی رہی کہ کوٹ، پینٹ اور ہیٹ والے ان کے آگے جھک جھک جاتے تھے، مگر اس میل جول اور نرمی اور نرم خوئی میں حق کے خلاف کوئی بات سن کر چپ نہیں رہ سکتے تھے، غرض وہ اپنے علم و عمل میں پہاڑ اور اخلاق و کرم میں بہتے پانی کی طرح تھے۔

نئے تعلیم یافتوں بلکہ نئی تعلیم کے اصل مرکز میں مذہبی وقار کو سلامت رکھنا کوئی آسان کام نہیں، انھوں نے اس مشکل کام کو آسان کر دکھایا تھا، ان کا فضل و کمال کسی خاص علم و فن میں محدود نہ تھا، یہاں تک کہ حدیث و فقہ و تفسیر سے آگے بڑھ کر شعر و شاعری اور ریاضیات تک سے ان کو یکساں دلچسپی تھی، ان کی سادگی کو دیکھ کر کسی کو ان کی اس گہرائی کا یقین نہیں آتا تھا، اور ان کی اس گہرائی کو دیکھ کر ان کی اس سادگی پر سب کو تعجب ہوتا تھا، اس قدر سادہ اور اس قدر رنگین۔

وہ آکلے (کینسر) کے مرض میں جس سے ایک طرف کا پورا رخسار اور جبڑا آدھے منہ تک خالی ہو گیا تھا، دو ڈھائی برس تک ہر قسم کی مصیبت اور ہر طرح کی تکلیف جھیلتے رہے، اور اس پوری مدت میں ایک دفعہ بھی بے صبری کی آہ اور تکلیف کی کراہ ان کے منہ سے نہیں نکلی، کوئی نماز ترک نہیں ہوئی، اور صبر و شکر کا دامن ایک لمحہ کے لیے ہاتھ سے نہیں چھوٹا، دیکھنے والے ان کی حالت کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لاتے تھے، اور وہ ہاتھ اور زبان کے اشاروں سے صبر و استقلال کی نصیحت کرتے تھے۔

آہ کہ فضل وکمال کا یہ پیکر، حسن اخلاق اور شرافت کا یہ پتلا، دینداری اور پرہیزگاری کا یہ مرقع، تواضع اور خاکساری کا یہ سراپا، صبر واستقلال کا یہ مجسمہ، ساٹھ برس دنیا کی نیرنگی کا تماشہ دیکھ کر دنیا کے رنگ وبو سے مٹ گیا۔

مرحوم کی یادگار چند اولادیں اور چند کتابیں ہیں، مگر ان سب سے بڑھکر ان کی یادگار ان کے حسن اخلاق کی یاد ہے، مرنے والے کا مدفن تو زمین کا ایک گوشہ ہے، مگر اس یادگار کا مزار ان کے دوستوں کے دل ہیں،

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو
در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

جانے والے جا! رحمت الٰہی تیری منتظر اور مغفرت الٰہی تیرے لیے چشم براہ ہوگی۔

(معارف ماہ اکتوبر ۱۹۴۰ء)

(۱۱)

قوموں کی زندگی کی اصلی روح چند حقیقتوں پر یقین ہے، یہ یقین جس شدت اور استحکام کے ساتھ ہوگا، اسی قدر اس قوم کی زندگی کی روح تازہ، زندہ، تابندہ، پایندہ اور سرگرم عمل ہوگی، یہی ایک روح جب متعدد افراد انسانی میں جلوہ گر ہو، تو وہ کل مل کر ایک حقیقی جماعت کی شکل پیدا کرتی ہے، اور جب ایسے افراد کی تعداد قابل لحاظ حد تک پہنچ جاتی ہے، تو ایک بڑی قوم یا بڑی ملت کا وجود ہو جاتا ہے، اور ان کے درمیان ان چند حقیقتوں پر یقین، اتصال کا وہ نقطہ اور اجماع کا وہ مرکز بن جاتا ہے، جس پر آکر قوم وملت کے کاروبار کے سارے دائرے ختم ہو جاتے ہیں، جس حد تک ان حقیقتوں کا یقین اسکے افراد میں پایا جائیگا اسی قدر ان افراد کی اجتماعی طاقت اور متحدہ قوت ناقابل شکست ہوگی۔

زوال پذیر قوم میں یقین کی یہی گرہ کھل جاتی ہے، وہ یقین جس نسبت سے زائل ہوتے یا سست پڑنے لگتا ہے، اسی نسبت سے اس کے افراد کی اجتماعی اور مرکزی طاقت کمزور ہونے لگتی ہے، یہاں تک کہ وہ مٹتے مٹتے بالکل مٹ جاتی ہے، اور وہ قوم فنا ہو جاتی ہے۔

قوموں کی ترقی وتنزل کا یہی راز ہے، اسی اصول کے مطابق ازل سے ابد تک قومیں بنتی اور بگڑتی

جیتی اور مرتی رہیں، جب کوئی قوم بڑھے گی تو اسی اصول سے، اور مرے گی تو اسی اصول کے مطابق، یہ سنت الہٰی ہے، اور اس سنت الہٰی میں بھی فرق پیدا نہ ہوگا۔

شرع کی اصطلاح میں چند حقیقتوں پر اس مستحکم یقین کا نام ایمان ہے، اور علم اجتماع (سوشیالوجی) میں اس کو جامعیت اور عصبیت کہتے ہیں۔

انبیاء کی دعوت

خالق فطرت نے تو ازل سے ان حقیقتوں کو جن کا یقین قوموں کی زندگی کی روح ہونی چاہیے اسی طرح متعین کر دیا ہے، جس طرح آغاز خلقت میں، دنیا کے جسمانی اور مادی قوانین کو جن پر اس دنیا کی بنیاد ڈالی گئی ہے، متعین فرما دیا ہے، انبیاء علیہم السلام شروع سے آخر تک جب بھی اس دنیا میں آئے، ان ہی حقیقتوں کی دعوت دی، اور ان ہی پر کامل یقین کا مطالبہ کیا، جن میں سے ایک تمام آسمانی کتابوں کو صادق اور خدا کی طرف سے بھی بھیجی ہوئی ماننا ہے۔

ہماری آج کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہے، کہ ہم سے ہمارے یقین کی یہ سب سے بڑی دولت چھیننے کی کوشش کی جا رہی ہے، ہماری سعادتوں اور ہدایتوں کے سب سے قیمتی خزانہ کا نام قرآن پاک ہے، جس کو باختلاف فرق تمام مسلمانوں کا اتفاق نام اور اجماع عام تھا، اور ہے، کہ یہ انسانی اوہام وخیالات اور خیالی قصص و حکایات سے بلند تر خدا کی طرف سے آئی ہوئی صداقت کا نام ہے، اور اسی لیے وہ ہر خطا سے پاک اور ہر غلطی سے مبرّا ہے، بس وہ ہر ہاتھ جو اس کی اس عصمت کو داغدار بنانے کی کوشش کریگا، اس کا کاٹ ڈالنا ہمارا فرض ہے۔

بہر حال اس گیے گذرے زمانہ میں بھی خدا کا شکر ہے، کہ فتنہ نگار کے جواب میں ہر کلمہ گو مسلمان نے یکساں حصہ لیا، اور یہ دکھا دیا، کہ ہر قسم کے اختلافوں کے باوجود ہماری وحدت کی یہ شہ رگ آسانی سے نہیں کاٹی جا سکتی، لیکن شیعہ، سنّی، مقلد، غیر مقلد، دیوبندی، بریلوی، ندوی امت مسلمہ یا اہل قرآن یہاں تک کہ قادیانی و احمدی ہر ایک نے شخص مذکور کے ہفوات پر لعنت بھیجی، اور اپنے اپنے خیال کے مطابق اس کی پرزور تردید کی۔

نیاز نامہ

بہار کے ممتاز فاضل و ادیب مولوی ریاض حسن خاں صاحب خیال رئیس مظفر پور اپنے ایک عنایت نامہ میں لکھتے ہیں، کہ "پچھلے پرچہ سے کلام اللہ پاک کی وحی پر جو مضمون شروع ہوا ہے، وہ اس

قابل ہے کہ اس کو رسالہ کی صورت میں چھاپا جائے، اگر دوسرے احباب بھی ان کی اس تجویز کو پسند فرمائیں تو اس کی تعمیل اس طرح کی جائے کہ "نیاز نامہ" کے نام سے ان تمام مستند تحریروں کو یکجا کر دیا جائے، جو اس کافرِ بے ادب کی تردید میں اہل علم کے قلم سے نکلی ہیں۔

شبان المسلمین کی صدارت کے لیے محمد صالح حرب کا انتخاب

آج کل بیرونی ڈاک کی بدنظمی سے دوسرے اسلامی ملکوں کا حال بہت کم ملتا ہے، تاہم اس اثنا میں مصر کی ایک ڈاک آئی ہے، جس سے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی، کہ ڈاکٹر عبدالحمید سعید کی وفات سے مرکزی جمعیۃ شبان المسلمین مصر کی صدارت کی جو جگہ خالی ہو گئی تھی، اس کے لیے ہز ایکسلنسی محمد صالح حرب پاشا سابق وزیر دفاع حکومت مصر کا انتخاب ہوا ہے، اس انتخاب کے جلسہ میں مصر کے علاوہ چین، سوماترا، البانیا، فلسطین، یمن، الجزائر وغیرہ دوسرے ملکوں کے نمایندوں نے بھی حصہ لیا، امید ہے کہ جس طرح وزیر موصوف سیاسی و ملکی دفاع میں کامیاب ہوئے ہیں، اسی طرح دینی و اسلامی دفاع میں بھی کامیاب رہیں گے۔

رحمت عالم

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے مدیر معارف نے جو (۱۵۰) صفحوں کی مختصر اور آسان سیرت طالب علموں اور مبتدیوں کے لیے لکھ کر دار العلوم ندوۃ العلماء کی امداد کے لیے وقف کی ہے، وہ بحمد اللہ مسلمانوں میں مقبول ہو رہی ہے، ایک مہینہ کے اندر اس کے ایکہزار نسخے فروخت ہو چکے ہیں، بہت سے اہل خیر حضرات نے اس کے کئی کئی نسخے خرید کر عام لوگوں میں تقسیم کیے ہیں، اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، ایک مخدوم نے جن کا ہاتھ ہر نیکی کی طرف سب سے پہلے بڑھتا ہے، اور جو اس طرزِ تعبیر کے نکرہ ہونے کے باوجود بھی اہل نظر کی نگاہوں میں معرفہ ہیں، یہ قدر فرمائی ہے، کہ سو نسخے، ایک ایک نسخہ پانچ پانچ روپیہ کے خرید کر مفت تقسیم فرمایا ہے، امید ہے کہ دوسرے اہل خیر بھی ایسی قدردانی اور فیاضی کا ثبوت دیں گے۔

(معارف ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء)

(۱۳)

۲۳؍ نومبر سنہ ۱۹۴۰ء اور ۲۱؍ شوال سنہ ۱۳۵۹ھ کی سہ پہر تھی، کہ پھلواری شریف سے مولانا ابو المحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت کی وفات کی خبر آئی، دل کو یارائے ضبط نہ رہا، آنسوؤں کے چند قطرے زمین پر گرے،

اس زمین پہ جو اب مرنے والے کی خوابگاہ ہے، ابھی قلب میں یہ ہمت بھی نہیں کہ جی بھر کر ماتم کروں، اور دل کے شیون کو سپردِ قلم

دریں آشوب غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم
جہانے را جگر خون شد ہمیں تنہا نہ من گریم (شبلی)

دو ماہ ہوئے کہ مولانا عبدالعزیز صاحب خطیب و امام جامع مسجد گوجرانوالہ نے جو دیوبند کے عالم اور وقت کے بڑے محدث تھے، وفات پائی، انھوں نے صحاح و مسانید کی مختلف کتابوں کی فہرستیں بطور اطراف بڑی محنت سے لکھی تھیں، جن میں صرف بخاری کی فہرست ”نبراس الساری فی اطراف البخاریؒ کے نام سے چھپی ہے، مرحوم نے مجھے لکھا تھا، کہ مسند بن حنبل کی بھی ایک فہرست بنائی ہے، اور وہ اس کے چھپوانے کی فکر میں تھے۔ کیا اچھا ہو اگر ان کی یادگار میں ان کی یہ کتاب گوجرانوالہ کے قدردان چھپوا سکیں، یا وہ اس نسخہ کو کسی قدر شناس کے سپرد کریں، کہ وہ اس کو چھپوا کر اس فیض کو عام کرے۔

رحمتِ عالم کی قدردانی

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے جو مختصر سیرت لکھی گئی تھی، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ وہ مقبول خاص و عام ہو رہی ہے، مختلف شہروں میں اس کے سو پچاس نسخے بھیجے جا رہے ہیں، اور فروخت ہو رہے ہیں، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سرکار نظام کے محکمۂ تعلیم نے بھی اپنے اسکولوں اور کتب خانوں کے لیے اس کے سات سو نسخے خرید فرمائے ہیں، یہ قدردانی اور دین پروری سرکار نظام کے ان خصوصیات میں ہے، جن کی بنا پر وہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ محبوب اور پشت و پناہ علوم دین سمجھے جاتے ہیں۔

فتنۂ نگار نے عام مسلمانوں کے دلوں میں خواہ آگ ہی کیوں نہ لگا دی ہو، مگر پوچھنا یہ ہے کہ ہمارے خواص کو اس کی خبر بھی ہوئی، اور ان مسلمانوں کے کانوں تک جو کسی ریاست کی مسند یا سلطنت کے تخت پر بیٹھے ہیں، یہ صدا پہنچی بھی۔

ممالک محروسۂ نظام میں نگار کا داخلہ بند

ہندوستان روئے زمین پہ ایک ہی فرماں روا ہے، جس کے کانوں میں یہ آواز اکثر مسلمانوں سے بھی پہلے پہنچی، اور اس کے دل کو بے چین کر گئی، یہ اعلیٰحضرت

فرماں روائے کشور دکن ہیں، آج اکثر ریاستوں میں حکومت کی باگ جن ہاتھوں میں ہے، وہ اپنے دل کا سرمایہ زمانہ کے سوداگر کے ہاتھوں فروخت کرچکے ہیں، لیکن وہ سیاست کے باب میں بے حد فرض شناس، اور دین کے معاملہ میں حد درجہ بے تعصب ہیں، سرزمین دکن پر ابھی تک بحمد اللہ ایسے وزراء کے ہاتھوں میں حکومت ہے، جو اپنی مختلف قوموں والی رعایا کے ساتھ حد درجہ روادار ہونے کے باوجود اپنے مذہبی فرض سے غافل نہیں، اسی کا نتیجہ ہے، کہ انھوں نے اپنے حدود مملکت کو اس فتنہ سے پاک رکھنا ضروری سمجھا، اور ایک سال کے لیے اس بدنام رسالہ کو ممالک محروسۂ سرکار عالی میں داخلہ کی ممانعت کردی، یہ وہ فرض شناسی ہے، جس کے لیے ہر کلمہ گو اعلیٰحضرت شہریار دکن کی حکومت کا شکر گذار ہوگا۔

رحمت عالم کی مقبولیت

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدگی عام طور سے کیجا رہی ہے، مختلف شہروں میں اب تک اس کے جو نسخے بھیجے گیے ہیں، ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

حیدرآباد دکن ۷۲۵، لکھنؤ ۳۰۰، علی گڈھ ۱۵۰، پٹنہ ۱۰۰، اعظم گڈھ ۵۰، مئو ۵۰، کراچی ۵۰، جون پور ۵۰، گجرانوالہ (پنجاب) ۲۵، احمد اباد ۲۵، شاہ گنج ۲۵، رام پور ۲۰، بھوپال ۲۰، شملہ ۲۰، لاہور ۲۰، رانچی ۲۰، مظفرپور ۲۰، ان کے علاوہ متفرق خریداریاں ہیں، امید ہے کہ نیا سال شروع ہوتے ہوتے یہ اڈیشن ختم ہوجائے۔

رحمت عالم اہل نظر کی نظر میں

اہل نظر نے بھی اس کے متعلق اچھی رائیں ظاہر کی ہیں، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے لکھا "یہ اچھا کام ہوا، اس کو پڑھکر آنکھیں پرآب ہوئیں"۔

شملہ سے مولوی محمد عمر صاحب نعمانی لکھتے ہیں؛

> "سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح یہ کتاب بھی یقیناً مقبول بارگاہ نبوت ہوئی کہ دل اس کی طرف کھنچے جاتے ہیں، کتاب بچوں کے لیے لکھی گئی ہے، مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ جوان اور بڈھے بچوں کو بھی وہ محقق معلومات نہ ہونگی، جو اس میں مذکور ہیں"۔

جسٹس مولوی معین الدین صاحب انصاری فرنگی محلی بیرسٹرایٹ لا جج عدالت عالیہ ریاست رام پور لکھتے ہیں:

"محسوس ہو رہا ہے، کہ یہ کتاب حسب امید مقبول ہو رہی ہے، آپ کی یہ سعی مشکور ہوئی، اور آپ مبارکباد قبول فرمائیں، آخری روزہ میرا اسی کتاب نے بہلایا، کسی نوبت پر کتاب ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔"

ع کرم کردی الٰہی زندہ باشی،

اسی سلسلہ میں انھوں نے ایک اور مفید تجویز پیش کی ہے، جو ذکر کے قابل ہے، لکھتے ہیں:

"اس کی سلاست کو دیکھ کر ایک عجیب خیال مجھے دامن گیر ہو رہا ہے، یعنی یہ کہ کتاب ہندی رسم الخط میں بھی شائع ہو جائے، مگر تھوڑے سے حذف و اضافہ کی حاجت ہوگی، اس کو ہندی خط میں لکھنے کا کام میں کر دوں گا، معلوم نہیں اس تجویز کی عملی تائید کرنے کے لیے کوئی آمادہ ہے یا نہیں"۔

(معارف ماہ دسمبر ۱۹۴۰ء)

شذرات

(بابت ماہ جنوری ۱۹۴۱ء تا ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء)

دنیا کی تاریخ میں ایک نئے سال کا اور اضافہ ہوا، لیکن اس اضافہ کا استقبال مسرت کے ترانوں اور خوشی کے نعروں کے بجائے مظلوموں کی آہوں اور بے کسوں کی فریادوں کے ساتھ ہوا، پوری دنیا اس وقت ایسی کشمکش کے گرداب میں ہے، کہ اس کے مستقبل کا فیصلہ مشکل ہو رہا ہے، جو جیت رہے ہیں، وہ ہار رہے ہیں، جو ہار رہے ہیں، وہ برباد ہو رہے ہیں۔

لیکن ایک بات پوری طرح ظاہر ہے، کہ دنیا میں جو قوم بھی اپنے کو دنیا کی امامت و قیادت کے لیے پیش کرتی ہے، وہ جب تک اپنے خون کے سمندر میں خود غوطہ نہیں لگاتی، اس منزل کو نہیں پہنچ سکتی، اجتماعی ترقی کا ذریعہ صرف ایک ہی ہے، اور وہ جہاد ہے، یعنی ہر پہلو کا جہاد، نفس کا جہاد، مال کا جہاد، علم کا جہاد، عقل کا جہاد، جسم کا جہاد، اور اس راہ میں جان و مال، اولاد و عزیز اور ہر محبوب سے محبوب اور عزیز سے عزیز متاع کی قربانی،

یہ تو مطلق جہاد کی راہ ہے، لیکن جہاد فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں جہاد کی منزلیں تو اس سے بھی زیادہ کٹھن ہیں، اس راہ میں صرف ایثار و قربانی ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے، کہ یہ ساری جد و جہاد، قتل و خون کس غرض سے ہو، نسل و قومیت کی برتری ملک و حکومت کی سرفرازی، دولت و ثروت کی فراوانی، صنعت و تجارت کی گرم بازاری، اشخاص کے بجائے قوموں کی نفسانی خواہشوں کے مظاہر ہیں، اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ مقام ہے، جہاں اپنے لیے نہیں، بلکہ خدا کے لیے، خدا کے دین کے لیے، اور خدا کے حکم کے لیے قومیں نہیں، بندے اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں، کہ اللہ کی بات کا بول بالا ہو، لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا، اور وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ، یعنی دین اور اطاعت صرف خدا کی ہو جائے، دنیا کی عام لڑائیوں اور اسلامی جہاد میں یہی فرق ہے،

اسلام کا جہاد موجودہ عالمگیر انسانی مصیبت یورپ کی محدود وطنی و قومی عصبیت کا افسوسناک نتیجہ ہے، ہر قوم اپنی

نسلی برتری اور وطنی تفوق کے لیے برسرپیکار ہے، جرمن قوم کی ساری ہنگامہ آرائی اور کشت وخون کا ماحصل کیا ہے، صرف یہ کہ پوری جرمن نسل ایک عَلَم کے نیچے جمع ہوکر ساری دنیا پر اپنی فرمانروائی کا اختیار حاصل کرلے، ایسی ہی دوسری قومیں ہیں، جو اپنی اپنی جگہ پر اسی قسم کے حق کی دعویدار ہیں، لیکن اسلام کا جہاد قوم کا نہیں، نسل کا نہیں، وطن کا نہیں، زبان کا نہیں، بلکہ پیغام حق کی دعوت کا نام ہے،

اسی پیغام حق کی متحدہ دعوت کا اثر تھا، کہ ہر اسلامی سلطنت میں ہر مسلمان کا حق یکساں تھا، اس کے سایہ میں ہر قوم اور ہر نسل کے لوگ آرام پاتے تھے، پچھلی ترکی سلطنت کے حقوق پر غور کیجئے، کہ ایک ہی سلطنت کے اندر ترکی، مصری، شامی، عراقی، عثمانی، کردی، طرابلسی، حجازی، نجدی، یمنی ہر ملک و قوم کے لوگ بسے تھے، قومیت کا امتیاز اور نسل کا تفرقہ، بیچ میں حائل نہ تھا، رفتہ رفتہ یورپ کی قومی ونسلی دعوتوں نے ترکی قوموں کے درمیان نفاق کا بیج بویا، اور قومی امتیازات اور نسلی تفرقوں کے جذبات کو بیدار کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس حکومت کے پرخچے اڑگیے، اور قوموں اور نسلوں کی وہ گرہ جو پیغام حق کی دعوت سے بندھی تھی، کھل گئی، اور آخر ان میں سے ایک ایک قوم ونسل آسانی سے دوسرے کے ہاتھوں میں جا جاکر گرفتار ہوتی اور اپنی ہستی کھوتی رہی.

پیغام حق آج ضرورت ہے، کہ ہم پھر اپنی آواز بلند کریں، اور تھکی ماندی دنیا کو بتائیں کہ اس کا امن اور چین ان قومی ونسلی امتیازات اور تفرقوں میں نہیں، بلکہ پیغام حق کے قبول میں ہے، پیغامی برادری قائم ہو، جس میں اس پیغام کے ہر قبول کرنے والے کو برابر کا درجہ ملے، اور اس پیغام کے مقدار قبول اور اس کے لیے جدوجہد کی ذمہ داری کے قبول کو حقوق کی کمی بیشی کا معیار بنایا جائے،

لیکن یہ پوری طرح یقین کرلینا چاہیے، کہ دنیا میں کسی پیغام یا کسی تحریک ودعوت کی کامیابی اس پیغام ودعوت کی صرف عمدگی سے نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کے علم برداروں کی جدوجہد، سعی ومحنت، سرگرمی عمل اور ایثار وخلوص سے ہوسکتی ہے، دنیا ایک بحر رواں ہے، اس بحر رواں میں وہی زندہ رہے گا جو خود بھی رواں ہے.

موجیم کہ آسودگی ما عدم ما
ماندہ بانیم کہ آرام نداریم

رحمت عالم اب تک رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنگال تک رسائی حاصل نہیں کی تھی، اس سینہ میں اس کے

سو نسخے کلکتہ بھیجے گیے، عام مدرسوں میں بھی متعدد شہروں میں داخل کی جا رہی ہے۔

(معارف ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء)

(۲)

رحمت عالم بنگال میں پچھلے پرچہ میں رحمت عالم کے بنگال پہنچنے کی جو اطلاع دی گئی تھی، وہ ابھی پہنچنے بھی نہیں پائی تھی کہ کلکتہ سے برادرم مولوی عبدالرحمٰن صاحب کاشغری ندوی مدرس فقہ واصول مدرسۂ عالیہ کلکتہ کا تار آیا، کہ فی الفور اس کے ڈھائی سو نسخے بھیجے جائیں، چنانچہ وہ بھیجے گیے، اور اب بنگال کے دوسرے شہروں تک بھی رحمت عالم پہنچ چکی ہے، اسی طرح کراچی سندھ میں پچاس اور بمبئی میں اسی قدر نسخے جا چکے ہیں۔ فالحمد للہ،

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے نصاب میں رحمت عالم مسلم یونیورسٹی کے دینیات میں مدت سے مولانا شبلی مرحوم کا رسالہ بدر الاسلام پڑھایا جاتا تھا، اب یہ اطلاع سن کر خوشی ہوئی کہ اس کی جگہ رحمت عالم کا انتخاب کیا گیا ہے، امید ہے کہ اس کے ذریعہ یونیورسٹی کے جوانوں تک یہ پیام رحمت پہنچ جائے۔

رحمت عالم کا ہندی ترجمہ رحمت عالم کے دائرہ کو وسیع کرنے کے لیے رام پور سے ایک دوست کی تحریک تھی، کہ اس کا ہندی ترجمہ شائع کیا جائے، اس کی تائید اب حیدرآباد دکن سے ہو رہی ہے، وہاں کے دیندار صاحب علم پروفیسر نے اس ہندی اڈیشن کے سو نسخوں کی ذمہ داری لی ہے، اگر ڈیڑھ سو نسخوں کی قیمت عہ فی نسخہ کے حساب سے کوئی اور ہمدرد ادا کر سکیں، تو اس ہندی اڈیشن کی اشاعت میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

قرآن پاک کے اعجاز پر کوئی ایسی مستقل کتاب جس میں اصولاً بھی اور آیات پر بھی دقت نظر کے ساتھ بحث ہو، موجود نہیں، البتہ کتب معانی و بیان میں یہ مباحث منتشر و پراگندہ موجود ہیں، دار المصنفین میں مدت سے یہ کاوش ہو رہی تھی، اور دو برس سے مستقل طور سے مولوی محمد اویس صاحب نگرامی ندوی کو یہ کام سپرد کیا گیا تھا، جس کو انہوں نے پوری تندہی او محنت سے انجام دیا، اور بحمد اللہ کہ یہ کام انجام کو پہنچ گیا، اور دو ایسی جلدیں تیار ہو گئیں، جن میں قرآن مجید کے ادبی و معنوی و لغوی و اعجازی نقطہ ہائے نظر جو ایک ہزار برس کی تحقیقات کا خلاصہ ہیں یکجا ہو گیے ہیں، اسوقت ان جلدوں کی فہرست زیر ترتیب ہے۔

علامہ شبلیؒ کی سوانحعمری حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات کی ترتیب و تالیف کا جو کام پچھلے

سال سے جاری تھا، بحمد اللہ کہ پورا ہوگیا، سوانح کی یہ پہلی جلد پانچ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہوگی، یہ شخصی سوانح ہونے کے علاوہ انشاء اللہ مسلمانوں کی چالیس برس کی علمی و تعلیمی و مذہبی و سیاسی تحریکات کی تاریخ بھی ہوگی، کتاب بہمہ وجوہ تیار ہوکر پریس میں جارہی ہے۔

سیرۃ النبیؐ جلد ششم کی چھوٹی تقطیع

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد ششم کی چھوٹی تقطیع کی مانگ ہر طرف سے جاری ہے، ان کی اطلاع کے لیے گذارش ہے، کہ چھوٹی تقطیع چھپ رہی ہے، دو سو سے زیادہ صفحے چھپ چکے ہیں، امید ہے کہ اخیر سال تک یہ پوری ہوکر قدردانوں کے ہاتھوں تک پہنچ جائے۔

محمد پاشا محمود کی وفات،

مصر کی ڈاک سے یہ معلوم کرکے افسوس ہوا، کہ محمد پاشا محمود جو زغلول پاشا کے وفد کے ممبر تھے، اور بعد کو الگ ہوکر مصر کی وزارت میں شامل ہوگئے تھے، وفات پاگئے، ان کو ہندوستان سے یہ نسبت تھی، کہ محمد علی مرحوم کے ساتھ آکسفورڈ میں انہوں نے بھی تعلیم پائی تھی، پیرس میں وفد خلافت اور وفد مصر کی ملاقاتوں کے سلسلہ میں ان دونوں رفیقوں میں بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی تھی، اور خاکسار سے زغلول پاشا کی قانسی میں صحیح بخاری کی صحت پر ایک پر لطف مناظرہ ہوا تھا، زغلول پاشا کا یہ فقرہ جو محمد پاشا محمود کو مخاطب کرکے انھوں نے کہا تھا، اب تک کانوں میں گونج رہا ہے، دع الامام یتکلم، اللہ تعالیٰ نام کی طرح ان کی عاقبت بھی محمود فرمائے۔

اسلام کا سیاسی و اقتصادی نظام،

ہمارے صوبہ میں اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام اور اصول کی ترتیب کے لیے جناب نواب صاحب چھتاری کی صدارت میں ایک چھوٹی سی مجلس بنائی گئی ہے، جس کا پہلا اجلاس دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عباسیہ ہال میں شروع جنوری میں ہوا، اور اس کے ارکان مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا عبدالحامد بدایونی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور خاکسار بنائے گئے، اور یہ طے پایا کہ مستند علماء اور لائق جدید تعلیم یافتہ اہل علم کی باہمی معاونت سے پہلے اسلامی سیاست و اقتصاد پر ایک معتبر کتاب تالیف کی جائے، اور پھر اس میں سے اس حصہ کو الگ کیا جائے، جو موجودہ زمانہ میں اور ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں بھی قابل عمل ہو۔

ہندوستان کے مختلف علماء اور اہل علم سے اس باب میں خط و کتابت ہورہی ہے، نہیں کہا جاسکتا، کہ

تعاون کس حد تک حاصل ہو سکتا ہے، لیکن بہر حال ایک دو آدمی بھی مستعد ہو جائیں گے، تو یہ کام کسی نہ کسی طرح انجام پا جائیگا۔ لیکن اصل ضرورت ان بے تاب قلوب کی ہے، جو اس راہ میں سرفروشانہ آگے بڑھیں، اور جو کہتے ہیں وہ کر بھی گذریں، یعنی جس اسلامی زندگی کی انہیں تلاش ہے، اس کا پتہ جب پالیں تو اس کے حصول اور اس پر عمل کو اپنی ہر قسم کی جدوجہد کا مرکز بنالیں۔

(معارف ماہ فروری سنہ ۱۹۴۱ء)

(۳)

علامہ موسیٰ جار اللہ مسلمانوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی، کہ ترکی کی موجودہ حکومت اپنی پچھلی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوگئی ہے، مشہور روسی ترکی عالم علامہ موسیٰ جار اللہ جو کئی سال ہندوستان میں رہ کر ایک اسلامی مقصد سے جاپان گئے تھے، وہاں سے وہ اب واپس آکر ٹرکی روانہ ہوگئے ہیں، ایک دوست کے ذریعہ سے ان کا ایک خط آیا، جس سے یہ معلوم ہوا، کہ وہ سالہا سال سے اس بات کی کوشش کر رہے تھے، کہ ان کو ترکی حکومت کے کسی مرکزی شہر میں ایک خالص مذہبی عربی درسگاہ کے قیام کی اجازت دی جائے۔ اب ترکی حکومت نے ان کی اس تجویز کو مان لیا ہے، اور اجازت دے دی ہے کہ وہ اس کے حدود سلطنت میں جہاں چاہیں اپنی مجوزہ مذہبی درسگاہ قائم کریں، بلکہ سلطنت مذکور اس کے مصارف ادا کرنے کو بھی تیار ہے، لیکن علامہ ممدوح اس کو سرکاری مدرسہ بنانے کے بجائے قومی مدرسہ بنانا زیادہ موزوں سمجھتے ہیں۔

انہی کے ایک خط سے یک بہ یک ایک حقیقت جو اوجھل سی ہو رہی تھی، نظر کے سامنے آگئی، ترکی و تاتاری نسل جس کے مسلمان بادشاہوں اور عالموں نے تقریباً چھ سو برس تک اسلام کے سیاسی و علمی خدمات انجام دیئے تھے، اس دور میں خدمت دین، بلکہ خود دین سے اتنی دوری ہوگئی، کہ کاشغر سے لے کر کریمیا اور قازان تک سارا علاقہ جو اسلام کا مسکن تھا، بالشویک اثر اور حکومت کے ماتحت ہو کر ہر قسم کی علمی و عملی و مذہبی تحریک سے خالی ہوگیا ہے خود عثمانی ترک بھی اپنے نئے دور انقلاب میں اس سے اتنے ہی کورے ہوگیے، اور اب یہ سمجھنا چاہیے، کہ ترک و تاتار کی پوری نسل جس کی تعداد دس کروڑ سے کم نہ ہوگی، سلسلۂ محمدیؐ سے بیگانہ سی ہو رہی ہے، اس حالت میں اس نئی مذہبی درسگاہ کا قیام نہ صرف ٹرکی کے لیے، بلکہ ساری ترکی و تاتاری نسل میں دوبارہ پیغام محمدیؐ کے احیاء کے لیے ہوگا، اور

عجب نہیں، کہ آیندہ چل کر وہ کسی عظیم الشان اسلامی تحریک کا مرکز بن جائے، وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

علامہ ممدوح اپنی اس تجویز کے مطابق ترکی روانہ ہو گیے ہیں، اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اپنی ایک درخواست چھوڑ گیے ہیں، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ اسلامی دنیا میں ہندوستان کے مسلمانوں کو جو اہمیت حاصل ہے اور اسلامی تحریکات سے ان کو جو دلچسپی ہے، اس کی بنا پر ان سے یہ توقع بیجا نہ ہوگی، کہ وہ اس تجویز سے پوری دلچسپی لیں گے، اور ان سے وہ صرف یہ امداد چاہتے ہیں، کہ مجوزہ درسگاہ کے اسلامی کتب خانہ کے لیے ہندوستانی مطبوعات فراہم کر دیں۔ اور خصوصیت کے ساتھ انہوں نے دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کی مطبوعات کی خواہش کی ہے، ہم نے انہیں امید دلائی ہے، کہ انشاء اللہ ہندوستان اور دکن کے مسلمان اس فرض کے ادا کرنے میں پیچھے نہیں رہیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔

تحریک ندوۃ العلماء

ندوۃ العلماء کی تحریک کو ہندوستان میں دوبارہ زندہ کرنے کے لیے ہم کئی مہینوں سے غور کر رہے تھے، اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، کہ ہندوستان میں اس وقت جس قسم کے اختلافات پیدا ہیں، اور دینی تحریک جس درجہ قوم کے نوجوانوں میں تغافل بلکہ بے گانگی پھیل رہی ہے، اس کے روکنے اور اسلام کے نام کو بلند کرنے کے لیے دوبارہ حضرات علماء کو ہر قسم کے سیاسی اختلافات کے باوجود دینی خدمت کے ایک متحدہ پلیٹ فارم پر مجتمع ہونے کی دعوت دیجائے، اور یہ سوچا جائے، کہ موجودہ دلچسپی اور اقتصادی و سیاسی انتشار فکر کی حالت میں مسلمان نوجوانوں کو اسلامی تعلیم سے کیونکر مانوس کیا جائے۔

اس سلسلہ میں ہم نے بہت سے علماء اور زعماء سے زبانی اور تحریری گفتگو کی ہے، اور ہم کو یہ معلوم ہو کر تسلی ہوئی کہ وہ سب اس مقصد سے پوری طرح متفق ہیں، ہمارے پچھلے چند سال ہماری قومی تاریخ کے سب سے سیاہ اوراق ہیں، جن میں ہمارے تغافل، تکاسل، پست ہمتی، انتشار فکر، اور اختلافات کے سوا کچھ اور ملتا نہیں، اب بھی وقت ہے کہ ہم اپنی خانہ جنگی کے افسوسناک نتیجوں کو پوری طرح سمجھیں، اور اپنے بعض اختلافات کو اگر وہ نہ مٹ سکیں تو ان کو اپنی جگہ محدود رکھکر ہم سب اسلامی خدمت کے مقصد پر متفق ہو جائیں۔

دارالعلوم ندوہ میں بورڈنگ

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں چھوٹے بچوں کے بورڈنگ کی تعمیر کے لیے رحمت عالم کی خریداری کی تجویز کے ذریعہ سے جو کوشش کی گئی تھی، بحمد اللہ کہ وہ پوری طرح کامیاب ہوئی، اور اس وقت تک

تین ہزار روپے نقد اس سلسلہ میں جمع ہو چکے ہیں، اور امید ہے کہ پانچ ہزار پورے ہو جانے پر ایک دو مہینہ کے اندر اندر اس کی تعمیر کا کام شروع کر دیا جائے گا، جو اصحاب یوں بھی اس کار خیر میں شریک ہونا چاہتے ہیں، وہ بخوشی شریک ہو سکتے ہیں۔

رحمت عالمؐ کے ہندی ترجمہ کے لیے ارباب خیر کی امداد

بعض گھڑی کی تحریکیں عجیب طرح سے کامیاب ہوتی ہیں، رحمت عالمؐ کے ہندی ترجمہ کی جو تحریک ایک دوست نے شروع کی تھی، وہ پچھلے پرچہ میں شایع ہی ہوئی تھی کہ اہل خیر نے مسابقت الی الخیر کی، اور صرف تین آدمیوں نے مل کر اس مالی مشکل کو حل فرما دیا، حیدرآباد کے بعد اس کے لیے علی گڑھ کے ذو الریاستین صاحب علم نے حسب معمول سبقت فرمائی، آخری ۵۰۰ کی رقم پروفیسر سید الطاف کریم صاحب نے رانچی سے بھیجدی ہے، ترجمہ کا کام مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب نگرامی نے جو ہندی کے اچھے ادیب ہیں، شروع کر دیا ہے۔

(معارف ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء)

(۴)

سر شاہ سلیمانؒ

نئی تعلیم نے جو بہتر سے بہتر نمونے ہماری قوم میں پیش کیے، ان میں سے ایک سر شاہ سلیمان تھے، وہ مشرقی تعلیم کے ایک ممتاز خاندان کے فرد فرید تھے، ان کا آبائی وطن ضلع اعظم گڈھ ہی کا ایک ممتاز قصبہ بھیرا تھا، ملا محمود جونپوری جن کا نام شمس بازغہ اور فرائد کے مصنف کی حیثیت سے آفتاب کی طرح درخشاں ہے، ان کے مورث اعلیٰ تھے، سر سلیمان مرحوم نے بھی ابتدائی مشرقی تعلیم حاصل کی تھی، اور عربی تعلیم سے بہرور تھے، ملا محمود نے فلسفہ میں ادب کی، اور ادب میں فلسفہ کی شان پیدا کی تھی، یہی خصوصیت سر سلیمان کی ذات میں تھی، ایک طرف وہ قصائد ذوق اور مثنویات میر کو ترتیب دیتے تھے، اور دوسری طرف آین سٹاین کے نظریہ پر نقد و تبصرہ کرتے تھے۔

سر سلیمان کی فطری ذہانت بے نظیر تھی، ذہانت کی بجلی ان کی رگ رگ میں بھری تھی، وہ نہ صرف ہائی کورٹ

کے جج رہے، بلکہ قانون کے نکتہ شناس بھی تھے، ان کی لیاقت و قابلیت کی شرح کے لیے چند سطریں کسی طرح کافی نہیں ہو سکتیں، اور ان سب باتوں کے ساتھ وہ مسلمان بھی تھے، ایماناً اور عملاً مسلمان! وہ ان تنگ بخزموں میں نہ تھے، جو رومن حروف کے چند الفاظ پڑھ لینے کے بعد اپنے کو حقایق و معارف کا سب سے بڑا عارف مان کر دین و مذہب سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، اور بندگی کی حد سے آگے بڑھ کر خدائی کے عرش کا اپنے کو مستحق سمجھنے لگتے ہیں، مرحوم میں ان خوبیوں کے ساتھ بہت سی اخلاقی خوبیاں بھی جمع تھیں، وہ منکسر، متواضع، حلیم، اور سادہ مزاج تھے، ساتھ ہی اپنی رائے کے مضبوط اور کام کے دھنی تھے، وہ عالم تھے، مگر عمر بھر طالب علم ہی بنے رہے۔

مرحوم ہندوستان کا وقار اور مسلمانوں کا فخر تھے، افسوس کہ ۱۳ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء کو ہمارے ملک کا یہ وقار اور ہماری قوم کا یہ فخر جاتا رہا، گلے کی ایک معمولی بیماری نے خناق، اور خناق نے غالباً دماغ کے پھوڑے کی شکل اختیار کی، سنہ ۱۸۸۶ء پیدائش کا سال تھا، پچپن برس کی عمر میں اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، انا للہ و انا الیہ راجعون، دنیاوی قانونوں کا جج اب دلوں کے سب سے بڑے قاضی القضاۃ اور احکم الحاکمین کی بارگاہ عدالت میں ہے، دعا ہے کہ وہ احکم الحاکمین جو ارحم الراحمین بھی ہے، اپنی شفقت و رحمت کی کرسی پر اس کو جگہ دے گا، اور اپنی بخشش و بخشایش کی عزت سے سرفراز فرمائے گا۔

۲ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء کو ریاست رام پور اپنی پرانی علم پروری اور علمی سرپرستی کے ثبوت میں اعلیٰحضرت نواب صاحب رام پور کے نام نامی سے نسبت دیکر رضا اکاڈیمی کے نام سے ایک علمی مجلس کا افتتاح کر رہی تھی، اس کی صدارت کے لیے مرحوم سر شاہ سلیمان کا انتخاب ہوا تھا، مرحوم نے اپنا خطبۂ صدارت لکھ لیا تھا، کہ بیمار پڑے، اور جلسہ کی صدارت نہ کر سکے، مگر ان کا خطبہ مجلس میں آیا، اور پڑھا گیا، آج ہم مرحوم کے اس خطبہ کو ان کی علمی زندگی کی اخیر یادگار کے طور پر شائع کرتے ہیں۔

(۵)

رضا اکاڈیمی کا افتتاح

رضا اکاڈیمی رام پور کا افتتاح ۲ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء کو ظہر کے بعد ریاست کے ایک خوش

فضا میدان میں ہوا، جس کے پاس ہی وہ مختصر مگر پاکیزہ سرکاری عمارت تھی، جو اکاڈمی کو دی گئی ہے، اعلیحضرت سرکار رام پور بنفس نفیس شریک مجلس تھے، اور ریاست کے تمام اعلیٰ عہدہ دار اور ممتاز اہل علم حاضر تھے، ملک کے بعض مشہور اداروں کے نمایندے بھی خاص طور سے بلائے گیے تھے، چنانچہ انجمن ترقی اردو، جامعہ ملیہ، اور دار المصنفین کے نمایندوں کے علاوہ مسلم یونیورسٹی، دلی یونیورسٹی، اور لکھنؤ یونیورسٹی کے مشرقی علوم کے بعض اساتذہ بھی تشریف رکھتے تھے۔

اکاڈمی کا افتتاح کلام پاک کی تلاوت سے ہوا، پہلے اعلیحضرت کی خدمت میں اکاڈمی کے صدر جسٹس مولوی معین الدین صاحب انصاری فرنگی محلی نے سپاس نامہ پیش کیا، پھر اعلیٰ حضرت نے اپنا جواب ارشاد فرمایا، پھر مختلف قومی و ملی اداروں کے نمایندوں اور یونیورسٹیوں کے استادوں نے تبریک و تہنیت اور رام پور کے گذشتہ علمی خدمات اور آیندہ توقعات پر مختصر تقریریں کیں، اور آخر میں اکاڈمی کے ناظم مولانا امتیاز علی خان صاحب عرشی نے سر شاہ سلیمان صاحب کا خطبہ پڑھکر سنایا، اور اسی پر جلسہ ختم ہوا، یہ اکاڈمی اعلیحضرت نواب صاحب رام پور کی موروثی علمی قدردانی اور عالی مرتبت سید بشیر حسین زیدی بالقابہ چیف منسٹر کی علم دوستی کا نتیجہ ہے، خدا کرے کہ یہ نومولود بچہ اپنے سرپرستوں کے زیر سایہ اپنی ترقی کی منزلیں طے کرے۔

سیرت محمد بن عبدالوہاب خیال تھا کہ اس نمبر میں مولوی مسعود عالم ندوی (کیٹلاگر بانکی پور لائبریری) کی نئی تصنیف سیرت محمد بن عبدالوہاب کا ایک باب پیش کیا جائے گا، مگر سر شاہ سلیمان مرحوم کے یادگار آخری خطبہ کی بروقت اشاعت کے خیال سے اس کو روک لینا پڑا، مولوی مسعود عالم صاحب بڑی محنت و تحقیق و کاوش اور دیدہ ریزی سے محمد بن عبدالوہاب کی ایک ایسی سوانح عمری مرتب کر رہے ہیں، جس سے صاحب سوانح کے تمام کارنامے سامنے آجائیں، اور دوستوں اور دشمنوں دونوں کی غلطیاں زائل اور غلط فہمیاں دور ہو جائیں، اور مشرق و مغرب میں جو کچھ اس کے متعلق لکھا گیا ہے، اس پر محققانہ تبصرہ بھی ہو جائے، اور معلوم ہو جائے کہ اس تحریک کا اصل منشا کیا تھا، اور وہ کہاں تک کامیاب ہوئی۔

(معارف ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۱ء)

(۵)

افسوس کہ ۵ ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۰ھ کو ہماری جماعت کے ایک لائق فرد مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی صدر مدرس مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے تقریباً ۵۰ برس کی عمر میں وفات پائی، انہوں نے اپنی پوری تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حاصل کی، اور سنہ ۱۹۱۲ء میں درجۂ تکمیل سے فراغت پائی، سنہ ۱۹۱۳ء کے آخر میں دارالمصنفین کے قیام پر وہ دارالمصنفین کے رفیق منتخب ہوئے، اور سلسلۂ سیر الصحابہؓ کی پہلی اور دوسری جلد خلفائے راشدین اور مہاجرین حصہ اول لکھی، ایک سال کے بعد یہاں سے کتب خانۂ ندوہ کی ترتیب کے لیے لکھنؤ گیے، اور اس کام سے ان کو ایسی دلچسپی ہوئی کہ بوہار امپیریل لائبریری کلکتہ میں ترتیب فہرست کے کام پر مقرر ہو گیے، اور وہاں سے اورینٹل لائبریری بانکی پور پٹنہ کی عربی کتابوں کی ترتیب فہرست کے کام پر لگائے گئے، اور کئی جلدیں بڑی قابلیت سے انگریزی میں مرتب کیں، اور گورنمنٹ کی طرف سے چھپیں، اس جگہ کی تخفیف ہونے پر دائرۃ المعارف حیدرآباد میں قدیم ہندوستانی تاریخی مقامات کا ایک جغرافیہ عربی زبان میں ترتیب دیا، جو دائرہ کی طرف سے چھپا ہے، یہاں سے نکل کر وہ چند روز رامپور کی سرکاری لائبریری میں مقرر ہوئے، اور آخر میں صوبہ بہار کی مشہور سرکاری عربی درسگاہ مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل مقرر ہوئے، اور اسی خدمت پر وفات پائی۔

وہ نہایت خاموش طبیعت، ملنسار، متواضع اور نیک دل تھے، وطن صوبہ بہار کے دو مشہور گاؤں گیلانی اور استھاواں میں تھا، نوجوانی ہی میں جب وہ دارالعلوم میں پڑھتے تھے، حج سے مشرف ہوئے تھے، اسی لیے وہ ہماری جماعت میں حاجی صاحب کے نام سے ایسے مشہور و متعارف تھے، کہ یہ ان کے اصلی نام کا جزو بن گیا تھا، انگریزی تعلیم صرف ندوہ میں چند ریڈروں تک پڑھی، مگر کام کرنے پر اپنی ذاتی محنت سے اتنی ترقی کی، کہ انگریزی میں فہرست کی ۲ ۳ دو تین جلدیں ایسی لکھیں، کہ اہل بصیرت نے بھی ان کی تعریف کی، اخیر زمانہ میں وہ کتب حدیث کا درس دیتے تھے، اور یہی انکا آخری کارنامہ ہے۔

اللہ تعالےٰ اس مجموعۂ فضل و کمال و اخلاق کو اپنی عطاء مغفرت سے سرفراز اور اس کی خدمتوں کو قبول فرمائے۔

اسلام کا سیاسی و اقتصادی نظام

نظام اسلامی کی ترتیب کا جو کام شروع ہوا تھا، وہ اب تک مختلف مفکرین سے خاکہ بنوانے اور سوالات مرتب کرانے کی منزل تک پہنچا ہے، اس سلسلہ میں جناب مولوی عبد الماجد صاحب دریابادی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اپنے اپنے خیالات لکھ کر بھیجے ہیں، جن کی روشنی میں آئندہ کام کا نقشہ تیار ہوگا، یہ ایک اہم تعمیری کام ہوگا، جو کسی شخصی خیال کے بجائے ایک پوری مجلس مفکرین اسلام کی طرف سے پیش ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ

مدیر نگار (یادش بخیر) نے اپنے پچھلے جاہلانہ اجتہادات پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا ہے، کہ دوسرے غیر معروف لوگوں سے (کہ خود اس میں تو اتنی قابلیت بھی شاید نہیں کہ صحیح و غلط میں تمیز کر سکے) ہماری کتابوں پر اعتراضات لکھوا کر ان کی تشہیر کرتا ہے، اور اس طرح اپنی مفروضہ نیک نامی کو جو علمی دنیا میں اس کو حاصل ہے، قائم رکھنے کے لیے آخری جد و جہد میں مصروف ہے، ہم کو اپنی غلطیوں کے ماننے میں اگر وہ صحیح ہیں، تو کوئی پس و پیش نہیں، بلکہ ہم الٹے اس کے ممنون ہوں گے، لیکن اس حیلہ سے مدیر مذکور کا دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرنا کہ ہم اس کے ہفوات کا جواب صرف شخصی اختلاف کی بنا پر لکھتے ہیں، مضحکہ انگیز طریق استدلال ہے، کہ بہر حال غلطی غلطی ہے، اور سرقہ سرقہ ہے۔

مدیر نگار کی تردید میں "البیان" امرتسر کا خاص نمبر

ہم نے اس کے جاہلانہ ہفوات کی تردید میں حق کے جن مضامین کی ترتیب کا خیال ظاہر کیا تھا، اس کو بحمد اللہ امرتسر کا رسالہ "البیان" نے انجام دیدیا، معاصر موصوف نے تمام جوابات کو اپنے ایک خاص نمبر میں جمع کر کے مدیر نگار دل نگار کی خدمت میں نذر پیش کیا ہے، اس مجموعہ میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا منظور احمد نعمانی اڈیٹر الفرقان، پروفیسر سعید احمد اکبرابادی، ایم۔ اے، مولوی محمد اویس نگرامی ندوی رفیق دار المصنفین، پرنسپل ڈاکٹر تاثیر ایم۔ اے۔ ڈپٹی سید مقبول احمد صاحب بی۔ اے، جناب عرشی صاحب اور جناب محمد اقبال سلمانی صاحب، مدیران البیان وغیرہ کے مضامین جمع ہیں، ناموں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے، کہ ایک مشترک مقصد کی حمایت میں تمام مختلف الخیال مسلمان بحمد اللہ متحد ہیں، یہاں تک کہ وہ بھی جو کبھی نگار کے مضمون نگار رہتے، سلمان صاحب کا اول و آخر مضمون خود مدیر نگار

کے پڑھنے کے قابل ہے۔

شخص مذکور کا فریب علم تو پوری طرح آشکارا ہو چکا، اب اس کی ادبی حیثیت کا فریب بھی عنقریب کھل جائے گا، اس کی سب سے مایہ ناز ادبی تصنیف "شہاب" کی سرگذشت ہے، جس کی بہ نسبت بانگ دہلی آج بتایا جاتا ہے، کہ وہ مشہور انگریز افسانہ نویس، اسکر وائلڈ کی کتاب ڈورین گرے کی تصویر زندگی ...... (A Picture of Dorian Grey) کا سرقہ ہے، بلکہ کہیں کہیں "نقرئی آواز" وغیرہ اس کا لفظی و بے معنی ترجمہ ہے، اس اظہار جرم کے بعد مدیر نگار کے نزدیک سب سے بڑے ندوی (مدیر معارف) کی "اخلاقی پستی" اب کتنی اور زیادہ پست نظر آنے لگے گی

(معارف ماہ مئی سنہ ١٩٤١ء)

(٦)

ایک نیا علم کلام زمانہ کے انقلابات جہاں نوجوان مسلمانوں کو دنیا کی نئی عالمگیر تحریکات کی طرف کھینچ رہے ہیں، وہاں ایسے نوجوانوں کا طبقہ بھی موجود ہے، جو اسلامی تخیل اور اس کی عالمگیر تحریک کی حقیقت کو سمجھنا اور زمانۂ حال کی زبان میں اس کی تعبیر اور فہم و تفہیم کے لیے بے تاب ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ جس طرح تاریخ کے پچھلے دوروں میں اسلام کے دفاع کے لیے حسب ضرورت علم کلام کے مختلف نقشے بنتے اور بگڑتے رہے، اسی طرح یہ دور بھی اسلام کے لیے ایک نئے علم کلام کا مقتضی ہے، جس کا مقصد اجتماعی، سیاسی، اقتصادی تنظیمات میں اسلام کی صحیح رہبری ہے۔

مجلس نظام اسلامی جو ہماری کمیٹی کی خواہش کے مطابق اس کام کو انجام دے رہی ہے، وہ اسی اقتضائے حال کی تعمیل ہے، مسلم یونیورسٹی کی مجلس اسلامیات کے سالانہ جلسوں میں علماء جو مضامین بیان کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر ایسے ہی مباحث پر ہوتے ہیں، جو زمانہ کی ضرورتوں کو سامنے رکھکر پیش کیے جاتے ہیں، مجلس مذکور نے اب یہ طے کیا ہے، کہ ان تقریروں میں سے اہم مباحث کو رسالوں کی صورت میں شائع کیا جائے۔ چنانچہ اس سے پہلے اسلامی نظام سلطنت کے ایک پہلو پر، اور اب اسلام اور سائنس پر، اور آئندہ ایمان باعتبار بنیاد عمل پر ایک رسالہ شایع کیا جا رہا ہے۔

خورشید الاسلام کا ایک خط

اس سلسلہ میں ابھی ایک خط ہم کو مسلم یونیورسٹی کے ایک پُرجوش اور صاحب فکر طالب علم خورشید الاسلام صاحب کی طرف سے موصول ہوا ہے، جس میں انہوں نے اپنی آفتاب مجلس کی طرف سے ایک کتاب کی اشاعت کی اطلاع دی ہے، جس میں امام غزالی سے لے کر جمال الدین افغانی اور اقبال تک اسلام کے مفکرین نے جتنے نظریے پیش کیے ہیں، ان کی تشریح ہوگی، ہم موصوف کے اس خط کو یہاں نقل کرتے ہیں، تاکہ ہمارے نوجوانوں کے خیالات کی ایک ہلکی تصویر اہل فکر کے سامنے آجائے، وہ لکھتے ہیں

جیسا کہ آپ کو اعلان سے معلوم ہوگا، ہم لوگوں کی تجویز ہے کہ ایک ایسی کتاب شائع کی جائے، جو ہمارے سامنے ہمارے بڑے بڑے مفکرین کی زندگی اور ان کے خیالات کو اس طرح پیش کرے، کہ مسلمانوں اور بالخصوص موجودہ دور کے مذہبی اور سیاسی عقائد پر ان کا عمدہ اثر ہو، مستقبل کی تعمیر میں جہاں شخصیتیں بظاہر پیش پیش نظر آتی ہیں، وہاں اصول اور نظریے تہ میں کام کرتے ہیں، نظریوں میں جس قدر سچائی، گہرائی اور توانائی ہوگی، تحریکیں اسی قدر کامیاب، کوششیں اسی قدر بارآور، اور مستقبل اسی قدر شاندار ہوگا۔ ابھی تک ہماری تحریکیں وقتی جوش کا مظہر رہی ہیں، اور بس، ہم نے صرف ردعمل کیا ہے، ہم تھوڑا سا احساس پیدا کر سکے ہیں، لیکن حرکت اور رفتار کے عناصر ہماری قوم سے ابھی تک مفقود ہیں، جو نوجوان شکست خوردہ ذہنیت رکھتے ہیں، وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، کہ اسلام زندگی کا ایک نظام ہے، وہ بڑا احسان کرتے ہیں، تو اسلام کو صرف ایک نجی معاملہ مان لیتے ہیں، نہ زیادہ نہ کم، بزرگ اپنی جگہ پر اتنے مطمئن ہیں، کہ حجرہ کی جالیوں سے باہر جھانکنا بھی پسند نہیں کرتے، اور وہ صاحبان جو قوم کے سیاسی مزاج کو سنوار رہے ہیں، دور حاضر کی کمزوریوں، پیچیدہ نظریوں اور سیاسی تخیلات سے مطلق بہرہ نہیں رکھتے، اس لیے ضرورت ہے کہ ہم ان بزرگوں کے نظری (Theoretical) اور عملی (practical) فلسفہ کو ایک بار گرد و غبار ہٹا کر پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں،......

..... فلسفہ پر درسی کتابیں بہت موجود ہیں، اور خصوصاً نظری پہلو پر، لیکن یہ بقول ایچ، جی ویلز روٹی کے بجائے چکی کے پتھر چبانا ہیں، اس لیے ہم اس کے عملی پہلو پر زیادہ زور دیتے ہیں، حضرت رومی، شاہ ولی اللہ اور ڈاکٹر اقبال ہماری زندگی کو کن سانچوں میں ڈھالنا چاہتے ہیں، اسے کیا آب و رنگ دینا چاہتے ہیں، ہماری

معاشرتی اور سیاسی اصلاح کن بنیادوں پر ہونی چاہیے، آج کل کے مسائل کیا ہیں؟ وہ زمانہ ماضی کے مسائل سے کس حد تک اپنی فطرت اور کردار میں مختلف ہیں، آیا یہ بزرگ اسلام کی روشنی میں ان کا کوئی حل پیش کرتے ہیں یا نہیں، موجودہ جمہوریت، آمریت، اور بادشاہی کس حد تک اسلام کی زد میں آتی ہیں، آیا اسلامی سوسائٹی کے لیے اسلامی ریاست کا قیام ضروری ہے یا نہیں، اشتراکیت کا جواب ہمارے پاس کیا ہے، اور سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے کیا دنیا خدا کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے، اور اگر قانون کو خدا کی ذات سے انسانی سماج کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ تو انسان آزادی، سربلندی اور خوشی کی زندگی گذار سکتا ہے، یہی سیکڑوں مسائل ہیں، جنھوں نے ہمارے دماغوں کو پراگندہ کر دیا ہے، آجکل سماجی مسائل پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، اس لیے ہمیں اسلام کی زندگی، صحت اور فوقیت تسلیم کرانا ہوگی، ورنہ دنیا ہی گمراہی کی طرف نہیں جائے گی بلکہ جوں جوں یہ مغربی تعلیمات یا روس اور جرمن نشان کے نظریے پھیلتے جائیں گے۔ مسلمانوں کو دین اور اس کے بعد قوم پر سے یقین اٹھتا جائے گا۔ مجھے یقین ہے، کہ آپ میری بے تکلفی کو معاف فرمائیں گے۔

(معارف ماہ جون سنہ ۱۹۴۱ء)

(۷)

دیسنہ اور اس کے اطراف میں ہندوؤں کے مسلمانوں پر مظالم

سالانہ دستور کے مطابق ان دنوں میرا قیام اپنے وطن بہار میں ہے، شہر بہار اور اس کے اطراف کے دیہاتوں میں مسلمانوں پر ہندوؤں کے مظالم اور ان کے حملوں کی اطلاعیں اخباروں کے ذریعہ عام ہو چکی ہیں، ان میں ستائیس مسلمان شہید ہو گئے، جن میں بوڑھے، بچے اور عورتیں سبھی شامل ہیں، اور سو سے زیادہ زخمی ہیں، سات آٹھ مسجدوں کو نقصان پہنچایا گیا، کئی قبریں توڑی گئیں، اور بہت سے مکانوں کو آگ لگا دی گئی، اسوقت بہار کی عدالت میں مقدمے پیش ہیں، یورپین اور عیسائی مجسٹریٹ عدالت کی کرسیوں پر ہیں، ملزم حاضر کئے جا رہے ہیں، اور گواہوں سے ان کی شناخت کرائی جا رہی ہے، مگر بلوائے عام کے ملزموں اور مجرموں کی شناخت جس قدر مشکل ہے، وہ ظاہر ہے، اور اس کا نتیجہ جو کچھ ہو سکتا ہے وہ بھی چھپا نہیں،

مسلمانوں کے لئے چند تجاویز

اس واقعہ نے متعدد نتیجے نگاہوں کے سامنے کر دیئے ہیں، ایک یہ ہے کہ ان سارے ہنگاموں میں مسلمانوں نے کسی ہندو پر از خود حملہ نہیں کیا، بلکہ ان کی حیثیت ہر جگہ اور ہر حالت میں مدافعانہ رہی، دوسری بات یہ ہے کہ جہاں چند مسلمانوں نے بھی جرأت و ہمت سے کام لیا، اور حملہ آوروں کا شجاعت سے مقابلہ کیا، خدا کی موعودہ نصرت ان کے پاس پہنچی، اور دشمنوں کے منہ پھیر دیئے، لیکن جہاں کہیں انہوں نے بھاگ کر چھپنے کی کوشش کی، وہیں مارے گئے اور اپنی سزا کو پہنچے۔

اس واقعہ نے ان دیہاتوں میں جہاں مسلمانوں کی آبادی کم ہے، سراسیمگی پھیلا دی ہے، اور وہ اپنے گانوں چھوڑ کر بھاگے، اور وہاں سے ہٹنے کی کوشش میں ہیں، اور مسلمانوں کی بعض انجمنیں بھی یہی چاہتی ہیں، کہ ایسے دیہاتوں سے مسلمانوں کو نکال کر محفوظ مقامات میں جہاں مسلمان زیادہ تعداد میں ہیں، آباد کر دیں، یہ صورت اچھی ہے، اور آیندہ کے لیے ان کی حفاظت کی تدبیروں میں سے ایک تدبیر یہ بھی ہے، مگر ہماری نظر ایک اور واقعہ پر ہے، مسلمانوں کا اس ملک میں قیام اللہ تعالےٰ کے فضل وکرم کے بعد صرف ان کی ذاتی قوت بازو پر موقوف ہے، مسلمانوں کی ہر آبادی

اسلام کا ایک مورچہ ہے، کسی مورچہ کو بے لڑے بھڑے دشمن کے حوالہ کر دینا آئینِ جنگ نہیں، جس طرح مسلمانوں نے اس ملک کے ایک ایک چپہ کو اپنے خون سے حاصل کیا ہے، ویسے ہی اس کے ایک ایک چپہ کو اپنے خون ہی سے بچانا ہے، دیکھئے اس جنگ میں اپنی سلطنت کے بچاؤ کے لیے کتنی جانی اور مالی قربانیاں دینی پڑ رہی ہیں، مگر قدم پیچھے نہیں ہٹاتے، مسلمان بھی کبھی اپنی سلطنت کے بچاؤ کے لیے یہی حق ادا کرتے تھے، لیکن جس دن سے ان پر بزدلی چھائی، اور اجتماعی زندگی کی اہمیت پر انفرادی اور شخصی زندگی کی اہمیت غالب آگئی، ہندوستان کے ہر معرکہ میں وہ پیچھے ہٹ گئے، اب پھر ان کو اسی طرح اپنی اجتماعی زندگی کا ثبوت دینا ہے، اور ہر حال میں اسلام کے ہر مورچہ کو بچانا ہے، اور دنیا پر یہ ثابت کرنا ہے کہ ان کو بھی اس ملک میں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔

ہندو مسلم اتحاد اور سمجھوتے کی ضرورت پر ہمارے قلم نے بارہا مضامین لکھے ہیں، اور اب بھی اس ضرورت کے قائل ہیں، مگر گڑگڑا کر دشمنوں سے اپنے زندہ رہنے کی التجا کرنے سے مردانہ وار مرجانا بہتر جانتے ہیں، کیونکہ مردانہ وار مظلومانہ موت بھی زندگی سے کم نہیں

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

بہرحال ایسے صوبوں میں جہاں مسلمان بڑی اقلیت میں ہیں، مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کی تدبیر سے غفلت برتنا نہیں چاہیے، مگر اس بات کو پوری طرح باور کرنا ہے، کہ ان کی زندگی نامردی اور مرعوبیت میں نہیں، بلکہ شجاعانہ مدافعت اور اسلام کی برتر قوت پر یقین میں ہے، کوئی قوم دشمنوں کے مارنے سے نہیں مرتی، اپنی اخلاقی اور ایمانی موت سے مرتی ہے، ہم کو اسی کی کوشش کرنا ہے، کہ مسلمانوں کو ان کی اخلاقی اور ایمانی موت سے بچائیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سلطنت وقت ان کی حفاظت کی ذمہ دار ہے، اور اسی ذمہ داری کے زیر سایہ وہ اپنی زندگی کا خواب دیکھتے ہیں، وہ سخت غلطی پر ہیں، کوئی سلطنت نہیں، بلکہ ہر قوم اپنی زندگی اور بقا کی ذمہ دار ہے، اور قوم کے نوجوانوں پر جو ملت کے سپاہی ہیں، قوم کی حفاظت کا فرض عائد ہوتا ہے، مگر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری قوت کا سرچشمہ ہماری ایمانی طاقت کا خزانہ ہے، اسی خزانہ کی حفاظت تیغ و خنجر کے بجائے

اسلام کی حقانیت کی تلوار اور ایمان باللہ کے خنجر سے ہو سکتی ہے۔

(معارف جولائی ۱۹۴۱ء)

(۸)

مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی کی وفات

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ فرنگی محل کے ممتاز عالم مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی نے ۸ جولائی ۱۹۴۱ء کو دفعتہً وفات پائی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم ابھی ۲۴، ۲۵، ۲۶ جون کو ہمارے ساتھ بھوپال میں عربی مدارس کی اصلاح کے کام میں شریک تھے، وہیں درد شکم میں مبتلا ہوئے، جس کے باعث وہ کئی دن تک وہاں علیل رہے، سوء ہضم، تسلسل بول، اور ضعف قلب کے عوارض ان کو پہلے سے لاحق تھے، بھوپال میں مرض کی تخفیف کے بعد وہ لکھنؤ روانہ ہوئے، اور میں بھی انہی کی وجہ سے ان ہی کے ساتھ لکھنؤ تک آیا۔ لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچ کر مرحوم نے کہا کہ میں آپ کی زحمتوں اور خدمتوں کا شکریہ اس لیے نہیں ادا کروں گا، کہ میں آپ کو اپنے سے علٰحدہ نہیں سمجھتا، یہ کہہ سنکر سلام کے بعد ہم دونوں الگ ہو گیے، یہ کون کہہ سکتا تھا، کہ یہ سلام رخصت آخری سلام ہے۔

مرحوم فرنگی محل کے خانوادہ میں تنہا جامع علوم و فنون ہستی باقی رہ گیے تھے، معقولات اور منقولات پر ان کو یکساں دسترس حاصل تھی، مسائل پر وہ مبصرانہ اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے، اردو میں تاریخ، حدیث و رجال پر کئی رسالے لکھے تھے، مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرس اور اچھے مدرس تھے، سیاسیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، خلافت اور مسلم لیگ کے کاموں میں حصہ لیتے رہتے تھے، کل چون ۵۴ برس کی عمر پائی، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی عنایتوں سے سرفراز فرمائے۔

حیات شبلی کی طباعت

خدا خدا کر کے حیات شبلی کی تالیف نو ۹ سو صفحوں میں جا کر تمام ہوئی، یہ نہ صرف مولانا شبلی کی زندگی کی شخصی تاریخ ہے، بلکہ ان کے زمانہ کے چالیس ۴۰ سال کی قومی زندگی کی تاریخ ہے، کتاب مطبع کے سپرد کر دی گئی ہے، اور اس وقت تک اس کے ڈیڑھ سو صفحوں کی کتابت ہو چکی ہے، کاغذ کی گرانی ہے، ڈر لگتا ہے کہ اس ضخامت کی کتاب جلد نہ چھپ سکے۔

خطبات شبلی مقالات شبلی کی آخری قسط خطبات شبلی کے نام سے چھپ کر پوری ہو گئی، اس حصہ میں مولانا کی وہ تقریریں ہیں جو انہوں نے علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوہ کے جلسوں اور عام مجمعوں میں کیں، افسوس ہے کہ ان کی یہ تقریریں بہت کم محفوظ رہیں، تاہم جو کچھ مل سکیں وہ ان اوراق میں جمع کر دی گئیں

دائرۃ المعارف کی نئی مطبوعات دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن کے علمی کارناموں کا ذکر بار بار آیا ہے، دائرہ نے اس سال بہت سی نادر کتابیں شائع کی ہیں، جن میں سے رسائل ابن ہیثم اور رسائل طوسی، علم مناظر اور ریاضیات میں، کتاب المعتبر ابو البرکات بغدادی، فلسفہ میں، میزان الحکم خازنی طبیعیات میں، تاریخ منتظم ابن جوزی تاریخ میں، الکفایۃ فی علم الروایۃ حاکم اصول حدیث میں بہت اہم کتابیں ہیں، اس سلسلہ میں ایک اور اہم کتاب کی چھپائی شروع ہو گئی ہے، یعنی امام بخاریؒ کی تاریخ کبیر جو علم رجال کی مستند اور اولین کتاب ہے، دائرہ کو ان کتابوں کی اشاعت پر مبارکباد دی جا سکتی ہے۔

اردو انسائیکلوپیڈیا ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن نے اردو کی ایک عظیم الشان خدمت اپنے ذمہ لی ہے، یعنی ایک اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب و اشاعت، حیدر آباد میں جدید و قدیم علوم و فنون کے اساتذہ اور ماہرین کی بہت بڑی جماعت موجود ہے، جن کی موجودگی میں اس کام کے انجام کی پوری توقع کی جا سکتی ہے، ادارۂ مذکور نے علوم و فنون کی تقسیم اور ان کے ذمہ دار ایڈیٹروں کے نام کا انتخاب کر لیا ہے، اور حیدر آباد کے باہر علماء اور اہل علم سے حصول امداد کی کوشش بھی کر رہا ہے، ضرورت ہے کہ اردو کے ہمدرد اور بہی خواہ اس کام میں اس کی ہمت بڑھائیں، ادارۂ مذکور سے رفعت منزل حیدر آباد دکن کے پتہ سے خط و کتابت کی جا سکتی ہے۔

مدرسہ رفیع الاسلام پشاور پشاور میں عربی کا ایک مدرسہ رفیع الاسلام ہے، مدرسۂ مذکور کی ملکیت میں ایک نادر کتاب خانہ ہے، جس میں چھ ہزار کتابیں ہیں، جن میں بہت سی قلمی کتابیں بھی ہیں، پشاور کے قیام میں اس کتاب خانہ کا ذکر میں نے سنا، لیکن دیکھنے کی نوبت نہیں آئی، معارف کے مئی نمبر ۵ ص ۳۹۲ میں تاریخ محمود شاہی کا ذکر ہے، جس کا نسخہ نہیں ملتا، مدرسۂ مذکور کے مہتمم صاحب مولوی

فضل صمدانی صاحب نے مجھے مطلع کیا ہے کہ اس کتاب کا نسخہ ان کے کتب خانہ میں موجود ہے، اسی طرح جولائی اور اگست کے پرچہ میں مظہر کڑہ کی جس شرح ظہور الاسرار کا ذکر ہے، اس کا نسخہ بھی اس میں موجود ہے. کتاب کا نام فخر الاسرار اور مصنف کا نام مظہر بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود البلخی المعروف بکری ہے۔

(معارف ماہ اگست سنہ ۱۹۴۱ء)

(۹)

ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں ایک "ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کی بنیاد ڈالی گئی ہے، جس کا مقصد اسلامی تاریخ پر مستند اور محققانہ کتابوں کی اشاعت ہے، اس سلسلہ میں ہندوستان میں عہد اسلامی میں طریق عدالت کی تاریخ پر ایک انگریزی کتاب شائع ہوئی ہے، اس کتاب کے جو ریویو نکلے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ کتاب کے مباحث خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

یہ سن کر بھی خوشی ہوئی کہ اس انسٹی ٹیوٹ کی مالی امداد کے لیے نواب صدر یار جنگ بہادر نے پچاس روپیے ماہوار منظور کیے ہیں، اور نواب مزمل اللہ خاں مرحوم کی ریاست کی طرف سے یکمشت چھ ہزار کی رقم عنایت ہوئی، ان کے علاوہ جناب محمد بشیر احمد صاحب آئی، سی، ایس نے ۲۳۵ دو سو پینتیس روپیے پیش کیے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان اوسوں سے پیاس نہیں بجھ سکتی، ضرورت ہے کہ کم از کم پچاس ہزار کا سرمایہ اس کے لیے الگ کیا جائے، اور اس روپیے کو صرف نام پر نہیں، بلکہ کام پر خرچ کیا جائے، اس مجلس کی انتظامیہ کمیٹی نے یہ بھی طے کیا ہے، کہ جن مصنفوں کی کتابیں اس سلسلہ میں اشاعت کے لیے منظور کی جائیں گی، ان کو ان کی تصنیف کا معاوضہ بھی دیا جائے گا۔

ہماری رائے میں ابھی کمیٹی کو اس عالی ہمتی کی ضرورت نہ تھی، اگر شروع میں طمع کے بجائے اخلاص کارفرما ہو، تو بہتر ہے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس مجلس کے کام کو "عیش" کے طور پر نہیں، بلکہ کاروباری طور پر چلایا جائے، جس سے بہت ممکن ہے، کہ وہ اپنے پانوں پر آپ کھڑی ہو جائے۔

رحمت عالمؐ کی فروخت رحمت عالمؐ کی فروخت کے سرمایہ میں بحمداللہ کہ اس وقت تک تین ہزار چھ سو ۳۶۰۰ روپیے دفتر میں جمع ہو گیے ہیں، کچھ سو مختلف شہروں میں ایجنٹوں کے پاس باقی ہوں گے، جس کے یہ معنی ہیں کہ اس مد میں چار ہزار کے قریب ہو جائیں گے۔ ابھی آٹھ سو کے قریب جلدیں اور باقی ہیں، اگر احباب توجہ کریں تو چند ہی روز میں اس کے دوسرے اڈیشن کی ضرورت ہو جائے گی۔

دار الاقامہ کی تعمیر سب کو معلوم ہے، کہ یہ پوری رقم مصارف طبع کی منہائی کے بعد کم و بیش ایکہزار ہے، دار العلوم ندوہ کے چھوٹے بچوں کے دار الاقامہ کی تعمیر میں صرف ہوگی، اس عمارت کا مختصر سا نقشہ بن گیا ہے، جس میں ۱۳ × ۱۲ کے پانچ کمرے رکھے گیے ہیں، جن کا کم از کم تخمینہ سات ہزار روپیہ ہوتا ہے، یعنی ہماری مد میں ابھی تین ہزار کی کمی ہے، کام تو بہرحال شروع ہو جائے گا، جس خدا نے یہاں تک سامان کیا ہے، وہ باقی کا بھی سامان کر دیگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

رحمت عالمؐ کا ہندی ترجمہ رحمت عالمؐ کے ہندی ترجمہ کی جو تجویز تھی، خدا کا شکر ہے، کہ وہ عمل میں آرہی ہے، ہندی ترجمہ کا کام پورا ہو گیا، اور وہ اس وقت جسٹس مولوی معین الدین صاحب انصاری (رام پور) کے پاس ہے، موصوف اس پر ہندی میں مقدمہ لکھنا چاہتے ہیں، وہاں سے آجائے، تو وہ پریس میں بھیج دیا جائے، جن احباب نے اس کے چندہ میں حصہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، ضرورت ہے کہ وہ اب ایفا بھی فرمائیں۔

امسال دسمبر میں حیدرآباد میں ملک کی بڑی بڑی علمی و تعلیمی مجلسوں کے جلسے ہیں، آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، انڈین ہسٹاریکل کانگریس، اور شاید علی گڈھ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس وہاں ہوں گے، امید ہے کہ ملک کے اہل علم اور اصحاب کمال دور دور سے آکر اس میں شرکت کریں گے۔

دائرہ معارف اسلامیہ لاہور کا اجلاس ندوہ لکھنؤ میں ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کا پچھلا اجلاس دہلی میں ہوا تھا، جس کی روداد چھپ گئی ہے، یا چھپ رہی ہے، اور اس کے آیندہ اجلاس کی تجویز دار المصنفین اور طلبائے قدیم ندوۃ العلماء کی دعوت پر لکھنؤ میں ہوئی تھی، لیکن جنگ کے ناگزیر

اسباب کی بنا پر اب تک یہ اجلاس منعقد نہ ہو سکا، خیال ہے کہ جنگ کے خاتمہ کے انتظار میں اس جلسہ کو ملتوی نہ کیا جائے، اور ۱۹۴۲ء کے آغاز میں اپریل تک اس کے انعقاد کی کوشش کی جائے، امید ہے کہ دار المصنفین اور ندوۃ العلماء کے علاوہ مسلم یونیورسٹی اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بھی اس میں امداد حاصل کی جائے، مصارف کا تخمینہ ہزار بارہ سو ہے۔

(معارف ماہ ستمبر ۱۹۴۱ء)

(۱۰)

اس نمبر کے سر مقالہ میں ایک اہم اسلامی مسئلہ کی تحقیق کی طرف حضرات علمائے کرام کو متوجہ کیا گیا ہے، امید ہے کہ ان میں سے وہ حضرات جو فقہی مسائل میں بصیرت رکھتے ہیں، اس کی طرف توجہ فرمائیں گے، بحث صرف خالص فقہی نقطہ نظر سے ہو، حشو و زوائد اور طعن و طنز سے پرہیز کیا جائے۔

رحمت عالمؐ کے ہندی ترجمہ کے لئے امداد!

رحمت عالم کے ہندی ترجمہ کے لیے حسب ذیل اصحاب کی طرف سے امدادی رقمیں وصول ہوئیں۔

ایک پروفیسر از حیدرآباد دکن	مار
ایک پروفیسر از رانچی، بہار	صہ/
عبدالرزاق سعید بن عمر از بمبئی	ڡعہ/
مجیب الحق صاحب بختیار پور، مونگیر	صہ/
	ا/ معہ/

اس رقم میں سے اس کے ہندی ترجمہ میں سہ/ خرچ ہوئے، باقی چھپائی میں تقریباً دو سو کی ضرورت ہوگی۔ ا/ للعہ موجود ہے، باقی سہ کی کمی ہے۔

الکلام کے نئے اڈیشن پر دیباچہ

مولانا شبلی مرحوم کی مشہور تصنیف "الکلام" جس میں اسلامی عقائد پر متکلمانہ بحث ہے، بار بار چھپ چکی ہے، اب دار المصنفین نے اس کا ایک نیا اڈیشن

شایع کیا ہے، جس کے شروع میں اڈیٹر معارف کے قلم سے ایک دیباچہ ہے، جس میں اس کتاب کے بعض مسائل پر تبصرہ ہے، اور کتاب میں جا بجا مفید حواشی ہیں، جن سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں، اور اگر کتاب میں کوئی غلطی رہ گئی ہے، تو اس کی تصحیح کر دی گئی ہے، ان وجوہ سے اب یہ کتاب ان لوگوں کے لیے مفید بلکہ ضروری ہے جن کے پاس اس کا پہلا اڈیشن ہو۔

جس طرح کسی انسانی جسم میں فاسد مادے جمع ہو جاتے ہیں تو بخار، درد اور دوسرے عوارض پیدا ہو جاتے ہیں، اور جب وہ فاسد مادے نکل جاتے ہیں، تو جسم میں صحت کا نور جھلکنے لگتا ہے، اسی طرح لڑائی دنیا کے جسم میں فاسد مادوں کے اجتماع کا لازمی نتیجہ ہے، اس لیے اگر اس وقت دنیا خون میں نہا رہی ہے، تو اس سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، ممکن ہے کہ وہ اس غسل سے نکھر رہی ہو۔

یہ تو صاف نظر آتا ہے کہ جو قومیں اپنی قوت کے غرور میں خدا کو بھولی ہوئی تھیں، اس مشکل کے وقت میں اب اسی کا سہارا ڈھونڈ رہی ہیں، بالشویک روس ابھی زندہ ہے، مگر اس کے ماننے والوں کے ایمان میں فرق پیدا ہو چلا ہے، یہاں تک کہ خود اس کو اپنی مذہبی ناطرفداری کا اعلان کرنا پڑا

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا۔

دولت کی بہتات، تمدن کے فساد اور اخلاق کے بگاڑ کا سبب ہے، اس لیے قرآن نے بتایا ہے، اور تاریخ نے اس کی تصدیق کی ہے، کہ انسانیت کی بہت سی تمدنی برائیاں دولت کی افراط کا نتیجہ ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ	اور ہم نے کتنی آبادیوں کو جو اپنی دنیا
بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ	کے عیش میں اترا رہی تھیں، برباد کر ڈالا
لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا	یہ ہیں ان کے رہنے کے مقامات جن میں
قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۝	پھر کوئی نہیں بسا، مگر کم، اور ہم
(قصص - ۶)	ہی اس کے مالک رہ گیے۔

کم نگاہ انسان خدا کے ہاتھ کو گوشت پوست کی صورت میں اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے،

حالانکہ اسکے انتقام کا ہاتھ آگ، پانی، بجلی، زلزلہ، وبا، لڑائی غرض ان مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے جن سے گنہ گار قومیں ہلاک ہوتی رہی ہیں۔

تاریخ کے ظاہر بیں برباد شدہ قوموں میں عاد، ثمود، فرعون، قوم صالح وغیرہ ناموں کو سن کر غیر تاریخی وجود کا شبہہ کرتے ہیں، حالانکہ یہ غیر تاریخی بھی نہیں ہیں، تاہم ان تاریخی قوموں میں بھی اس انجام کی مثالیں کم نہیں، قدیم یونانی کیا ہوئے، رومہ کے بسنے والے کہاں ہیں، کارتھج کے بہادر کدھر گیے، ستھنیس کہاں ہیں، بابل، نینوئی اور مصر میں خدائی کا دعوئی کرنے والے کدھر گیے، ایران کے پاک نژاد کیانی کس سیلاب میں بہہ گیے، سلجوق، غزنی، غوری، یلم کہاں گیے، کیا ان میں سے ہر قوم قرآن پاک کے دعوئی کی شہادت نہیں۔

جو کچھ کل ہوا ہے، وہ آج بھی ہوگا، عاد، ثمود، فرعون، نمرود کے مثالی پیکر ہر زمانہ میں ہوئے ہیں، اور ہر زمانہ میں ہوں گے۔ ان کے پیکر بدلتے رہتے ہیں، لیکن حقیقت نہیں بدلتی، اسی طرح قومی بربادیاں بھی ہر زمانہ میں بھیس بدل کر آتی ہیں۔ مگر اس کی حقیقت عذاب الٰہی ہی کی طرح ہے، جو کبھی نہیں بدلے گی، غفلت کا ماتا انسان جس طرح ہر مصیبت کو کسی مادی سبب کا نتیجہ بتا کر اپنی جگہ پر مطمئن ہو جاتا ہے، اور آخر برباد ہو جاتا ہے، اسی طرح غفلت شعار قومیں بھی مادی اسباب میں چھپی ہوئی حقیقت سے نا آشنا رہ کر فنا ہو جاتی ہیں۔

فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا	اور کتنی آبادیوں کو ہم نے ہلاک
وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ	کر دیا کہ وہ گنہگار تھیں، تو وہ اپنی گری
عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ	ہوئی چھتوں، بیکار ہوگیے ہوئے کنووں
وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ،	اور اونچے محلوں سمیت اجڑ گئیں۔

(معارف ماہ اکتوبر ۱۹۴۱ء)

(۱۱)

اسلام کا سیاسی نظام | مجلس نظام اسلامی کی خواہش کے مطابق، اسلام کے سیاسی و اقتصادی

نظامات پر جو کتابیں لکھی جا رہی تھیں اس کا پہلا حصہ جو سیاسی نظام پر ہے، تقریباً مکمل ہو گیا ہے، مولانا اسحاق صاحب ندوی سندیلوی سابق مدرس جامع العلوم کانپور اس کو مرتب کر رہے ہیں، موصوف انگریزی بھی جانتے ہیں، اور انہوں نے ان مسائل کا کافی مطالعہ کیا ہے، اور ان پر رسائل و مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں

درۃ التاج لغرۃ الدباج ایران اس وقت جس سیاسی کش مکش میں مبتلا ہے، اس سے کون واقف نہیں، لیکن یہ بات حیرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ اس کش مکش اور پریشانی کے ساتھ ساتھ علم و فن کی خدمت کرنے والے اس حالت میں بھی اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، اسی ہفتہ ایران سے ایک نئی کتاب "درۃ التاج لغرۃ الدباج" فارسی تصنیف علامہ قطب الدین شیرازی المتوفی ۷۱۰ھ چھپ کر آئی ہے، دباج اس زمانہ میں گیلان کا ایک امیر تھا، جس کے نام پر یہ کتاب لکھی گئی ہے، کتاب قدیم فلسفہ و حکمت کی ساری شاخوں پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، بالفعل اس کے پانچ حصے شایع ہوئے ہیں، سید محمد مشکوٰۃ نام ایک ایرانی فاضل نے متعدد قلمی نسخوں کی مدد سے اس کی تصحیح کی ہے، اور شروع میں تصنیف اور مصنف پر ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے،

ہر زمانہ میں پیروانِ مذہب کے اندر اہل عقل اور اہل نقل کے دو گروہ قائم رہے ہیں، اور آج بھی موجود ہیں، اہل عقل یہ چاہتے رہے ہیں کہ ہر زمانہ میں جو علوم، خیالات اور افکار پیدا ہوتے رہتے ہیں، دین کو اس زمانہ کے لوگوں میں قابل قبول بنانے کے لیے اس کی ترجمانی ہر زمانہ میں اس کے علوم و افکار کے مطابق کی جاتی رہے،

بات یہ ہے کہ ہر زمانہ میں ایک نہ ایک کوئی ایسا نظری خیال پیدا ہو جاتا ہے، جو ہر طرح مشکوک، ناپائدار، اور بے دلیل ہونے کے ساتھ اس درجہ یقینی، پائدار اور مدلل معلوم ہوتا ہے، کہ اس زمانہ کا ہر انسان اس کو بے چون و چرا تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، متکلمین یہ چاہتے اور کرتے رہے ہیں، کہ دین کی تعبیر اور اس کے مسائل کی ترجمانی اسی کے مطابق کر دیں،

تاکہ اس زمانہ کے لوگ ان کو آسانی سے قبول کرلیں۔

ابھی جدید علم کلام کی آفرینش کو نصف صدی بھی نہیں گذری کہ اس پر چار دور گذر گیے، سرسید نے جن کے زمانہ میں سائنس کا نیا نیا زور تھا، فطرت اور انکار خرق عادت کے اصول پر اس کو تول کر پیش کیا، انکی اس ترازو پر جو مسئلہ پورا اترا، اسکو مانا، اور جو نہیں آیا یا اسکو کم و بیش کرکے پورا آگیا تو اس کمی بیشی کے ساتھ قبول کرلیا اور اس پر بھی جو نہیں آیا اسکو رد کردیا، مولانا شبلیؒ کے عہد میں جدید تہذیب و تمدن کی گرم بازاری ہوئی، تو ان کی ساری عمر اسلام اور مسائل اسلام کو تہذیب و تمدن یا سویزیلیشن کے اصول پر سمجھنے اور سمجھانے میں گذر گئی، اور اسی لیے وہ ہمیشہ تاریخ اسلام اور تاریخ سلاطین اسلام سے تمدنی مسائل کی تحقیق کرکے اور ان کو موجودہ زمانہ کی تہذیب و تمدن کے نقطۂ نظر سے مستحسن کرکے دکھاتے رہے۔

ان کے بعد تیسرا دور سیاسیات کا آیا، جس میں عقائد و عبادات کے بجائے اسلامی مسائل میں سے سیاسیات کی بحث اہم ہوگئی، اور ان کی تعبیر جمہوریت، دستوریت، نظام شوریٰ، خلافت، امارت، وطنیت اور دین و ملت اور وطنیت میں تطبیق کی صورت میں نمایاں ہوئی، اس کے بعد ہی بالشوایزم نے جنم لیا، تو پیٹ اور روٹی اور مزدوری کے نظریے سامنے آگیے، متکلمین عصر نے ان کی تطبیق کی طرف توجہ فرمائی ہی تھی کہ یورپ کی یہ جنگ سامنے آگئی، اور نازی ازم اور فسزم کی تحریکوں کی قوت ظاہر ہوئی، اب اس زمانہ کے متکلمین اسلام کو ایک تحریک کا نام رکھکر سارے مسائل۔۔۔۔۔ کو حل کرنے میں مصروف ہیں۔

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

لیکن دوسرا فریق جو اہل نقل کا ہے، اس کے نزدیک اسلام کے حقایق و مسائل اپنی جگہ پر خود مستقل ہیں، ان کی تعبیر و ترجمانی کسی زمانہ میں بھی کسی عارضی مصالحت اور ہنگامی تطبیق کی خاطر ایسی نہیں کرنی چاہیے، کہ دین اطفال عقل کا بازیچہ بن جائے، اور اس کی اپنی اصل مستقل حیثیت کے بجائے دوسروں کے ضمیمہ کی ہو جائے، جو دھوپ چھاؤں کی طرح ہر نئی حرکت

آفتاب کے ساتھ نیا نیا رنگ بدلتا رہے۔

اہل عقل کے نظریہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے، کہ اس میں دین پر براہ راست قلبی یقین کے بجائے عقلیات کے سہارے یقین ثانوی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ سہارا جہاں ہٹا عقائد و اعمال کی ساری عمارت نیچے بیٹھ جاتی ہے، اس کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ چونکہ اس میں دین کی کوئی مستقل حیثیت قائم نہیں رہتی، بلکہ ہر عصر اور ہر زمانہ میں اس کے نئے نئے قالب بدلتے رہتے ہیں، اور اس کی نئی نئی شکلیں نکلتی رہتی ہیں، اس لیے یہیں سے فرقہ آرائی کا سامان پیدا ہوتا ہے، اور نئے فرقوں کا ظہور ہوتا ہے، اور پھر ہر طرف سے اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا کی لعنت برسنے لگتی ہے۔

(معارف ماہ نومبر ۱۹۴۱ء)

(۱۲)

رحمت عالمؐ کے ہندی ترجمہ کے لیے تین صاحبوں نے چندے بھیجے ہیں، اور یہ تینوں علماء کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، ایک صاحب نے دکن سے پچاس روپے بھیجے ہیں، اور دوسرے صاحب نے علی گڈھ کے نواح سے پچاس روپے عنایت فرمائے ہیں، اور تیسرے صاحب نے سی۔ پی کے ایک گوشہ سے پانچ روپیے ارسال کیے ہیں، اب اس کام کے لیے مزید چندہ کی ضرورت نہیں ہے، احباب زحمت نہ فرمائیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی
کا
انگریزی ترجمۂ قرآن

ایک زمانہ تھا، جب کسی مسلمان کے قلم سے قرآن پاک کا کوئی انگریزی ترجمہ موجود نہ تھا۔ لیکن ادھر بیس برس کے عرصہ میں مسلمانوں کے قلم سے بحمد اللہ متعدد ترجمے چھپ کر شایع ہو گیے ہیں، اور مسلمانوں میں پھیل بھی گیے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی ترجمہ بھی ایسا نہیں تھا، جس پر اہل علم اور علمائے دین کو پورا اعتبار ہوتا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مولانا عبدالماجد دریابادی بی۔ اے۔ برسوں سے کوشش کر رہے تھے، اور مسلسل کئی سال سے پورے انہماک کے ساتھ اس کام میں مصروف تھے، اب بحمد اللہ انکا یہ کام اتمام کو پہنچ گیا۔

اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ترجمہ حاصل مراد اور مطلب کا نہیں کیا گیا ہے، جس میں بیسیوں لفظی و معنوی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، بلکہ پوری لفظی پابندی کی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ ہر قرآنی لفظ کا ٹھیک ترجمہ صحیح انگریزی لفظ میں ادا ہو جائے، مطلب و معنی میں متبعین سنت کے اصول کی پیروی کی گئی ہے، یعنی ہر قسم کی فاسد تاویلات سے احتراز کیا گیا ہے، ہر آیت کے معنٰی اور اس کے حل کے تعین میں تفسیر کی تمام معتبر کتابوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے، جو آیتیں زیادہ شرح طلب تھیں ان پر حاشیے لکھے گیے ہیں، جن میں متعلقہ تاریخی، جغرافی کلامی، فقہی، تمدنی مسائل کی تفصیل کی گئی ہے، اور جہاں تورات، انجیل اور یہود و نصاریٰ کی مستند کتابوں کے حوالوں کی ضرورت پیش آئی ہے، ان کے حوالے دیکر قرآن پاک کی تصدیق کی گئی ہے۔ انگریزی ترجمہ کی صحت کے لیے متعدد انگریزی کے زبان دانوں سے مشورے بھی لیے گیے ہیں۔

ہمارے ملک میں مصنف و مترجم کی اصل دقت اپنے کام کے ختم کرنے کے بعد شروع ہوتی ہے، جب وہ اپنا کام ختم کر کے یہ آواز لگاتا ہے،

من قماش فروش دل صد پارۂ خویشم

پھر اس کے جواب میں کہیں سے کوئی آواز نہیں اٹھتی، چاہیے تو یہ تھا کہ اس کی تکمیل کی خبر پا کر کوئی سخی دریا دل اٹھتا اور دین کی ایک اہم خدمت سمجھ کر اس کی طبع و اشاعت کا کام انجام دیتا، بہر حال اس وقت اس کے طبع و اشاعت کی جو صورت پیدا ہو گئی ہے، وہ بھی اچھی ہے، یعنی لاہور کی مشہور تاج کمپنی نے تجارتی نقطۂ نظر سے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے، اس سے امید بندھتی ہے، کہ موجودہ زمانہ کی ناگزیر دشواریوں کے باوجود کچھ دنوں میں مسلمانوں کے ہاتھوں میں کلام الٰہی کا ایک مستند ترجمہ آجائے گا، انشاء اللہ اس ترجمہ سے نئے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں اور دنیا کے ان ملکوں کے مسلمانوں کو جہاں انگریزی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے، بے حد فائدہ پہنچے گا۔

معارف اسلامیہ لاہور کا سالانہ اجلاس لکھنؤ

ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کا سالانہ اجلاس، جیسا کہ آپ کو پہلے سے معلوم ہے، امسال لکھنؤ میں ہوگا، ادارہ کی مجلس عاملہ نے ۱۶، ۱۷، ۱۸ / مارچ ۱۹۴۲ء کی تاریخیں مقرر کی ہیں، ۱۰ / ماہ ستمبر کو اس کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایوان عباسیہ میں شہر کے اکثر اہل علم و قلم اور علم دوست حضرات کا جلسہ ہوا، جس میں مجلس استقبالیہ کی ابتدائی کارروائیاں طے پائیں، جناب مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی ازہری مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور جناب مولانا حکیم خواجہ شمس الدین صاحب جنرل سکریٹری اور جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی ناظم نمایش کتب علمی، جناب منتصر اللہ صاحب خازن، اور چھ سات اصحاب مجلس انتظامی کے ممبر منتخب کیے گئے، جن کے نام یہ ہیں، نواب زادہ شمس الحسن خاں صاحب شمس بی۔ اے، ال، ال، بی (بھوپال ہاؤس) مولانا محمد شفیع صاحب مدرس اعلیٰ مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل، مولوی عبد الماجد صاحب دریا بادی، اور یہ ہیچ مداں، شاید ایک دو نام رہ بھی گیے ہوں، مجلس استقبالیہ کی صدارت کے لیے چند نام زیر غور ہیں، یونیورسٹیوں کے فضلاء کے تعاون کی بھی امید ہے۔

یہ تو اس اجلاس کی ظاہری شکل ہے، جو پیش کی گئی، لیکن اس کی حقیقی کامیابی اہل علم اہل قلم و ارباب تحقیق اور شایقین علم کی شرکت اور مقالات کی اہمیت ہے، ہم کو امید ہے کہ پنجاب، یوپی اور دوسرے صوبوں کے ارباب علم و تحقیق اس میں محققانہ مقالات پڑھیں گے اور سعی بلیغ فرمائیں گے، کہ یہ اجلاس اپنی ظاہری و معنوی دونوں خصوصیات کے لحاظ سے کامیاب ہو۔

اس اجلاس کے متعلق ہر قسم کی اطلاع، خط و کتابت اور استفسار براہ راست جنرل سکریٹری صاحب اجلاس ادارۂ معارف اسلامیہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے کریں، یا سکریٹری صاحب دفتر ادارۂ معارف اسلامیہ اورینٹل کالج لاہور سے

(معارف ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء)

شذرات

بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء تا ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء

سر اکبر حیدری کی وفات!

افسوس ہے کہ ۸ر جنوری سنہ ۱۹۴۲ء کی شام کو سابق صدر اعظم ریاست حیدرآباد سر اکبر حیدری نے دلی میں وفات پائی، سر اکبر حیدری ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے وزیر مالیات اور پھر صدر اعظم ہونے کے سبب سے تمام اسلامی اداروں سے ایک خاص مربیانہ تعلق رکھتے تھے، اور اس بنا پر ان کا حادثۂ وفات ہم سب کے لیے غم و الم کا باعث ہوا ہے، ان کی عمر اس وقت بہتّر برس کی تھی، مگر اس عالم میں بھی جس انہماک مصروفیت اور بیدار مغزی سے وہ اپنے مفوضہ خدمات کو انجام دیتے تھے، اس سے ان کے غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہونے کا ثبوت ملتا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

سندھ میں عربی زبان کی تعلیم!

سندھ عربی زبان کے سفر ہند کی پہلی منزل ہے، اس لیے بیجا نہیں، اگر صوبہ میں اس کے لیے سب سے پہلی عربی یونیورسٹی یا جامعۂ عربیہ کا قیام عمل میں آئے، سندھ کے موجودہ ڈائرکٹر تعلیمات ماشاءاللہ عربی زبان کے فاضل بھی ہیں، اس کام کے لیے اس سے بہتر موقع اور کیا مل سکتا ہے، اس تجویز کو عمل میں لانے کے لیے "سندھ عربک یونیورسٹی ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک جماعت بن چکی ہے، اور اس کی باقاعدہ رجسٹری ہو چکی ہے، اور سب سے پہلے ایک ٹریننگ کالج (دار المعلمین) جاری کرنے کی تجویز زیر غور ہے، ہم کو اس انجمن کے لائق کارکنوں سے جو کچھ کہنا ہے، وہ یہ ہے کہ اس نکتہ کو خوب سمجھ لیں، کہ مسلمانوں کو عربی زبان اور اس کی تعلیم اس لیے عزیز ہے، کہ وہ ان کے مذہب کی خزینہ دار ہے، اس لیے اس تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے، کہ اس سے ان کو اس خزانہ کی کنجی ہاتھ آئے۔

محمد اسد آسٹروی آسٹرین نومسلم محمد اسد جو مدت تک حجاز میں رہنے کے سبب سے عربی زبان سے واقف تھے، اور انگریزی پر پہلے سے قدرت رکھتے تھے، انہوں نے ہندوستان میں آکر "اسلام آن کراس روڈ" نامی کتاب انگریزی میں لکھی تھی، جو بہت مقبول ہوئی تھی، اس کے بعد انھوں نے صحیح بخاری کا انگریزی ترجمہ شروع کیا تھا،

صحیح بخاری کا انگریزی ترجمہ؛ ابھی چند ہی پارے نکلے تھے، کہ اس جنگ کے شروع میں وہ آسٹریا کے باشندہ ہونے کے سبب سے نظر بند کرلیے گیے، اور اب ان کا سارا کاروبار اور پریس معطل ہے، اور ان پر مالک مکان کا کرایہ چڑھا ہوا ہے، ایک ہمدرد مسلمان چودھری نیاز علی صاحب (دارالاسلام پٹھان کوٹ) نے ان کے کرایہ کا قرض ادا کردیا ہے، مگر پریس کے بہت سے باقی داروں کے قرضے ابھی باقی ہیں، انگریزی داں احباب سے التماس ہے کہ اسلامی ہمدردی کی خاطر ان کے ترجمۂ صحیح بخاری کے جو چار حصے شائع ہو چکے ہیں وہ ان کو خرید کر داخل ثواب ہوں، ان کی اصل قیمت تو عـ۲ فی حصہ، اور چاروں حصوں کے دس روپیے ہیں، مگر اس وقت فی حصہ عا/ اور چاروں حصوں کی عہ/ قیمت رکھی گئی ہے، پتہ یہ ہے (دارالاسلام، جمال پور، پٹھان کوٹ، پنجاب)

ہم نے نومبر کے شذرات میں اس زمانہ کے بعض متکلمین اسلام کی خدمت میں جن میں سے کسی کا نام نہیں لیا تھا، کچھ عرض کیا تھا، ان میں سے ایک صاحب نے خدا جانے کیوں اس لقب کو اپنے لیے خاص قرار دیا، اور اس مخلصانہ عرض کو تعریض سمجھا، اور اس کا لمبا جواب دیا، میں نے عرض کیا تھا، کہ حقایق اسلامی کو زمانہ کے ماحول کے مطابق زمانہ کی اصطلاحات میں ادا کرنا ہمیشہ تعبیر حقایق کے بجائے تغیر حقایق کا باعث ہوا ہے، اور مثالاً اس زمانہ کی عام اصطلاح تحریک کو لکھ کر ظاہر کیا تھا، کہ جو لوگ اسلام کو ایک تحریک قرار دیکر اس کے حقائق کی تعبیر کرنا چاہتے ہیں، وہ بلا ارادہ اسلام کی تغیر کے مرتکب ہورہے ہیں (ملخصاً)

فاضل مجیب نے اپنے جواب میں پہلے تو حسب دستور اپنے طول عبارت اور بڑے بڑے لفظوں سے مرعوب کرنا چاہا ہے، اور پھر تجدید اور تجدد کا خود ساختہ فرق ظاہر کر کے ہم کو ایک عظیم الشان نکتہ سمجھایا ہے، جس کا وہ شکریہ قبول فرمائیں۔

بے شبہہ ان دونوں میں اتنے فرق کو تو ہم بھی اور سب عربی داں تسلیم کریں گے، کہ تجدید بوزن تفعیل متعدی ہے، یعنی نیا کرنا۔ اور تجدد بوزن تفعّل لازم ہے، یعنی نیا ہونا، اس کے علاوہ کوئی قلب حقیقت کا فرق ہم کو نہیں معلوم، مگر مدعی مجیب ہم کو یہ فرق بتاتے ہیں:

> "تجدید اور تجدد کا اصولی فرق یہ ہے کہ تجدید ہر زمانہ میں انہی حقایق اور انہی صداقتوں کو جو روز ازل سے چلی آ رہی ہیں، اپنے زمانہ کی زبان میں اپنے زمانہ کی ذہنیتوں اور ضروریات کے مطابق مرتب کر کے پیش کرتی ہے، اور تجدد اپنے زمانہ کے فتنوں سے متاثر ہو کر ان حقیقتوں اور صداقتوں ہی میں ترمیم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اگر ان حضرات کے نزدیک میں تجدد کا مجرم ہوں، تو براہ کرم مجھے تعین کے ساتھ بتائیں، کہ کہاں میں نے دین کے جوہر میں تغیر کیا ہے۔"

اصل سوال کا جواب آیندہ دیا جائے گا، اس وقت صرف اس قدر عرض ہے کہ "ان حضرات" کے نزدیک حضرت مجیب تجدد کے مجرم ہوں یا نہ ہوں، لیکن جناب مجیب برعم خود دعوائے تجدید کے مجرم تو علانیہ اپنے قلم سے ہو رہے ہیں، کیونکہ وہ اپنے مقالات فقہی بمسائل فقہی، اور مسائل سیاسی کو تجدید گمان کرتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ جب ان کے یہ چند سالہ کارنامے تجدید دین ہیں، تو وہ اس صدی کے مجدد بننے کے بھی مدعی بن رہے ہیں، اور "یہ حضرات" یہ کہتے ہیں،

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا[1] را بلند است آشیانہ

(معارف ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء)

---

[1] یعنی دعوائے تجدید۔ ۱۲

(۲)

اس زمانہ کے متعدد ”متکلمین اسلام“ میں سے ایک متکلم اسلام سے گذارش کی گئی تھی، کہ وہ اسلامی حقایق کی تعبیر مصطلحات زمانہ سے کر کے حقیقت کی تغیر نہ کریں، اس پر انہوں نے تجدید اور تجدد کی بحث نکالی۔ اور اپنے کارنامے کو تجدد کے بجائے تجدید کا لقب دینا پسند کیا ہے، اور فرمایا کہ تجدید میں مصطلحات زمانہ کی تعبیر سے چارہ نہیں، مثلاً اعتراض تھا، کہ اسلام کو دین اور مذہب کہنے کے بجائے ”تحریک“ کیوں کہا جائے، جواب ملا، کہ دین اور مذہب کے فرسودہ لفظ اس زمانہ میں اپنی اہمیت کھو چکے ہیں، اور اپنے لیے مخصوص معنی پیدا کر چکے ہیں، اس لیے ایک نئے لفظ تحریک سے اسلام کی تعبیر کرنے میں اسلام کا پورا نظام زندگی سامنے آجاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس پورے نظام کے لیے جس کو اسلام چاہتا ہے، اسلام نے خود کوئی لفظ وضع کیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کیا ہے، تو یہ جدت (یعنی تجدد) آپ بھی نہیں کر سکتے، کہ یہ تجدید نہیں، تبدیع ہوگی، اور اگر کیا ہے۔ اور اس کے مفہوم میں اتنی صدیوں میں تنگی اور تغیر نے راہ پالی ہے، تو لفظ بدلنے کے بجائے آپ اس غلط فہمی کو کیوں دور نہیں فرماتے، کیا عجب کہ اسی دلیل سے آگے چل کر صلوٰۃ و صوم، و زکوٰۃ و حج کی جگہ بھی نئے مصطلحات زمانہ گھڑنے کی ضرورت پیش آجائے۔

غالباً موصوف کی نظر اس گوشہ پر نہیں پڑی، کہ کسی لفظ کے مفہوم کی تعیین یک دن میں نہیں ہو جاتی، سالہا سال کے استعمال کے بعد لفظ اپنے معنٰی کی وسعت کی تجدید کرتا ہے، اور اس زمانہ میں اس کے ساتھ خاص ذہنی تصورات لازمہ قائم ہو جاتے ہیں، جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔

مثلاً یہی لفظ تحریک جو پہلے ہماری زبان میں صرف نزلہ کے لیے بولا جاتا تھا، جیسے آج کل مجھے نزلہ کی تحریک ہے، پھر مجلسی اصطلاح میں کسی تجویز کے پہلے پیش کرنے کو تحریک

کہنے لگے، جیسے میں تحریک کرتا ہوں، کہ ...... اب یہ لفظ انگریزی موومنٹ (Movement) کا ترجمہ ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ "کوئی ذہنی تجویز یا اسکیم جس کو ایک شخص نے یا چند شخصوں نے مل کر سوچا ہو، اور اس پورے جوش وخروش کے ساتھ کامیاب بنانے کے لیے جدوجہد کی جائے"۔ اب فرمائیے کہ کیا اسلام ایک ذہنی تجویز یا اسکیم ہے جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار حرا میں بیٹھ کر سوچا ہو، یا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وغیرہ نے مل کر سوچ کر طے کیا ہو، اور ملک میں اس کو کامیاب بنانے کے لیے جدوجہد کی ہو۔ (نعوذ باللہ)

اصل میں عیسائیوں نے اسلام کے ساتھ اس لفظ "موومنٹ" کا استعمال کیا، بدیں معنی کہ نعوذ باللہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوچی ہوئی اور ذہن سے نکالی ہوئی اسکیم تھی جس کو انہوں نے اپنے پرجوش رفقاء کے ساتھ مل کر کامیاب کیا، ممکن ہے ہمارے متکلم آج اس لفظ کو اپنے ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کریں، اور اس کے استعمال پر اس وقت مسامحت برتی جائے، لیکن کیا یہ ڈر نہیں، کہ ناواقف نوجوان مسلمان آئندہ اسلام کو واقعی اسی قسم کی ذہنی اسکیم نہ سمجھ لیں، جیسا عیسائی مصنفین سمجھانا چاہتے ہیں، اب دین اسلام کے لیے اس لفظ تحریک کا استعمال ہمارے متکلم اسلام بتائیں تجدد ہے یا تجدید ہے۔

ابھی خان بہادر ذکاء اللہ صاحب کے جواب میں ہمارے متکلم نے کہا ہے، کہ خلافت راشدہ "پارٹی اسٹیٹ" تھی، اور اسی اصول پر پارٹی کا لیڈر حکومت کا خلیفہ بن گیا، (مسلمان لاہور، ۸ر فروری سنہ ۱۹۴۲ء) یہ کس کو معلوم تھا، کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا انتخاب آج کی نازی۔ فیسٹ، بالشویک، یوروپین پارٹیز کے اصول پر تیرہ سو پہلے ہو چکا تھا، پھر وہ پارٹیاں کون تھیں، اور لیڈر کون تھے، فرض کیجئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا آغاز عہد ہے، اس وقت کون کون پارٹیاں تھیں، جس میں ایک پارٹی کامیاب ہو کر یا قوت پاکر برسر عروج ہو گئی تھی، کیا وہ کفار، منافقین، یہود اور مسلمان تھے، کیا بنو امیہ، بنو ہاشم اور بنو حنیفہ تھے، یا مہاجرین وانصار و نو مسلمان فتح مکہ یا کوئی اور مقصود، آپ کاہے، ان

میں سے ہر معصوم صحت وصواب سے خالی ہے، آخر ہمارے فاضل متکلم حقائق اسلام کو مصطلحات زمانہ کے قالب میں ڈھالنے کی مسلسل کوشش کیوں فرما رہے ہیں، کیا یہی تجدید ہے، پھر پارٹی لیڈر کا یہ تخیل اسلامی ہے یا فرنگی۔

ہر زمانہ کے مجدد کا اصلی کام یہ ہے، کہ وہ مسلمانوں کو علم (عقائد) اور عمل (فقہ) کی صحیح صورت کی جس پر جہالت کے پردے پڑ گیے ہوں تلقین کرے، اور جہالت کے ان تو بہ تو پردوں کو اپنے علم وعمل سے چاک کردے، لیکن اس صدی کے مجدد کا اعلان یہ ہے:

> "اب کہ میری حیثیت اس جماعت کے امیر کی ہوگئی ہے، میرے لیے یہ صاف کردینا ضروری ہے، کہ فقہ وکلام کے مسائل میں جو کچھ میں نے پہلے لکھا ہے، یا اور جو کچھ آیندہ لکھوں گا، یا کہوں گا، اس کی حیثیت امیر جماعت اسلامی کے فیصلہ کی نہ ہوگی، بلکہ میری ذاتی رائے کی ہوگی، میں نہ تو یہ چاہتا ہوں، کہ ان مسائل میں اپنی رائے کو جماعت کے دوسرے اہل علم وتحقیق پر مسلط کردوں اور نہ اسی کو پسند کرتا ہوں، کہ جماعت کی طرف سے مجھ پر ایسی پابندی عائد ہو، کہ مجھ سے علمی تحقیق اور اظہار رائے کی آزادی سلب ہوجائے۔ ارکان جماعت کو میں خداوند برتر کا واسطہ دے کر ہدایت کرتا ہوں، کہ کوئی شخص فقہی و کلامی مسائل میں میرے اقوال کو دوسروں کے سامنے حجت کے طور پر پیش نہ کرے۔"

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے مجدد کی شان تجدید کا ظہور نہ عقائد رائجہ کی تصحیح میں ہوگا نہ اعمال فاسدہ کی اصلاح میں، تو پھر اس امیر کی پیروی کس چیز میں ہوگی، یہ یاد رہے کہ سیاسیات بھی فقہ سے باہر نہیں، اور یہ بھی معلوم نہ تھا، کہ عقائد وفقہ میں امام ومجدد کی دو رائیں ہوتی ہیں، ایک ذاتی رائے اور ایک امام کی حیثیت سے، ایک کی تقلید مسلمانوں کے لیے ضروری، اور دوسری کی نہیں۔

(معارف ماہ فروری سنہ ۱۹۴۳ء)

(۳)

کشف الظنون عربی مصنفین کی تصنیفات اور عربی علوم وفنون کی کتابوں کی سب سے بڑی اور مستند فہرست کا نام "کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون" ہے، جو حاجی خلیفہ چلپی دسویں صدی ہجری کے ایک ترک عالم کی تصنیف ہے، یہ کتاب یورپ میں اور قسطنطنیہ میں پہلے چھپ چکی ہے، اور عربی کتابوں کے محققین اور اصحاب ذوق کے مطالعہ میں متداول ہے، لیکن افسوس ہے کہ یورپ اور قسطنطنیہ میں جو نسخہ چھپا تھا وہ غلط بھی تھا، اور ناقص بھی، خوش قسمتی سے قسطنطنیہ ہی میں اس کا دوسرا کامل اور صحیح نسخہ اب دستیاب ہو گیا ہے۔ جس میں دال تک کا حصہ تو خود مصنف کے قلم کا مبیضہ ہے، اور باقی کے لیے مصنف کا مسودہ سامنے رکھا گیا ہے۔

ٹرکی میں جب سے عربی رسم الخط موقوف ہوئے ہیں، کسی عربی کتاب کی اشاعت کا موقع کم آتا ہے، ان ہی کم موقعوں میں سے کشف الظنون کے اس نسخہ کی اشاعت ہے، محمد شرف الدین بالتقایا استاذ جامعہ استنبول، اور پروفیسر رفعت بیگ انکلیسی نے بڑی محنت سے اس جدید نسخہ کو مرتب کیا ہے، اور اس کی پہلی جلد جو حرف ر پر ختم ہوتی ہے، اور جس کے ۴۷۰ صفحے اور ۹۴۰ کالم ہیں چھپ کر ہندوستان آ گئی ہے، اس میں قلمی نسخہ کے چند صفحوں کے فوٹو، مصنف کے حالات کے ۱۸ صفحے اور مقدمہ احوال العلوم کے ۵۸ صفحات شامل ہیں، نہایت جلی اور عمدہ کاغذ پر بہت عمدہ چھپی ہے، اہل علم کے لیے اس جدید نسخہ کی اشاعت نوید بشارت ہے، بقیہ دو جلدیں زیر طبع ہیں، اس بارہ میں خط و کتابت شرف الدین الکتبی واولادہ ۲۶ محمد علی روڈ، بمبئی ۳ سے کی جائے۔

انگریزی ترجمۂ قرآن جناب مولوی عبد الماجد صاحب دریابادی کے انگریزی ترجمۂ قرآن مجید کا ذکر اس سے پہلے آ چکا ہے، تاج کمپنی لاہور نے اب اس کا اشتہار اور نمونہ کے دو صفحے چھاپے ہیں، امید ہے کہ وہ حضرات جو قرآن پاک کو تاویل و تحریک کے بغیر اس کو اس کی اصلی اسپرٹ میں پڑھنے کے شائق ہیں، وہ اپنی درخواست تاج کمپنی کو (پوسٹ بکس ۲۵۲ ریلوے روڈ لاہور کے پتہ سے) جلد

از جلد روانہ کریں گے، غالباً یہ ایک ایک پارہ کی صورت میں شایع ہو، اور ہر پارہ کی قیمت عا ہوگی، جو کاغذ کی موجودہ گرانی کے زمانہ میں اعتراض کے قابل نہیں۔

رحمت عالمؐ کا ہندی ترجمہ

کتاب رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہندی ترجمہ اس وقت الہ آباد میں ایک ہندی انشا پرداز کی نظر ثانی کے اندر ہے۔ اس کے واپس آنے کے ساتھ انشاء اللہ اس کی چھپائی شروع ہو جائے گی۔

رحمت عالم کا گجراتی ترجمہ

مسلمانوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی، کہ احمد آباد میں ایک ہندو خاتون دن مالا بہن نے جو نہری بھائی پریکھ گاندھی آشرم کے سکریٹری کی بڑی لڑکی ہیں، خود اپنے ذاتی شوق سے اس کا ترجمہ اردو سے گجراتی زبان میں کیا ہے، جو اب زیر طبع ہے۔

اس کی بھی خوشی ہے کہ اب وہ اسلامیہ اسکولوں اور مکتبوں کے درس میں بھی شامل ہو رہی ہے، سرکار نظام کے محکمۂ تعلیمات نے اپنے ہائی اسکولوں اور کالجوں میں اس کی خریداری کی ہدایت کی ہے، امید ہے کہ بہت جلد اس کے دوسرے اڈیشن کی ضرورت پیش آئے۔

مولوی عبد الحق

جناب مولوی عبد الحق انجمن ترقی اردو کا کام جس تندہی، محنت اور جانفشانی .... سے کر رہے ہیں، اس کے لیے ہر اردو بولنے والا ان کا ممنون ہے، اس عمر میں پورے ہندوستان میں جس طرح وہ دورے کرتے ہیں، لوگوں سے ملتے ہیں، تجویزیں سوچتے ہیں، ان کو عمل میں لاتے ہیں، وہ سب پر ظاہر ہے، انہوں نے ادھر چند برسوں میں اس کی کوشش کی ہے، کہ انجمن کی بنیاد کو اس طرح پائدار بنا دیں کہ آیندہ بھی وہ مضبوطی کے ساتھ کام کرتی رہے، اسی غرض سے وہ انجمن کے لیے دلی میں ایک مستقل عمارت بنوانا چاہتے ہیں، اور اس سلسلہ میں اپنے دوستوں سے قریباً بیس ۳۰ ہزار روپے جمع کیے ہیں۔

لیکن لوگوں کو یہ سن کر اور بھی خوشی ہوگی، کہ موصوف اردو کی خدمت صرف قدمے اور قلمے نہیں کر رہے ہیں، بلکہ درمے بھی کر رہے، چنانچہ موصوف نے انجمن کو ابھی پچاس ہزار روپیے کی کثیر رقم اپنی ذاتی ملک سے ہبہ کی ہے، مسلمانوں میں غالباً اپنی نوعیت کی یہ پہلی مثال ہے کہ کسی قومی

خادم یا علمی خدمت گذار نے اپنی جسمانی و مادی خدمتوں کے ساتھ اتنی بڑی مالی اعانت کی توفیق پائی ہے۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ موصوف نے جو زن و فرزند کا جھگڑا نہیں پائے عمر بھر اپنی ساری کمائی اپنی متبنّیٰ اولاد انجمن ترقی اردو کے حوالہ کر دی ہے، ہم موصوف کو ان کی اس جواں مردانہ سخاوت پر مبارکباد دیتے ہیں۔

ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کا جو اجلاس دار المصنفین اور طلبائے قدیم ندوۃ العلماء کی دعوت پر ۱۷، ۱۸، ۱۹ مارچ ۱۹۴۲ء کو لکھنؤ میں ہو رہا تھا، وہ بعض وجوہ سے ملتوی کر دیا گیا ہے۔

(معارف ماہ مارچ ۱۹۴۲ء)

(۴۴)

حامد نعمانی مرحوم

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک ہی جسمانی یادگار باقی رہ گئی تھی، وہ بھی مٹ گئی، یعنی ان کے اکلوتے صاحبزادے حامد نعمانی صاحب نے ۶۲ برس کی عمر میں ۲ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ مطابق ۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء کی شب کو جونپور میں دفعۃً وفات پائی، وہ کئی برس سے مرض قلب میں گرفتار تھے، علاجوں کے سہارے چلتے پھرتے تھے، مگر اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے، ۱۹ مارچ کو وہ ایک ضرورت سے جونپور گئے تھے۔ شام کو پہنچے، اپنا کام کیا، رات کو ۳ بجے کے قریب درد دل کا دورہ ہوا، ان کے میزبان دوست ان کے کراہنے کی آواز سن کر ان کے پاس آئے، مرحوم نے کہا کہ مجھے ذرا سہارا دیکر بٹھا دو، انہوں نے اپنے سینے کے سہارے سے بٹھا دیا، اسی کے ساتھ مرحوم نے ان کو السلام علیکم کہا۔ اور آخری سانس لے کر نامعلوم سفر کی منزل پر روانہ ہو گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، ۲۰ کی صبح کو لاش کار سے اعظم گڈھ آئی، اور شبلی منزل میں باپ کے پہلو میں بیٹے کو ہمیشہ کے لیے سلا دیا گیا۔

مرحوم بڑے توانا و تندرست، قوی ہیکل، بلند و بالا، اور علی گڈھ کالج کے مشہور کھلاڑیوں

میں تھے، گھوڑے کی سواری اور پولو میں بھی ممتاز تھے، تحصیلداری کے عہدہ پر فائز ہو کر پنشن پائی، پھر ریاست مجھولی (گورکھپور) میں منیجر ہوئے، مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے مستعفی ہو گیے، پابند صوم وصلوٰۃ، نیک دل، اور بہت رحم المزاج تھے، اپنی ذاتی زندگی میں گو وہ بہت قانع و منتظم تھے، مگر اس طرح سے جو بچتا تھا، اس کو ہمیشہ فیاضی کے ساتھ نیک کاموں میں لگا دیا کرتے تھے، ۱۹۲۷ء میں حج بھی کیا تھا، زکوٰۃ کا پورا حساب رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے، اور اپنے خزانے سے انکو اجر جزیل عطا کرے، مولانا شبلی مرحوم کی جو صاحبزادیاں تھیں وہ تو باپ کی زندگی ہی میں وفات پا چکی تھیں، ایک یہ فرزند تھے، جو اب چل بسے،

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند،

زمانہ کے حالات جس تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں، خوشی کی بات ہے کہ مسلمان اس سے بے خبر نہیں، معالجوں کی رایوں میں اختلاف ہو سکتا ہے، مگر مرض کی شدت اور نفس علاج کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں، قوم وملت کے معالجوں کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ جو مسلمان قوم کی سیاسی تنظیم کر کے اس کو بر سر عروج لانا چاہتے ہیں، دوسرے وہ جو نام کے مسلمانوں کو پہلے کام کا مسلمان بنانا چاہتے ہیں، اور پھر ان کو استخلاف فی الارض کا مستحق ٹھہراتے ہیں، لیکن اس کے لیے ضرورت یہ ہے کہ اس پیام کے مبلغ اور رہبر پہلے خود کام کے مسلمان بنیں، کہ

خفتہ را خفتہ کے کند بیدار،

سچ یہ ہے کہ اس سے پہلے کہ ہم دوسروں پر حکومت کریں، ہم کو خود اپنے نفس کے اوپر آپ حکومت کرنا چاہیے، حق کے پیام پر غیر متزلزل ایمان، احکام الٰہی پر بے چون وچرا عمل، حق کی راہ میں مجاہدانہ روح، ثبات قدم، عزم راسخ، حق کے لیے ایثار، اور ذاتی خود غرضیوں کا استیصال، کیونکہ دنیا کسی دعوت کو اس وقت تک قبول نہیں کرتی، جب تک داعیوں کے جان ومال کا پورا امتحان نہیں لے لیتی، اور دعوت کے حرفوں کو داعیوں کے خون کی روشنائی میں نہیں پڑھ لیتی، یہ خدائے تعالیٰ کے بنائے ہوئے اصول فطری ہیں، جو نہ کبھی بدلے ہیں، نہ بدلیں گے۔

ایک اور نکتہ کو بھی بھولنا نہیں چاہیے، اسلام اور مسلمان ایک نہیں دو چیزیں ہیں،

مسلمان اب ایک قوم کا نام پڑ گیا ہے، جس کے اسلاف پیام اسلام کے حامل اور تعلیم اسلام کے عامل تھے، انہوں نے دنیا پر فتح پائی، اور اپنی مفتوحہ دولت اپنے اخلاف کے سپرد کر دی، زمانہ کے مرور سے یہ اخلاف یہ بھول گئے، کہ یہ انعام ان کے اسلاف کو ان کے خاص اوصاف کے صلہ میں ملا تھا، جب تک وہ اوصاف رہے، وہ انعام ان کے پاس رہا، اور جب وہ جاتے رہے تو ان کا یہ انعام بھی چھن گیا، اب اگر اس کے حصول کی پھر تمنا ہے، تو پھر انہی اوصاف کو حاصل کرنا ہے، مَا کَانَ اللّٰہُ یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ حکم ناطق ہے۔

نادانی سے ہم لازم کو ملزوم اور ملزوم کو لازم سمجھتے ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں، کہ پہلے کسی طرح حقوق حاصل کر لینے چاہئیں، پھر اس کے ساتھ سلطنت و حکومت کے اوصاف پیدا ہو جائیں گے، یہ خیال قطعاً غلط ہے، پہلے اوصاف حاصل کرو، پھر اس کے نتیجوں کی امید رکھو، اگر ان اوصاف کے بغیر کوئی چیز ہم کو رعایت سے ملی بھی تو وہ ہمارے پاس کبھی نہیں رہ سکتی۔

لیکن سوال اس سے بھی زیادہ دقیق ہے، فرض کیجئے کہ دنیا کے کسی گوشہ میں مسلمانوں کی ایک سلطنت کا اضافہ ہو گیا، تو کیا اس سے اسلام کا پیام زندہ ہو جائے گا، اس سے مسلمان پھر مسلمان ہو جائیں گے، زیادہ سے زیادہ جو خوش کن خواب نظر آ سکتا ہے، وہ یہ ہے، کہ ہم کو ایک اور طویل و عریض عراق یا شام یا مصر مل جائے، تو کیا اس سے اسلام کی بے کسی و غربت میں کچھ بھی کمی ہو سکتی ہے،

(معارف ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء)

(۵)

انجمن عربی صوبۂ متحدہ

انجمن عربی صوبۂ متحدہ الٰہ آباد (جس کا مقصد صوبہ کے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے مسلمان طالب علموں میں عربی زبان کی تعلیم کا شوق پیدا کرنا، اور ان میں سے ہونہار طالب علموں کو مناسب مالی امداد دے کر ان کی مشکلوں کو حل کرنا ہے) بحمد اللہ اپنا کام مستعدی اور خوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہے، انجمن کے سکریٹری پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب مبارکباد کے قابل ہیں،

جنھوں نے بڑی تندہی اور محنت سے اپنے کام کو انجام دیا ہے۔

یہ معلوم کرکے بھی خوشی ہوئی کہ نواب صدر یار جنگ بہادر اس کو چار برس سے پچاس روپیہ ماہوار کی امداد دے رہے ہیں، اس کے علاوہ صوبہ کے کورٹ آف وارڈس نے پچھلے دو برسوں میں اس کو پانچ پانچ سو روپیہ دیے ہیں، اور دوسرے مخیر حضرات بھی اس کو ماہانہ اور سالانہ عطایا دیتے ہیں، انجمن کی کوششوں سے عربی خواں انگریزی طالب علموں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے، اس اضافۂ شوق کو دیکھ کر ضرورت ہے، کہ معطیوں کی تعداد میں بھی ترقی ہو، جس کے لیے ہم احساس مند مسلمانوں کو اس کی امداد کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن جس سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ اپنے کاموں کو انجام دے رہا ہے، اس پر اس کے مخلص کارکنوں کو مبارکباد دینا زبان کے ہر خادم کا فرض ہے، ادارہ نے اپنے کاموں کے شعبوں میں مزید ترقی کی ہے، ایک طرف علوم عالیہ میں وہ اردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کی مہم پر غور کر رہا ہے، اور دوسری طرف چھوٹے بچوں کے لیے مفید و صالح لٹریچر کی اشاعت میں بھی دلچسپی لے رہا ہے، اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے، کہ اس نے اپنی کم عمری میں مختلف عنوانوں پر جتنی کتابیں شائع کی ہیں، شاید ہی اس ملک کا کوئی ادارہ اس میں اس کا مقابلہ کرسکے، گو اس میں کتابیں ہر نوع کی ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ ہر ڈھیر میں جواہر ہی جواہر ہوتے ہیں،

علی گڈھ ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جس کو قائم ہوئے دو ہی تین سال کا عرصہ ہوا ہے، اپنا کام خاص مستعدی سے کر رہا ہے، اس کا سہ ماہی انگریزی رسالہ بہت سے اچھے مضامین شایع کر رہا ہے، کتابوں کے سلسلہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے آئین و طریق عدالت پر جو کتاب شایع ہو رہی ہے، اس نے ہندوستان کے تاریخی معلومات میں بہت بڑی کمی پوری کی ہے، ضرورت ہے، کہ بادشاہوں کے جنگ و جدال کے قصوں کے بجائے اسی قسم کے مختلف عنوانوں پر انگریزی میں ایسی کتابیں لکھی جائیں، جن سے معلوم ہو، کہ مسلمانوں نے ہندوستان کو کیا دیا ہے۔

اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی!

بمبئی میں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کے نام سے جو علمی انجمن ۱۹۳۳ء میں قائم ہوئی تھی اور جس کے لایق سکریٹری جناب آصف فیضی صاحب ہیں، وہ برابر اپنے فرائض کے انجام دینے میں مصروف ہے، اس زمانہ میں وہ متعدد کتابوں کی اشاعت کر چکی ہے، جن کا ذکر معارف میں وقتاً فوقتاً آتا رہتا ہے، اب اس کے کارکنوں نے اس کی دہ سالہ خدمات کی یادگار میں یہ طے کیا ہے، کہ اسلامی مباحث پر لایق ارباب قلم کے محققانہ مضامین کا ایک مجموعہ تیار کرایا جائے، اور اس سال کے آخر تک اس کو شایع کیا جائے۔

ادارۂ اقبال لکھنؤ!

لکھنؤ کے بعض نوجوان مسلمانوں نے مل کر ادارۂ اقبال کے نام سے ایک مجلس قائم کی ہے، جس کا مقصد اقبال کے فلسفہ کی اشاعت اور نوجوانوں میں ان کی تعلیمات کی تبلیغ ہے۔ ۸ر اپریل ۴۳ء کو لکھنؤ گنگا پرشاد میموریل ہال میں نواب بہادر یار جنگ حیدرآباد دکن کی صدارت میں اس کا ایک کامیاب اجلاس ہوا، اس اجلاس کی خصوصیت یہ تھی، کہ بوڑھے کارگذار بھی نوجوانوں کے پہلو بہ پہلو تھے۔

آج کل ڈاکٹر اقبال کے نام سے متعدد رسائل نکل رہے ہیں، اور مجلسیں قائم ہیں، یہ سب کو معلوم ہے، کہ اشخاص بھی بتدریج ترقی کر کے منزل مقصود کے احاطہ میں داخل ہوتے ہیں، اور ان کے خیالات بھی اسی تدریج کے ساتھ کمال کے مرتبہ پر پہنچتے ہیں، اس لیے اگر یہ کہا جائے، کہ ہر شے جو ڈاکٹر اقبال کے کلام کے قالب میں نکل آئے، وہ ان کی تعلیم ہے، تو وہ سراسر غلط ہوگا، بلکہ وہی چیزیں ان کی تعلیمات کی عناصر ہوں گی، جن پر ان کے قلم نے ایک مدت کی تلاش کے بعد آرام کی سانس لی، اور جس منزل پر پہنچ کر ان کے خیال کے مسافر نے اقامت اختیار کی، اس بنا، پر آج کل رسالوں کے کارخانوں میں جو مال بھی تیار ہوتا ہے، اور اس پر ڈاکٹر اقبال کے نام کا مارکہ لگا کر جو دکانداری کی جا رہی ہے، وہ ہمت افزائی کے لایق نہیں۔

کبھی فرصت سے سن لینا بڑی ہے داستاں میری۔

سیرۃ النبی جلد اول کا مرہٹی ترجمہ

شایقین سیرۃ نبوی کو یہ سن کر خوشی ہوگی، کہ مولانا شبلی مرحوم کی سیرۃ نبوی

کا ترجمہ مرہٹی زبان میں ہو رہا ہے، میر منشی محمد اسماعیل بھالدار صاحب جو مرہٹی کے ادیب ہیں، یہ ترجمہ کر رہے ہیں، اس کی پہلی جلد عنقریب پریس میں جانے والی ہے، اس مرہٹی ترجمہ کی اشاعت کی سعادت بھی سرکار نظام ہی کے حصہ میں آئی،

(معارف ماہ مئی سنہ ۱۹۴۲ء)

(۶)

آج کل گرمی کی شدت سے دارالمصنفین سونا پڑا ہے، اکثر رفقاء اپنے گھروں میں ہیں، خاکسار اپنے وطن میں ہے، مولانا مسعود علی صاحب اپنے وطن میں اپنے گھر کی تعمیر میں مصروف ہیں، حیات شبلیؒ کی چھپائی بھی گرمی کی شدت کے سبب سے روک دی گئی ہے، برسات کا کوئی چھینٹا پڑے تو پھر کام شروع ہو۔

رحمت عالمؐ کی آمدنی سے دارالعلوم ندوہ میں دارالاقامہ

رحمت عالمؐ کی فروخت کا چار ہزار روپیہ حسب اعلان دفتر ندوۃ العلماء کو بھیجدیا گیا، تاکہ وہ ندوہ کے تعمیراتی فنڈ میں جمع کر دیا جائے، اور اس روپیہ سے چھوٹے بچوں کے لیے دارالاقامہ بنایا جائے،

دارالعلوم ندوہ میں اپنے نام سے ایک کمرہ کی تعمیر کے لیے مختار بیگم کی امداد!

اس سلسلہ کی ایک خوشخبری یہ ہے کہ ملتان کی ایک تعلیم یافتہ مسلمان خاتون نے جن کا نام مختار بیگم ہے، اور جو انگریزی مدارس نسواں کی انسپکٹرس ہیں، ڈیڑھ ہزار روپیہ کا ایک چک اس لیے ہمارے پاس بھیجا ہے، کہ ہم ان کی اس رقم سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کے نام سے کوئی کمرہ بنوادیں، اللہ تعالیٰ اس کار خیر کے لیے موصوفہ[1] کو جزائے خیر دے، اور نیکیوں کی مزید توفیق بخشے۔

ہندوستان میں مسلمان اپنی سیاسی خود مختاری کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں، لیکن یہ معلوم ہونا چاہیے کہ نفس سیاسی خود مختاری کی قیمت دنیا کے بازار میں کیا ہے، سیاسی خود مختاری

---

[1] یہ تحریر پریس میں جا رہی تھی، کہ ملتان سے موصوفہ کی وفات کی خبر موصول ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (س)

اس وقت تک دل خوش کن خواب سے زیادہ نہیں، جب تک اس کی اساس ایمانی، جسمانی، اقتصادی اور تعلیمی طاقتوں کے چار ستونوں پر قائم نہ ہو۔

انسان صرف اپنی طاقت سے زندہ رہتا ہے، ہماری انفرادی زندگی بھی ہماری طاقت ہی کا نتیجہ ہے، اگر ہمارے جسم و اعصاب اور دل و دماغ کے اندر قوت باقی نہ رہے، تو ہم میں سے کسی فرد کی بھی انفرادی زندگی قائم نہیں رہ سکتی اسی طرح کوئی اجتماعی زندگی بھی کبھی قائم نہیں رہ سکتی اگر اس کے اندر ایمان کی طاقت، جسم کی طاقت، اقتصادی طاقت اور تعلیم کی طاقت نہ ہو۔

قرآن پاک نے بنی اسرائیل کے آغاز سلطنت کے قصہ کے ضمن میں یہ بتا دیا ہے، کہ حکمرانی کی صلاحیت و استعداد کے لیے دو صفتیں ضروری ہیں۔ بسطۃ فی العلم والجسم یعنی علم اور جسم کی طاقت، علم کی طاقت کے دائرہ میں ایمان اور تعلیم صحیح دونوں داخل ہیں، اور جسم کی طاقت میں اس کے سپاہیانہ جوہر کی طرف اشارہ ہے، اور جہاد الٰہی کی راہ میں انفاق فی سبیل اللہ کی بار بار تاکید جماعت کی اقتصادی طاقت کو نمایاں کرتی ہے۔

لوگ جسمانی و اقتصادی طاقت کی ضرورت کو تو تسلیم کر لیں گے، مگر ایمانی اور تعلیمی طاقت کے باب میں ہم سے دلیل کے طالب ہوں گے، لیکن ایمان اور تعلیم کی حقیقت سمجھ لینے کے بعد یہ شک خود بخود زائل ہو جائے گا۔ انسان جس غرض سے کوئی کام کرتا ہے۔ اس غرض کی صحت، اس صحت کا یقین، اور اس یقین کے لیے سرفروشی کا جذبہ ایمان ہے۔ مسلمان کے جہاد کی اصل غرض و غایت، حکومت، تجارت، قومیت اور وطنیت نہیں، بلکہ صرف اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ یعنی ایک اللہ کی حاکمیت علی الاطلاق کے تحت میں انسانوں کی دینی اخوت کا قیام، اور اس مقصد کے حصول کے لیے صحیح طریق و تدابیر کے علم کا نام تعلیم ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد یہ عرض کرنا ہے، کہ مسلمان اگر اپنی سیاسی خود مختاری کے طلبگار ہیں، تو ان کو چاہیے کہ اپنے اندر پہلے ایمان کی طاقت، جسم کی طاقت، جماعتی اقتصادی طاقت اور تعلیم کی طاقت جمع کریں، اور اس کے وسیلہ سے سیاسی طاقت کا خواب دیکھیں۔

دنیا میں آج بھی اور پہلے بھی جب کسی قوم نے سیاسی طاقت حاصل کی ہے، ان چار طاقتوں کے حصول کے بعد ہی کی ہے، دنیا کی پچھلی تاریخ تو افسانہ ہے، مگر آج کا پیشِ نظر قصہ تو ناقابلِ انکار حقیقت ہے، جس قسم کی سیاسی طاقت اور جس غرض کے لیے حکومت کا قیام آج جو قوم کر رہی ہے، غور سے دیکھئے کہ اس کے لیے اس کی ایمانی طاقت، جسمانی طاقت، اقتصادی طاقت اور تعلیمی طاقت کس کس طرح ہر ہر قدم پر اس کو سنبھال سنبھال کر آگے بڑھا رہی ہے۔

اقتصادی طاقت کے معنی شخصی دولت مندی کے نہیں ہیں، بلکہ کسی نصب العین کے لیے قوم کی جماعتی مالی حالت کی بہتری، اور اس سے زیادہ اس کے لیے ایثار اور اس کے حصول کی راہ میں ہر انفرادی ضرورت کی قربانی،

(معارف ماہ جون ؁۱۹۴۲ء)

(۷)

مولانا حیدر حسن صاحب محدث ٹونکی کی وفات

مولانا حیدر حسن خاں محدث ٹونکی جو تقریباً دس پندرہ برس تک دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شیخ الحدیث رہ کر دو سال ہوئے کہ ریاست کی خواہش پر اپنے وطن چلے گئے تھے، افسوس ہے کہ چند روز ہوئے کہ اپنے وطن ہی میں وفات پائی، محدث مرحوم اور ان کے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں صاحب مصنف "معجم المصنفین" اس وقت کے علماء میں ایسے دو نامور فرد تھے، کہ جن کے وجود پر علم و فضل اور ورع و تقویٰ کو ناز تھا، الحمد للہ کہ ابھی مولانا محمود حسن خاں صاحب ہم میں موجود ہیں، مگر افسوس ہے کہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا حیدر خاں صاحب نے اس عالم فانی کو الوداع کہا، ایسے زمانہ میں جب نام کے مولویوں کی تعداد گو کثرت حاصل کر رہی ہے، مگر کام کے علماء روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ مرحوم کی وفات مشرقی علم و فضل کی کائنات میں حادثۂ عظیم سمجھی جائے گی۔

مرحوم بڑے جامع العلوم تھے، علوم عقلیہ و نقلیہ و ریاضیہ کے وہ یکساں ماہر تھے، زیادہ تر اپنے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں صاحب سے پڑھا تھا، حدیث کی سند شیخ حسین صاحب عرب یمنی خزرجی سے حاصل کی تھی، استفادہ باطنی میں بھی ان کا مرتبہ بلند تھا، انہوں نے مکہ معظمہ جاکر حضرت حاجی شاہ امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ سے فیض حاصل کیا تھا، اور ماشاء اللہ زہد و عبادت، بے تکلفی اور تواضع میں بزرگوں کا نمونہ تھے، علوم عقلیہ و ریاضیہ میں بھی ان کا درجہ بلند تھا، اور علوم نقلیہ میں وہ ماہر کامل تھے، علم حدیث کو بطرز حنفیہ بہت خوبی سے پڑھاتے تھے، رجال پر ان کی نظر وسیع تھی، ان کے درس کا طریقہ یہ تھا، کہ حدیث پڑھاتے وقت حدیث کی ساری کتابیں، اور اسماء الرجال اور اصول کی کوئی مستند کتاب ارد گرد رکھ لیتے تھے، ہر نزاعی مسئلہ کی وہ داد تحقیق دیتے وقت اپنے شاگردوں کو ہر حوالہ کی حدیث کو نکال کر دکھاتے، اور رجال پر بحث کرتے وقت راوی کی حالت زبانی بیان کرکے مزید تشفی کے لیے ان کو کتاب کھول کر اس راوی پر جرح و توثیق کے اقوال بھی دکھا دیتے، اور اصول سے اپنے مدعا کو ثابت کرتے تھے۔

ان سے اکثر مسائل میں گفتگو آتی رہتی تھی، مگر وہ ہمیشہ حاضر العلم نظر آئے، اور جب کوئی بات سمجھ میں نہ آتی، صاف اقرار کر لیتے تھے، اور دوسرے وقت وہ اس کو دوبارہ سمجھ کر بحث میں لاتے تھے، اس علم و فضل پر بیحد منکسر، بے حد خاکسار، بے حد متواضع، اتباع سنت اور پابندی شریعت میں ممتاز تھے، ان کی نماز خضوع و خشوع اور سکون و طمانیت کی تصویر ہوتی تھی، اور دار العلوم کی مدرسی کے زمانہ میں لکھنؤ کے اکثر اہل علم ان کے معترف و مداح تھے، اور مسائل میں ان کا فیصلہ قول فیصل کا حکم رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ اس مجموعۂ خوبی کو اپنے فضل و کرم سے نوازے اور مراتب اعلیٰ عنایت فرمائے۔

ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد جو کئی سال سے حکومت کی تحقیقاتی قید و بند میں گرفتار تھی، اخبارات سے یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا، کہ اب وہ گورنر صاحب صوبہ

کے حکم سے آزاد کردی گئی ہے، ہز اکسلنسی نے تحقیقاتی کمیٹی کی ایک دو باتوں سے اتفاق، اور اس کے اکثر فیصلوں سے، بجا اختلاف کیا ہے، ہز اکسلنسی کی یہ ادب نوازی اس وقت جب دنیا خون میں نہا رہی ہے، اور دوبارہ اس کی امداد کا اجرا، جب ہر حکومت جو کچھ اس کے خزانہ میں ہے، جنگ کی قربان گاہ پر چڑھا رہی ہے، بیحد تعریف کے قابل ہے۔

اگرچہ یہ بات جو ہمارے بہت سے ہم وطنوں پر گراں گذرے گی، صفائی اور ایمانداری کے ساتھ کہدی جائے، تو بے جا نہ ہوگا، کہ ہمارے بہت سے ہم وطن جو ہندی کو صوبہ کی زبان بنانے کے لیے سالہا سال سے بے قرار ہیں، ہر اس کوشش کو جس سے اردو کی بقا اور قیام کو کوئی مدد ملے، حد درجہ ناپسند کرتے ہیں، اور اس لیے ہندوستانی اکاڈمی ہمیشہ ان کی نظروں میں کھٹکتی رہی، کہ یہ ہندی کے ساتھ ہندی کے برابر برابر اردو کو کیوں جگہ دیتی، اور اس کی بقا و قیام میں کیوں کوشش کرتی ہے۔

کانگریس گورنمنٹ کے عہد میں وزیر تعلیم اور اسپیکر جس طرح کھلم کھلا اور بالاعلان ہندی کی اشاعت اور امداد کا کام انجام دیتے رہے، وہ کچھ چھپی بات نہیں، ان ہی کے اشارہ سے ہندوستانی اکاڈمی پر اس نام سے تحقیقات کا پہرہ بٹھایا گیا، کہ اس کے ذریعہ سے اردو اور ہندی دو زبانوں کے بجائے ایک ہندوستانی زبان کا کام کس طرح لیا جا سکتا ہے، حالانکہ اس کے بنانے کی غرض یہ کبھی نہ تھی، بلکہ فریقانہ جھگڑوں سے الگ رہ کر دونوں زبانوں کی برابر کی خدمت تھی۔

یہ سب کو معلوم ہے، کہ خاکسار نے مخالفتوں کے باوجود ہندوستانی نام اور ہندوستانی زبان کی پر زور حمایت کی تھی، اس سے مقصود یہ تھا، کہ دونوں قوموں کے درمیان بول چال کی زبان ایک رہے، اور جس کی صورت یہ تھی کہ ہمارے اردو اور ہندی کے اہل قلم چند اصول پر مل کر ایک ہوتے، اور دونوں کوشش کرتے، کہ اپنی زبان کو آسان سے آسان کریں، اور لفظوں کے پرتال کا طریقہ یہ ہوتا کہ وہ لفظ

قبول کیے جاتے جو چلن میں ہیں۔ اس کے لیے نہ قاموس کے ورق کھولے جاتے، اور نہ شبد ساگر سے دیکھ دیکھ کر بولے اور لکھے جاتے۔ مگر افسوس کہ یہ میری تحریک عام طور سے کامیاب نہ ہوئی، اس کا سبب صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ ہمارے سیاسی ہندی کے حامی یہ فیصلہ کر چکے ہیں، کہ وہ ہندی کو یعنی سنسکرتی ہندی کو اس صوبہ کی سرکاری اور تعلیمی زبان بنا کر چھوڑیں گے۔ اس خیال کے حامی اگر صوبہ کی تعلیمی وزارت، مجلس قانون ساز کی صدارت اور ہماری سب سے پرانی تعلیم گاہ (یونیورسٹی) کی وائس چانسلری کی کرسیوں پر ہوں تو نتیجہ کے متعلق فیصلہ مشکل نہیں۔

ہندی کے بعض حامیوں کی طرف سے یہ بات کہی گئی ہے، کہ اردو مسلمان بادشاہوں کے دربار میں پیدا ہوئی، اور صرف ان لوگوں کی زبان رہی جو درباروں سے تعلق رکھتے تھے، باقی سارے ملک کی زبان ہمیشہ ہندی ہی رہی ہے، افسوس ہے کہ یہ نظریہ ایک بڑی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوگا، کہ علمی اور تاریخی مسئلوں میں بھی ذہنی تنگ نظری حقیقت کو کس طرح بدلنے پر مجبور کرتی ہے، اردو کی ہزار سال کی تاریخ اب بالکل سامنے آگئی ہے، اس کو دیکھ کر ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے، کہ یہ زبان عوام کے جھونپڑوں، بیوپاریوں کی دوکانوں، لشکریوں کے خیموں، اور فقیروں کی خانقاہوں سے نکل کر بادشاہوں کے درباروں تک پہنچی ہے، یہ دربار سے بازار، بازار سے دربار تک نہیں پہنچی ہے، اور یہی واقعہ اردو کی ملکی ضرورت کے راز کو فاش کرتا ہے،

(معارف ماہ جولائی ۱۹۴۲ء)

(۸)

الحمد للہ کہ اب دار المصنفین کی آبادی شروع ہوگئی ہے۔ رفقاء اور مولانا مسعود علی صاحب واپس آچکے ہیں، وسط اگست تک خاکسار کی بھی وطن سے واپسی ہو جائے گی "حیات شبلی" کی ملتوی شدہ چھپائی کا کام اجراء پائے گا، اور تالیف و تصنیف کے دوسرے

سلسلے بھی جاری ہوں گے۔

اس دوران میں احباب کے بہت سے خطوط کے جواب میں خاکسار سے تعویق و تاخیر ہوئی، جس کا افسوس ہے، لیکن اس ہیچمداں کی تنہائی اور بعض ذاتی افکار و مشاغل کو خیال میں رکھکر امید ہے کہ احباب میری فرو گذاشت کو معاف فرمائیں گے۔

بہار اردو کانفرنس پٹنہ ؛

جولائی کے آخر میں پٹنہ میں بہار اردو کانفرنس کا اجلاس ہوا، خطبے ہوئے، تقریریں ہوئیں، پیغام پڑھے گئے، تجویزیں منظور ہوئیں، اور ہندوستانی زبان کی تحریک کے حسن و قبح پر معرکہ آرائیاں بھی رہیں، خوشی اس کی ہے، کہ اس صوبہ کے حامیان اردو اور شائقین ادب نے "نشستند و گفتند" کے فریضہ کا احساس تو کیا، عمل کا قدم تو اس کے بعد اٹھے گا۔

بہار میں اردو کی اشاعت

اس میں کوئی شبہہ نہیں، کہ بیس پچیس برس کے اندر اس صوبہ کے تعلیم یافتوں میں اپنی زبان کی اشاعت، اصلاح اور صحت کے خیال نے بڑی ترقی پائی ہے، اور ذوق ادب کا وہ ہنر جس کا دعویٰ پہلے صرف خواص کو تھا، اب وہ عام ہے، لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے، کہ کسی صوبہ میں اس کی زبان کی ترقی کا اندازہ اس صوبہ کے منشورات اور مطبوعات ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اب غور کرنا چاہیے کہ اس صوبہ میں اخبار اور رسالے اور کتابیں سال میں کتنی چھپتی ہیں، اور کتنی بکتی ہیں، اس دور میں اگر اردو کے حامی یہاں پیچھے ہیں، تو صرف زبانی دعویٰ، زبان کی ترقی کو کسی صوبہ میں آگے نہیں بڑھا سکتا ہے،

ریڈیو کے ذریعہ اردو کی اشاعت

اس جنگ نے ریڈیو کی شکل میں دنیا کی زبانوں میں برق کی سی رفتار پیدا کر دی ہے، برلن، لندن، اٹلی، جاپان، ٹرکی، مصر اور خدا جانے کن کن ملکوں سے اردو یا ہندوستانی زبان میں خبروں اور تقریروں کی اشاعت ہر روز ہوتی رہی ہے، اور اس کی گونج آواز فضائے عالم میں پھیل کر خدا جانے کہاں کہاں تک پہنچتی ہے

جاپان کو چھوڑ کر باقی ملکوں سے سلیس زبان میں خبریں اور تقریریں پھیلائی جاتی ہیں، اور اپنی زبان کے باوجود اسی زبان میں ہوتی ہیں، جس کے اندر اشاعت کی قدرتی صلاحیت موجود ہے، اور یہ طبعی دلیل اس زبان کے مستقبل کے دعویٰ کے لیے ناقابل تردید ہے۔

کتاب الصیدلہ ابوریحان بیرونی

اس عالم انتشار و پریشانیٔ خاطر کے دور میں بعض ایسے خادمانِ علم ہیں، جو اطمینان کے ساتھ زمانہ کے حالات سے بے پروا ہو کر علمی خدمات میں مصروف ہیں، چنانچہ ایک دوست کی اطلاع ہے، کہ مصر سے مشرقی علوم کے بعض شائق حکیم ابوریحان بیرونی کی "کتاب الصیدلہ" کی اشاعت کی کوشش میں مصروف ہیں، اس کا عربی متن جو بروصہ واقع ترکی سے ملا ہے، اس میں جا بجا بیاض پائے جاتے ہیں، مقابلہ اور تصحیح کے لیے اس کے دوسرے نسخوں کی تلاش ہے، اصل عربی نہ ہو تو اس کے فارسی ہی نسخے ملیں، اس سلسلہ میں ہندوستان کے اہل علم سے بھی اس کے متعلق استفسار ہے، اگر ہمارے ناظرین میں سے کسی کو اس کا پتہ معلوم ہو، تو دریغ نہ فرمائیں۔

صوبۂ متحدہ کے تعلیمی محکمہ نے اپنے ہندوستانی اکاڈمی کی رکنیت کے لیے دارالمصنفین سے ایک رکن کی نامزدگی کی خواہش کی ہے، یہ سرکاری مراسلہ صدر نشین دارالمصنفین کے نام ہے، امید ہے کہ دارالمصنفین کے صدر نشین نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی دارالمصنفین کی طرف سے کسی رکن کو نامزد فرمائیں،

جنگی ضرورتوں نے ریلوے پارسلوں پر جو پابندیاں عائد کی ہیں، اس سے تجارتی اشیا کی آمد و رفت کی راہ میں جو دقتیں پیدا ہوئی ہیں، اس سے کتابوں کے خرید و فروخت پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے، اس حالت سے دارالمصنفین کے شعبۂ اشاعت کا متاثر ہونا بھی ناگزیر ہے، اور نہیں کہا جا سکتا کہ دارالمصنفین کی مالی حالت پر اس کے جو اثرات پڑیں گے، وہ کہاں تک اس کے لیے قابل برداشت ہو سکیں گے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے احباب ڈاک کے ذریعہ سے کتابوں کے طلب کرنے کے سلسلہ کو وسعت دیں، تاکہ ان کا یہ ادارہ

اپنی زندگی کے ان مشکل دنوں کو کسی طرح کاٹ سکے۔

(معارف ماہ اگست ۱۹۴۲ء)

(۹)

الحمدللہ کہ اس ہنگامۂ رستخیز میں جس میں مشرقی اضلاع پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، اور ہفتوں تک ریل، ڈاک، اور تار کے سلسلہ کے کٹ جانے سے ایک وحشتناک بے خبری طاری رہی، دار المصنفین اور دار المصنفین کے رفقا ربخیریت رہے، اب دوبارہ امن و امان قائم اور آمد و رفت اور ڈاک کا سلسلہ جاری ہو چکا ہے، فللہ الحمد۔

مولانا محمد سورتی کی وفات!

پچھلے مہینہ کا سب سے اندوہناک علمی حادثہ مولانا محمد سورتی کی وفات ہے، مرحوم اس عہد کے مستثنیٰ دل و دماغ اور حافظہ کے صاحب علم تھے، جہاں تک میری اطلاع ہے، اس وقت اتنا وسیع النظر، وسیع المطالعہ، کثیر الحافظہ عالم موجود نہیں، صرف و نحو و لغت و ادب و اخبار و انساب و رجال کے اس زمانہ میں درحقیقت وہ امام تھے، وہ چند ماہ سے مرض استسقاء میں مبتلا تھے، علی گڈھ میں ان دنوں قیام تھا، اور ۷؍ اگست کو بروز جمعہ وفات پائی

مرحوم کا اصلی وطن سورت (گجرات)، تھا، وطن میں ابتدائی تعلیم پاکر یہ دلی آئے، اور رام پور میں مولانا محمد طیب صاحب مکی کا تلمذ حاصل کیا، میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۰۸ء میں ہوئی، جب مولانا محمد طیب مکی رام پور چھوڑ کر دار العلوم ندوہ، لکھنؤ میں ادیب اول کے عہدہ پر فائز تھے، فاضل استاذ کے ساتھ یہ لائق شاگرد بھی لکھنؤ وارد ہوا، اور اس زمانہ سے لے کر آخر تک ان کے ساتھ میری علمی رفاقت اور ذاتی دوستی کا سلسلہ قائم رہا، معارف بھی ان کے رشحات قلم سے کبھی کبھی مستفید ہوتا رہا ہے۔

مرحوم اس فضل و کمال کے باوجود ہمیشہ پریشان حال رہے، اور کہیں ایک جگہ جم کر بیٹھنا ان کو نصیب نہ ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ ان کے علم سے استفادہ بہت کم کیا جاسکا، اور کوئی کارآمد

تصنیف بھی اپنی یادگار نہ چھوڑ سکے، اور نہ کوئی لائق شاگرد ہی ان کا قائم مقام ہو سکا۔ البتہ چند جسمانی اولاد ان کی یادگار ہیں۔

ایک زمانہ میں جامعہ ملیہ دہلی میں معلم رہے، پھر بنارس کے جامعہ رحمانیہ میں مدرس ہوئے بعد کو بمبئی میں ایک اہلحدیث مدرسہ میں حدیث کا درس دینے لگے تھے، ٹونک کے مشہور کتبخانہ کی کشش بھی ان کو ٹونک لیجاتی تھی، انہوں نے شادی بھی ٹونک ہی میں کر لی تھی، قلمی کتابوں کی تلاش اور فراہمی اور نقل انکا ذریعۂ معاش رہ گیا تھا، اور اس تعلق سے وہ ٹونک، پٹنہ رام پور، کلکتہ اور حیدر اباد کا سفر اکثر کیا کرتے تھے، لیکن آخرت کے سفر کے لیے ان کی تقدیر میں علی گڈھ کی مٹی لکھی تھی، ساٹھ کے قریب عمر پائی، سر بڑا، بدن گداز، اور ہاتھ پاؤں بھاری تھے۔

مرحوم مسلکاً اہلحدیث تھے، اور اپنے مسلک میں بیحد غالی تھے، طبیعت بے قرار اور وارستہ تھی، کسی ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتے تھے، ساتھ ہی نہایت سادہ مزاج، بے تکلف، احباب پرور، فیاض اور مستغنی تھے، کھانے اور کھلانے کے بے حد شایق تھے، ہمیشہ مقروض اور خانہ بدوش رہتے تھے۔

مرحوم کا پایہ علم ادب اور رجال و انساب و اخبار میں اتنا اونچا تھا، کہ اس عہد میں اس کی نظیر مشکل تھی، جو کتاب دیکھتے تھے، وہ ان کے حافظہ کے قید میں آجاتی تھی، سیکڑوں نادر عربی قصائد، ہزاروں عربی اشعار اور لغات اور انساب نوک زبان تھے، ان کو دیکھ کر یقین آتا تھا، کہ ابتدائی اسلامی صدیوں میں علماء، ادباء اور محدثین کی وسعت حافظ کی جو عجیب و غریب مثالیں تاریخوں میں مذکور ہیں، وہ یقیناً صحیح ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

نواب محمد یار جنگ کی وفات!

نواب محمد یار جنگ بہادر (حیدر اباد دکن) کی وفات کا سانحہ بھی اسی اثنا میں پیش آیا، مرحوم نسلاً عرب تھے، اور ایک مرنج و مرنجان بزرگ

نہایت مخلص، بے ریا، باخدا اور نیک طبع تھے، صوبہ داری کے منصب سے فیض یاب ہوکر بلدہ میں مقیم تھے، حیدرآباد کی ہر علمی و تعلیمی تحریک میں وہ شریک رہتے تھے، دائرۃ المعارف اور مدرسہ نظامیہ کی اعزازی خدمت بھی ان کی سپرد تھی، دار المصنفین سے مرحوم کو بے حد دلچسپی تھی، اور ہمیشہ وہ اس کی مدد فرماتے رہتے تھے، اہل علم کے لیے ان کا گھر ایک مہمان خانہ کی حیثیت رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے،

دائرۃ المعارف کی تازہ مطبوعات

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کی چند تازہ مطبوعات شایع ہوئی ہیں، ان میں سے ایک "تاریخ کبیر" امام بخاری کی چوتھی، اور "تاریخ منتظم" علامہ ابن جوزی کی دسویں جلد، رسائل محقق طوسی کا دوسرا حصہ، اور ابوبکر محمد بن حسن الحاسب کا ایک اہم رسالہ "انباط المیاہ الخفیہ" ہے، اس اخیر رسالہ میں طبیعیات کی بعض اہم عرب تحقیقات درج ہیں، اور بتایا گیا ہے، کہ زمین کے اندر سے پانی نکالنے، چشموں کا پتہ لگانے، اور نہروں کے بنانے کے کیا طریق ہیں۔

رحمت عالم کا دوسرا اڈیشن!

رحمت عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پہلا اڈیشن بحمد اللہ کہ ختم ہو رہا ہے، اب اس کے دوسرے اڈیشن کی فکر ہے، اس دوسرے اڈیشن میں بعض تصحیحات کا بھی خیال ہے، اگر کوئی صاحب نظر اس باب میں کچھ مشورے دینا چاہتے ہوں، تو وہ دو مہینے کے اندر مطلع فرمائیں، کہ ان کے مشوروں سے مستفید ہوا جا سکے، اس کا ہندی ترجمہ بھی پریس میں جا رہا ہے۔

عبد الماجد دریابادی کا انگریزی ترجمۂ قرآن

ہمارے فاضل دوست جناب مولانا عبد الماجد دریابادی کا انگریزی ترجمۂ قرآن لاہور کی تاج کمپنی کی طرف سے چھپنا شروع ہو گیا ہے، مترجم نے اس ترجمہ میں خالص اہل سنت کی تفسیروں کی پیروی کی ہے، اور حواشی میں جو بکثرت ہیں، شکوک وشبہات کا ازالہ کیا ہے، اور یہود و نصاریٰ کی کتابوں سے تائیدات، بعض آیات کی جغرافی و تاریخی تحقیقات درج کی ہیں، امید ہے کہ نوجوان انگریزی خواں طبقہ اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش

کرے گا۔

(معارف ماہ ستمبر ۱۹۴۲ء)

(۱۰)

حافظ آزاد مرحوم

۲۷ شعبان ۱۳۶۱ھ کو صوبہ بہار کے مشہور و ممتاز کہنہ مشق شاعر حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی نے اس دنیائے دوں کو الوداع کہا، مرحوم کی عمر اس وقت غالباً اسّی سے زیادہ ہوگی، کانوں سے اونچا سننے لگے تھے، مگر اس سن و سال میں بھی ان کی شاعری کے شباب کا وہی عالم تھا، غزلوں کے کہنے کا اتفاق کم ہوتا تھا، مگر قومی و علمی و اخلاقی نظموں کا شوق زیادہ تھا، زیادہ تر اردو میں اور کبھی کبھی فارسی میں کہتے تھے، اور شاذ و نادر عربی میں بھی طبع آزمائی کی نوبت آجاتی تھی۔

پٹنہ میں سرسیّد مرحوم کی تعلیمی و قومی تحریک کے علمبردار قاضی حسین صاحب مرحوم تھے، یہ ان کے حیدرآباد کے وفد کے ایک رکن بھی تھے، قاضی صاحب مرحوم کی فیض بخش علمی صحبتوں میں بہار کے جو چند نوجوان ابھرے، بڑھے اور پھیلے ان میں ایک نام حافظ آزاد مرحوم کا بھی ہے، چنانچہ سرسیّد مرحوم کے اس ۱۸۹۱ء والے حیدرآبادی وفد میں جس کے دوسرے ممبر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حالی وغیرہ تھے، قاضی رضا حسین صاحب کے ساتھ آزاد مرحوم بھی تھے۔

میں نے ان کو سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں جب میری نو عمری تھی، ندوہ کے اجلاس پٹنہ میں اپنا ترکیب بند پڑھتے سنا، بلند قد، اونچی آواز، خود اعتمادی کے تیور، لہجہ پرجوش، کٹہرے میں شیر کی گرج سنائی دیتی تھی، سامنے علماء اور مشائخ کی صفیں تھیں، جن کی تعداد کئی سو سے کم نہ ہوگی، اکثر کی نورانی شکلوں کی یاد اب بھی دل کو منور کرتی ہے، شاعر نے جب ان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے یہ شعر پڑھا ہے۔

نشانِ کارواں رفتہ ہیں، دل کے اجالے ہیں
غنیمت ہی غنیمت ہیں کہ سب اللہ والے ہیں

تو تحسین و آفریں کی آوازوں سے ساری فضا گونج گئی تھی، اسی جلسہ میں آغا سنجر طہرانی بھی تھے، اور انہوں

نے بھی اپنا وہ فارسی قصیدہ پڑھا تھا، جس کا مطلع تھا،

ستایش می سزد البتہ یکتا ذات یزداں را
کہ او از نطق تشریف شرف بخشید انساں را

مولانا شبلی مرحوم سے ان کی ملاقات اسی عہد جوانی کی تھی، مولانا مرحوم نے جن دنوں ۱۹۰۸ء میں اپنی ان فارسی غزلوں کا سلسلہ شروع کیا تھا، جو "بوئے گل" اور "دستۂ گل" کے نام سے چھپ چکی ہیں، اور ملک میں ان غزلوں کا پرجوش خیر مقدم کیا جا رہا تھا، اور اہل سخن ان کے جواب میں غزلیں لکھا کرتے تھے، تو ان میں سے ایک حافظ صاحب مرحوم بھی تھے، غالباً یہی سنہ تھا مولانا مرحوم کلکتہ سے لوٹ کر پٹنہ میں مولوی خدابخش خاں مرحوم (کتب خانہ والے) کے یہاں ٹھہرے تھے، خاکسار بھی حاضر تھا، اتنے میں مولانا سے ملنے حافظ صاحب مرحوم بھی آگیے، اس زمانہ میں مولانا کی ایک فارسی غزل نئی نئی شاق افتادہ بود، طاق افتادہ بود نکلی تھی، وہ مولانا نے ان کو سنائی، انہوں نے بعد کو اس کا جواب لکھا، سب سے آخری دفعہ وہ ۱۹۲۷ء کے اجلاس ندوہ کانپور میں جس کے صدر حکیم اجمل خاں مرحوم تھے، ادھر آئے تھے، اور اپنی ایک نظم پڑھی تھی۔

مرحوم فطری شاعر تھے، کسی استاذ سے کبھی اصلاح نہیں لی، مشکل قافیوں اور ردیفوں کا بھی شوق تھا، زبان، محاورات و روزمرہ کے بجائے دقیق مضامین و معانی کا شوق زیادہ تھا، اسی لیے مشکل الفاظ سے پرہیز نہ تھا، طبیعت میں ذکاوت و ذہانت تھی، اور اپنے لیے آپ راستہ پیدا کرنے کی دھن تھی، تقلید عام سے نفور تھے، جوانی میں شاد عظیم آبادی سے بھی بھڑتے رہتے تھے، اوراپنچ میں مذاقیہ داد نظم بھی دیتے تھے، ادھر مدت سے خانہ نشین تھے، باہر کی آمد و رفت بند تھی، کبھی کبھی ایک آدھ نظم کسی رسالہ میں نکل جاتی تھی، اسی حالت میں اپنے وطن شاہو بگہہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

کتاب الصیدلہ کا فارسی ترجمہ اگست ۱۹۴۲ء کے معارف میں بیرونی کی کتاب الصیدلہ یا کتاب الصیدنہ کی اصل عربی یا فارسی ترجمہ کی بابت اہل علم سے استفسار کیا گیا تھا، مولوی سید حسن برنی مولف البیرونی

نے اطلاع دی ہے، کہ اس کا خلاصہ فارسی ترجمہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے اور اس کا ذکر ان کی کتاب البیرونی کے ص ۸۶ پر ملے گا،

ان کی کتاب البیرونی کو نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ کتاب لغات الطب میں ہے، نسخہ سنہ ۱۰۰۸ھ کا لکھا ہے، اس کا ترجمہ ہندوستان ہی میں عثمان الکاشانی نے کیا تھا، کتاب کا طرز یہ ہے، کہ پہلے ہر دوا کا نام لکھا ہے، پھر عربی، یونانی، سریانی، جرجانی، خوارزمی، فارسی، عراقی، ہندی، سندھی نام لکھے ہیں، پھر اس کی خاصیت بیان کی ہے۔

میسور یونیورسٹی میں اردو فارسی کی چیر

جنوبی ہند کی دو یونیورسٹیوں میں اردو، فارسی اور عربی کی دو کرسیوں کے قیام سے اس دور افتادہ حصہ ملک میں اسلامی ادبیات کی ترقی کی نئی راہیں نکلی ہیں، میسور یونیورسٹی نے اپنے یہاں اردو اور فارسی کی ایک کرسی قائم کی ہے، اور اس پر حیدرآباد کے نوجوان ادیب پروفیسر عبدالقادر سروری کا انتخاب کیا ہے، جس کے لیے یونیورسٹی اور پروفیسر دونوں کی خدمت میں ہدیۂ تہنیت پیش ہے،

ٹراونکور یونیورسٹی میں عربی کی چیر

ٹراونکور یونیورسٹی نے سری چترا ترنال مہاراجہ کی منظوری سے اپنے یہاں عربی کی کرسی بڑھائی ہے، اس کے لیے محمد ایم۔ اے کو جو عربی کے لائق فاضل ہیں، اور جن کے عربی میں خطوط میرے پاس وقتاً فوقتاً آیا کرتے ہیں، لکچرر مقرر کیا ہے، ان اطراف میں عربوں کی پرانی نوآبادی ہونے کے سبب سے عربی کی خاص اہمیت ہے، اور اس بنا پر ٹراونکور یونیورسٹی کے اس ضروری اضافہ کی قدر سارے ملک میں کی جائے گی

(معارف ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء)

(۱۱)

اس ماہ میں یوپی اور بہار کے دو۲ ممتاز شاعروں اور ادیبوں کی وفات کی اطلاع ملی ہے، ان صفحات میں ان مرحوموں کا ذکر اس لیے ہوتا ہے، کہ ہماری آیندہ نسلوں کو اپنے پچھلوں کے نام نیک

کی خبر ہے، اسلامی تاریخ کا ایک بڑا اہم کارنامہ وفیات یعنی ہزاروں، لاکھوں بزرگوں، فاضلوں، ادیبوں اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ کا تعین ہے، تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدون ہوئیں، کیا عجب ہے کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بن جائیں۔

وصل بلگرامی وصل بلگرامی مرحوم ومغفور کے جاننے والوں اور ملنے والوں کو یہ سن کر بڑا قلق ہوگا کہ ۲۸ر رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۱ھ کو رات کے وقت وہ ہمیشہ کے لیے ان سے جدا ہوگئے، مرحوم بڑے ملنسار، متواضع، پرمحبت، دوستوں کے فداکار، اور وقت پر ہر ایک کے کام آنے والے تھے، وہ گو ہمیشہ سے دیندار اور پابند وضع لوگوں میں تھے، جوانی میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث گنگوہی سے ملے تھے۔ اور اب ادھر دس بارہ برس سے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی (متعنا اللہ تعالیٰ بفیوضہ وبرکاتہ) سے ان کی ارادت کا تعلق تھا، اور اب وہ زیادہ تر حضرت مولانا کی خدمت میں تھانہ بھون ہی میں خانقاہ امدادیہ کے ایک حجرہ میں مقیم رہتے تھے، وہیں اسی حجرہ میں چند روز کے بخار میں اچانک وفات پائی، شیخ نے اپنے مرید کی نماز جنازہ پڑھائی، اور وہیں کے قبرستان میں تدفین ہوئی،

خاکسار سے مرحوم کے تعلقات بہت پرانے تھے، سنہ ۱۹۰۶ء میں میری تعلیم ختم ہوئی، اور وہ اس عمر میں تھے، کہ "عالمگیر" نام ایک رسالہ نکال رہے تھے، ان سے بلگرام ہی کی مردم خیز زمین پر اسی زمانہ میں ملاقات ہوئی تھی، اس وقت وہ جوان شاعر اور ادیب تھے، اردو، فارسی، قدرے عربی اور انگریزی جانتے تھے، پھر ان کو جب وہ ادھیڑ ہو چکے تھے، مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم رئیس گورکھپور کی سرپرستی میں گورکھپور میں دیکھا، اس کے بعد انہوں نے لکھنؤ پہنچ کر "مرقع" نام رسالہ جاری کیا، جو چند سال جیتا رہا، اب آخر میں وہ زاہد گوشہ نشین ہو کر نظر آئے، اور اسی پر ان کا زمانہ حیات کا خاتمہ ہوگیا، اللہ تعالیٰ اس خلق ومروت کے مجسمہ کو اپنی محبت سے نوازے۔

مسٹر نصیر بیرسٹر

بہار میں نئی تعلیم بنگال کے قرب بلکہ ملحقہ صوبہ ہونے کی وجہ سے بہت پہلے پھیلی وہاں کے مسلمان شرفا کے جو نونہال ان میں سب سے زیادہ پھلے اور پھولے ان میں سید علی امام، حسن امام اور مظہر الحق وغیرہ کے نام، ان کے بعض سیاسی اور قومی کارناموں کی وجہ سے بہت نمایاں ہیں۔ ان ہی کے معاصرین میں ایک نام مسٹر نصیر بیرسٹر کا ہے، پٹنہ کے قریب شرفا کا ایک مشہور قصبہ نگرنہسہ ہے، وہ وہیں کے ایک انصاری خاندان کے چشم و چراغ تھے، خاندان میں عربی و فارسی علوم کا چرچا تھا، ان کے دادا شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ یا شاہ عبد الغنی صاحب مجددی کے شاگرد تھے، اور ان نفوس قدسیہ کے برکات کا خاص اثر اس مغربی تعلیم یافتہ کے ذہن و خیال پر تھا، افسوس کہ ستمبر ۱۹۴۲ء کے آخر میں اس دور کی یہ یادگار شخصیت بھی مٹ گئی،

ان کی کوٹھی مراد پور میں میرا قیام

۱۸۹۸ء میں جب خاکسار پہلی دفعہ دیہات سے نکل کر شہر (پٹنہ) میں آیا، تو سب سے پہلے ان ہی کی کوٹھی پر جو مراد پور کی سڑک کے شمال رخ پر تھی، اس تعلق سے قیام ہوا تھا، کہ میرے چھوٹے چچا مرحوم اس زمانہ میں انہی کے ساتھ رہتے تھے، عمر میں پہلا اتفاق تھا، اس لیے ان کی ہر چیز مجھے عجیب معلوم ہوئی تھی، بہت گویا، بہت ہنس مکھ، ہر وقت خوش و بشاش، شعر و سخن کے دلدادہ، علمی صحبتوں کے شائق، بزرگوں کا ادب، دین کا پاس، اور مذہب کا جوش، کوٹ پتلون، اور ہیٹ کے اس پتلے میں عجیب رنگین کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔

ندوۃ العلماء کا ساتواں اجلاس پٹنہ!

۱۹۰۰ء میں ندوۃ العلماء کا ساتواں جلسہ پٹنہ عظیم آباد میں تھا، جو قدیم تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم کا بھی مرکز تھا، اجلاس میں علمائے کرام اور مشائخ عظام کے پہلو بہ پہلو جسٹس مولوی سید شرف الدین مرحوم کی سرکردگی میں ان نوجوان بیرسٹروں کا جھرمٹ بھی تھا، اور شاید یہ پہلا دن تھا جب مقدس شملے اور ہیٹ یکجا نظر آئے تھے، اس اثنا میں جوش و حمیت کا یہ پتلا پورے انگریزی ڈریس میں اسٹیج پر آیا، اور دلدوز تقریر کی،

کہ میری ان آنکھوں نے بڑے بڑے مقدس علما اور مشائخ کو دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا، مقرر کے جوش کا یہ عالم تھا، کہ اس نے اپنا قیمتی کوٹ، گھڑی، انگوٹھی، سب نذر کر دی، جن لوگوں نے اس منظر کو دیکھا تھا، وہ سماں آج تک نہیں بھولے ہیں۔

یا تو میں نے ان کو ان انگریزی کپڑوں اور انگریزی شکل وصورت میں دیکھا، یا پھر ابھی دس پندرہ برس ہوئے ریش سفید، مخملی ٹوپی، اور اچکن اور کرتے میں دیکھا، اور سنا کہ اب یہ عالم ہے، کہ تسبیح وسجادہ سے سروکار ہے، مرحوم کی دوسری شادی نیورہ میں ہوئی تھی، چند سال ہوئے کہ وہاں اس سے بھی بڑھکر محو استغراق پایا، مجھ سے عزیزانہ برتاؤ تھا، جوانی میں میلاد کا پرشوق رسالہ لکھا تھا، اور پیری میں شاعری پر ایک اردو مثنوی لکھی، جو خاکسار کے مقدمہ کے ساتھ مطبع معارف میں چھپی تھی

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی مغفرت سے سرفراز کرے، ان کے پورے حالات نقوش سلیمانی کے آخر میں ان کی مثنوی کے دیباچہ میں لکھے گیے ہیں۔

(معارف ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۲ء)

(۱۲)

پنجاب کے نامور عالم ووکیل ومجاہد سیاسیات مولانا **عبد القادر** صاحب قصوری کی وفات کی خبر سے بڑا صدمہ ہوا، قصور ضلع لاہور ان کا وطن تھا، اور وہیں وکالت کرتے تھے، اور اچھے نامور وکیل تھے، عربی کے عالم، دینیات کے فاضل اور انگریزی سے واقف تھے، مولانا ابو الکلام کے الہلال والی تحریک سے ان کو ایسی دلچسپی تھی، کہ اس کے لیے انھوں نے بہت کچھ نثار کیا، اپنے ایک صاحبزادہ کو ایک طرف عالم بنایا، اور دوسری طرف کیمبرج کا گریجویٹ، اسی طرح اپنے دوسرے بیٹے کو بھی عربی وانگریزی کی تعلیم دلائی، اور دونوں کو مع اپنی زندگی کے بہت سے سرمایہ کے دعوت وتبلیغ اسلام کے کاموں کے نذر کر دیا، جس کا سلسلہ ایک زمانہ میں بمبئی سے لے کر مدراس تک جال کی طرح پھیلا تھا خلافت کی تحریک

میں کامیاب وکالت کو خیرباد کہہ کر قومی وسیاسی تحریکوں میں شامل ہوگیے، اور اخیر تک اپنے عہد پر قائم رہے۔

مرحوم مسلکاً اہل حدیث تھے، نہایت دیندار، متواضع، ملنسار، پابند وضع، علامہ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کی تصانیف کے بڑے شایق تھے، اور انہی کی تحقیقات پر ان کا عمل تھا، خلافت، حجاز اور کانگریس میں بیش از بیش حصہ لیا، اور اس عمر میں بھی جو غالباً اسّی کے قریب ہوگی، وہ اپنے جذبات کے لحاظ سے ایسے ہی جوان تھے، ادھر سیاسیات کی عملی تحریکوں سے کنارہ کش تھے۔

مرحوم کو خاکسار سے گوناگوں تعلقات قلبی تھے، قومیات میں ہمیشہ ساتھ رہا، خیالات میں بہت کچھ ہم آہنگی تھی، سب سے اخیر بات یہ کہ حجاز کے وفد خلافت میں جو ۱۹۲۴ء میں جدہ تک جاسکا تھا، وہ خاکسار کے ساتھ تھے، گو وفد کی صدارت برائے نام میرے نام تھی، مگر ان کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا تھا، جدہ کے نہایت پرخطر موقعوں پر جب جان کا خطرہ بھی تھا، وہ برابر ہمت بڑھاتے رہتے تھے، مکلا، سوڈان، جدہ اور قاہرہ میں ہر جگہ وہ ساتھ تھے، افسوس کہ اس وفد کے تین ممبروں میں دو مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا عبدالقادر قصوری چل بسے، اب صرف ایک باقی ہے، معلوم نہیں وہ بھی کے دن کے لیے۔

سر محمد یعقوب کی ناگہانی وفات کا سانحہ اخباروں میں آچکا ہے، مرحوم مراداباد کے رہنے والے تھے، ان کے والد ماجد مولوی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل شاہجہانپور نہایت نیک ومتین ودیندار بزرگ تھے، ندوۃ العلماء کے رکن تھے، اور ۱۹۰۸ء کی تبلیغی تحریک میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ تھے، سر محمد یعقوب نے گو انگریزی تعلیم پائی تھی، مگر مذہبی ذوق ورثہ میں پایا تھا، اور بڑے خوش قسمت تھے، مراداباد کی کامیاب وکالت سے لے کر کونسل کی صدارت تک اور پھر سرکار نظام کے مشیر اصلاحات کے رتبہ تک انھوں نے جو ترقی کی،

وہ سراسر ان کی خوش قسمتی کا نتیجہ تھی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس عالم میں بھی خوش قسمت بنائے، وہ بہت خوش خلق، متواضع، متحمل اور حاجت مندوں اور ضرورت مندوں کی امداد میں کشادہ دست تھے۔ غفر لہ اللہ تعالیٰ۔

اردو زبان کے مشہور پرانے رسالہ "زمانہ" کے اڈیٹر **دیانراین نگم** نے اسی مہینہ وفات پائی، کالج سے نکلنے کے بعد انہوں نے بریلی میں "زمانہ" کو جو اردو کا ایک معمولی رسالہ تھا اپنی ادارت میں لیا، اور اس کو کانپور لائے، اور اس کو اس حد تک چمکایا، کہ اردو کے اچھے رسالوں میں گنا جانے لگا، بلکہ اس وقت تک اردو کا سب سے پرانا رسالہ ہے، پریم چند آنجہانی کو وہی سب سے پہلے اسٹیج پر لائے، ان کے علاوہ اور بہت سے اچھے لکھنے والے اور کہنے والے ہندو اور مسلمان اہل قلم کا سنگم اب تک رہا، اور اس کو دیکھ کر تسکین ہوتی تھی، کہ ہندو مسلمانوں کی پرانی تہذیب کے شیدائی ہندو ابھی تک زندہ ہیں،

امید کہ "زمانہ" آئندہ بھی اپنے بانی کی یادگار میں اس کی بنائی ہوئی روش پر چلتا رہے گا، تاکہ اس اختلاف آباد ہند کی اس آندھی میں دیانراین کا یہ دیا جلتا رہے گا۔

البرامکہ کا دوسرا اڈیشن!

ہماری زبان کے مصنفوں میں اس وقت سب سے بوڑھے مصنف غالباً مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری ہیں، جو البرامکہ اور نظام الملک طوسی نامی دو مشہور کتابوں کے مصنف ہیں، مولانا شبلی مرحوم نے فرمانروایان اسلام کا سلسلہ قائم کیا تھا، ان ہی کے ساتھ ان ہی کے زیر مشورہ مولوی عبدالرزاق صاحب نے وزرائے اسلام کا سلسلہ شروع کیا تھا، جس کی پہلی کڑی البرامکہ ہے، جو آج سے چالیس سال پہلے لکھی گئی تھی، اور اس وقت بڑی دلچسپی سے پڑھی گئی تھی۔

لیکن اب چالیس سال میں تحقیقات میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا ہے، اور بہت سی نئی کتابیں بھی چھپ گئی ہیں، اس لیے ضرورت تھی، کہ مصنف اس پر نظر ثانی کریں، چنانچہ موصوف نے کئی سال کی محنت میں اس کو نظر ثانی کرکے چھپوایا ہے، اور تین سو سے

صفحے اور پانچ باب بڑھائے ہیں، امید ہے کہ اہل شوق ہمارے سب سے بوڑھے مصنف کی اس کتاب کی اس سب سے پہلی کتاب کی پوری قدر کریں گے۔ غیر مجلد کی قیمت عہ۴ر اور مجلد کی ۶ےر ہے، پتہ: مولوی عبدالرزاق صاحب مہتمم صیغہ تاریخ بھوپال۔

آج کل عریاں نویسی کا نام ادب لطیف اور مزدوروں اور غریبوں کے مرثیہ کا نام نیا ادب رکھا گیا ہے، اور کہا جا رہا ہے، کہ یہ نئے انقلاب کی بنیاد بنے گا، اس نئے ادب میں ہر پرانی چیز سے بے ادبی پہلا اصول ہے، اس بنا پر مذہب سے جو انسان کا سب سے پرانا سرمایۂ روح ہے، بے ادبی ناگزیر ہے، چنانچہ ہندو نوجوانوں کی دیکھا دیکھی مسلمان نوجوانوں نے بھی تفریح طبع کی خاطر اس بے ادبی سے دل بہلانے کی طرح طرح کی صورتیں ایجاد کی ہیں، کہیں ظرافت، کہیں تمسخر، کہیں شاعری، کہیں سیاست اور کہیں معاشرت کے مسائل میں بذلہ سنجی کی جاتی ہے، اور عموماً اس مشغلہ میں بے روزگار اہل قلم مصروف ہیں، دلی کے ایک نئے ادب کے رسالہ میں ابھی اس بے ادبی کا نیا مظاہرہ کیا گیا ہے، یہ رسالہ اس دادا کے پوتے کی ادارت میں نکلتا ہے، جو مہدی مرحوم کے بقول مذہب کے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑتے تھے۔

بہ بیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

پھر کیا مسلمان اس پر صرف افسوس کر کے رہ جائیں گے۔

(معارف ماہ دسمبر ۱۹۴۲ء)

شذرات

بابت ماہ جنوری ۱۹۴۳ء تا ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء

رجوع اور اعتراف

میری پیدائش صفر ۱۳۰۲ھ میں ہوئی، اور اب یہ محرم ۱۳۶۲ھ شروع ہوگیا ہے، یعنی میری عمر نے زندگی کے ساٹھ مرحلے طے کر لیے، میری تحریر کا آغاز ۱۹۰۲ء سے ہوا ہے، اور اب ۱۹۴۳ء ہے، جس کے معنی یہ ہیں، کہ میری تحریری عمر نے چالیس سال پورے کر لیے، جب اس پر نظر جاتی ہے، کہ اس ساٹھ سال کی زندگی میں کیا کیا کوتاہیاں ہوئیں، اور کیسی کیسی لغزشیں پیش آئی ہوں گی، تو دل پکار اٹھتا ہے۔

از کردۂ ناصواب یارب توبہ

تحریری زندگی کے چالیس سال پورے ہوگیے، یاد نہیں کہ ان چالیس برسوں میں قلم نے کیا کیا لکھا، اور کہاں کہاں غلطی کی، اتباع حق کے بجائے اتباع ہوی کے موقعے کہاں کہاں پیش آئے اور اب بھی اپنی موجودہ حالت پر بزبان حال یہ صدائے غیب آتی ہے؛

چہل سال عمر عزیزت گذشت
مزاج تو از حال طفلی نہ گشت

کتابوں اور مضمونوں کے ہزارہا صفحات اتنے دنوں میں سیاہ کیے گیے، کہا نہیں جاسکتا، کہ کہاں کہاں حق کا ساتھ چھوٹا ہے، اور کس باطل کی تائید میں قلم نے لغزش کی ہے، جس سے اتباع حق کے بجائے اتباع ہوی کا ارتکاب ہوا ہو، بندہ ہر حالت میں قصوروار ہے، خطا و نسیان اس کا خمیر ہے، اور اس کا علم و عمل کی لغزشگاہوں سے ٹھیک ٹھیک بچ نکلنا بہت مشکل ہے، اس لیے یہ خاکسار ہیچمداں علی الاعلان اپنی ان تمام غلطیوں سے جو دانستہ یا نادانستہ

حق کے خلاف ہوئی ہوں، صدق دل سے توبہ کرتا ہے، اور اپنے قصور کا اعتراف اور اپنی ہر اس رائے سے جس کی سند کتاب و سنت میں نہ ہو، اعلان برأت کرتا ہے، وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰه۔

مذہبی مسائل کی تحقیقات میں میرا یہ عمل رہا ہے، کہ عقائد میں سلف صالحین رحمہم اللہ تعالیٰ کے مسلک سے علٰحدگی نہ ہو، البتہ فقہیات میں کسی ایک مجتہد کی تقلید بتمامہ نہیں ہو سکی ہے، بلکہ اپنی بساط بھر دلائل کی تنقید کے بعد فقہاء کے کسی ایک مسلک کو ترجیح دی ہے۔ لیکن کبھی کوئی ایسی رائے اختیار نہیں کی، جس کی تائید ائمۂ حق میں سے کسی ایک نے بھی نہ کی ہو خصوصیت کے ساتھ مسائل کی تشریح میں حافظ ابن تیمیہؒ، حافظ ابن قیم اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہم کی تحقیقات پر اکثر اعتماد کیا ہے۔

ایسا بھی دو چار دفعہ ہوا ہے، کہ ایک تحقیق کے بعد دوسری تحقیق سامنے آئی ہے اور اپنی غلطی ظاہر ہوئی ہے، تو بعد کے اڈیشن میں اس کے مطابق تبدیلی کر دی ہے، مثلاً معراج بحالت بیداری و بجسم ہونے پر قرآن پاک سے صحیح استدلال مجھے پہلے نہیں مل سکا، اور بعد کو اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی توفیق سے صحیح دلیل سمجھا دی تو دوسرے اڈیشن میں اس کو بڑھا کر مقام کی تصحیح کر دی، اسی طرح فنائے نار کے مسئلہ میں پہلے حافظ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی پیروی میں جو کچھ لکھا گیا، بعد کو جمہور کی رائے کا اضافہ کر کے دونوں کے دلائل کی تشریح کر دی، اور اب بحمد اللہ کہ اس باب میں جمہور ہی کے مسلک کا حق ہونا سمجھ میں آگیا ہے، وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰه،

مسئلۂ تصاویر کے متعلق میں نے ١٩١٩ء میں ایک مضمون لکھا تھا، جس میں ذی روح کے فوٹو لینے یعنی عکسی تصویر کشی اور خصوصاً نصف حصۂ جسم کے فوٹو کا جواز ظاہر کیا تھا، اس سلسلہ میں بعد کو ہندوستان اور مصر کے بعض علماء نے بھی مضامین لکھے ہیں، جن میں سے بعض میرے موافق ہیں، اور بعض مخالف ہیں، لیکن بہر حال اس بحث کے سارے پہلو سامنے آگئے ہیں، اس لیے سب کو سامنے رکھکر اب اس سے اتفاق ہے، کہ صحیح یہی ہے کہ امر اوّل

دستی تصویر کی طرح ناجائز ہے، اور امر ثانی کا کھینچنا ناجائز اور کھچوانا باضطرار جائز اور دھڑ کا بغیر سر اور چہرہ کے دونوں جائز، پوری تفصیل آیندہ لکھی جائے گی، انشاء اللہ

زیوروں میں زکوٰۃ کے وجوب اور عدم وجوب کے مسئلہ پر صحابہ رضی اللہ عنہم سے لے کر اب تک اختلاف رہا ہے، روایات سے ظاہر ہوتا ہے، کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عدم وجوب کی قائل تھیں، سیرت عائشہ صدیقہؓ میں ان کے اس مسلک کی تشریح میرے قلم سے کچھ اس انداز سے نکلی ہے، جس سے اس مسئلہ میں ان کی اس رائے کی تائید ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ ایک صاحب علم نے بڑی خوبی سے اس کا جواب بھی ایک رسالہ میں لکھا ہے، جو شایع ہو چکا ہے، اس لیے اس غلط فہمی کو دور کر دینا ہے، اور کہہ دینا ہے، کہ میں زیوروں میں جمہور کے فیصلہ کے مطابق زکوٰۃ کے وجوب کا قائل اور اسی پر بحمد اللہ عامل ہوں، اور کتاب کے آیندہ اڈیشن میں انشاء اللہ اس کی تصحیح بھی ہو جائے گی۔

یہ باتیں کسی معترض کے خوف سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے لکھ رہا ہوں، اور دعا کرتا ہوں کہ بار الہا مجھے صراط مستقیم پر قائم رکھ، اور جب کبھی تقاضائے بشری سے مجھ سے غلطی ہو تو مجھے تنبیہ اور معاف فرما، اور مسلمانوں کو اس کے شر سے محفوظ رکھ، اور مجھے راہ صواب دکھا۔ رَبَّنَا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ، رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ..... وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلَانَا۔

اگر مسلمانوں میں کوئی ایسا ہو، جس نے میری وجہ سے ان مسئلوں میں میری رائے اختیار کی ہو، تو اس کی خدمت میں عرض ہے، کہ وہ میرے اس رجوع اور تصحیح کے بعد اپنی غلطی سے رجوع کرلے، اور صحیح امر اختیار کرے، علمائے سلف میں اپنی رائے سے رجوع اور ترجیح اور قول ثانی کا رواج عام رہا ہے، یہ ان ہی کا اتباع حق ہے۔ وَالْحَقُّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى

(معارف ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۳ء)

(۲)

تاریخ دولت عثمانیہ جلد دوم

سنہ ۱۹۴۲ء ختم ہوگیا، مگر دار المصنفین سے اس سال کوئی نئی کتاب شایع نہ ہوسکی، مطبع کا زیادہ تر وقت پرانی ختم شدہ کتابوں کی دوبارہ چھپائی میں لگ گیا، اور جو دو کتابیں زیر طبع تھیں، وہ بھی پوری نہ ہوسکیں، ان میں ایک تو "تاریخ دولت عثمانیہ" تھی، جو تین سو صفحوں تک چھپ چکی ہے، اور اس کا آخری صفحہ مصطفےٰ کمال پاشا کی تحریک تک پہنچ چکا ہے، ہم نے مصنف سے خواہش کی ہے، کہ وہ اس جلد کو یہیں تک ختم کردیں، اگر ان کی تصنیفی مصلحت نے اس کو منظور کرلیا تو یہ جلد فروری میں شایع ہوجائے گی، ورنہ تاخیر ہوگی۔

حیات شبلی

دوسری زیر طبع کتاب "حیات شبلی" ہے، یہ ساڑھے پانچ سو صفحوں تک چھپ چکی ہے، آیندہ تین سو صفحے باقی ہیں، کوشش ہو رہی ہے، کہ اپریل تک یہ چھپ جائے، خیال ہوتا ہے، کہ اس میں دار المصنفین، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، اور شبلی اسکول و شبلی کالج اعظم گڈھ کی عمارتوں کے فوٹو ہوں، کہ اب مولانا مرحوم کے مجسم کارنامے دنیا میں یہی ہیں، اگر ان فوٹوؤں کے بلاک اور ان کے چھپنے کا سامان اس زمانہ میں نہ ہوسکا، تو یوں ہی سادہ کتاب شایع ہوجائے گی، کہ شبلی کی معنوی حیثیت کو اس ظاہری آرایش کی چنداں ضرورت بھی نہیں،

تاریخ اسلام جلد سوم

ہمارے یہاں اس وقت دو نئی کتابیں پریس میں جانے کے قابل ہیں، "تاریخ بنی عباس" یعنی تاریخ اسلام کا تیسرا حصہ، "امام رازی" یعنی امام رازی کی حیات اور ان کا فلسفہ، باقی تاریخ اسلام اور تاریخ ہند کے متعدد حصے تیار ہیں، مگر ابھی ان کی چھپائی اور کاغذ کا انتظام نہیں ہوسکتا، ان کے علاوہ "شعر العرب" اور "تاریخ الحکماء" کے ابواب بھی زیر ترتیب ہیں،

رحمت عالم کا ھندی ترجمہ

رحمت عالمؐ کا ہندی ترجمہ یہیں ہندی ٹائپ میں چھپ رہا ہے،

یہ ترجمہ ایک مسلمان نے کیا ہے، جس کو ہندی لٹریچر سے پوری آگاہی ہے، اور موجودہ ہندی ادب و انشا، کا معیار بھی معلوم ہے، اس لیے امید ہے، کہ یہ ترجمہ زبان کے اعتبار سے بھی اچھا ہوگا، اور اس لایق ہوگا کہ ہندی ادب میں اس کو جگہ مل سکے۔

اسلام کا سیاسی نظام

مجلس نظام اسلامی کی طرف سے اسلام کے سیاسی و اقتصادی نظام پر دو کتابوں کے لکھوانے کا جو فیصلہ ہوا تھا، بحمد اللہ کہ اس کی تکمیل ہو رہی ہے، پہلا حصہ سیاسی نظام کا مرتب ہو گیا، اس کا مسودہ صاف ہو کر اس وقت مصنف کے زیر نظر ثانی ہے، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے بھی اس کو دیکھا ہے، اور اس پر اپنے مشورے لکھے ہیں، دوسرا حصہ ۹۰ نوے صفحے تک ہوا ہے، جس کو کاتب اب صاف کر رہا ہے، باقی حصہ بھی مکمل ہو کر آجائے تو صاف ہو کر ارکان کی خدمت میں بھیجا جائے۔

کتاب کا مرتب ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے، کتاب تو سب ہی مرتب کر سکتے ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ جو لکھا جائے، اس میں خواہ مخواہ اس کی کوشش نہ ہو کہ اسلامی اصولوں کو موجودہ اقتصادی تحریکوں کے اصولوں اور مطالبوں سے ہم آہنگ کرنے کی سعی بیجا کی جائے، اور اس کے لیے آیات قرآنی، احادیث نبوی اور احکام فقہی میں تحریف کی جرأت کی جائے، اس بدعت کی مثالیں وقت کی موجودہ تحریروں، رسالوں اور کتابوں میں جو اسی موضوع سے متعلق لکھی جا رہی ہیں، مل رہی ہیں۔

ترکی اخبارات کے اڈیٹروں کا وفد

ترکی مدیران اخبار کا وفد ہندوستان آیا ہوا ہے، اس نے لاہور میں یہ کہا کہ وہ پہلے ترک ہیں، پھر مسلمان، عجب نہیں کہ اس بیان پر بہت کچھ مخالف و موافق کہا جائے، اور لکھا جائے، لیکن ہم تو اتنا جانتے ہیں، کہ وہ پہلے ہوں یا پیچھے ہوں، مگر ہزار پیچھا چھڑانے پر بھی وہ مسلمان ہی ہیں، وہ اس اسلام سے برأت کا اعلان نہ کر سکے، حالانکہ اس اعلان کی آزادی پر اب کسی خوف کا پہرہ نہیں، اس سے ہمارے ان غلام نوجوانوں کو سبق لینا چاہیے، جو سوشلزم کے چند حرف رٹ لینے کے بعد اپنا نام مسلمان

قوم کے رجسٹر سے کٹوانے پر فخر کرتے ہیں، ان نوجوانوں کو پیر شیراز کی یہ نصیحت یاد رکھنی چاہیے؛

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت
بہر در کہ شد، ہیچ عزت نہ یافت

تاہم یہ ترک وفد اگر واقعی اسلام کا نمایندہ ہو کر آتا تو دیکھتا کہ نو کرور مسلمان ان کے استقبال و احترام کا کیا منظر پیش کرتے ہیں، انہوں نے تو اب تک مسلمان اور اسلام کے نام سے حتی الوسع احتراز کیا ہے، تاہم جس طرح وہ ہندوستان کے مردہ آثار قدیمہ دیکھنے آتے ہیں، ہم ترکان عثمانیہ کے ان زندہ اور چلتے پھرتے آثار قدیمہ کو دیکھ رہے ہیں، اور اس پر خوش ہیں

مرا از زلف او موئے بس است

(کافی)

(معارف ماہ فروری ۱۹۴۳ء)

(۳)

کاغذ کی گرانی بلکہ کمیابی نے اچھے اچھے مطبعوں اور ناشروں کے حوصلے پست کر دیئے ہیں، مگر معارف نے ابھی تک اپنی آن قائم رکھی ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا ہے، کہ یہ حالت کب تک چل سکتی ہے، بہر حال اگر واقعات نے مجبور کیا تو ممکن ہے کہ صفحات کی تعداد میں کمی کرنی پڑے۔ یا کسی اور قسم کی کفایت نکالنی پڑے، قبل از وقت اس کا ذکر اس لیے کر دیا گیا کہ ناظرین تیار رہیں۔

معارف نے اپنی مالی و اقتصادی حالت کا ذکر بہت کم کیا ہے، اور اخفائے حال ہی کو شرافت کا معیار سمجھا ہے، لیکن حالات ایسے پیش ہیں، کہ شاید اس معیار شرافت پر قائم رہنا مشکل ہو جائے۔ معارف میں تجارتی اصول صرف اسی قدر ملحوظ رہتا ہے، کہ اس سے مجلس کو نفع ہو یا نہ ہو، لیکن اس سے نقصان نہ ہو، چنانچہ معارف اسی اصول پر چلا ہے اور چل رہا ہے، اب یہ پہلا سال ہے کہ اس کی آمد سے اس کا خرچ سو روپیے کے قریب بڑھ

گیا ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ موجودہ خریداروں کی تعداد قائم رہ کر ہمیں نئے خریدار اگر بڑھ جائیں، تو یہ دوسرے شعبوں سے دریوزہ گری کے بغیر بدستور چلتا رہے، اس لیے ہمدردوں سے یہ توقع بے جا نہیں، کہ وہ اس کمی کو مزید حلقۂ احباب سے پوری کریں، اور اس کے لیے تھوڑی سی کوشش کی زحمت گوارہ فرمائیں۔

دار المصنفین کے مطبوعات کے نئے اڈیشن

دار المصنفین کے بہت سے پرانے مطبوعات اسی زمانہ میں ختم ہو گیے اور ہو رہے ہیں، ان کے دوبارہ طبع کا سامان کیا جا رہا ہے، "ارض القرآن" کا پہلا حصہ زیر طبع ہے، "خلفائے راشدینؓ" بھی دوبارہ چھپ رہی ہے، "سیرت عائشہ صدیقہؓ" کے نسخے بھی کم رہ گیے ہیں، اس کے تیسرے اڈیشن کا انتظام کرنا ہے، "سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے پہلے حصہ کے نسخے بھی کم تعداد میں ہیں، ان کتابوں کے دوبارہ انتظامات کے سبب سے نئی کتابوں کی اشاعت کو ملتوی کرنا پڑ رہا ہے،

سید صاحب، شروانی صاحب اور مولوی عبد الحق کو اعزازی ڈگری

امسال ۱۳؍ فروری ۱۹۴۳ء کو مسلم یونیورسٹی نے اپنی عمر میں پہلی دفعہ اپنی قوم کے تین خادمان علم کو اپنی اعزازی علمی ڈگریوں سے نوازا ہے، اس نوازش کی تہ میں نہ تو کوئی سیاسی غرض پنہاں ہے، اور نہ کسی اقتصادی مشکل کا حل چھپا ہے، بلکہ صرف ان کی طویل علمی خدمات کا اعتراف اس کا مقصد ہے، اس لیے یہ نوازش خاص شکریہ کی مستحق ہے، اگرچہ یہ تجویز سر شاہ سلیمان مرحوم نے اپنے زمانہ میں منظور کرائی تھی، مگر اس کی تعمیل ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب کے عہد میں ہوئی، اس سلسلہ میں میری ہیچ میرز ذات کو الگ کر کے اگر دیکھا جائے، تو واقعۃً نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی اور ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب اپنے گراں بہا اور طویل علمی و ادبی خدمات کے لحاظ سے بجا طور پر اس اعتراف کے مستحق تھے، اور خود مسلم یونیورسٹی کے لیے بھی یہ امر کچھ کم فخر کا باعث نہیں، کہ دونوں صاحبوں نے ...... اس عزت کو بخوشی قبول فرمایا۔

موجودہ زمانہ کے بعض خامکار مصلحین جو تجدید ملت کے اہم منصب کی نقل اتارنا چاہتے ہیں،

یعنی شیر کی کھال اوڑھ کر شیر بننا چاہتے ہیں، یہ کر رہے ہیں کہ اپنے زمانہ کے لباس عاریت کو جس کو وہ دوسری قوموں سے مانگ کر لائے ہیں، اپنی ذاتی ملک کہہ کر پیش کر رہے ہیں، اور دعوی کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے جسم کو لباس عاریت کے بجائے ان کا اصلی لباس پہنانا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ تمامتر فریب خیال اور فریب فکر ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ خود اپنے جسم پر زمانہ کا لباس مستعاری رکھتے ہیں، اور اسی کو جامۂ حقیقت سمجھتے ہیں، مشرقی قیادت، مودودی امارت، وحید خانی سیاست، سب اسی نظریہ کی مثالیں ہیں، جو اپنے زمانہ کے خیالات کو قبول کر کے اور انہی کو ادل بدل کر اسلام کے عقائد و تعلیمات کی اصلی روح ظاہر کر رہے ہیں، اور منادی کر رہے ہیں،

ع شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

افکار اسلامی کی تاریخ!

تعجب ہوتا ہے، کہ ایک شخص جو اسلامی علوم و فنون اور ان کے اصلی ماخذوں سے یکسر ناواقف ہو، وہ محض اردو کتابوں کی ورق گردانی کر کے افکار اسلامی کی تاریخ مرتب کرے، اور اس نشان دہی کی جرأت کرے کہ علمائے امت اور ائمۂ دین نے کہاں کہاں غلطی کی، اور عجمی خیالات و اثرات سے ان کا دماغ کہاں تک متاثر ہوتا رہا، اور اپنے ہر دعوی کے لیے یہی دلیل کافی سمجھے کہ اقبال کے کسی شعر کو اس طرح پیش کر دے کہ گویا قرآن پاک کی کوئی آیت پیش کر کے اس نے اپنی حجت پوری کر دی، اور اب کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہی، حالانکہ ابھی یہ بات بھی محل کلام ہے، کہ یہ اشعار زمانۂ حال کا لباس مستعار ہیں، جو فرنگستان کے کارخانے میں تیار ہوئے ہیں، یا وہ سراسر حجازی ہیں، اور وحی الٰہی کی صنعت گاہ کی پیداوار۔

جس وقت یہ کتاب افکار اسلامی کی تاریخ چھپ رہی تھی، اور مجھے اس کے آدھے مطبوعہ صفحات بھیجے گیے تھے، اسی وقت مؤلف کو متنبہ کر دیا گیا تھا، کہ ان کی یہ کتاب اغلاط سے بھری ہوئی اور ان کی خام کاری پر پختہ دلیل اور چند اردو کتابوں کے ثانوی درجہ کے معلومات پر بھروسہ کر کے اجتہاد کی عظیم الشان جرأت ہے، مگر انھوں نے اپنی محنت کی نسبت جس میں سنا گیا ہے کہ

کسی اور کی محنت بھی شریک ہے، اس تنقید کو قبول نہیں کیا۔

تعجب پر تعجب یہ ہوتا ہے کہ فضلائے وقت میں سے بھی ایک دو اصحاب ایسے ہیں جنہوں نے گویا یہ عہد کیا ہے، کہ ہر نئی مذہب کی بدعت کی تائید وہ ضرور ہی کریں گے، مشرقی کا تذکرہ ہو یا منکرین حدیث کی ضلالت ہو، یا افکار اسلامی کی یہ تاریخ ہو، ان کو کسی بدعت کے عین دین ماننے میں کبھی باک نہیں ہوتا، اس سے زیادہ تعجب مولانا سندھی جیسے اہل علم پر ہے، جو اسلام کو ہندی اسلام بنا ڈالنے کی کوشش کے باوجود اس کتاب کی جو خود ان کی دعوت کو بھی عجمی تصور کہہ کر ہم پایۂ کفر قرار دے رہی ہے، تحسین فرما رہے ہیں،

کبھی یہ حکم ہے کبھی وہ ارشاد ہے،

(معارف ماہ مارچ ۱۹۴۳ء)

(۴)

نواب عماد الملک اور سید امیر علی کو اعزازی ڈگریاں!

گذشتہ مہینہ کے شذرات میں آمد سخن کے طور پر یہ بات آگئی تھی، کہ مسلم یونیورسٹی نے خالص خدام علم کی یہ قدر دانی عمر میں پہلی دفعہ کی ہے، ایک دوست نے علی گڑھ سے متنبہ کیا ہے کہ اس قسم کے دو موقعے اس کی عمر میں پہلے بھی آچکے ہیں، پہلی دفعہ جب اس نے ۱۹۲۵ء میں نواب عماد الملک بہادر اور آنریبل سید امیر علی کو ڈگری دی، اور دوسری دفعہ جب ۱۹۳۴ء میں اس نے ڈاکٹر سر اقبال اور ڈاکٹر سر سلیمان کی خدمت میں ڈگری پیش کی، اور یہ چاروں یقیناً علم کے خادم تھے، اور ان کے علمی خدمات قوم کے شکریہ کے مستحق۔

پچھلے شذرات میں معارف کے خسارہ کو پورا کرنے کی جو تحریک کی گئی تھی، اس سے متاثر ہو کر ایک بزرگ نے تنہا بیس خریداروں کی قیمت ادا کر دینے کی اطلاع دی ہے، اس رقم میں سے نصف یعنی دس رسالے دس نادار طلبہ کے نام جاری کیے جائیں گے، اہل شوق نادار طلبہ مہتمم مدرسہ سے تصدیق کر کے درخواست بھیجیں،

"الابانہ" کا انگریزی ترجمہ

"امریکن اورینٹل سریز" نے حال میں امام ابو الحسن اشعری کی

“کتاب الابانہ عن اصول الدیانہ” کا انگریزی ترجمہ شایع کیا ہے، امام اشعریؒ کی یہ کتاب علم کلام میں ہے، اس کا اصل عربی متن مدت ہوئی کہ دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شایع ہو چکا ہے، معلوم نہیں سوسائٹی نے اس کے ترجمہ کی اشاعت کس نقطۂ نظر سے کی ہے، کیونکہ ان کے خالص کام بھی کسی دور رس نتیجہ سے خالی نہیں ہوتے، اور یہ تو بہرحال اسلامی عقائد کی کتاب ہے۔

المجر اور کتاب المنمق ایام جاہلیت اور آغاز اسلام کے معاشرتی و اجتماعی حالات کے مآخذ میں ابن حبیب (المتوفی ۲۴۵ھ) کی کتاب ”المجر اور کتاب المنمق“ خاص طور سے اہمیت رکھتی ہیں، یہ دونوں کتابیں بہت نادر ہیں، دائرۃ المعارف حیدرآباد مستحق مبارکباد ہے، کہ اس نے دونوں کتابوں کے قلمی نسخے حاصل کر کے ان کی چھپائی کا کام شروع کیا ہے، چنانچہ کتاب المجر قریباً چھ سو صفحوں میں چھپ کر تمام ہو رہی ہے، اور کتاب المنمق کی تیاری ہو رہی ہے۔

میرج اِن ارلی اسلام ابتدائے اسلام کی شادیوں کے مراسم پر لندن کی ایشیاٹک سوسائٹی نے (Marriagein Early Islam) نامی کتاب انگریزی میں شایع کی ہے، جس میں مسند ابن حنبل اور طبقات ابن سعد کے حصۂ نسوان سے خاص کر استدلال و استنباط کر کے آغاز اسلام میں منگنی، رضامندی، مہر وغیرہ رسوم کے بیان کے علاوہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی شادیوں کے ابواب بھی قائم کیے گئے ہیں، ایک صاحب نظر کی خبر ہے، کہ کتاب احتیاط سے پڑھنے کے قابل اور ایک حد تک معاندانہ ہے۔

عیسائی اور یہودی مصنفین نے اسلام اور اسلامی مسائل پر اظہار رائے کا جو طریقہ اب بظاہر ناطرفدارانہ علمی طرز بیان کا اختیار کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ طرز اپنے مقصد کے لحاظ سے عام مناظرانہ طریقوں سے زیادہ زہرناک ہے، اس کا کاٹا بچ نہیں سکتا، یہ آہستہ آہستہ سرایت کرنے والا زہر ہے، جو بظاہر علم آداب و تاریخ کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے، وہ نامعلوم طریق سے اچھے اچھے مسلمانوں کو متاثر کر لیتا ہے، اور یہ معلوم بھی نہیں ہونے پاتا کہ یہ زہر اسمیں کہاں چھپا تھا'

قند میں زہر ملا تھا مجھے معلوم نہ تھا۔

مخالفانہ پروپگنڈے کا یہ طرز اب اس قدر عام ہو رہا ہے، کہ سیاست سے نکل کر یہ مذہب میں بھی داخل ہو رہا ہے، اور دانستہ یا نا دانستہ طور پر اس کی وسعت میں دشمن تو دشمن دوست بھی داخل ہو رہے ہیں، اور پھر وہ اس پر خوش ہیں، کہ ہم نے مذہب وملت کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

ز نادانی براد کرد ہمدم کار من ضائع
عجب تر اینکہ بر من منت بسیار ہم دارد

امریکن اورینٹل سوسائٹی کی صدسالہ سالگرہ

گذشتہ اپریل ۱۹۴۲ء میں شہر بوسٹن میں امریکن اورینٹل سوسائٹی کی صدسالہ سالگرہ منائی گئی، اس میں بہت سے دلچسپ مقالے پڑھے گیے، انہی میں ایک مقالہ میں عباسی داعیوں کے ان اصول تبلیغ (پروپگنڈے) کی تشریح کی گئی ہے، جن سے کام لے کر عباسی داعیوں نے بنی امیہ کی سلطنت کے الٹنے میں کامیابی حاصل کی، ان اصول کا پروپگنڈے کے جدید ترین اصول سے موازنہ کیا گیا، اور مسلمانوں کی ان جدید تحریکات پر جو ہندوستان اور مصر وشام میں اس وقت چل رہی ہیں، نظر ڈالی گئی ہے،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اسلامی ملکوں میں کوئی اسلامی تحریک جاری ہی نہیں ہے، جو ہے وہ اسلامی تحریک نہیں، بلکہ مسلمانوں کی تحریک ہے، یعنی مسلمان نام قوم کو دوبارہ سیاست وسلطنت کی دنیا میں کیونکر برتری حاصل ہو، اور اس کی صورت یہ ہو رہی ہے، کہ جن کو مفکرین اسلام کہا جاتا ہے، وہ دنیا کی موجودہ برسر عروج قوموں کے ایک ایک خصوصیات کو لے کر دیکھتے ہیں، کہ شاید ان کی یہی خصوصیات ان کے اس اقبال کی حقیقی علت تو نہیں، اور پھر ان ہی چیزوں کی تحریک مسلمانوں میں کرتے ہیں، قومیت، وطنیت، اقتصادیت، عسکریت، تنظیمیت، لادینیت، بے پردگی، بے حیائی، اخلاقی ومذہبی آزادی وغیرہ یورپین قوموں کے خصائص کو لیکر ان کے عروج کا راز دریافت کرتے ہیں، اور اسی راز سے مسلمانوں کو آشنا کر کے اس پر اپنی اسلامی تحریک کی بنیاد ڈال رہے ہیں، حالانکہ

ع مایۂ طینت آدم ز خمیر دگر است۔

اصلی اسلامی تحریک وہ ہے جو صرف اسلام کے صحیفہ ربانی اور ارشادات نبویؐ پر مبنی ہو، جس میں وہ اصول یکجا کیے گیے ہوں، جن پر تیرہ سو برس پہلے مسلمانوں کی تعمیر کی گئی تھی، تیرہ سو برس پہلے بھی جب رسول اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرب میں اسلام کی دعوت پیش کی، ایران و روم کی بڑی بڑی قومیں موجود تھیں، جن میں وطنیت بھی تھی، قومیت بھی تھی، دولت بھی تھی، تعلیم بھی تھی، سلطنت بھی تھی، عسکریت بھی تھی، اور ان کے نام کا دبدبہ بھی عربوں پر چھایا ہوا تھا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ان ترقی یافتہ دولت مند حکمراں قوموں کی خصوصیات کی نقل اتارنے کی دعوت نہیں دی، نہ ان کو کسریٰ کے اصولوں کی تعلیم دی، اور نہ قیصریت کے اصولوں سے باخبر کیا، بلکہ تمام دنیا کی قوموں سے بے نیاز ہو کر اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے اور بتائے ہوئے اصول زندگی کو سب کے سامنے پیش کیا، جن کے بدلے قبول اور عمل سے وہ سب کچھ ملا جو دین و دنیا کی بہتری تھی، ان کو آسمان کی بادشاہت کی دعوت دی گئی، تو زمین کی بادشاہی بھی ان کو مل گئی، اب بھی آسمان ہی کی بادشاہی کی طلب سے زمین کی بادشاہی مل سکتی ہے، اور آسمان کی بادشاہت کا دروازہ ہم پر کیونکر کھل سکتا ہے، صرف اس کی دو کنجیوں سے یعنی ایمان کامل اور عمل صالح سے فرمایا

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	خدا نے ان سے جو تم میں سے ایمان
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْكُمْ	لائے اور نیک کام کیے، وعدہ کیا ہے
يَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا	کہ وہ ان کو زمین میں حکومت بخشے گا،
اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ،	جیسے ان سے پہلوں کو اس نے بخشی تھی۔

(معارف ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۳ء)

(۵)

معارف کے جن دس پرچوں کیلئے طلبہ کے نام جاری کیے جانے کی درخواستیں مطلوب تھیں، وہ پوری ہو چکیں، اب کوئی صاحب اس کے لیے درخواست نہ بھیجیں، البتہ .... مخیر اصحاب سے التماس ہے کہ وہ اس نیک مثال کی پیروی میں اپنی طرف سے بعض نادار طلبہ کے نام معارف کے پرچے جاری کرائیں،

تاکہ معارف کا فائدہ ان لوگوں تک پہنچے جو اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔

(معارف ماہ مئی سنہ ۱۹۴۳ء)

(۶)

رسائل کی دنیا میں معارف کے بہت سے اولیات ہیں، جن میں سے ایک رسالہ کے مضامین کو مختلف ابواب میں تقسیم کرنا ہے، اور اس میں بھی اس سے پہلے اس کے دو دور گذرے ہیں، پہلا سنہ ۱۹۱۶ء سے اپریل سنہ ۱۹۱۹ء تک، اور دوسرا سنہ ۱۹۱۹ء سے اس وقت تک کہ سنہ ۱۹۴۳ء ہے، پہلے دور میں اس کے ابواب شذرات، مقالات، تقریظ و انتقاد، آثار علمیہ و ادبیہ، تراجم، مسائل و فتاوی، ادبیات اور مطبوعات تھے، سنہ ۱۹۱۹ء میں ہمارے دوست مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے معارف کی ادارت میں شرکت فرما کر شذرات کو بہت بڑھا دیا، یعنی اس میں ہر قسم کے مسائل پر اظہار خیال کی طرح ڈالی، اور ساتھ ہی تلخیص و تبصرہ کا ایک باب بڑھایا جس میں مشہور انگریزی رسالوں کے مضامین کا خلاصہ ہونے لگا، اور اخبار علمیہ کا ایک باب اضافہ کیا، اور رسالہ اسی ترتیب پر اب تک نکلتا رہا۔

رسالہ کی یہ ترتیب بعض اہل ذوق کو ایسی پسند آئی، کہ اس کی تقلید شروع ہوگئی، اور معارف کے امتیاز میں اشتراک کا عیب پیدا ہوگیا، اسی وقت سے جی چاہ رہا تھا کہ اس میں کوئی تغیر کیا جائے، اتفاق یہ کہ جنگ کی وجہ سے انگلینڈ، امریکہ اور مصر کے رسائل کی آمد بند ہوگئی تاہم اس وقت تک اس ترتیب کو چلایا جاتا رہا، لیکن پیش پا افتادہ مضامین کی تلخیص اور اخبار علمیہ کی تراوش آمد کے بجائے آورد ہوتی جارہی ہے، اس لیے اس ترتیب میں کچھ ادل بدل مناسب معلوم ہوا۔

دار المصنفین میں اطراف ملک سے علمی سوالات اکثر آتے رہتے ہیں، اور ان کے جوابات جاتے رہتے ہیں، اب اس خیال سے کہ ہمارے رفقاء کی یہ محنت جو جوابوں پر صرف ہوتی ہے، بیکار کیوں جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان جوابات میں سے جو ایسے ہوں جن میں عموم فائدہ

کا پہلو ہو، معارف میں وقتاً فوقتاً شایع کیے جاتے رہیں، اسی لیے پچھلے پرچہ سے سوال و جواب کا بھی ایک باب بڑھا دیا گیا ہے، اور اخبار علمیہ اور تلخیص کے ابواب تو بند نہیں کیے جا رہے ہیں، لیکن ان کا التزام ترک کیا جاتا ہے،

ہمارے ایک لائق دوست ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی (دکن کالج پونہ) اپنے ایک عنایت نامہ میں لکھتے ہیں،

> " آپ بعض اوقات بہت سے اہم واقعات کو شذرات میں مختصراً المعنی فی بطن الشاعر رکھ کر درج کرتے ہیں، یاد رہے کہ آپ کے بعد لوگوں کو تکلیف ہوگی، جب لوگ ان کے تحت تلاش سے کام لیں گے، اس لیے میری ناقص رائے میں آپ کو ان عنوانات کے متعلق مفصل لکھنا چاہیے، ہماری تاریخ آگے ہی سے تشنہ ہے"۔

ہمارے دوست کا یہ بیان کسی قدر صحیح ہے، مگر وہ غور کریں تو پائیں گے، کہ یہ اجمال کی راہ وہیں اختیار کی جاتی ہے، جہاں اس کی تفصیل میں فتنہ کا خوف ہوتا ہے، ایسے موقع پر "ایمان مجمل" کو "ایمان مفصل" پر ترجیح دی جاتی ہے، اور یہ کہہ کر خموشی اختیار کی جاتی ہے، کہ "اگر بخانہ کس است یک حرف بس است"۔

ہمارے دوست ایک اور مشورہ دیتے ہیں:

> " آپ بعض اوقات کسی عالم کی موت کا ذکر اپنے سحر بھرے الفاظ میں بیان کر جاتے ہیں، جن کو پڑھ کر آنکھیں آبدیدہ بھی ہوتی ہیں، اگر آپ مستند یورپی رسائل کی طرح ایک الگ موضوع وفیات بنالیں تو اچھا ہے"۔

یہ مشورہ پسند آیا، اور اسی پرچہ سے اس کی پیروی بھی شروع کر دی گئی، اور اس کا عنوان "وفیات" قرار دیا گیا۔

یہ بات اب چھپی نہیں، کہ مسلمان نوجوانوں میں ایک ذہنی انقلاب کی تڑپ پیدا ہے،

حال سے بیزاری اور مستقبل کی تلاش کی کاوش ان کی ہر فکر اور عمل سے نمایاں ہے، اس وقت ان کے سامنے دو راہیں ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنے ہم وطن، ہم عمر اور ہم درس ہندو نوجوانوں کی صف میں کھڑے ہو جائیں کہ جو ماضی سے بھی خفا، حال سے بیزار اور مستقبل کے لیے مضطرب ہیں، اور بادۂ اسلام کے دائرہ کے اندر رہ کر خود اسلامی تخیل اور اسلامی اعمال کا ایک ایسا خاکہ تیار کریں، جو ان کے حال کو بدل کر ان کے مستقبل کو ان کے ماضی سے مربوط کر دے۔

لیکن درحقیقت یہ کام علمائے کرام کے کرنے کا ہے، لیکن چونکہ وہ اس سے تغافل برت رہے ہیں، اس لیے ان نوجوانوں میں جو لوگ تھوڑی سی اہلیت رکھتے ہیں، وہ اس کام کو اپنی حیثیت کے مطابق انجام دے رہے ہیں، اور ظاہر ہے، کہ علم کامل نہ ہونے یعنی تمام پہلوؤں کے پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے ان سے کہیں فہم حقیقت میں اور کہیں تعبیر میں غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، اس باب میں پھر فریقین سے فرد گذاشتیں ہوتی ہیں، حضرات علما تکفیر و تفسیق سے ان غلطیوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں، اور نوجوان اپنی ضد پر اڑ کر اپنی غلطیوں کی صحت پر اصرار کرتے ہیں، اور صرف اپنی خواہش کو صحت کا معیار بناتے ہیں۔

اس غلطی کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے، کہ عام طور سے ماضی و حال میں ربط دینے کے لیے تطبیق اور مصالحت کا راستہ اختیار کیا جاتا ہے، لیکن اس تطبیق و مصالحت سے یہ ہوتا ہے، کہ آدھی بات ادھر کی ہوتی ہے، اور آدھی ادھر کی، اس کا نتیجہ تغیر حقیقت ہے، اور تاویل بعید کی وہ صورت جس کا دوسرا نام معنوی تحریف ہے، صحیح صورت یہ ہے کہ کتاب و سنت میں جو کچھ ہے اس کو بدعات و اضافات سے پاک کر کے صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے عملی نمونوں کے مطابق کر کے سامنے لایا جائے، صداقت کی سادگی خود اپنے اندر کشش رکھتی ہے، تاریخی طور سے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر دور کے مجددین امت نے اسی راستہ سے کامیابی حاصل کی ہے، اور لوگوں کی ذہنیتوں اور کیفیتوں میں تبدیلی پیدا کی ہے، غرضیکہ طرز تبلیغ اور موعظت میں بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی جائے۔ (معارف ماہ جون سنہ ۱۹۴۳ء)

(۷)

مسلمانوں میں جو ذہنی انقلاب پیدا ہو رہا ہے، باوجود طریق اظہار و خیال و تعبیر کے اختلاف اور تعدد کے ان میں ایک رنگی اور یکسانی نمایاں ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں، کہ مسلمانوں میں اس انقلاب کا بیج مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے الہلال نے بویا تھا۔ ان کی اصطلاح توحید کی تعبیر یہ تھی، کہ ایک کے آستانہ پر سر رکھ کر ہر چوکھٹ سے بے نیاز ہو جانا۔ خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خلافت الٰہی کی تعبیر مختلف طریقوں سے کی گئی۔ مگر بالآخر اس کا منشا یہ تھا کہ نوعِ انسان اس خلافت سے سرفراز ہے، اور اسی خلافت کے فرض کا ادا کرنا دین ہے، اور خلیفہ اس دین کا انتظامی مرکز و امام ہے۔ مولانا محمد علی مرحوم نے اسی سے کنگڈم آف گاڈ کی فلاسفی پیدا کی، اور اس پر وہ مستقل تصنیف اپنے زمانۂ قید میں لکھنا چاہتے تھے، اور کئی سو صفحے لکھے بھی، مگر ان کی آپ بیتی کی تمہید اتنی پھیلی کہ جگ بیتی کی نوبت آ گئی۔ تاہم یہ ان کی تقریروں کا موضوع برابر رہا۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے ۱۹۱۵ء میں خودی اور بے خودی کے اسرار فاش کیے، اور مسلم کامل اور مردِ غازی کے وہ فلسفیانہ اصول بتائے، جس سے ایمان کامل، یقین محکم اور عمل پیہم پیدا ہو، جس سے مسلم قوم کی دینی و سیاسی زندگی تکوین پائے، اور اس کو روے زمین کی امامت اور پیشوائی کا درجہ حاصل ہو، اور ثابت کیا کہ اسلام وطنیت کی حد بندی سے آزاد اور ایک ایسی حقیقت ہے، جو بجائے خود مستقل، اور دوسروں کی دست نگری اور آمیزش سے پاک ہے۔ اسلامی خلافت وہ ہے جو اپنے دست و بازو سے حاصل کی جائے، نہ کہ جس کی دوسروں سے بھیک مانگی جائے، اور یہ کہ ہندوستان میں مسلمان ایک مستقل قوم ہیں، جن کی خصوصیات، امتیازات اور تعمیری مقاصد دوسری قوموں سے الگ ہیں۔

مشرقی صاحب نے تذکرہ لکھا جس میں لغویات کو حذف کر کے اگر دیکھا جائے، تو منشا وہی استخلاف فی الارض کا حصول اور اس کے حصول کے لیے اصول ہے، اور اس پر

"خاکسار تحریک" کی بنیاد رکھی ہے، مگر چونکہ اس کا بانی دین کے اصول اور مبانی سے واقف نہ تھا، اس لیے حق و باطل کی آمیزش سے اسکو دوچار ہونا پڑا۔

ہمارے مشہور مفکر دوست مولانا آزاد سبحانی بھی پورب کے شہروں میں دعوت کلمہ کے نام سے ایک تحریک عرصہ سے چلا رہے ہیں، اور لا الہ الا اللہ کے معنی و مقصود کو اس وسعت کے ساتھ مسلمانوں کو سمجھانا چاہتے ہیں، جس میں خدائے برحق کی بادشاہی کے سوا ہر بادشاہی کا ابطال ہو، اور اسی واحد کلمہ کو وہ سیاسیات اور دینیات کا عظیم الشان سنگم قرار دیکر اپنے فلسفۂ تعلیم کا مرکز ٹھہراتے ہیں۔

چند سال سے مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے جس جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی ہے، اور اس کے متعلق جو اصول و مبادی انہوں نے تحریر فرمائے ہیں، ان سب کا منشا بھی خلافت انسانی اور حکومت الٰہی کو مرکز قرار دے کر پورے اسلام کو ایک عظیم الشان تحریک ٹھہرانا جس کی دعوت لے کر مسلمان پھر کھڑے ہوں

کلکتہ میں صوفی نذیر احمد صاحب اسی کام کو مسلم لیگ کے زیر سایہ اور مسٹر محمد علی جینا کے زیر قیادت انجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں، اجلاس دلی کے موقع پر گیارہ مسلمان لیڈروں کے دستخط سے ایک اعلان شایع کیا ہے، جس میں دو تجویزیں پیش کی گئی ہیں، ان میں سے اول تعمیر ملی کے لیے ایک مرکزی مجلس کا قیام ہی۔ جس کے ذریعہ سے مسلم لیگ کی تجویز پاکستان کی ایسی تشریح کی جائے، جس سے مسلم سوسائٹی مسلم نظام معاشیات، ملی سیرت و تعلیم، تہذیب و تمدن کی، اسلام کے اساسی اصول کے مطابق اصلاح و ترقی کی تحریکات کی اس طرح ہدایت و رہنمائی کی جائے، کہ ان کے ذریعہ ایک حقیقی اسلامی اسٹیٹ اور حقیقت اجتماعی کی تجدید کا نصب العین حاصل ہوسکے۔

تجویز دوم کا مقصد یہ ہے کہ لیگ میں شعبۂ اسلامیات و اصلاح تمدن و معاشرت یا شعبۂ تبلیغ و اصلاح و تربیت دین قائم کیا جائے، جس سے مسلمانوں کی روحانی و اخلاقی

نشأۃ جدیدہ کے لیے تبلیغ عام اور تعلیم عام (ماس ایجوکیشن) اور معاشرتی اصلاحات کی تحریکات اس طرح جاری ہوں ، کہ اسلام کے بنیادی اصول و تعلیمات پر عوام کا شعوری ایمان پختہ اور عمل راسخ ہو جائے ، ہم کو معلوم نہیں کہ دلی میں ان تجویزوں کا کیا حشر ہوا ، تاہم مسلمانوں کے اس ذہنی انقلاب کا ایک منظریہ بھی ہے ۔

خود مسلم لیگ کے اندر پاکستان کی سیاسی حقیقت کی تعبیر میں اس کے مذہبی و روحانی عناصر کا رجحان روزانہ بڑھتا جا رہا ہے ، اور اسلامی نظام حکومت ، نظام معاش ، نظام اقتصاد ، اور نظام تعلیم کے خاکوں کی طرف ذہن خود بخود منتقل ہوتا جا رہا ہے ۔

ابھی حال میں علی گڈھ اور لکھنؤ کے امتزاج سے ایک نئی اسلامی جماعت کے قیام کی اطلاع مل رہی ہے ، جس میں مسلم یونیورسٹی کی مجلس اسلامیات و جناب راجہ صاحب محمود آباد کے اتحاد سے اسلامی تعلیم و تمدن کے احیاء کی تجویزیں منظور کی گئی ہیں ، اور اس مجلس کی وسعت کو پورے ملک میں پھیلانے کا عزم ظاہر کیا گیا ہے ، جس میں سنی و شیعہ دونوں شریک ہوں ،

ان تجویزوں سے جو مختلف حلقوں سے نکلی ہیں ، اور مختلف بانیوں اور مجوزوں کی طرف منسوب ہیں ، اس بازگشت کا اندازہ ہوتا ہے ، جو یورپ کی تقلید عام کے پرانے تخیل کی جگہ لے رہی ہے ، اور جس کا ہم بڑی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں ، جزئی اختلافات سے قطع نظر کر کے یہ بات دیکھنے کی ہے کہ گذشتہ تحریکوں کی طرح اس کی بنیاد فوری جوش و خروش اور ہنگامی زود اشتعالی پر نہیں ہے ، بلکہ آہستہ آہستہ ایک صحیح عقیدہ اور آئیڈیالوجی پیدا ہو رہی ہے ، جو ایک دن امید ہے کہ صحیح راستہ پائے گی ، اور اس کی بنیاد پر عمل کا جو خاکہ تیار ہوگا وہ سارے افراد ملت کو دین و سیاست کے باہمی ربط و ضبط پر استوار کر کے اس کے حصول کے لیے ان میں نئے جوش ، نئے عزم اور ایثار و قربانی اور جدوجہد کے جذبات پیدا کر دے گا ، انشاء اللہ تعالیٰ ، لیکن صرف اتنی ترمیم یاد رکھی جائے ، کہ سیاست کو دین کا درجہ نہ دیا جائے ، یعنی دعوت کا مقصود حصول دنیا نہ ہو ، بلکہ رضائے الٰہی کی طلب ہو ، جس کی وسعت میں

دین و دنیا کی سعادتیں جمع ہیں۔

(معارف ماہ جولائی ۱۹۴۳ء)

(۸)

مولانا الیاس کاندھلوی اور انکی دعوت

۱۱؍ جولائی ۱۹۴۳ء کی دوپہر کو تھانہ بھون کے اسٹیشن پر حسن اتفاق سے حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلوی سے ملاقات ہوئی، جنہوں نے بستی نظام الدین دہلی میں تبلیغ دین کی دعوت کا کام پندرہ سولہ برس سے شروع کر رکھا ہے، اور جن کے فیض اثر سے میوات کے علاقہ میں جہاں تیس چالیس لاکھ نومسلموں کی آبادی ہے، انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے، حضرت ممدوح کے نام اور کام سے تو پہلے سے آشنا تھا، ہمارے مدرسہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے بعض مدرسین اور طلبہ اکثر ان کی خدمت میں حاضر، ان کی صحبت سے مستفید، اور ان کے تبلیغی کاموں میں شریک ہوتے رہے، لیکن خاکسار ابھی تک ذاتی طور سے ان کی ملاقات سے محروم اور ان کے کاموں کی حقیقت اور نوعیت سے لاعلم تھا، تھوڑی دیر اسٹیشن پر، اور پھر تھانہ بھون سے کاندھلہ تک ریل پر گھنٹہ دو گھنٹہ ان کا ساتھ رہا، اور ان کی دعوت کے مقصد اور طریق کو سمجھتا رہا، بحمد اللہ کہ انھوں نے اتنی دیر میں جو کچھ فرمایا وہ دل میں ایسا...... پوری طرح اتر گیا، کہ موصوف کے ارشاد پر ان کے ایک جلسہ میں جو دہلی میں حبش خاں کے پھاٹک میں ۱۲؍ جولائی ۱۹۴۳ء کی شب کو ہوا، خاکسار نے اس دعوت کے مقاصد و طریق پر تقریر کی۔

إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ شَيْئًا هَيَّأَ أَسْبَابَهٗ جب اللہ تعالیٰ کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کا سامان بھی پیدا کر دیتے ہیں، ندوہ کے بعض حضرات مدرسین اور ان میں سے برادر عزیز و محبوب مولانا ابو الحسن علی سلمہ اللہ تعالیٰ و رفع شانہٗ (حضرت مولانا سید عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم ندوۃ العلماء کے چھوٹے صاحبزادے) جن سے ہماری بڑی بڑی توقعات قائم ہیں،

مولانا کاندھلوی کے اوصاف جمیلہ اور ان کی دعوت کے مقاصد و مہمات کے گرویدہ تھے، اور مجھ سے بار بار ان کا تذکرہ کرتے رہتے تھے، اور ان کو لکھنؤ لانے کے باب میں مجھ سے مشورہ بھی چاہا کرتے تھے، لیکن چونکہ اس کا مقررہ وقت نہیں آیا تھا، اس لیے یہ کام مشورہ سے آگے نہیں بڑھا، لیکن عین اس وقت جب ان سے تھانہ بھون اور دہلی میں میری ملاقات ہوئی، ان کے لکھنؤ کے سفر کا پروگرام بھی تیار ہو گیا، اور مولانا ابوالحسن علی اور ان کے رفقاء کی دعوت پر مولانا نے مع ساٹھ رفقاء و مبلغین کے لکھنؤ آنے کا عزم کر لیا چنانچہ جولائی کے تیسرے ہفتہ سے چوتھے ہفتہ تک یہ حضرات لکھنؤ آتے رہے، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خوش قسمتی ہے، کہ اس میں سب نے ایک ہفتہ عشرہ کے قریب قیام کیا، مبلغین کا بڑا حصہ مدرسہ کی بڑی مسجد میں مقیم رہا، اور یہ کہیے کہ گویا ایک ہفتہ عشرہ دارالعلوم نے وہ روحانی منظر دیکھا جو اس کے سیکڑوں تزک و احتشام کے زرق برق تماشوں سے بالکل الگ تھا، یہ فقراء کا مجمع تھا، اور صلحاء اور اتقیاء کی جماعت تھی، جس کے سامنے رضائے الٰہی کے حصول کے سوا دنیا کا کوئی مقصد نہ تھا، جو تھا اسی راہ سے تھا، اور جو چاہا جاتا تھا، وہ اسی نسبت سے۔

ان بزرگوں کو دیکھا جن کے سینوں میں ہندوستان میں اسلام کے احیاء اور مسلمانوں کی اصلاح کی دھن تھی، ان کی نمازوں میں، ان کی دعاؤں میں، ان کے تہجدوں میں، ان کی شب بیداریوں میں، ان کے ذکر و شغل میں رضائے الٰہی کی طلب کا نور جھلکتا تھا، ان کی کوششوں کا محور خدا کی خوشنودی کی خاطر مسلمانوں میں دین توحید کی صحیح تعلیم و تلقین، کلمۂ مبارکہ کی تصحیح، نماز پنجگانہ کی تبلیغ اور داعیوں اور مبلغوں کی جماعت بنا بنا کر اطراف و دیار میں مجاہدانہ سرفروشی کے ساتھ مہاجرت کا صحیح جذبہ تھا، میں نے اس دعوت کو جہاں تک سمجھا ہے، اس کی تعبیر یوں کی، کہ نام کے مسلمانوں میں اسلام حقیقی کی از سر نو تبلیغ، انہی اصولوں پر جن اصولوں پر کہ جناب سرور کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی، ایک اور مقرر نے اس کو چلتے پھرتے مدرسہ اور چلتی پھرتی خانقاہ سے تعبیر کیا۔

اس جماعت کے ساتھ حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور مولانا عبدالحق صاحب مدنی صدر المدرسین مدرسہ فتح پوری دہلی اور دوسرے اکابر دین اور دلی کے بعض نامور تاجر بھی آئے، اور ایک ہفتہ کے قریب دارالعلوم ندوہ کی مختلف عمارتوں میں فروکش رہے، لکھنؤ کے مختلف محلوں میں اس کے جلسے ہوتے رہے، اور اس کے تبلیغی وفود عملی کام کرتے رہے، یہاں سے چند روز کے لیے اہل کان پور کی دعوت پر کانپور کو یہ قافلہ منتقل ہوا، اور وہاں بھی محلہ بہ محلہ اس دعوت کو پھیلایا گیا، اس سلسلہ میں خاکسار کو لکھنؤ اور کان پور میں متعدد دفعہ اس دعوت کے مقصد اور طریق پر تقریروں کا اتفاق ہوا، اور دوسرے لوگ بھی تقریریں فرماتے رہے، جن میں سے مولانا ابوالحسن علی صاحب اور مولانا منظور صاحب نعمانی کے نام ذکر کے قابل ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے متعلق ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب (ترقی اردو) کا ایک خطبۂ صدارت جو اسی سال علی گڈھ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں پڑھا گیا تھا، رسالہ اردو میں چھپا ہے، موصوف کو اردو سے جو عشق ہے، اس کا افسانہ ملک کے کوچہ کوچہ میں مشہور ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ اپنے کمال عشق کی بنا پر ان سے دوسروں کی محبت اردو کا اقرار نہیں بن آتا، یونیورسٹی ایک تعلیمی ادارہ ہے، اس پر جو گرفت کی جاسکتی ہے، وہ اسی حیثیت سے کی جاسکتی ہے، خاکسار کو امتحانات کے سلسلہ میں متعدد یونیورسٹیوں کے طالب علموں کو جانچنے اور پرکھنے اور ان کے کاموں کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے، مجھے اس کے اظہار میں پس و پیش نہیں، کہ یہاں کا شعبۂ اردو، اپنی معاصر یونیورسٹیوں کے شعبوں سے علانیہ اونچا ہے، نصاب، طرز تعلیم، طریق تحقیق اور اساتذہ کی دلچسپی ہر چیز مستحق تعریف ہے، ایم۔ اے کے طلبہ جو اپنے آخری امتحان کے لیے مقالے تیار کرتے ہیں، دو تین سال سے میں ان کو دیکھ رہا ہوں، اور یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہر سال ان کے متعدد مقالے سنجیدہ تصانیف کی حیثیت رکھتے ہیں، ہاں یہ صحیح ہے کہ شبلی و حالی نہیں پیدا ہوتے، لیکن شبلی و حالی کیا عبدالحق پیدا کرنا بھی یونیورسٹی کا نہیں، قدرت کا کام ہے، اور وہ کسی کے بس میں نہیں۔ (معارف ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء)

شذرات

از ماہ اگست ۱۹۴۴ء تا ماہ دسمبر ۱۹۴۴ء

(۱)

ابھی لڑائی ختم نہیں ہوئی ہے، مگر مابعد جنگ کی دنیا کی تشکیل کے لیے اہل فکر و نظر کی خیال آرائی کاغذوں پر خاکہ کی لکیریں کھینچنے میں ابھی سے مصروف ہے، مسٹر سارجنٹ مرکزی حکومت کے تعلیمی ماہر ہندوستان کے لیے تعلیم کا ایک نیا خاکہ تیار کر رہے ہیں، جس کی نسبت بیان ہے کہ وہ عام تر قومی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے، اور خالص ذہنی تعلیم کے بجائے جیسا کہ اسوقت ہے، اسمیں صناعی اور عملی تعلیم کے اجزا زیادہ ہوں گے، ظاہر ہے کہ یہ تعلیم ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے یکساں ہوگی، کانگریس وزارت کے زمانہ میں جس بنیادی تعلیم کو رائج کیا جا رہا تھا غالباً اسمیں بھی یہی دو چیزیں اصلی اور بنیادی تھیں لیکن مسلمانوں نے اسکی سخت مخالفت کی اور بجا کی، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس نئی سرکاری تجویز کیساتھ قوم کیا معاملہ کرتے ہیں۔

آل انڈیا ہسٹاریکل کانگریس کا سالانہ اجلاس امسال دسمبر کی تعطیلوں میں مدراس میں ہو رہا ہے، اس کے ایک شعبہ (ماقبل مغل عہد) کی صدارت دار المصنفین کے حصہ میں آئی ہے، دار المصنفین کا انگریزی میں کوئی کارنامہ نہیں، لیکن اس کے باوجود اگر اہل کانگریس کی نگاہ اس کی طرف اٹھی، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے کارناموں نے قبولیت عامہ کی سند پالی ہے، فالحمد للہ۔

دار المصنفین کی مجوزہ تاریخ ہند کے متعدد حصے تکمیل پا چکے ہیں، اس سلسلۂ تاریخ کا اہم مقصد یہ ہے، کہ مسلمانوں کے ان تمدنی و صنعتی و علمی و فنی کارناموں کو دیکھا جائے، جن سے یہ معلوم ہو، کہ ہندوستان کی تعمیر میں ان کی کوششوں کو کہاں تک دخل ہے، اس ضمن میں ایک پوری جلد ہندوستان میں مسلمانوں کی فوجی و عسکری تنظیم پر ہے، اور جس کو ہمارے رفیق مولوی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم۔ اے نے کئی سال کی تلاش و محنت میں ترتیب دیا ہے، یہ کتاب ان کے قلم سے پوری ہو کر ختم ہوئی ہے۔

فواد اول یونیورسٹی مصر کے مشرقی شعبہ کے استاذ محی الدین کا ایک نوازش نامہ ابھی حال میں موصول ہوا ہے، جس سے یہ ظاہر ہوا کہ مجمع فواد (فواد اکاڈیمی) کے نام سے ایک مجلس وہاں بنائی

گئی ہے، جس کی غرض عربی زبان میں نئی علمی و فنی اصطلاحات کا بنانا اور پھیلانا ہے، اس سال اس اکاڈمی کے ایوان میں علوم مشرقی کے علماء اور ماہرین کی ایک کانفرنس ہوئی، جو ڈیڑھ ماہ تک قائم رہی، اس کانفرنس میں بہت سی اہم تجویزیں منظور ہوئیں، جو وقتاً فوقتاً عمل میں آئیں گی، اس ضمن میں ایک تجویز یہ بھی منظور ہوئی ہے کہ قرآن پاک کی ایک فنی ڈکشنری لکھی جائے، اس کام کے لئے ایک کمیٹی الگ بنادی گئی ہے، جو اپنا کام مستقل طور سے انجام دیتی رہے گی۔

اس اخیر کمیٹی میں استاذ موصوف نے دار المصنفین کی کتاب ارض القرآن کو روشناس کیا، کمیٹی نے اس کتاب کے مفید مضامین کی تلخیص و ترجمہ کی تجویز منظور کی، گو کہ یہ کتاب جو آج سے پچیس تیس برس پہلے لکھی گئی تھی، اس زمانہ کے علوم کی ترقی کے ساتھ اپنے نئے پرداز پر تالیف کی محتاج ہے، تاہم یہ فخر اس کے لیے کیا کم ہے، کہ اس نے قدیم و جدید کے ارکان عظام سے خراج تحسین وصول کیا ہے، ان سے مراد حضرت مولانا انور شاہ کشمیری صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمد علی جوہر مرحوم ہیں، آج مصر کی سرزمین میں اس کا ذکر سنا جارہا ہے، وللہ الحمد۔

خطبات مدراس کے نام سے جو کتاب اردو میں شایع ہوئی ہے، اس کے انگریزی ترجمہ کا مطالبہ ہر طرف سے عرصہ سے جاری تھا، اب اہل شوق کو یہ سن کر خوشی ہوگی، کہ انگریزی کے ایک نوجوان ادیب سعید الحق صاحب ایم۔ اے نے اس کا انگریزی ترجمہ پورا کرلیا ہے، یہ ترجمہ گو وہ بہت پہلے کر چکے تھے، مگر اب تک اس کی اشاعت نہیں ہوئی تھی، رانچی کے ایک تاجر کاروباری مسلمان ایس۔ اے جبار کی مالی امداد سے اس کے آٹھ میں سے پانچ خطبوں کا ترجمہ شایع ہو گیا ہے۔

پچھلے دنوں ادارۂ ادبیات اردو کی دعوت پر حیدرآباد دکن میں اردو کانگریس کے نام سے ایک اہم مجلس منعقد ہوئی، جس میں دکن اور شمالی ہند کے بہت سے مشاہیر اور اکابر جمع ہوئے، اور اردو زبان کی ترقی، توسیع اور اشاعت پر اہم مباحث طے ہوئے، جن میں سے سب سے اہم بات یہ ہے، کہ یہ ہنگامی مجلس مستقل مجلس کی شکل میں قائم ہو گئی، اور ابھی سے اس کے آئندہ اجلاس کا مقام لکھنؤ مقرر ہوگیا، جس کے صدر سر تیج بہادر سپرو ہوں گے، اس مجلس کے عہدہ داروں میں ہندو

اور مسلمانوں دونوں کے نام ملتے ہیں، کیا عجب یہی اردو کانگریس آپس کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کا ذریعہ بنے، اس لیے ہم اس کانگریس کا شاندار استقبال کرتے ہیں

کاغذ کی کمیابی کے باوجود معارف نے اب تک اپنے صفحات کو قائم رکھا، لیکن گورنمنٹ کے تازہ آرڈر کے مطابق اس کی آئندہ اشاعت کے صفحات کم کردینے پڑیں گے، کوشش کی جائیگی کہ خط کو خفی کرکے مضامین کی کمیت میں کمی نہ ہونے دی جائے۔

(معارف ماہ اگست ۱۹۴۴ء)

(۲)

افسوس ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی نے ۲۲ر اگست ۱۹۴۴ء کو اس عالم فانی کو الوداع کہا، مرحوم نے ساری عمر اپنے خیالات کی خاطر جن کو وہ حق سمجھتے تھے، تکالیف میں بسر کی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مدت کے بعد کوئی عالم دین ایسا پیدا ہوا تھا جس نے اس طرح مجاہدانہ زندگی بسر کی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ اور مقام اعلیٰ نصیب کرے۔

اس ماہ کا دوسرا حادثہ حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب کی وفات ہے، مرحوم حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے محبوب خلفاء میں تھے، گو کہ وہ عالم نہ تھے، گریجویٹ تھے، عمر بھر اعلیٰ سرکاری ملازمت کی، مگر ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ قلب خاشع اور وہ تقویٰ عطا ہوا تھا، جس پر بڑے بڑے علماء کو رشک ہونا چاہیے، اور شعر وسخن کی مجلس میں وہ بلبل گویا تھے، کہ جس کے سریلے نغموں سے ایک مدت تک اہل درد لذت پاتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ جنت الفردوس ان کی آرام گاہ بنائے۔

اس نمبر میں "مولانا عبید اللہ سندھی" نام ایک کتاب پر تبصرہ شامل ہے، یہ مضمون کئی ماہ پہلے لکھا گیا، اور معارف میں چھپنے کو آیا، اگر اس کا تعلق مولانا کی ذات سے ہوتا تو ہم اس کی اشاعت قطعاً روک دیتے، مگر چونکہ یہ ذات کے بجائے ان کے خیالات سے متعلق ہے، جو ان کی وفات کے بعد بھی پھیلیں گے، اور پھیلائے جائیں گے، اس لیے اسکی اشاعت کی ضرورت بہرحال باقی ہے۔

مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی رقمطراز ہیں:

"آج پھر مدت کے بعد اس عریضہ کے لکھنے کی نوبت آرہی ہے، حقیقی محرک تو اس کا جولائی کے معارف کے شذرات کا وہ وسطانی حصہ ہے، جس میں معارف نے ان عصری لغزشوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جنہیں آپ تو لغزش ہی فرمارہے ہیں، لیکن میرے نزدیک تو یہ چیزیں قریب قریب ارتداد کے پہنچتی جا رہی ہیں، ...... اس راہ کے سب سے بڑے پیشوا نظر آتے ہیں، اور بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب ... کا حشر بھی خدا نخواستہ ان کے ساتھ نہ ہو......

اتفاقاً معارف کے اس شذرہ پر ادھر نظر پڑی ہی تھی کہ منہاج السنۃ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کے دیکھنے کی ضرورت پیش آئی، ابتدائے کتاب ہی میں یہ عجیب الفاظ آج سے صدیوں پہلے کے ملے، دیکھ کر حیران ہو گیا، بے اختیار جی چاہا کہ آپ کی خدمت میں بھی اس کی ایک نقل روانہ کردوں، وہ اپنے زمانہ کے چند خاص طبقات کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھنے کے بعد کہ یہ لوگ ان لوگوں میں ہیں، ممن قلت معرفتهم بالعلم والدین ولم یعرفوا اصل دین المسلمین (علم اور دین کی معرفت جنکی تھوڑی ہے اور مسلمانوں کے دین کی بنیاد تک جنکی رسائی نہ ہوسکی) فرماتے ہیں:

الذین هم فی الباطن من
الصابئة الفلاسفة الخارجین
عن حقیقة سید المرسلین
لا یجبون اتباع دین
الاسلام ولا یحرمون
اتباع ما سواه من
الادیان یجعلون
الملل بمنزلة المذاهب

درحقیقت صابیوں میں ارباب فلسفہ کا
جو گروہ ہے یہ لوگ بباطن وہی ہیں،
سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع
کی جو اصل حقیقت ہے، اس کے دائرہ سے
یہ باہر ہیں، یہ وہی لوگ ہیں جو دین اسلام
کی پیروی یعنی اس کے مطابق زندگی بسر
کرنا ضروری نہیں خیال کرتے، اور اسلام
کے سوا دنیا کے دوسرے مذاہب و ادیان

والسياسيات التي يسوغ اتباعها، وان النبوة نوع من السياسة العادلة التي وضعت لمصلحة العامة في الدنيا فان هذا الصنف يكثرون ويظهرون اذا كثرت الجاهلية واهلها،

کی اتباع کو حرام نہیں سمجھتے، بلکہ دنیا کے تمام ملل و ادیان کے متعلق ان کا یہ عقیدہ ہے، کہ یہ مختلف طریقے اور سیاسی ادارے ہیں، جن ہیں سے جس کی بھی آدمی چاہے پیروی کر سکتا ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں، کہ نبوت بھی دراصل ایک قسم کی سیاست ہی ہے، لیکن ایسی سیاست جس کی بنیاد عدل اور توازن پر قائم ہے، خیال ان کا یہ ہے کہ عوام کی دنیاوی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر بنانے والوں نے اسے بنالیا ہے، اس قسم کے لوگوں کی کثرت اس وقت ہو جاتی ہے، اور اس زمانہ میں ان کا ظہور ہوتا ہی جب جاہلیت پھیل جاتی ہے، اور جاہلیت والوں کا اقتدار قائم ہو جاتا ہے۔

شیخ الاسلام نے اس کے بعد ان الفاظ پر اپنے اس بیان کو ختم کیا ہے:

هؤلاء لا يكذبون النبوة تكذيبا مطلقاً بل يؤمنون ببعض احوالها ويكفرون ببعض الاحوال

نبوت کی تکذیب کامل طور پر مطلقاً نہیں کرتے، بلکہ بعض چیزیں مانتے ہیں اور بعض چیزوں کا انکار کرتے ہیں، پھر اس مسئلہ میں یعنی نبوت

وھم متفاوتون فیما یومنون بہ ویکفرون بہ من تلک الخلال فلھذا یلتبس امرھم بسبب تعظیمھم للنبوات علی کثیر من اھل الجھالات

(منہاج النبوۃ دیباچہ ص ۳ ج ۱)

کہ کن باتوں کو مانا جائے اور کن کا انکار کیا جائے، باہم ان کے خیالات میں اختلاف بھی ہوتا ہے، نبوات اور پیغمبرانہ ہدایتوں کا چونکہ یہ احترام بھی کرتے ہیں، یہی چیز ہے جس کی وجہ ان کی اصل حقیقت پر جاہلوں کے نزدیک پردہ پڑا رہتا ہے۔

میں نے مولانا عبدالباری صاحب ندوی کو شیخ الاسلام کی یہ عبارت سنائی تو متحیر ہو کر رہ گئے، اور فرمانے لگے کہ دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے، یہ بھی فرمایا کہ اردو میں ترجمہ کر کے آپ بطور سوال کے لوگوں سے دریافت کیجیے، کہ یہ خیالات کس زمانہ کے ہو سکتے ہیں؛ میں نے کہا کہ جی ہاں قرآن میں بھی اسی کی طرف

اَتَوَاصَوْا بِہٖ بَلْ ھُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ،

کیا یہ لوگ ایک دوسرے کو یہ کفر کی باتیں کہتے آئے ہیں، بلکہ یہ سرکش لوگ ہیں۔

کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے، دلوں میں جب کبھی طغیان کی کیفیت پیدا ہوتی ہے دماغ جب سرکش ہو جاتے ہیں تو اس وقت ہر طغیان زدہ فطرت سے اسی قسم کے خیالات ابلنے لگتے ہیں، بہر حال کچھ بھی ہو، روشن خیالی کے مدعیوں کے لیے یہ ایک تحفہ ہے ان بیماروں کو جو یہ مغالطہ لگا ہوا ہے کہ آج جو کچھ یہ سوچ رہے ہیں، یہ انسانی دماغ کے ارتقاء کا نتیجہ ہے، ہو سکتا ہے کہ اسی قسم کی چیزوں سے اپنے بے جا ادعا کا علاج کریں، اور مسکینوں کو محسوس ہو، کہ دماغی تنزل نہ سہی قلبی و روحانی تنزل کے یہ لازمی نتائج ہیں۔

اَمْ تَاْمُرُھُمْ اَحْلَامُھُمْ

کیا ان کی دانشمندیاں ان سے یہ کہلاتی

بِھٰذَا اَمْ ھُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ، ہیں، یا وہ سرکش لوگ ہیں۔

(معارف ماہ ستمبر ۱۹۴۴ء)

(۳)

حکومت الٰہیہ کے مبشر اخبار "کوثر" لاہور نے اپنے یکم ستمبر ۱۹۴۴ء کے "تیر و نشتر" میں ایک نوٹ لکھا ہے، جس کا مآل یہ ہے کہ میں نے اپنے خطبات کا ترجمہ ایک شراب فروش سے روپیے لے کر چھپوایا ہے، اور اس تقریب سے میرے ساتھ تمام علمائے کرام کو اس نے مورد طعن بنایا ہے، جواباً عرض ہے کہ میری نسبت سے یہ واقعہ قطعاً غلط ہے، اور جس نے بھی ایسا لکھا ہے اس نے صریح جھوٹ کہا ہے، ہاں میری کسی کتاب کا کسی صاحب نے ترجمہ کیا ہے، اور اس کو میرے علم و اطلاع کے بغیر از خود کسی ایسے ذریعۂ آمدنی سے شایع کیا ہے، تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں، نہ دینی نہ دنیاوی۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْریٰ۔

افسوس کہ ہمارے اخبار نویسوں میں دوسروں کی عزت اتارنے کا میلان عام طور سے پایا جاتا ہے، وکفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع۔ کاش اگر الزام کی اشاعت سے پہلے صاحب معاملہ سے تھوڑی سی تحقیق کر لی جایا کرے، تو بہت کچھ اس قسم کے غلط واقعات کی اشاعت کی روک تھام ہو سکتی ہے۔

پھر نکتہ شناس جانتے ہیں کہ ادبی طنزیات کا لکھنا کچھ آسان کام نہیں ہے، اس کے لیے بڑے ستھرے مذاق کی ضرورت ہے، اردو اخبار نویسوں میں اس قسم کے کامیاب لکھنے والے دو ہی تین ہیں، جناب سالک (انقلاب لاہور) جناب قاضی عبدالغفار صاحب (پیام دکن) جناب مولانا عبدالماجد دریابادی (صدق لکھنؤ) طنزیات کا کمال یہ ہے کہ جس پر لکھا جائے وہ خود بھی مزے لے کر پڑھے۔ طنزیہ نگاری، دشنام طرازی اور افترا پردازی نہیں ہے۔

اس طرز نگارش کی صلاحیت فطری ہوتی ہے، وہ نقالی سے نہیں آتی ہے، اب یہ حال ہے کہ اخبار کے مزہ کے لیے اصلاح و تنبیہ کی نیت سے نہیں، اکثر اخباروں نے اپنا ایک کالم اس

"فنِ شریف" کے لیے وقف کر رکھا ہے، اور ہر ہفتہ اور بعض ہر روز اپنی بدمذاقی کا ثبوت پیش کرتے رہتے ہیں، اور انشاء اللہ خان بیچارہ کی طرح ہر اشاعت کے وقت ڈھونڈتے پھرتے ہیں، کہ آج کس کی پگڑی اتاری جائے، اور کس کو سر بازار لتاڑا جائے، تاکہ اخبار میں نمک مرچ کی چٹ پٹاہٹ ہو، اور خریداروں کے کام و دہن کی لذت کا سامان ہو۔

انجمن ترقی اردو نے گذشتہ سال کی روداد چھاپ کر شایع کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انجمن نے اس سال تقریباً پندرہ کتابیں شایع کیں، ملک میں متعدد شاخیں قائم کیں، دور دراز مقامات میں اردو کی اشاعت کا کام کیا، اور ایک اردو کانفرنس بمقام ناگپور منعقد کی، اور سال حال کے لیے اس کے پاس متعدد ضروری تصانیف تیار اور زیر تحریر ہیں، اس کامیابی پر انجمن مذکور مبارکباد کی مستحق ہے۔

ناظم انجمن ترقی اردو کی طرف سے ایک اردو یونیورسٹی کی تجویز تمام اخباروں میں چھپی ہوئی ہے، تجویز کی اہمیت اور معقولیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کے امکانات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، میرے خیال میں تو اگر اس کام کے لیے جامعہ ملیہ دہلی کو مرکز بنایا جائے، تو اس خواب کی تعبیر بڑی آسانی سے نکل سکتی ہے، جامعہ نے اپنے مخلص کارکنوں کی بدولت ایک کامیاب حیثیت حاصل کر لی ہے، اس کے پاس سرمایہ بھی ہے، اہل علم بھی ہیں، کالج بھی ہے، اسکول بھی ہیں، ٹریننگ کالج بھی ہے، عمارتیں بھی ہیں، کتب خانہ بھی ہے، اور اس کے یہاں تمام علوم کی تعلیم اردو میں ہوتی بھی ہے، اور اس کی سند کو یورپ اور ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں نے مان بھی لیا ہے، اور اب خود گورنمنٹ نے بھی اس کو تسلیم کر لیا ہے، ایسی حالت میں اس کو اردو یونیورسٹی کی صورت میں ترقی دینا کیا مشکل ہے۔ دونوں اداروں کا مرکز بھی دلی ہی ہے، اس لیے دونوں ایک دوسرے کی معاونت سے اس تجویز کی جزئیات پر غور کر سکتے ہیں۔

(معارف ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء)

(۳)

بحمد اللہ کہ دار العلوم ندوۃ العلماء نے اس موجودہ گرانی کے عالم میں سرکار نظام خلد اللہ ملکہ،

کی شاہانہ امداد سے نئی زندگی پائی، اب حضرات مدرسین مطمئن ہو کر اپنے فرائض میں جمعیت خاطر مصروف و مشغول ہیں، طلبہ کی تعداد بھی گذشتہ سال سے دونی ہو گئی ہے، امسال کام کرنے والوں میں بھی بفضلہ تعالیٰ کام کا نیا ولولہ پیدا ہے، اگر جنگ کا زمانہ نہ ہوتا، تو بہت سی نئی ترقیاں ظہور میں آتیں، مگر اس وقت بھی غنیمت ہے، کہ مدرسہ جادۂ حیات پر مستقیم ہے۔

البتہ غیر مستطیع طلبہ کے وظائف کی مد میں اشیائے خوراک کی گرانی کے سبب سے بہت کمی ہے، ضرورت ہے کہ اہل دل دردمند جو علوم دینی کی اشاعت کو ضروری سمجھتے ہیں، اور اس کی امداد میں حصہ لینے کو کار ثواب جانتے ہیں، ادھر توجہ فرمائیں، اور ناظم صاحب ندوۃ العلماء کے نام سے اپنی امداد بھیجیں۔

افسوس یہ ہے کہ عربی تعلیم ہمارے دولت مند اور شرفاء کے گھرانوں سے عام طور سے رخصت ہو رہی ہے، اب جو کچھ اس کا رواج و قیام ہے، وہ صرف غرباء کے ذریعہ ہے، اب اگر دولت مند طبقہ اپنے جگر گوشوں کی قربانی نہیں کر سکتا تو اس تعلیم کی بقا کے لیے چند خزف ریزوں کی قربانی تو گوارہ کرے، ورنہ ذرا دل میں سوچنا چاہیے کہ جو جان سے مدد نہیں کر رہے ہیں، اگر وہ مال سے بھی مدد نہ کریں تو وہ دین کی اشاعت و تبلیغ کے مواخذہ سے قیامت کے دن کیونکر بچیں گے۔

لکھنؤ میں چند دردمند مسلمانوں نے مل کر ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا ہے، خوشی ہے کہ اس کی تعلیمی و علمی خدمت کی سربراہی کی توفیق بعض علمائے ندوہ کو حاصل ہوئی ہے، اور بعض دیندار تعلیم یافتہ حضرات اس کی مالی امداد میں حصہ لے رہے ہیں، ادارہ کا مقصد بالغ، کاروباری اور نوکری پیشہ لوگوں میں قرآن پاک کی تعلیم کی اشاعت ہے، وہ آسان اور سہل طریقوں سے ابتدائی عربی زبان سکھا کر ساتھ ہی روزانہ اسباق کے ذریعہ سے قرآن پاک، عربی عبارت پڑھنے اور سمجھنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، اور ہفتہ میں ایک دن اسی طرح حدیث کی تعلیم ہوتی ہے، ادارۂ مذکورہ کی طرف سے ادارہ کے استاذ مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی

نے اپنے طریقۂ تعلیم پر دو رسالے بھی شایع کیے جن سے ان کے خیال اور تجربہ کے مطابق آسانی سے عربی زبان عموماً اور قرآن کی عربی خصوصاً سیکھی جا سکتی ہے، اور باہر کے لوگ خط و کتابت کے ذریعہ سے بھی اس طریقہ کی تعلیم مفت حاصل کر سکتے ہیں، خط و کتابت کا پتہ یہ ہے:۔ ادارۂ تعلیماتِ اسلام نمبر ۱،۳۵ امین آباد، لکھنؤ۔

(معارف ماہ نومبر ۱۹۴۴ء)

(۵۱)

کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ تحقیقاتِ علمیہ کے تحت اکبر کے دینِ الٰہی پر ایک مقالہ ایک بنگالی طالب تحقیق نے لکھ کر پیش کیا ہے، جس میں ثابت کیا ہے کہ اکبر کا یہ مذہب آیات و احادیث کے مطابق اور عین اسلام تھا، یہ مقالہ ڈاکٹریٹ کی سند کے لیے مستند سمجھا گیا، اور مقالہ نویس کو اسلامی علوم میں کمال مہارت کی داد دی گئی، اور کہتے ہیں کہ اس کے مصنف کو یونیورسٹی کے محققین علوم اسلامیہ کی نگاہ میں اس لایق سمجھا گیا، کہ اس کو مزید تعلیم کے لیے جامع ازہر بھیجا جائے، اور وہاں سے واپسی پر اس کو اسلامی چیر پیش کی جائے۔

یہ واقعہ اگر صحیح ہوتا تو بہت امید افزا تھا، کیونکہ اس سے اس بات کی امید ہوتی ہے کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے مذہبی علوم سے اس درجہ واقف ہوگئے ہیں، کہ ایک دوسرے کے اہم مذہبی مسائل میں ماہرانہ رائے دے سکتے ہیں، مگر افسوس کہ واقعہ ایسا نہیں، مصنف مذکور کا جامع ازہر تو کجا مدرسہ عالیہ کلکتہ میں بھی داخلہ مشکل معلوم ہوتا ہے، جس کو وضو اور وجو میں تمیز نہ ہو، وہ مسائل دینِ اسلام میں تحقیق کی داد دینا چاہے تو کیسے تعجب کی بات نہیں۔

مقالۂ مذکور ناواقفیتوں کا مجموعہ اور غلط قیاسات و استدلالات کی منطق سے معمور ہے، دبستان المذاہب جیسی مجہول الاسم مصنف کے بیان سے دینِ الٰہی کے جو اصول بتائے گئے ہیں، وہ تمامتر فارسی عبارت کی نافہمی پر مبنی ہے، دینِ الٰہی کے اصول و رسوم کو ابوالفضل نے تفصیل سے لکھا ہے، ان رسوم کو سامنے رکھ کر اس کو دین کہنا، دین سے ناواقفیت کا اظہار ہے۔

بہرحال سنا ہے کہ بنگال کے علمی و تعلیمی حلقہ میں اس کو یہ سند قبول حاصل ہوئی، کہ مقالہ نویس صاحب کا نام یونیورسٹی مذکور میں اسلامی تاریخ کا جو نیا شعبہ قائم ہوا ہے، اس کی صدارت کے لیے لیا جا رہا ہے، ہم کو علم نہیں کہ اس مقالہ کے ممتحنین میں کون کون اہل کمال شامل تھے، تاہم اتنا یقینی معلوم ہوتا ہے کہ علم کی خدمت پر تعلقات اور مصلحتوں کو تقدم کا حق بخشا گیا ہے، علم کے دین الٰہی میں اس سے بڑا گناہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

مصنف نے کتاب کے آغاز میں آل تیمور کے مذہبی حالات کا تیمور سے لیکر اکبر تک کا جائزہ لیا ہے، اور بتایا ہے کہ تیمور اور آل تیمور پورے مسلمان کبھی نہ تھے، بلکہ صوفیانہ ارتقاء طے کرتے آئے تھے، جس کی آخری سیڑھی اکبر کا یہ دین الٰہی ہے، عمل کے لحاظ سے تو ظاہر ہے کہ کوئی کامل مسلمان مشکل سے ثابت ہو سکتا ہے، مگر عقیدہ کے لحاظ سے آل تیمور کو ہمیشہ سے اس لیے بدعقیدہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ اکبر کی بدعقیدگی کے لیے گنجائش نکلے، عذر گناہ بدتر از گناہ کی بہترین مثال ہے۔

ہم کو خوشی ہے کہ دار المصنفین کے ایک رفیق سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب نے اس کتاب پر انگریزی میں جو ریویو لکھا وہ کلکتہ اور دلی کے اسلامی اخبارات میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، اصل انگریزی ریویو اسٹار آف انڈیا کلکتہ میں چھپا تھا، اور اخبار مذکور نے اس پر لیڈنگ آرٹیکل لکھ کر اس کی تحسین کی، اور اخبار ڈان دہلی نے اس ریویو کو اپنے کالموں میں نقل کیا۔

لیکن ضرورت ہے کہ اصل کتاب پر مفصل ریویو کیا جائے، اور اس کی غلطیاں دکھائی جائیں، جن سے یہ معلوم ہو کہ انگریزی کے مواد فاسدہ سے جو چیز تیار کی گئی ہے، وہ کس قدر زہرناک ہے، اسلام کا تصوف وہ نہیں ہے جو دارا شکوہ وغیرہ کی تصنیفات میں ہے، بلکہ وہ ہے جو سلطان نظام الاولیا، مخدوم الملک بہاری، مجدد الف ثانی اور دیگر ائمۂ اسلام کی تصنیفات میں ہے، جوگ آمیز تصوف کی راہ سے ہندو مسلمانوں کو ملانے کی کوشش نہ ہندوؤں میں مقبول ہو سکتی ہے اور نہ مسلمانوں میں، اسکا تجربہ اکبر سے لیکر اصغر تک نے کر لیا مگر نتیجہ ناقابل قبول ہی رہا۔

اسی قسم کی ایک اور کوشش یو۔ پی ہسٹاریکل جرنل میں کی گئی ہے، اس میں اکبر کے اس محضر نامہ پر جس کے رو سے اس وقت کے چند روشن خیال علماء نے اس کو امام بنا کر مختلف فیہ مذاہب میں ترجیح و اجتہاد کا حق دیا تھا، تحقیق کی گئی ہے، اس کے لکھنے والے ایک ایسے صاحب ہیں، جو اہل سنت سے باخبر نہیں، اور لکھنؤ یونیورسٹی میں یورپین ہسٹری کے پروفیسر ہیں، مضمون نگار کی بنیاد ایک معمولی غلط فہمی پر ہے، ماوردی کی الاحکام السلطانیہ میں خلیفہ و امام کے انتخاب کے لیے جس علم کی قید ہے، اس سے مقصود دین اور اصول و مسائل دین کا علم اور عمل ہے، ظاہر ہے کہ اکبر صاحب اس علم کے ظاہر اور باطن دونوں سے کورے تھے، اس لیے انتخاب کے طور پر نہ خلیفہ ہو سکتے تھے، نہ امام، نہ مجتہد، نہ مرجح، البتہ وراثت کے دعویٰ، اور تلوار کے زور سے وہ سب بنائے جا سکتے تھے، اور بنائے گیے، تو اس کے لیے سرے سے علم ہی کی ضرورت نہیں، صرف تاج و تخت کی ضرورت ہے۔

صاحب مضمون کو شاید کسی وجہ سے یہ دھوکا ہوا کہ لفظ امام اہلسنت میں بھی ایک ہی معنی رکھتا ہے، لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے، امام کے لغوی معنی پیشوا کے ہیں، اس کا اطلاق اہل سنت میں پیشوائے دینی، پیشوائے علمی پیشوائے سیاسی، بلکہ پیشوائے کفر تک پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے

اس لیے جس امام کو اجتہاد اور ترجیح کا حق حاصل ہے، وہ وہ امام ہے جو پیشوائے علوم دین ہے، نہ کہ ہر اس شخص کو جو کسی اور معنی کے لحاظ سے امام ہو، البتہ اگر کسی کی ذات میں اتفاق سے امامت علمی و سیاسی مجتمع ہو جائیں تو بے شبہ اس کو اس کی اہلیت کے مطابق اجتہاد اور ترجیح کا حق حاصل ہوگا، جیسے خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم اور خلیفہ عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ یا کوئی اور اگر ایسا ہوا ہو، یا ہو۔

اس سلسلہ میں صرف ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ جس مسئلہ میں فقہاء میں اختلاف ہو اور ہر ایک کے پاس انکے اپنے دلائل ہوں ان میں کسی زمانہ میں کوئی امام سیاسی (سلطان) مسلمانوں کی کسی خاص ضروری مصلحت کی بنا پر جس کو علمائے وقت بھی مصلحت سمجھیں کسی ایک پہلو کو اختیار کر کے کوئی حکم دے تو وہ ہنگامی طور سے اس خاص مصلحت کے تحت نافذ العمل ہو سکتا ہے مگر یہ جزئی اختیار ہے، جس محضر نامہ کے مضمون کو تعلق نہیں اور نہ اسکے لیے اس شد و مد سے محضر نامہ تیار کرنے کی ضرورت تھی، یہ اختیار تو محضر نامہ کے بغیر آج بھی ہر

(معارف ماہ دسمبر ۱۹۴۴)

اسلامی ریاست کے امیر کو حاصل ہے۔

شذرات

از ماہ اپریل ۱۹۴۵ء تا ماہ دسمبر ۱۹۴۵ء

(۱)

مورخین ہند کی کانفرنس کی صدارت!

خاکسار تین ماہ کے سفر مدراس و بمبئی و حیدرآباد دکن و وردھا و بھوپال سے مارچ کے وسط میں واپس آیا، مدراس میں اواخر دسمبر ۱۹۴۴ء میں مورخین ہند کی کانفرنس تھی، جس کے ایک شعبہ کی صدارت کیلئے مدراس کا سفر کیا گیا۔

یہ ظاہر ہے کہ کسی شعبہ کی صدارت کے لیے اتنا لمبا سفر اختیار کرنا اور وہ بھی صحت کی خرابی کی حالت میں کسی نئے حصول اعزاز کی غرض سے نہ تھا، بلکہ ان تلخ حقیقتوں کے اظہار کے لیے تھا جن سے اب تک چشم پوشی برتی گئی ہے، اور جن کے اظہار کا اس سے بہتر موقع نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ اس خطبہ میں جس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے، اس کو کانفرنس کے سمجھدار لوگوں نے اچھی طرح سمجھا، بلکہ کانفرنس کے صدر ڈاکٹر سریندر ناتھ سین نے اپنے صدارتی خطبہ میں بھی ادھر اشارہ کیا ہے، اور ابھی ۲۵ر مارچ ۱۹۴۵ء کو ہندوستانی کلچر الہ آباد کی صدارتی تقریر میں سر تیج بہادر سپرو نے "حقیقی تاریخ" کے عنوان سے اسی مقصد کو ظاہر کیا ہے۔

مدراس کے بعض دوسرے مقامات میں بھی تقریریں ہوئیں، ویلور و یشارم میں تقریر کا عنوان "ملت محمدیہ کی حقیقت" اور دارالسلام عمرآباد میں "عبدیت" تھا، دارالسلام کی مسجد میں دو روز صبح کے وقت قرآن پاک کے درس بھی ہوئے، پریم بیٹ میں بھی صبح کو ایک مسجد میں قرآن پاک کی بعض سورتوں کا درس ہوا۔

جلسہ جمعیۃ العلمائے بمبئی کی صدارت!

بمبئی کا سفر وہاں کی جمعیۃ العلماء کی دعوت پر ۲۰ر صفر ۱۳۶۴ھ کی رات کو جمعیۃ العلماء مذکور کی صدارت کا خطبہ پڑھا گیا، جس میں سورہ الحمد کی تفسیر کے ضمن میں مسلمانوں کے حال پر تبصرہ تھا، شہر میں انجمن اسلام ہال میں اردو پر

اور صابو صدیق ہال میں ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی خدمت کے موضوع پر، اور احباب کے ایک مخصوص مجمع میں توبہ وانابت کے صحیح طریق پر تقریریں کی گئیں۔

حیدر آباد دکن کے سفر میں خرابیٔ صحت کی بنا پر قصداً تقریروں سے احتراز کیا گیا، صرف سکندرآباد کے نوجوانوں کے ایک مختصر سے مجمع میں اصلاح کے بنیادی طریق پر گفتگو کی گئی جس کو اکثر نوجوانوں نے پسند کیا۔

وردھا کا سفر ہندوستانی زبان کے مشورہ کی غرض سے ہوا، میں نے اپنی تقریر میں ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیا، اور یہ عرض کیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں اسی حد تک فرق ہونا چاہیے، جس حد تک ان کے مذہبوں اور تمدنوں میں فرق ہے، اس لیے جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی مذہبی و تمدنی اصطلاحوں اور لفظوں کا ماخذ عربی و فارسی و ترکی ہونے سے کوئی چارا نہیں ہے، اور ایسی ہی اجازت ہندوؤں کو بھی ان کے مذہبی و تمدنی خصوصیات کے لیے ہونی چاہیے، اس کے بعد یہ عرض کیا گیا، کہ زبان کے لفظوں کی صحت کا مدار لغت کی کتابوں کے بجائے بازار کے چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہیے، اب اس وقت ہماری زبان میں عربی و فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگلش کا جو لفظ جس صورت میں بولا جاتا ہے، وہی ہماری زبان کا صحیح لفظ ہے، افسوس ہے کہ رپوٹروں نے لوگوں کی صحیح تقریریں چھاپنے کا بندوبست نہیں کیا،

عرب ریاستوں کی وحدت کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان میں اب تک صرف علمی و ادبی و اقتصادی خیالات ظاہر کیے گئے تھے، لیکن بعض مصلحین نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے، اور یہ ظاہر کیا ہے، کہ شریعت اسلامیہ کے قانون کو اگر یہ سب اختیار کرلیں تو یہ وحدت کا بہترین ذریعہ ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ریاستیں اس تجویز کو منظور کریں، تو یہ عربی وحدت کا حقیقی ظہور ہوگا، اور پوری دنیائے اسلام اس کی پشت پر ہوگی، خدا کرے کہ عرب مسلمانوں کی نظر توجہ لندن اور نیویارک سے ہٹ کر اگر پھر مکہ اور مدینہ پر پڑنے لگے، تو ان کی دوسری زندگی پھر ان کی پہلی زندگی کی طرح دنیا کی قوموں کے لیے زندگی کا نیا پیغام پیش کردے، جس کی دنیا کو اس وقت بڑی

ضرورت ہے،

پچھلے تین مہینوں کے پرچوں کی ترتیب اور شذرات کی تحریر کا کام ہمارے رفیق مولوی شاہ معین الدین صاحب ندوی نے کیا ہے، اب معارف کا کام زیادہ تر وہ اور مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی کرتے ہیں، امید ہے کہ آیندہ بھی اس بوجھ کو وہی دونوں اٹھائیں گے، اور میرے لیے یہ بڑی طمانیت کا باعث ہے۔

معارف کی ضخامت کی کمی کا غم اپنے ناظرین کے ساتھ خود رسالہ کے مدیروں کو بھی ہے اب تک سرکار سے اجازت ملنے کی جو کوششیں کی گئیں، وہ ناکام رہیں، اب مرکزی حکومت میں کوشش کی جا رہی ہے، انجام اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

اشتراکیت اور اسلام نئے سال کی کتابوں میں مولوی مسعود عالم صاحب ندوی کی کتاب "اشتراکیت اور اسلام" چھپ کر شایع ہوئی ہے، کتاب گو مختصر ہے مگر تحقیق اور استناد سے لکھی گئی ہے، اس لیے امید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کریں گے۔

(معارف ماہ اپریل ۱۹۴۵ء)

(۲)

دار المصنفین صرف دار الاشاعت نہیں ہے، بلکہ دار التکمیل اور دار التربیۃ بھی ہے، جہاں عربی و انگریزی کے فارغ التحصیل، سلیم الذوق اصحاب پانچ برس رہ کر مزید تحقیق و تدقیق، تلاش و جستجو اور مطالعہ و توسیع علم میں مصروف رہتے ہیں، اور اس تلاش و محنت اور مطالعہ کے نتائج وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہتے ہیں، اس کی گذشتہ تیس سال کی زندگی میں متعدد فضلاء یہاں سے فارغ ہو کر باہر گیے، اور ملک و ملت دونوں ان کی تصنیفات و تحقیقات سے مستفید ہو رہے ہیں، فالحمد علیٰ ذالک۔

اس سلسلہ میں مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی مرحوم کا پہلا نام ہے، جو یہاں سے پہلے کلکتہ لائبریری میں، پھر اورینٹل لائبریری پٹنہ میں، اور پھر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں صدر مدرس

ہوئے، دوسرا نام پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کا ہے، جو اس وقت اسماعیل کالج بمبئی میں السنۂ مشرقیہ کے معلم ہیں، تیسرا نام مولوی سعید صاحب انصاری کا ہے جو ہندوستانی اکادمی الہ آباد کے رسالہ میں اڈیٹر ہوئے، چوتھا نام مولوی محمد عزیز صاحب ایم۔ اے کا ہے، جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں اردو کے لکچرر ہیں، پانچویں مولوی ابو الجلال صاحب ندوی ہیں، جو اس وقت جامعہ دار السلام عمرآباد کے سلسلۂ تالیف و تصنیف میں منسلک ہیں، چھٹے مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ہیں، جو پہلے یہاں سے شانتی نکیتن بنگال میں عربی کے پروفیسر ہو کر گیے، اور اب گجرات ورنیکلر سوسائٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔

اس سلسلہ کا اخیر نام مولوی محمد اویس صاحب نگرامی ندوی کا ہے جو ابھی پانچ برس کی مدت ختم کر کے دار العلوم ندوۃ العلماء میں درس قرآنیہ اور علوم قرآنیہ اور فقہ وکلام کے مدرس ہو کر گیے ہیں، دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے مدرسۂ مذکور کے طلبہ کو مستفید فرمائے۔

انگریزی یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالر اور ڈاکٹریٹ کے طالب علم بھی وقتاً فوقتاً یہاں سے مستفید ہوتے رہتے ہیں، خطوط سے، مشوروں سے، اور کبھی کبھی یہاں قیام کر کے اپنے مقالوں کو تیار کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم مہینوں یہاں مقیم رہے، اور اپنے کام کو تکمیل کو پہنچایا، یعنی مولوی محمد اسحاق صاحب، اس وقت وہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی کے لکچرر ہیں، اور ابھی بمبئی یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے کراچی سے آکر اور ایک ہفتہ رہکر اپنی ضرورت کے معلومات فراہم کیے، اور ایسے شائقین کے لیے دار المصنفین کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

دار المصنفین کا اس سے بھی ایک وسیع کام تلاش و تحقیق جویاؤں کے لیے معلومات کی فراہمی اور علمی مشکلات کے حل میں ان کی مدد ہے، چنانچہ اس قسم کے سوالات اور خطوط جو آتے ہیں، ان کے جوابات ہمارے رفقاء اور مصنفین لکھ کر برابر دیتے رہتے ہیں۔

دار المصنفین کی طرف سے تاریخ ہند اور تاریخ اسلام کے دو سلسلوں کے شروع ہونے کا اعلان کیا

گیا تھا، خدا کا شکر ہے، کہ یہ دونوں سلسلے اتمام کو پہنچ رہے ہیں، لیکن ابھی تک کاغذ اور چھپائی کے سامان کی کمیابی کی وجہ سے چھپ نہیں سکے ہیں، تاریخ اسلام کے دو سلسلے ہیں، ایک مشرقی سلطنتوں کی تاریخ کا، اور دوسری مغربی سلطنتوں کی تاریخ کا، مشرقی سلطنتوں کی تاریخ مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مرتب کر رہے ہیں، اس سلسلہ کی تین جلدیں چھپ چکی ہیں، اور چوتھی زیر ترتیب ہے، اسی پر بنی عباس کی سیاسی تاریخ مکمل ہو جائے گی، پانچویں جلد جو ان کے علمی و تمدنی کارناموں پر مشتمل ہوگی، زیر ترتیب ہے، اس کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ سامانیوں، دیلمیوں، غزنویوں اور خوارزم شاہیوں کی تاریخیں لکھی جائیں گی۔

مغربی سلطنتوں کی تاریخ کا کام ہمارے دوسرے رفیق مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لیا ہے، اور سات آٹھ سال سے وہ اس میں لگے ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں مغربی سلطنتوں میں صقلیہ (سسلی) کی محققانہ تاریخ دو جلدوں میں لکھ کر وہ پیش کر چکے ہیں، اور وہ اہل شوق کے ہاتھوں میں بحمد اللہ پہنچ چکی ہیں، اب وہ اندلس اور افریقہ کی مختلف اسلامی سلطنتوں کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں، اور اس کا بہت سا کام وہ ختم کر چکے ہیں، اور اب عنقریب اندلس کی تاریخ کی جلد مطبع میں جانے والی ہے۔

تمام اسلامی سلطنتوں میں جو دنیا کے مختلف حصوں میں قائم ہوئیں، سب سے لمبی اور طویل سلطنت دولت عثمانیہ (ٹرکی) ہے، اس کی تاریخ کی ترتیب کا کام مولوی محمد عزیز صاحب ایم۔ اے نے انجام دیا ہے، جس کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں، اور تیسری زیر قلم ہے، اور اسی پر اس سلسلہ کا خاتمہ ہو جائے گا۔

تاریخ ہند کے سلسلہ کی دو ابتدائی جلدیں جن میں سے ایک سندھ کی عرب ریاستوں کی تاریخ ہے، اور دوسری غزنویوں سے متعلق ہے، مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی نے لکھی ہیں، اور وہ بالکل تیار ہیں، اس سلسلہ کی ایک جلد جو ہندوستان کی اسلامی سلطنتوں کے علمی و تمدنی کارناموں پر مشتمل ہوگی، مولانا عبد السلام صاحب ندوی، مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی اور سید صباح الدین عبد الرحمن

صاحب ایم۔ اے کی محنتوں کا ثمرہ ہے، اور وہ مکمل ہے، تاریخ ہند کی بقیہ جلدوں کی تکمیل سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب سے متعلق ہے، جس میں وہ برابر مصروف ہیں۔

ٹنڈن جی اور ہندی اردو اور ہندی کے قصہ کو کانگریس کے پلیٹ فارم پر لانے والے ٹنڈن جی ہیں، ان ہی نے پہلے یوپی کانگریس کمیٹی میں اس کو پھیلایا، اور بڑھایا، اور اب اس کو وہ سارے ہندوستان کا مسئلہ بنا رہے ہیں، پچھلی کانگریس منسٹری میں یہی خیال تھا جس نے پیارے لال شرما جیسے شریف اور ملنسار آدمی کی جگہ سمپورنانند کو اسکول کی ماسٹری سے ہٹا کر وزارت کی کرسی پر بٹھایا، اور سنسکرتی ہندی کے رواج کو اس تھوڑے سے اختیار کے برتے پر محکمۂ تعلیمات میں بزور پھیلانے کی اسکیم پر عمل اعلانیہ شروع کردیا گیا، فیض آباد کی تقریروں میں دونوں نے ملکر اس کا اعلان کیا، اور یہ کہنا حقیقت سے دور نہ ہوگا، کہ کانگریس منسٹری سے مسلمانوں کو نفرت دلانے میں ان سورماؤں کا بڑا حصہ ہے، ٹنڈن جی ہی کی ابھی حال کی پونہ تقریر سے پتہ چلتا ہے، کہ وہ اپنی رائے پر مضبوطی سے قائم ہیں۔

(معارف ماہ مئی ۱۹۴۵ء)

(۳)

اللہ کا شکر ہے کہ معارف اپنی پہلی ضخامت کی طرف آہستہ آہستہ لوٹ رہا ہے، پچھلے مہینہ سے بتیس ۳۲ صفحوں پر شایع ہو رہا ہے، انشاء اللہ آیندہ ماہ سے چونسٹھ ۶۴ صفحوں پر شایع ہوگا، اور امید ہے کہ چند ماہ میں اس کی اصلی ضخامت پھر اپنی جگہ پر آجائے گی، صفحوں کی کمی کے سبب سے مضامین کے تنوع اور رسالہ کی دلچسپی میں جو کمی آگئی تھی، ہم کو خود اس کا افسوس تھا، پھر بھی قدردانوں کی طرف سے اس کی مانگ برابر بڑھتی ہی رہی، اور ہم کاغذ کی کمی سے ان کی تعمیل بروقت نہ کرسکے، امید ہے کہ یہ مشکل بھی دور ہوجائے گی۔

چھ ۶ برس سے دنیا میں لڑائی کی جو تباہی چھائی تھی، اس مہینہ جرمنی کی شکست سے یورپ کے ملکوں میں اس کا خاتمہ ہوگیا، یہ تاریخ کا اپنی قسم کا کوئی نیا واقعہ نہیں، ہمیشہ ہی سے یہ دستور الٰہی رہا ہے کہ

جو اپنی تلوار کے زور سے دوسروں کو گراتے ہیں، وہ آخر دوسروں کی تلوار کے زور سے ایک دن خود گرائے جاتے ہیں۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ لڑائی جس مقصد سے لڑی گئی، اس میں دنیا کو کہاں تک کامیابی ہوئی یا ہوگی، چھوٹی قوموں کی حفاظت، کمزور ملکوں کی حمایت اور جمہوریت کا بول بالا اس جنگ کا مقصد تھا، اب ہم کو دیکھنا ہے، اور تاریخ کو اپنے اوراق میں قلم بند کرنا ہے، کہ اس زمانہ کے مہذب فاتح اور متمدن کشور کشا کہاں تک میدان جنگ کے وعدوں کو صلح کی میزوں پر یاد رکھتے ہیں، اور فتح و شکست کے نتیجوں میں قوت اور ضعف کی پرانی بار بار کی دہرائی ہوئی دلیلوں کے علاوہ اس مدعیانہ ترقی و تہذیب کا عہد بھی کچھ تبدیلی پیدا کرتا ہے یا نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں دنیا کی بڑی بڑی جبار و قہار قوموں کی تباہی کا نقشہ پیش فرمایا ہے، اور بتایا ہے کہ قوت کا زور، طاقت کا گھمنڈ، دولت کا غرور، اور سازوسامان کی فراوانی نے ہمیشہ قوموں کو حدود الٰہی سے قدم باہر نکالنے پر آمادہ کیا ہے، فرعون و نمرود اور عاد و ثمود، تبابعہ یمن اور شاہان سبا کے واقعات کو قرآن پاک میں بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے، اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ واقعات اور ان کے یہ نتیجے، یہ کرتوت اور ان کے یہ پھل صرف پچھلی ہی قوموں کے حق میں تھے، نہیں، دنیا کا کوئی دور، تاریخ کا کوئی ورق، اور زمانہ کا کوئی عہد ان واقعات اور ان کے ان لازمی نتیجوں سے کبھی خالی نہیں رہا ہے، فاعتبروا یا اولی الابصار۔

تاریخ کا یہ کس قدر عبرت ناک انجام ہے، کہ وہ ہٹلر، وہ مسولینی، وہ ہملر، وہ گوئرنگ، وہ گوبلز، جن کے لفظ لفظ کو دنیا تقدیر مبرم سمجھی تھی، جن کے ہر محال دعویٰ کو صرف ان کے کہہ دینے ہی سے ممکن یقین کر لیتی تھی، جن کے رعب و دبدبہ سے زمین کا ہر قطعہ خوف و دہشت سے لرزہ براندام تھا، اور جن کے ایک ایک قدم سے ہر وقت دنیا زیر و زبر ہو رہی تھی، آخر وہ گھڑی آئی کہ بے کسی اور مایوسی نے ان کی ہر امید کا خاتمہ کر دیا، ان میں سے کسی نے اپنے ہاتھ سے آپ اپنا گلا کاٹ لیا، کسی نے زہر کا پیالہ پی لیا، کوئی اپنے دوستوں کی تلواروں سے آپ مارا گیا، اور برلن جو کبھی بابل

کا مینار تھا، آج خاک کے تودوں کے سوا کچھ نہیں۔

یہ تو وہ نقشہ ہے جو لڑائی کے میدانوں میں نظر آیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ سان فرانسسکو کے دلکش ایوانوں اور سینتالیس ملکوں کی شاندار نشست گاہوں میں کیا نظر آتا ہے، گو کہ مستقبل کے چہرے پر بھاری پردہ پڑا ہے، پھر بھی دوربین نگاہوں کو شام کے سبزہ زاروں، ٹریسٹ کے کناروں پولینڈ کی وادیوں، افریقہ کے ریگستانوں، چین اور برما کے بندرگاہوں اور جزائر ہند کے ٹاپوؤں میں ابھی سے آنے والی شکلوں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک اشخاص کی طرح قومیں بھی حرص و طمع اور لالچ اور نہ ختم ہونے والی زمین کی بھوک سے آزاد نہ ہوں گی، ایک سان فرانسسکو کیا، سو سان فرانسسکو بھی دنیا میں امن اور چین پیدا نہیں کر سکتے، جرنل اور سپہ سالار اپنی جیت اور ہار کی بازی ختم کر چکے، اب سیاست کے ماہروں اور ڈپلومیسی کے شاطروں کی بساطیں بچھی ہیں، اور تلوار کی الجھی ہوئی قوت کو قلم کی نوک سے کام میں لا رہے ہیں۔

یاد ہوگا کہ جرمن خطرہ کے عہد میں شام اور لبنان کے لوگوں کو فرانس کی منظوری سے اتحادیوں کی طرف سے خود مختاری کی سند عطا ہوئی تھی، ابھی زخموں سے چور فرانس، بستر سے اٹھا بھی نہیں، پھر بھی بستر سے اٹھنے کے ارادہ کے ثبوت میں سب سے پہلا قدم شام و لبنان سے ان کی اس مجبورانہ عطا کی ہوئی خود مختاری کی سند کو چھیننے ہی کی طرف بڑھ رہا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی قوموں کی اخلاقی بیماری اتنی پرانی ہو چکی ہے، کہ موت کے سوا ان کا کوئی دوسرا علاج نہیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں، کہ اقلیت والی قومیں اکثریت کے مقابلہ میں کچھ نہیں کر سکتیں، وہ دیکھیں کہ دنیا کی سب سے چھوٹی، سب سے پراگندہ اور آوارہ قوم یہود نے آج اپنی دولت کی قوت اور تنظیم کی مضبوطی سے دنیا کے سب سے زیادہ آزادی پسند ملک (امریکہ) کے پریسیڈنٹ اور انگلستان کی سب سے زیادہ آزادی دوست پارٹی (لیبر پارٹی) کے نمائندہ کی زبانوں سے اپنے دلی مقصد کا

اظہار کر رہی ہے، اور ان کی مدد سے یہود فلسطین میں اپنے جبروت کا تخت بچھانا چاہتے ہیں، اور اس طرح قرآن پاک کی پیشین گوئی اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ الخ پوری ہو رہی ہے۔

آج عیسائی اور یہودی قوموں نے مسلمانوں کے خلاف جو باہم اتحاد کیا ہے، وہ بھی قرآن پاک ہی کی تصدیق ہے، بعضھم من بعض ۔ مسلمانوں میں جو لوگ ان کی ہر چیز میں نقالی کر کے قوت و عظمت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو قرآن پاک کی ایک اور پیشین گوئی یاد دلانا ہے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ	تم سے یہود اور نصاریٰ اس وقت تک
وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ۔	راضی نہیں ہو سکتے جب تک تم اپنا
(بقرۃ : ۱۴۱)	دین چھوڑ کر ان کی ملت اختیار نہ کرو،

مسلمان زبان سے اس تبدیلی کا انکار کریں گے، لیکن ان کا ظاہر و باطن کیا ان کے زبان حال کا اعتراف نہیں۔

(معارف ماہ جون ۱۹۴۵ء)

(۴)

ہندوستان کے مستقبل کا افق امیدوں سے جھلک رہا ہے، پہلو کوئی ہو مگر انقلاب کا منظر سامنے ہے، سیاسی انتظامات کے تغیر کے ساتھ تعلیمی نظام کا تغیر بھی ضروری ہے، بلکہ سیاسی انتظامات کا خاکہ تو سیاسی رہنماؤں اور انگریز حاکموں کے درمیان ابھی تک مزید گفتگوؤں کا محتاج ہے لیکن تعلیمی خاکہ گورنمنٹ کے مشیر تعلیم کے بغل میں ابھی سے دبا ہے۔

اس خاکہ کی جو اوپری جھلک دکھی گئی ہے، اس سے تو یہی خیال ہوتا ہے، کہ جس طرح حکومت کا پرانا نظام ایسے ہندوستانیوں کی پیداوار اور پرورش میں مصروف تھا، جو گو نسل اور رنگ و روغن کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں مگر دل و دماغ اور ذہنیت کے لحاظ سے انگریز ہوں، اور جو حکومت کے سرکاری دفتروں کے چلانے کے کام میں آئیں، اسی طرح آیندہ تعلیم کا نظام کانگریسی وزارت کے زمانہ کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق ایسا ہوگا، جو دل و دماغ اور ذہنیت کے لحاظ سے

سراسر ہندی اور خالص قومی ہو، اور آیندہ ہندوستان کے متوقع صنعتی انتظامات کے مطابق ہو۔

ہم نے پہلے بھی کہا ہے، اور اب پھر کہتے ہیں، کہ مسلمان وقت سے پہلے طوفان کا اندازہ کریں، اور یہ سمجھ لیں کہ ان کو ایسی تعلیم درکار ہے جس سے مسلمان، مسلمان بھی باقی رہیں، اور اس راہ میں جو غفلت سرکاری مدارس کے پہلے دور میں ان سے ہو چکی ہے، وہ اس آنے والے دور میں نہ ہو، اس کے لیے وقت سے پہلے مسلمانوں کو اپنی تعلیم کا مقصد اور ملکی تعلیم کے ساتھ ساتھ جو ناگزیر ہے اپنی مذہبی تعلیم کے شمول کا بندوبست کرنا ہے۔

تعلیم کی اہمیت بہت بڑی ہے، یہی وہ سانچہ ہے جس میں ملت کے نوجوان افراد ڈھل کر نکلتے ہیں، ان کی ذہنی تربیت، اخلاقی نشو و نما، دماغی استعداد اور قلبی قوت یقین یعنی ساری ذہنیت اسی کے ذریعہ بنائی اور بگاڑی جا سکتی ہے، امت کو جیسے افراد کی ضرورت ہے، وہ انہی کے ذریعہ تیار ہوتے ہیں، اور ہو سکتے ہیں،

خوب سمجھ لیجیے، کہ ہندویت کی طرح اسلامیت کوئی قومیت یا وطنیت نہیں ہے، بلکہ وہ ذہنی یقین اور اعمال و اخلاق کے ایک خاص طریق کا نام ہے، جس کی بقا تعلیم و تربیت کے سوا اور کسی ذریعہ سے ممکن ہی نہیں، اس لیے اس کی بقا کے لیے تعلیم و تربیت کے ایک ایسے خاص نظام کی ضرورت ہے، جو مسلمانوں کو مسلمان رہنے اور بننے میں مدد دے۔

ہم کو خوشی ہے، کہ اس وقت متعدد اصحاب فکر ایسے ہیں، جو اس ضرورت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، اور اس کے لیے اپنی جد و جہد سے تیاری کر رہے ہیں، ڈاکٹر افضال قادری صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مسلم لیگ کے شعبۂ تعلیم کے ماتحت ایسے اصحاب کے مشوروں کو یکجا کر رہے ہیں، اور وہ اپنی کمیٹی کے ارکان کے مشوروں سے ایک اسلامی تعلیمی نظام کا ایسا خاکہ تیار کر رہے ہیں، جو موجودہ جدید علوم و فنون کے ساتھ ساتھ اسلامی ذہنیت کی پرورش کا بھی کفیل ہو۔

موجودہ علماء میں ہمارے فاضل دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی اس لحاظ سے خاص مدح کے قابل ہیں، کہ وہ اس کام کی مشکل کو پوری طرح سمجھتے ہیں، اور اس کا حل نکالنے کی

فکر میں رہتے ہیں، ابھی انھوں نے ہندوستان کے اسلامی نظام تعلیم و تربیت پر ایک ضخیم تالیف شائع کی ہے، اور دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان میں گذشتہ زمانہ میں اس مشکل کو جس طرح حل کیا تھا، وہی اب بھی اس کے حل کا راستہ ہے۔

آئندہ صفحوں میں موصوف کا ایک مقالہ ایسی موضوع پر آپ کے سامنے گذرے گا، جو خاکسار کی اس فرمائش پر لکھا گیا ہے، کہ کم سے کم لفظوں میں وہ اپنے خیالات کو اس طرح یکجا کریں، کہ عام مسلمان بھی ان کو سمجھ سکیں، اور اس کے امکان پر غور کر سکیں، اور ہو سکے تو آئندہ اسلامی نظام تعلیم کی ترتیب میں اس کو پیش نظر رکھا جائے،

مولانا موصوف کا کہنا یہ ہے کہ سرکاری دفتری زبان ہونے کی جو حیثیت آج انگریزی کو حاصل ہے، کل وہی ملک میں فارسی کو حاصل تھی، اور عربی میں یونانی عقلی علوم کو جو درجہ پہلے حاصل تھا، آج جدید انگریزی عقلی علوم اور سائنس کو حاصل ہے، اس لیے جس طرح مسلمانوں نے پہلے اپنے خالص مذہبی علوم فقہ و تفسیر و حدیث کی ایک ایک دو دو کتابوں کے ساتھ فارسی ادبیات اور یونانی عقلی علوم کو پیوند دے کر تمام اہل ملت کے لیے ایک نصاب تعلیم تیار کر لیا تھا، اسی طرح آج بھی ان خالص عربی علوم کی ایک ایک دو دو کتابوں کو ملا کر انگریزی درسیات اور جدید عقلی علوم کا ایک ایسا نصاب بنایا جا سکتا ہے، جو سارے مدارس اور اسکولوں اور کالجوں میں یکساں پڑھایا جائے۔

اس نصاب کے ختم کرنے کے بعد جو لوگ مزید مذہبی علوم میں تحقیقی شان پیدا کرنا چاہیں ان کے لیے تکمیل کا الگ زائد نصاب بنا لیا جائے، اور جو جدید عقلیات اور انگریزی درسیات میں ترقی کرنا چاہیں انکے لیے بھی راستہ تیار رکھا جائے، اس سے ایک طرف قوم میں علماء اور تعلیم یافتوں کی دو رنگی کا خاتمہ ہو جائے گا، دوسری طرف مسلمان نوجوانوں سے مذہبی بے گانگی کا عیب دور ہو جائے گا، اور تیسری طرف علماء کی بے کاری کا خیال باطل ہو جائے گا، اور وہ بھی دوسروں کی طرح اگر چاہیں گے تو دنیا کے کام میں بھی لگ سکیں گے۔

ضرورت ہے کہ اہل نظر حضرات اس تجویز پر غور کریں، اس وقت جمعیۃ علمائے ہند بھی عربی مدارس کے نصاب کی اصلاح کی فکر میں ہے، اور اس کے لیے ایک کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا ہے، اور بعض تجویزیں زیر غور ہیں، اس لیے یہ وقت اس تجویز پر غور کرنے کے لیے بہت مناسب ہے،

ہندوستان میں عربی کتابوں کی اشاعت کا کام بہت محدود ہو کر رہ گیا ہے، ایک لے دے کر دائرۃ المعارف ہے، وہ بھی ان دنوں جنگ کی مشکلات میں گرفتار ہے، اس سلسلہ میں بہار کے ایک شایق علم نے یہ جرأت کی ہے، کہ قدیم عربی کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لیے ایک نیا ادارہ قائم کریں، چنانچہ انہوں نے اس کام کے لیے پہلا قدم یہ اٹھایا ہے کہ امام بیہقی کی کتاب معرفۃ السنن والآثار کے چھاپنے کا اہتمام کیا ہے، اور اس کا پہلا حصہ (۱۶۰) صفحوں میں نواقض وضو تک پتھر پر چھاپا ہے، اور خریداری کے لیے اہل شوق کے سامنے پیش کیا ہے، یہ مسائل فقہیہ کی فقہ الحدیث کی حیثیت سے دائرۃ المعارف ہے، امید ہے کہ علم کے شایق، کتب خانوں کے ناظم اور عربی مدرسوں کے مدرسین اس کو خرید کر ناشر کی ہمت بڑھائیں گے، پتہ: شفیق احمد محلہ سکونت کلاں، بہار شریف، ضلع پٹنہ (معارف ماہ جولائی سنہ ۱۹۴۵ء)

(۵)

شملہ کانفرنس کا حسرت ناک انجام سب کے سامنے ہے، فریقین میں سے ہر ایک دوسرے کو اس کی ناکامی کا ملزم ٹھہرا رہا ہے، مگر غور سے دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا، کہ اس کانفرنس کی تعمیر ہی میں خرابی کی ایک صورت مضمر تھی، اور وہ یہ کہ ان مسلمانوں کے انتخاب کا اختیار کس کو ہوگا، یہ ایک ایسا سوال تھا، جو اول ہی دہلہ میں سامنے آنا تھا، اس کا جواب سوچے بغیر جو بزم رچائی گئی اس کی برہمی کی پیشین گوئی کوئی بڑی مشکل نہ تھی، اس لیے ہز اکسلنسی وائسرائے لارڈ ویول کا یہ ارشاد کہ اس کانفرنس کی ناکامی کے وہی ذمہ دار ہیں، تواضع کی بنا پر نہیں، بلکہ واقعہ ہے اور اس تماشے سے مقصود شملہ کی بلندی سے دنیا کو اہل ہند کے باہمی اختلافات کی داستانوں کو سارے عالم میں پھیلانا تھا، اور یہ مقصود حاصل ہو کر رہا۔

لیبر پارٹی کی کامیابی سے ہندوستانی اہل سیاست کچھ مسرور سے نظر آتے ہیں، کتنے احباب نے مزدور لیڈروں کو خوشی اور مبارکباد کے تار بھیجے ہیں، لیکن کیا لیبر پارٹی کا وہ زمانہ یاد نہیں رہا، جب ریمزے میکڈانلڈ صاحب کی وزارت میں مزدور حکومت برسر اقتدار آئی تھی، اس وقت بھی بہت سی امیدیں بندھی تھیں، مگر کیا وہ ایک ایک کر کے آخر ٹوٹ نہیں گئیں، پھر اٹیلی صاحب کی وزارت میں اس سے بہتر امیدوں کا خواب دیکھنا ایک ہی حماقت میں دوبارہ گرفتار ہونا ہے، ہم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہمارے حق میں انگلستان کی ہر لیبر پارٹی کنسرویٹو ہے۔

یورپ صرف قوت کے دیوتا کا پجاری ہے، خواہ یہ جنگی ہو، یا مالی، اس لیے عدل و انصاف اور رحم و ترحم اور سوال و دریوزہ گری کے نام سے اس سے کسی قوم کو کچھ نہیں مل سکتا، یہود جو کبھی ذلیل تھے، اور کسی سیاست میں اعتناء کے قابل نہ تھے، ان کی دولت کے چشمہ نے لیبر پارٹی کے سیلاب کے رخ کو بدل دیا ہے، چنانچہ اس کے ایک نمایندہ کا یہ بیان پہلے بھی پڑھا گیا، کہ وہ فلسطین میں یہود کی مدد کریں گے، اور اب دوبارہ پڑھا گیا، کہ اس کی پارٹی فلسطین میں ایک آزاد یہودی ریاست کی تائید میں ہے۔

عرب ریاستوں کی جو متحدہ کوششیں اس وقت نظر آتی ہیں، وہ خود مختار عرب رئیسوں اور امیروں کی ارادی حرکت نہیں، بلکہ گذشتہ برسر اقتدار انگریز پارٹی کے چشم و ابرو کے اشارے کا نتیجہ تھی، اور اس بھید کو خود لیبر پارٹی کے ایک ممبر نے کھول دیا ہے، لیکن اب جب وہ کسی نہ کسی طرح اپنا متحدہ محاذ پیش کر چکے ہیں، تو دیکھنا ہے کہ انگریزی اشارات کے ختم ہونے کے بعد بھی وہ کہاں تک اپنی بات پر جمے رہتے ہیں۔

یہ کھلا ہوا راز ہے کہ نہر سویز انگریزی شہنشاہی کے گلے کی شہ رگ ہے، جس کے کٹنے سے خود شہنشاہی معرض زوال میں آجائے گی، اس لیے اس کی حفاظت انگریزی قوم کی زندگی کا فرض ہے، لیکن مصر کی خود مختاری کے اعتراف کے بعد نہر کی ایک جانب سے اگر ان کا پہرہ اٹھ جائیگا تو لازماً دوسری جانب جو فلسطین کا ملک ہے، پہرے کی چوکی بٹھانی پڑے گی، اور اس کیلئے ایک

ایسے قلیل التعداد باشندوں کی قوم سب سے زیادہ مناسب ہے، جو اپنے وجود کے لیے ہر وقت انگریزوں کی محتاج رہے، اور یہی انگریزی سیاست دانوں کی اصطلاح میں فلسطین میں یہودی آبادی اور یہودی ریاست کے معنی ہیں۔

روسی بالشوازم آہستہ آہستہ جس طرح روسی نیشنلزم کی صورت میں بدل رہا ہے، وہ غور کرنے والے کو نظر آسکتا ہے، اب طنجہ پر بھی نظر ہے، دردانیال کی بھی ضرورت ہے، ایرانی تیل کے چشمے بھی چاہئیں، اور شاید بعض ایرانی صوبے بھی، اور ٹرکی صوبوں میں سے قارص اور اردھان کے دو صوبے بھی مطلوب ہیں، آخر زار کا قصور بھی اس سے زیادہ کیا تھا، عجب نہیں کہ ان واقعات پر ہماری ملت کے غدار افراد فلسفۂ شکم کے کچھ نئے راز بتا کر ہم کو تسکین دینے کی کوشش کریں گے، تاہم واقعہ، واقعہ ہے، فلسفہ کے اختراع سے واقعہ نہیں بدل سکتا،

نگار کے ملحدانہ مضامین کچھ نئے نہیں ہیں، گو رنگ بدل کر کتنے ہی اسلوب وہ اختیار کرے، اس کا ماخذ اصل کفر ہی ہے، ابھی اس کے مدیر نے اپنے مذہب کا خاکہ کھینچا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا کوئی چیز نہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حساس قلب، مصلح دل و دماغ اور حکیم فطرت انسان تھے، انہوں نے گرد و پیش کی قوموں سے بہت سی عمدہ باتیں سن کر اور ان کو اپنا کر اپنا شاعرانہ دیوان قرآن نام جمع کیا، اب اگر اس میں بقول ٹسڈل دوسری کتابوں سے کچھ لے کر شامل کر دیا گیا ہو، تو اس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات میں کوئی فرق نہیں آسکتا، یہ ہے اس مضمون کا خلاصہ جس کا ماننے والا ظاہر ہے کہ کسی طرح مسلمان نہیں کہلایا جا سکتا ہے، اور جس کا مقصد یہ ہوا کہ ٹسڈل کے ہفوات تمام تر صحیح ہیں، اور مدیر نگار کے عقیدہ کے مطابق ہیں۔

مدیر نگار سے میں نے خط لکھ کر مطالبہ کیا، اور اب بھی کرتا ہوں، کہ ڈاکٹر ٹسڈل کے نام سے جس کتاب کا اشتہار وہ بار بار دے رہا ہے، وہ اس کے صحیح نام اور اس کے مطبع سے جس میں وہ چھپی ہے، اور جو نسخہ اس کے پاس ہے، اس کے سال و مقام طبع سے مطلع کرے، یا

وہ تھوڑی دیر کے لیے دفتر معارف میں بھیج دے، تاکہ یہ معلوم ہو کہ جو ترجمہ اس نے شایع کیا ہے، وہ ٹنڈل کی کسی کتاب کا ترجمہ ہے بھی یا نہیں، یا اسی پرانے ینابیع القرآن کا دوسرا اڈیشن ہے، جس کو مدیر نگار کی جودت قلم نے خود گھڑ کر تیار کیا ہے، اور اس کے لیے هَلْ مِنْ مُّبَارِزٍ کا نعرہ بار بار لگ رہا ہے۔

اعتراض کا یہ اچھا طریق ہے، کہ آپ باایں ہمہ جہل و نادانی اپنے دفتر میں چودھری بن کر بیٹھیں، اور علماء سے جواب کا مطالبہ کریں، اور جو جواب وہ دیں، اس میں سے کسی کو ناقص اور کسی کو غیر تشفی بخش کہکر استہزا کریں، گویا حافظ نے یہ شعر اسی دن کے لیے کہا تھا،

نگار ما کہ بہ مکتب رفت و خط نہ نوشت
بہ یک نگاہ ادب آموز صد مدرس شد

اس طرح تو کسی سوال کا کوئی جواب ہی نہیں ہو سکتا، معترض کا کام کتنا آسان ہے، کہ لوگ اس کو جواب دیتے جائیں، اور وہ سب سن کر آخر میں یہ کہدے کہ تسلی نہیں ہوئی، ایسے ہی لوگوں کے باب میں قرآن پاک کا یہ فتویٰ ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ"۔

مدیر نگار نے اس مضمون مذکور میں اپنے اسلام کی جو حقیقت بیان کی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے، کہ یہ وہ مذہب ہے جس کو عرب کے مصلح حکیم نے زمانہ کے حالات کو دیکھ کر بنایا ہے، اور اپنے ان تجربات کے تاثرات کو قرآن میں اپنے لفظوں میں ادا کیا ہے، خدا کا عقیدہ، قیامت اور جنت و دوزخ وغیرہ کے عقائد برائے بیت ہیں، عبادات وغیرہ رسوم ہیں، اصل میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کردار کو دیکھنا چاہیے اور وہی عین اسلام ہے۔ لیکن کیا ایسے شخص کا کردار سراہنے کے قابل ہو سکتا ہے، جو عمر بھر یہ جھوٹ بولتا رہا ہو کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا ہے، اور فرشتوں کے ذریعہ خدا کا پیغام اس کے پاس آتا ہے، اور جو کچھ وہ کہتا ہے وہ خدا کی بولی ہے، حالانکہ وہ ساری اسی کی بنائی ہوئی ہے، اور اس کی اپنی ایجاد ہے، مگر لوگوں کو سمجھانے اور منوانے کیلئے

وہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے، اس سے زیادہ شدید الزام کسی پاک ہستی پر اور کیا ہو سکتا ہے، مدیر نگار نے اتنے پیچ و خم سے جو بات کہی ہے، وہ نئی نہیں ہے، ہر زمانہ کے زنادقہ یہی کہتے آئے ہیں، کہ انبیاء علیہم السلام نے عوام کی بھلائی کے لیے یہ جھوٹ گھڑ کر پھیلایا ہے۔

گویا مذہب اک دروغ مصلحت آمیز ہے۔

باطنیہ اسی خیال کو تاویلات فاسدہ کے رنگ میں پیش کرتے ہیں، یہ زمانہ آزادی کا ہے، اس لیے تاویل کے پردہ کی ضرورت بھی نہیں رہی، بے پردہ بات کہدی گئی، اور پھر اس پر بھی اسلام کا دعویٰ ہے۔

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔

ظاہر ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت مسلمانوں پر اس لحاظ سے واجب نہیں ہے، کہ آپ عرب کے حکیم یا انسانیت کے مصلح تھے، بلکہ اس لیے واجب ہے، کہ آپ رسول اللہ ہیں، اور رسول اللہ کا تصور بغیر اس کے کہ اللہ پر ایمان لایا جائے ممکن ہی نہیں ہے۔

(معارف ماہ اگست سنہ ۱۹۴۵ء)

(۶)

الحمد للہ کہ اپنی گذشتہ علالت کے شدید حملہ سے جانبر تو ہو گیا، اور اب جسمانی ضعف بھی باقی نہیں، مگر دل و دماغ ابھی تک کام کے لائق نہیں، اطباء کا مشورہ ہے، کہ اب دماغی کام کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا جائے، گو عمر بھر کی لگی ہوئی عادت کا یک قلم چھوٹ جانا مشکل ہے، تاہم یہ ضرور ہے کہ اب کم سے کم کام کی زحمت اٹھائی جائے، اور جب تک یہ صورت حال باقی ہے، دماغی مشاغل بھی سے پرہیز کیا جائے، اس سلسلہ میں احباب سے درخواست ہے کہ معارف اور علمی استفسارات اور فتاویٰ سے متعلق میرے نام کے بجائے صرف ایڈیٹر معارف کے نام سے، اور فرمائشوں اور شکایتوں کے متعلق مہتمم صاحب دار المصنفین اور دار العلوم ندوہ سے متعلق امور کی نسبت مہتمم صاحب دار العلوم ندوہ لکھنؤ سے خط و کتابت کریں، فتاویٰ کا اہتمام ہمارے یہاں نہیں ہے، ان کے لیے دیوبند، سہارنپور

اور ندوہ لکھنؤ میں خاص انتظامات ہیں، ان کی طرف توجہ فرمائیں۔

آج کل مسلمانوں میں الکشن کا بحران ہے، اس بحران میں جس طرح نامعقول طریقوں سے لوگ اپنی قوت کا اظہار کر رہے ہیں، وہ حد درجہ نامناسب ہے، انتہا یہ ہے کہ اس سلسلہ میں سب وشتم، لعن وطعن اور زدوکوب سے بھی پرہیز نہیں کیا جا رہا ہے، یہ طریق عمل استدلال کی قوت ظاہر کرنے کے بجائے اس کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے، مذہب اور دین کی حمایت کا نام لے کر عوام کو جوش دلانا اور ان سے اپنا کام نکالنا غلط رہنمائی ہے، جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا، ضرورت اس کی ہے کہ مسلمانوں کو ضبط، صبر، ڈسپلن، تنظیم، استقامت، تحمل، برداشت، ایثار، باہمی ہمدردی، عملی وحدت اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی جائے جو سیاست کی جنگ کے سب سے کارگر ہتھیار ہیں، صرف زبانی جوش وخروش، گرما گرم محفلی اور اخباری بحث اور برسر راہ دست وگریباں ہونا، قوم کی طاقت نہیں، ہماری بحثوں کا موضوع، مسائل کا صواب وخطا ہونا چاہیے، نہ کہ اشخاص کے محاسن ومعائب کا اظہار۔

اس جنگ میں یورپ کی اتحادی شہنشاہانہ طاقتوں نے دنیا کو ضعیف وکمزور قوموں کی حفاظت وحمایت کا جو خواب دکھایا تھا، اس کی تعبیر ظاہر ہونی شروع ہو گئی ہے، یعنی اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دوسروں کے بجائے ہماری ہی محکوم وغلام رہیں، فرانس، الجزائر، وتونس، شام، لبنان اور ہند چینی کو پھر سے بزور اپنا غلام بنانے میں مصروف ہے، ڈچ جاوا وغیرہ جزائر میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کے لیے وہاں کے باشندوں سے برسرپیکار ہیں، روس ایران سے آذربیجان اور ترکی سے قارس اور اردھان اور درہ دانیال کا خواہاں ہے، انگریز ہندوستان میں اب بھی اصلاحات کا اپنا وہی پرانا کھیل کھیل رہے ہیں، اور مزدور حکومت وہی کر رہی ہے جو لبرل کنزرویٹو ہمیشہ کرتے رہے ہیں، اور جس کے لیے لیبر پارٹی ان کو مورد الزام ٹھہرایا کرتی تھی، لیکن ان محکوم قوموں کے سینوں میں آزادی کی جو آگ بھڑک اٹھی ہے، وہ خون کے چھینٹوں کے بغیر اب بجھ نہیں سکتی، اب یورپ کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ان کی جابرانہ شہنشاہی کا عہد ختم ہو چکا، اب محکوم قومیں اپنی مرضی کے مطابق جینے کا حق حاصل کر کے رہیں گی۔

یہود اس دنیا میں سب سے بڑی مالی طاقت کے مالک ہیں، امریکہ کے سونے میں ان کے خزانوں کا بڑا حصہ ہے، برطانیہ کو اس جنگ کے اندر اور اب بھی اپنی حالت کی درستی کے لیے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے، اور یہ صرف امریکی یہودی سرمایہ داروں سے حاصل ہو سکتا ہے، اس لیے بالفور کے اعلان سے لیکر ٹرومین کے خط تک جو کچھ فلسطین میں ہو رہا ہے، یا ہوگا، وہ یہودیوں کی سامری طاقت کا کرشمہ ہے، انہوں نے مصر سے نکل کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جس سونے کے بچھڑے کی پوجا کی تھی، وہ آج تک اسی کی پوجا میں مصروف ہیں، ان کے متعلق قرآن پاک کا بیان وَاُشْرِبُ فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْعِجْلَ (اس سونے کے بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں پلادی گئی) آج بھی حرف بحرف صادق ہے، اب دیکھنا ہے کہ امریکہ کی اس سامری طاقت کے آگے برطانی سیاست کا دیو اپنی طاقت کا اظہار کیونکر کرتا ہے۔

کہتے ہیں کہ دنیا بڑی ترقی کر رہی ہے، ہزاروں نئی نئی ایجادیں ہوئیں، اور ہو رہی ہیں، ہزاروں میل کی آوازیں سنی جا رہی ہیں، ہزاروں میل کی صورتیں چلتی پھرتی دکھائی دے رہی ہیں، سمندر کی تہہ میں غوطہ خور کشتیاں دوڑ رہی ہیں، آسمان کی فضا میں ہوائی جہازوں کے قلعے اڑ رہے ہیں، ایٹم گولہ دم کے دم میں میلوں کی آبادی کو خاک سیاہ بنا سکتا ہے، یہ سب کچھ ہوا، لیکن یہ سب تو شیطنت کی ترقی ہوئی، انسانیت کی ترقی کا اس میں کیا حصہ ہے، کیا بڑی قوموں میں انصاف زیادہ آگیا، کیا ظلم و ستم کی حکمرانی اٹھ گئی، کیا کالے گورے کا فرق مٹ گیا، کیا ایشیا اور یورپ کا تفرقہ ختم ہو گیا، کیا مادی طاقت حق کی قوت کے سامنے سرنگوں ہو گئی، کیا شہنشاہانہ حرص و ہوس کا عہد چلا گیا، یہ کچھ بھی نہ ہوا اس نظر سے اب بھی دنیا وہیں ہے، جہاں پہلے تھی، اب بھی ستر لاکھ ڈچ، سات کروڑ جاویوں پر، اور چند کروڑ انگریز چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر اسی طرح حکومت کرنے کو تلے ہوئے ہیں، انسانوں کے اخلاقی معائب بھی وہی ہیں، اور طبائع کے رذائل بھی وہی ہیں۔

یہ صاف نظر آتا ہے کہ جن صوبوں میں اردو زبان، عام زبان نہیں، وہاں اردو زبان میں

اسلام اور مسلمانوں کی جو تحریکیں اور تحریریں چل اور نکل رہی ہیں، ان سے ایک گونہ بے خبری ہی ہے، جیسے مہاراشٹر، گجرات، بنگال اور مدراس وغیرہ، ضرورت ہے کہ وہاں کی مقامی بولیوں میں بھی اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو نئی نئی کتابیں اردو میں نکل رہی ہیں، ان کو ان زبانوں میں ترجمہ کرکے پھیلایا جائے، مجھے جہاں تک علم ہے، ان مقامی بولیوں میں سے اس لحاظ سے گجراتی کا پایہ بہت اونچا ہے، گجراتی مسلمانوں نے اس کا اہتمام کر رکھا ہے، کہ اردو کی مفید کتابوں، رسالوں اور مقالوں کے ترجمے وہ شایع کرتے رہیں، شاید یہی سبب ہے کہ مقامی بولیوں والے صوبوں سے ان میں دینداری کا خیال زیادہ ہے۔

اس لحاظ سے سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت بنگال کے مسلمانوں کی ہے، کہ نہ وہاں کے دیہاتیوں میں اردو کے پڑھنے اور پڑھانے کی تدبیر کی جاتی ہے، اور نہ اردو کی اچھی اچھی کتابوں اور رسالوں اور مضمونوں کے ترجمہ کا خیال ہے، اس لیے بنگال کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ اندھیرا ہے، لیکن ابھی حال میں کلکتہ میں ایک انجمن دارالفلاح بنی ہے، جس کے ناظم اپنے خط میں لکھتے ہیں:

> ”عرض نگار ہوں، کہ انجمن ہذا نے بنگال کے کروروں مسلمانوں کی غیر اسلامی ذہنیت اور ان کے دینی لٹریچر کی بے مائگی کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اردو کی مستند مذہبی تصانیف و تالیفات کا بنگلہ میں ترجمہ یہاں کے عوام اور ذی علم طبقہ کے سامنے کرے، چنانچہ فضل الٰہی سے یہ کام شروع بھی ہو چکا ہے۔“

اس خط کو پڑھکر بڑی خوشی ہوئی، کہ بنگال کے مسلمانوں نے کروٹ لی ہے، اس سلسلہ میں ”رحمت عالم“ کے بنگلہ ترجمہ کی اجازت مانگی گئی تھی، جو دی گئی، اور ان سے ہر ممکن مدد کا وعدہ کیا گیا،

(معارف ماہ نومبر ۱۹۴۵ء)

(۷)

خدا کا شکر ہے کہ راقم الحروف کو مزید صحت حاصل ہو رہی ہے، اور یہ سب محض اللہ تعالیٰ کا فضل

ہے، جو میرے گمان میں دوستوں کی مخلصانہ دعاؤں کا اثر ہے، ان سب احباب کا دلی شکریہ کہ انھوں نے اپنی محبت سے اس خادم کو نوازا، اور اپنی دعاؤں میں اسکو یاد رکھا، فجزاہم اللہ خیرا۔

عجیب بات ہے، کہ لڑائی تو ہوئی عیسائی قوموں میں، مگر اس لڑائی کے خاتمہ پر اس کا خمیازہ مسلمان قوموں کو بھگتنا پڑ رہا ہے، ٹرکی سے ارمنستان کے دو شہر اور ایران سے آذربایجان کا باقی صوبہ روس کو چاہیے، جاوا اور سوماترہ کے مسلمان انگریزی سنگینوں کے زور سے پھر سے ہالینڈ کے تابع بنائے جارہے ہیں، فلسطین میں امریکہ اور انگلینڈ کی مدد سے یہود کی ریاست کا انتظام در پیش ہے، شام اور لبنان میں فرانس پھر سے اپنا قبضہ بٹھانا چاہتا ہے، شمالی افریقہ میں آزادی خواہ عربوں کو قید و بند اور پھانسی کی سزائیں مل رہی ہیں، افریقہ میں نائجیریا کی اسلامی ریاست اصلاحات کے مطالبہ سے بھی محروم بنائی جارہی ہے، اور مصر ابھی تک انگریزی فوجوں سے خالی نہیں ہوا ہے، کیا یہ صورت حال ہر سمجھ دار مسلمان کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی نہیں۔

پچھلے مہینہ کلکتہ میں ایک نئی جمعیۃ علمائے اسلام کی بنیاد پڑی ہے، جہاں تک اس کے مطبوعہ نظام نامہ کا تعلق ہے وہ بڑی اہمیت کا مستحق ہے، اس سے بہت کچھ توقعات قائم کی جاسکتی ہیں، لیکن کاش یہ معلوم ہوتا کہ صرف کوئی ہنگامی محرک تو اس ساری گردش افکار کا محور نہیں ہے۔ ان کاموں کے لیے ضرورت ہے کہ چند جانباز مخلصوں کی جو اس کے نصب العین کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں، اور پیہم سرگرمیوں سے اپنے اپنے وجود کا یقین دلائیں، ورنہ سیاسی تماشوں میں ایسے سوانگ بہت دیکھنے میں آئے ہیں، جمعیت کو ثابت کرنا چاہیے، کہ وہ ایسی نہیں، اور اس سے جو توقعات قائم کی جائیں وہ پوری ہوں گی، اور وہ متبوع ہو کر رہے گی۔ تابع نہیں،

آج کل مسلمان اہل سیاست میں علماء کو برا بھلا کہنے کا عام رواج ہو رہا ہے، اب علمائے جمعیت علمائے اسلام نے ہمت کر کے ان کی تائید میں آواز بلند کی ہے، اور اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ علماء عموماً مسلمانوں کی موجودہ اکثریتی سیاست سے علیحدگی برت رہے ہیں، تو کیا اب

یہ امید کی جائے، کہ ہمارے دوستوں کے گذشتہ طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی ہوگی، کسی قوم کی حالت کا اس سے زیادہ برا منظر اور کیا ہوگا کہ اس کا زیادہ دلچسپ مشغلہ غیبت، بدگوئی اور باہمی طعن وطنز ہو۔

اس زمانہ میں جب الکشن کا بازار گرم ہے، سیاسیات نے قومی اور تعلیمی و علمی اداروں کو بھی اپنے ساتھ الجھالیا ہے، لیکن یہ صورت حال خود ان تعلیمی و علمی اداروں کے لیے موزوں نہیں، یہ ادارے وہ کارخانے ہیں جن کے سپرد قوم کے دماغوں کی تیاری کا کام ہے، اگر گولہ بارود بنانے والے کارخانوں کے مزدور اور جنگی تربیت گاہوں کے معلم بھی فوج میں بھرتی ہو جائیں، تو کیا ایسی قوم جو تقسیم عمل کے اصول سے اس طرح اعراض برت رہی ہو، کبھی لڑائی کے سلسلہ کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھ سکتی ہے،

مجلس دار المصنفین بھی ایک علمی ادارہ ہے اس ادارہ میں بھی طرز سیاست کے لحاظ سے لوگ مختلف الخیال ہیں، تاہم ہمارے ارکان مجلس اس باب میں متحد ہیں، کہ ادارہ کو سیاسیات کے الجھاؤ سے پاک رکھا جائے۔ اور اس کو عملی سرگرمیوں کا بازیچہ نہ بنایا جائے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب مسلمانوں کی اکثریت ایک طرف ہے، خطا وصواب اپنی جگہ پر۔ لیکن اکثریت کی رائے کو آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، خصوصاً اس وقت جب اس میں بعض مصالح اسلامیہ کے پرتو بھی نظر آتا ہو، اور ایسا ہی دوسرا فریق بھی اپنے نظریہ کے متعلق یہی خیال رکھتا ہے، اور فریقین اپنے دلائل پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں،

امسال تاریخ اسلام کے سلسلہ کی ایک نئی جلد اور تیار ہوگئی ہے، انشاء اللہ اس مہینہ کے آخر تک چھپ جائے گی اس جلد پر عباسی تاریخ کا سیاسی حصّہ پورا ہو جائے گا، اور اس کے بعد اس کا علمی و تمدنی حصّہ رہ جائے گا، جو زیر تالیف ہے، اس کے بعد اسپین وافریقہ کی سلطنتوں کی تاریخ کے حصّے شایع ہوں گے

تاریخ سندھ تاریخ ہند کے جو حصے تیار ہیں، ان میں سے تاریخ سندھ اگلے سال کے مطبوعات میں

شامل ہوگی یہ حصہ انشاء اللہ تعالیٰ اس سرزمین کی اسلامی تاریخ سے متعلق بہت سے نئے معلومات پر مشتمل ہوگا۔

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تیسرا حصہ جو معجزات پر ہے، بہت دنوں سے ختم ہوگیا ہے، اس پر نظر ثانی بھی ضروری تھی، بحمد اللہ کہ اس سے فرصت ہوگئی، اور اب کتاب پریس میں ہے، اور اس کی چھپائی کا کام بھی شروع ہوگیا ہے، اسی طرح سیرۃ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے، اور وہ بھی زیر طبع ہے،

زمانہ کے حالات کو مدنظر رکھ کر ضرورت تھی کہ اردو زبان میں فقہی مسائل کی ایک مستند کتاب ترتیب پائے، چنانچہ اس ضرورت کو پیش نظر رکھ کر اس کام کا آغاز کیا گیا، اور اس کی کتاب الطہارۃ تقریباً ڈیڑھ سو صفحوں میں مرتب ہوچکی ہے، خدا کرے کہ یہ سلسلہ پوری احتیاط کے ساتھ انجام کو پہنچے، تو مسلمانوں کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو۔

راقم الحروف اس وقت چند ماہ کے لیے اپنے مرکز دار المصنفین سے دور ہے، اس لیے احباب کے خطوط کے جواب میں تاخیر ہوتی ہے، اور ہوگی، امید ہے کہ احباب اپنی محبت سے اس تکلیف کو برداشت کریں گے، اور معذور سمجھیں گے۔

(معارف ماہ دسمبر ۱۹۴۵ء)

شذرات

بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۶ء تا ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء

(۱)

عیسائی مورخ مسلمانوں پر یہ الزام لگاتے رہے ہیں، کہ انہوں نے تلوار کے زور سے دوسرے مذاہب کو مٹایا ہے، خیر وہ تو عیسائیوں کے بقول تاریکی کا زمانہ تھا، لیکن آج تمدن اور تہذیب اور ترقی کی روشنی میں امریکہ کے سپہ سالار اور جاپان کے مختار مطلق نے اپنے فرمان سے جاپان کے سرکاری مذہب شنتوازم (اسلاف پرستی) کا خاتمہ کر دیا، کہ اب نہ وہ جاپان کا سرکاری مذہب رہے گا، اور نہ اس کے مندروں پر سرکاری خزانے سے کوئی رقم خرچ ہوگی، نہ جاپان کا امپرر اس مذہب کا اعلیٰ عہدہ دار اور بزرگوں کا نمایندہ اور خدا کا مظہر سمجھا جائے گا، اس کو کیا کہا جائے گا، عجب نہیں کہ امریکہ کی تاریخ میں اس واقعہ کا ذکر آزادئ مذہب کے تحت میں درج ہو، اور بتایا جائے کہ امریکہ نے جاپان کو اوہام کی تاریکی اور انسانی پرستش کی ظلمت سے نکال کر اس کے لیے حقیقت کے نور تک پہنچنے کے لیے راستہ صاف کر دیا، لیکن اگر مسلمانوں نے دنیا سے شرک و کفر کو مٹانے کے لیے ایسی ہی مجاہدانہ سرگرمیاں دکھائیں، تو وہ کیوں مورد الزام ہوں۔

بہرحال اس فرمان کے رو سے جاپان میں تمام مذاہب کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے، جو اب تک وہاں بہت سے مذاہب کو حاصل نہ تھے، لیکن ظاہر ہے کہ ان حقوق سے وہی زیادہ فائدہ اٹھائیں گے، جن کے ہاتھوں میں تلوار بھی ہے۔ گویا اس عموم کے تحت میں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، عیسائی مشنریوں کو جو وہاں سپاہیوں کے جھرمٹ سے الگ صلح و امان کے نام سے کام کر رہی ہیں، اصل میں فائدہ پہنچانا مقصود ہے۔ افسوس کہ اس وقت اسلام غربت کی حالت میں ہے، اور مسلمان غفلت کے خواب میں، چین اور جاوا کے مسلمان جو قرب کی بنا پر اس خدمت کے مستحق تھے، اور کلیۃً سیاسی فکروں میں منہمک ہیں، اور اعلائے دین سے غافل۔

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

اس لحاظ سے اسلامی ملکوں میں بحمد اللہ ہندوستان کی حالت اب بھی غنیمت ہے، کہ دینی تغافل اور سیاسی انہماک کے باوجود یہاں علماء، تعلیم یافتہ اور عوام کی ایک جماعت گو وہ تھوڑی ہی ہو، ایسی موجود ہے، جو دین کی خدمت اور اعلاء کے لیے سرگرمی کے ساتھ مصروف عمل اور عوام کو دین سے مربوط اور تعلیم یافتوں کو مذہب سے آشنا کرنے کے لیے اخلاص کے ساتھ کام کر رہی ہے، جماعت اسلامی کی تحریک، بستی نظام الدین دہلی کی تبلیغ، اور دعوۃ الحق کی تاثیر عوام اور تعلیم یافتہ طبقوں میں پھیل رہی ہے، ممکن ہے کسی کو ان میں سے کسی کے طریق کار سے مخلصانہ اختلاف ہو، تاہم جس حد تک مشترک مقصد کا تعلق ہے، ان کی نیک مساعی کا اعتراف اور ان کی کامیابی کی دعا کرنی چاہئے، اور اختلاف کو کوئی مخالفت کا رنگ نہیں دینا چاہیے، کیونکہ اصل مقصود دین کی خدمت ہے، اشخاص کی بحث نہیں۔

من و تو گر ہلاک شویم چہ باک
غرض اندر میاں سلامت اوست

دعوۃ الحق دعوۃ الحق کی حیثیت مجلسی نہیں ہے، اس کے کام کرنے والے افراد ہیں، یہ ایک دعوت کا خاکہ ہے، جس کو حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ایک زمانہ میں کھینچ کر تیار کیا تھا، اور جس کے مطابق ان کے زمانہ میں کہیں کہیں کام شروع ہوا تھا، اور اب ایک دو سال سے اس کے مطابق بمبئی اور دہلی اور بعض اور مقامات میں کچھ لوگ کام کر رہے ہیں، بمبئی اور دہلی دونوں جگہ اس کے ماتحت مسجدوں میں درس قرآن ہوتا ہے، اور عوام اور تعلیم یافتہ لوگوں تک پہنچ کر دین کے پیام سے ان کو آشنا کیا جاتا ہے، اور ان کے شکوک و شبہات کے گرد و غبار کو دور کر کے دین کے صافی چشمہ تک ان کی رہنمائی کی جاتی ہے۔

گذشتہ سال بمبئی کو دیکھا تھا، امسال ابھی اسی دسمبر ۱۹۴۵ء میں دہلی کی مسجد خواجہ میر دردؒ میں جو کام ہو رہا ہے، اس کو بھی دیکھا، مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی اس کے روح رواں ہیں، یہ مسجد نئی دلی میں گورنمنٹ آف انڈیا کے ملازمین کے کوارٹروں کے پاس واقع ہے، ماشاء اللہ

اس ویرانہ میں پانچوں وقت نماز باجماعت ہوتی ہے، صبح کی نماز میں تین تین صفیں دیکھیں، نماز کے بعد قرآن پاک کا درس اور ضروریات دین کا بیان ہوتا ہے، تعلیم یافتہ اصحاب شوق سے شریک ہوکر اس سے مستفید ہوتے ہیں، اسمبلی ہال کے پاس وسیع و عالی شان جامع مسجد بن کر تیار ہوئی ہے، جس میں نماز پنجگانہ کے علاوہ جمعہ کے روز مولانا موصوف نماز پڑھاتے، خطبہ دیتے، اور دینی مسائل سے حاضرین کو واقف کراتے ہیں، نمازیوں کی کثرت اتنی ہوتی ہے، کہ دو منزلہ مسجد بھر کر بیرون مسجد بھی صفیں قائم ہوتی ہیں، بارک اللہ فیہم وکثرہم۔

مسلم تعلیمی کانفرنس کا اجلاس آگرہ!

دسمبر ۱۹۴۵ء کی آخری تاریخوں میں مسلم تعلیمی کانفرنس کا اجلاس آگرہ میں ہوا، اجلاس کے صدر منتخب نواب زادہ لیاقت علی خاں کا صدارتی خطبہ اس بدلی ہوئی ذہنیت کا پتہ دیتا ہے جو تعلیم یافتہ نوجوانوں میں پیدا ہو رہی ہے، یورپ کی اندھا دھند تقلید اور محض نقالی کے بجائے اب یہ بات ان کے سمجھ میں آنے لگی ہے، کہ مسلمان ایک مستقل ملت ہیں، جس کا نظام تعلیم جب تک اسلامی اساس پر نہ ہوگا، احیائے ملت کا خواب ہمیشہ شرمندۂ تعبیر رہے گا، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس خاکہ کو جو ان کی تقریر میں ابھی تک مبہم ہے، اجاگر کیا جائے، اور ملکی خود مختاری کے ساتھ بلکہ پہلے تعلیمی خود مختاری کی اہمیت کو سمجھا جائے جس سے ملی خود مختاری کی حقیقت مجسم ہوکر سامنے آئے گی۔

عورتوں کی بین الاقوامی کانفرنس!

اواخر دسمبر میں مختلف الاقوام عورتوں کی ایک اہم کانفرنس سندھ میں ہوئی، مسز مہتہ صدر، اور دوسری خواتین کی تقریریں اور تجویزیں اخباروں میں آرہی ہیں، جن میں عورت کی خود مختاری، عورت کے حقوق اور فرائض کے مطالبے پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے غیر معتدل باتوں کو اگر الگ کر دیا جائے تو معلوم ہوگا، کہ آج جو چارٹر عورتیں مانگ رہی ہیں، وہ اسلام نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ہی ان کو عطا کر دیا تھا، ضرورت ہے کہ مسلمان عورتیں ان کی نقالی کے بجائے خود شریعت اسلامیہ میں اپنے حقوق و فرائض کا جائزہ لیں، اور ان کو وہ اپنے اوپر، اور مرد اپنے اوپر عائد

کریں، اور ان پر قائم رہیں،

(معارف ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۶ء)

(۲)

دنیا میں قوموں کی تقسیم عام طور سے نسل، وطن اور زبان کی بنا پر کی جاتی رہی ہے، اسلام سے پہلے بھی یہی تقسیم تھی، اور اب جب کہ اسلام دنیا کی قوت غالبہ نہیں رہی، یہی تقسیم جاری ہے، اور افسوس یہ ہے کہ عیسائی قوموں کی تقلید میں مسلمانوں میں بھی نسل پرستی اور وطن دوستی کا یہی جذبہ کام کر رہا ہے، ٹرکی، مصر، ایران، عراق، شام ہر جگہ اسی اصول پر علٰحدہ علٰحدہ حکومتیں اور ریاستیں بن رہی ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ان حکومتوں کے تحت میں جو بعض چھوٹی چھوٹی قومیں اور قبیلے ہیں، وہ بھی اپنے لیے ایک ایک علٰحدہ ریاست کا مطالبہ کر رہے ہیں، گذشتہ جنگ میں ٹرکی کا شیرازہ بکھرا، اور وہ صرف ترکی نسل کی حکومت ہو کر رہ گئی، اور اب اس جنگ میں ایران کا قومی شیرازہ بکھرتا نظر آتا ہے، آذربانجان اپنی نسل و زبان کی خود مختاری کا علم کھڑا کر چکا ہے، اور اس کے بعد دوسرے قبیلوں کی باری آنے والی ہے، اسی طرح عراق میں کرد اپنی خود مختاری کے لیے بے چین ہیں، حالانکہ ان کا رقبہ ایک چھوٹے سے ضلع کے برابر بھی نہیں۔

غور اس پر کرنا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، بات یہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیروؤں کو اسلامی اخوت، دینی وحدت اور نظام قانون و معاشرت کی جو یک جہتی بخشی تھی، جس سے دریائے سندھ کے کناروں سے لیکر بحر اٹلانٹک تک ایک مسلمان امت بن گئی تھی، اس متحدہ امت کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہ کر سکی، یورپ جو ہمیشہ سے وطنیت و نسلیت کا دلدادہ رہا ہے، اس نے جب اپنی نشأۃ جدیدہ میں اس طاقت کے بل بوتے پر نئی طاقت حاصل کی، تو اپنا مدمقابل دولت عثمانیہ کو پایا، جو گو زوال پذیر ہو رہی تھی، تاہم اس کی متحدہ طاقت باقی تھی، اس میں ترک، عرب افریقی، شامی، مصری، عراقی، کردی، یمنی،

نجدی، حجازی کی کوئی تقسیم نہ تھی، ایک اسلامی مشترکہ دولت تھی، جس میں ہر مسلمان برابر کا حق رکھتا تھا، اور وقت پر لڑائی کے میدان میں نہ صرف ترک بلکہ ہر مسلمان اس کی فوج کا سپاہی تھا۔

دولت عثمانیہ کی اس مشترکہ متحدہ طاقت کے توڑنے کے لیے یورپین مفکرین نے جن میں مسٹر بلنٹ کا نام سب سے نمایاں ہے، بہت بڑا حصہ لیا، اور خود ترکوں اور عربوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ وطنیت پرستی ہی یورپ کی ترقی کا راز ہے، اس کو اختیار کرنا شروع کیا، اور اس کے نتیجہ کے طور پر گذشتہ جنگ میں اس مشترکہ دولت عثمانیہ کا شیرازہ کھل گیا، اور ایک دولت اسلامیہ ٹوٹکر چھوٹی چھوٹی آٹھ دس ریاستیں بن گئیں، پھر ایک ٹرکی کے سوا باقی سب صیاد کے جال میں آ گئیں۔

ایک اور نقطۂ نظر سے بھی مسلمان قوموں کو اس صورت حال پر غور کرنا چاہیے، یہ زمانہ تعدادی تفوق کا ہے، مسلمانوں کا کوئی ملک ہندوستان، روس، جزائر ہند، اور چین کے سوا تعدادی تفوق ہی نہیں رکھتا، ترکی سلطنت کی آبادی ڈیڑھ کرور، مصر کی ایک کرور، ایران، افغانستان اور کل عرب ملکر سب کی ایک ایک ہی کرور آبادی کم و بیش ہوگی، مراکش کی تعداد پچاس ساٹھ لاکھ، الجزائر اور ٹیونس کی تعداد بھی دس دس پندرہ پندرہ لاکھ ہوگی، ہندوستان کی نو کرور کی اسلامی تعداد بتیس ۳۲ کرور میں، اور چین کے چار کرور مسلمان چالیس کرور انسانوں میں مخلوط، اور روس کے چار کرور کاشغر سے لیکر کریمیا تک، روسیوں کے پنجہ میں گرفتار، جزائر ہند کا سانحہ ابھی آپ کے سامنے ہے، کہ تعدادی تفوق کے باوجود اس کو تنہا ڈچوں کا نہیں بلکہ انگریزوں کا بھی مقابلہ کرنا ہے، اور اس کا کوئی مددگار نہیں۔

اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کو آپ دیکھیں گے کہ ان کی متعدد قومیں تعدادی لحاظ سے ایسی اہمیت رکھتی ہیں، کہ وہ چاہیں تو وطنی و نسلی بنیادوں پر اپنے وجود کو قائم رکھ سکتی ہیں انگریز چھ کرور، فرانس چار کرور، جرمنی آٹھ کرور، روس اٹھارہ کرور، اور ان کے

سہارے ان کی چھوٹی چھوٹی قومیں، چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قابض ہیں، ابھی ان کے سامنے چالیس لاکھ ڈچ چار کروڑ جاوی مسلمانوں کو انگریز سپاہیوں کی مدد سے زیر کر رہے ہیں، پہلے بھی آپ نے دیکھا تھا کہ ریف کا امیر عبدالکریم چند لاکھ مسلمانوں کے ساتھ جب اسپین کے قبضہ سے اپنے ملک کو نکال رہا تھا، تو فرانس نے اپنی فوجی طاقت سے اس کی کوششوں کو خاک میں ملادیا، گویا یہ طے کر لیا گیا ہے کہ یورپ کی قوموں کے سوا دنیا کی کسی اور قوم کو مستقل حکومت کا حق حاصل نہیں ہے۔

اب ہم کو اس پر غور کرنا ہے کہ کم تعداد کی قومیں کسطرح دنیا میں زندہ رہ سکتی ہیں، اس کی صورت صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ نسلی و وطنی قومیتوں کے گھروندے سے نکل کر وہ اپنی ایک نظامی وحدت قائم کریں، اسلام نے مختلف قوموں کی جو وحدت قائم کی تھی، وہ اسی اصول پر تھی، اس نے عرب و ترک و تاتار و ایران و سندھ و عراق و شام و مصر کو ملا کر ایک ایسے نظام وحدت میں بدل دیا تھا جس کا ذہنی تصور جس کا نام عقیدہ ہے، ایک ہو گیا، ان کا نظام دین، نظام اقتصاد و معیشت، نظام قانون و شریعت اور نظام اخلاق و معاشرت ایک تھا، اور اس سارے دارالاسلام میں ساری دنیا کے مسلمانوں کے حقوق یکساں تھے،

آج بھی دیکھیے، کہ روس نے بیسیوں قوموں کو اپنے ایک نظام معیشت میں جیسا کہ اس کا بیان ہے، ایک کر رکھا ہے، انگریزوں نے دولت مشترکہ کا تصور پیش کیا ہے، اور اپنی مملوکات اور نوآبادیوں کو ایک خاص سلسلہ میں منظم کرنا چاہتے ہیں، پھر کیا مسلمان قومیں اپنے لیے اس نظام وحدت سے جس کو لیکر ان کا دین پیدا ہوا ہے، اپنی قوت و طاقت کا نیا شیرازہ نہیں بنا سکتیں، لیکن ظاہر ہے کہ کسی نظام کو قبول کرنے کے لیے اس کے ساتھ دلی عقیدت اور اس کے قیام کے لیے سرفروشی اور اس کی راہ میں جو موانع پیش آئیں ان کو دور کرنے کے لیے پوری ہمت و عزیمت درکار ہے، ہندوستان کے مسلمان اگر اپنے مستقل وجود کی اہمیت کو نہ سمجھیں گے، تو تہند یا تفرنج کے دو عمیق گڈھوں سے جو ان کے سامنے ہیں، ان کا بچ نکلنا مشکل نظر آتا ہے، ع

جرس فریادی دارد کہ بر بندید محملہا،

ہندوستان کے مسلمان دو بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہیں، ایک طرف ہندو اکثریت اور دوسری طرف بیرونی طاقت، ایک جماعت پہلی مصیبت کو اہمیت دیتی ہے، اور دوسری دوسری کو، اور اس پر باہم دست و گریباں ہے، حالانکہ اگر پہلی کے لیے تہند کا خطرہ ہے، تو دوسری کے لیے تفرنج کا، اور مسلمانوں کے لیے دونوں ہی خطرے شدید ہیں، ضرورت ہے کہ جماعتی سیاسیات سے الگ ہو کر ہم اس مسئلہ کی اہمیت پر غور کریں، اور اس کی تدبیر سوچیں، تاکہ ہم ان خطرات سے بچ سکیں، جن میں آج دنیائے اسلام کے اکثر ترقی خواہ ملک گرفتار ہیں،

آج دنیا کی چھوٹی چھوٹی مردہ قومیں اپنی از سر نو مستقل زندگی کے لیے سرگرم عمل ہیں، یہود کی آوارہ گرد قوم آج جان و مال کی قوت پر فلسطین میں سمٹ رہی ہے، اور سن رہے ہیں کہ انڈمان کے جزیرے کو پارسی قوم اپنے لیے پسند کر رہی ہے، تاکہ وہاں اپنے لیے مستقل نظام حیات کا سامان کر کے زردشتی آئین کے سایہ میں اپنی نئی زندگی شروع کرے، ان دونوں واقعوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے عبرت کا سامان موجود ہے۔

(معارف ماہ فروری ۱۹۴۶؁ء)

(۳)

جماعت کی تعمیر صرف جذبات، جوش و خروش اور ہنگاموں سے نہیں ہوتی، بلکہ کسی مقصد کے ساتھ عشق کی سی وابستگی اور اس کے حصول کی راہ میں جان و مال و عزت، ہر چیز کی قربانی کا حوصلہ ہونا چاہیے، اور اس راہ میں موانع کی جو شکلیں پیش آئیں، ان کے ازالہ اور برداشت میں صبر و ضبط اور عزیمت و استقلال اور حصول مقصد کے بعد اس حاصل شدہ مقصد کی بقاء کے لیے اخلاق کی بلندی عیش و آرام کی زندگی سے پرہیز، مال و دولت اور جاہ و عزت کی حرص و محبت سے آزادی و مختلف عناصر کے مختلف افراد کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ اور مقصد کی بقا کو ہر ذاتی منفعت اور ہر شخصی فائدہ مندی سے برتر جاننا اور رکھنا اور اسی کے لیے جینا اسی کے لیے مرنا، جب تک کسی جماعت کے افراد میں اکثریت اور اغلبیت کے ساتھ یہ اوصاف پیدا نہ ہوں گے، اول تو کوئی جماعتی مقصد

حاصل نہیں ہو سکتا، اور ہو بھی جائے تو وہ باقی نہیں رہ سکتا۔

اب ہم کو دیکھنا ہے، کہ آیا ہماری اس وقت کی جماعتوں میں یہ اوصاف پیدا ہیں یا نہیں، اگر نہیں ہیں تو پیدا کرنا چاہیے، اور اگر ہیں تو ان میں مزید ترقی اور پختگی کی فکر کرنی چاہیے، اور ہمارے رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنی مختلف تحریکوں اور تعلیموں میں ان اصولوں کی تعلیم کے سبق دیا کریں، جماعتیں بھی بچوں ہی کی خاصیتیں رکھتی ہیں، اور ان کی تعلیم و تربیت کے اصول بھی انہی کے جیسے ہیں۔

اسلام میں بدر کا معرکہ جو ۳۱۳ مسلمانوں کا کارنامہ ہے، ہر وقت پیدا کیا جا سکتا تھا، مگر بدر کے وقوع کے لیے تیرہ[۱۳] برس کے انتظار کی ضرورت پیش آئی اور جب تک ٹھوک بجا کر اور آزمائشوں کی آگ میں تپا کر ان کو دیکھ نہیں لیا گیا، ان کو معرکوں میں نہیں لایا گیا، اس سے اندازہ ہوگا کہ جماعتوں کی تعمیر صرف ضد اور ہٹ، سب و شتم، طعن و طنز، شور و غل اور مختلف نعروں کے بلند کرنے ولولہ انگیز شعر پڑھنے اور محض چیخنے سے نہیں ہوتی، بلکہ مقصد کی بلندی، مقصد سے عشق نما وابستگی ان کے حصول اور بقاء کے لیے اعلیٰ اخلاق، پختہ سیرت اور مضبوط کیرکٹر پیدا کرنا ضروری ہے۔

تاریخ میں اس کی بکثرت مثالیں ہیں، کہ جماعت نے اپنے وحشیانہ جوش اور شجاعت سے کسی مقصد کو حاصل کر لیا، لیکن چونکہ اس کی بقا کے لیے جو اخلاق اور کیریکٹر چاہیے، ان کے نہ ہونے سے وہ مقصد ان کے ہاتھوں سے بہت جلد کھو گیا، ابھی ہندوستان کی تاریخ میں اودھ کی سلطنت، روہیلوں کی ریاست، سکھوں کی شاہی اور مرہٹوں کی پیشوائی میں عبرت کی داستانیں چھپی ہیں۔

اس وقت بھی ہندوستان میں گو بہت سی ایسی ریاستیں آپ کو کھڑی نظر آتی ہیں، مگر غور سے دیکھئے کہ ان قدیم یادگاروں کو صرف انگریزوں کی آہنی سلاخوں نے تھام رکھا ہے، ورنہ ان میں سے کے ہیں، جن میں اپنی ریاست کے آپ سنبھالنے کی عزیمت، استقامت اور ہمت باقی ہے، کیا عیش و آرام، حرص و ہوس اور ناز و نعمت کی فراوانی نے ان کو اندر سے بالکل کھوکھلا نہیں بنا رکھا ہے۔

اب جو ہندوستان میں وزارتوں کی حکومتیں قائم ہو رہی ہیں، ان کو بھی دیکھیے کہ اگر ان کے چلانے والوں میں یہ اخلاق کی بلندی اور وسعت اور سیرت کی یہ پختگی اور کیریکٹر کی یہ مضبوطی نہیں، تو یہ انگریزوں کے سہارے چلنے کو چل جائیں مگر ان میں وجود کی ذاتی صلاحیت اور بقا کی اصلی استعداد کبھی پیدا نہ ہوگی۔

کانگریس کی پچھلی منسٹری کے چلانے والوں میں جو کمزوریاں تھیں، ان کے رہتے ہوئے اگر وہ جنگ کے بوجھ سے ٹوٹ نہ جائیں تو بھی از خود ان کو ٹوٹ جانا چاہیے تھا، واقعات کو شہادت اور گواہی کے ساتھ ثابت کرنا تو بہت مشکل ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب یہ شہادت کسی حکومتی نظام کے زیر ہدایت فراہم کی جائے، تو اور بھی مشکل ہے۔ اس لیے ہم حریف اور مقابل بنکر نہیں، بلکہ دوست بن کر کہتے ہیں، کہ افراد کا انتخاب، اعلیٰ کیریکٹر، شریفانہ سیرت، اور بلند اخلاق کی بنا پر کرنا چاہتے ہیں، جن کی نظر میں وسعت، سینہ میں گنجائش، اور ہاتھ میں مضبوطی ہو، جن میں دوستوں کو بھی ان کی غلطی پر پکڑنے میں جھجک اور دشمنوں کے ساتھ بھی ان کے بجا مطالبہ کے وقت ضد اور ہٹ نہ پیدا ہو، جو صرف اپنے اور اپنے خاندان اور اپنے دوستوں کی شکم سیری کے سامان نہ ہوں، بلکہ ان کی نیکی اور مہربانی عام خلق کے ساتھ ہو، ان کو صرف اپنے ہی معبد اور مدرسے اور مکتب اور دھرم شالے عزیز نہ ہوں، بلکہ ہر جماعت کے مذہبی، جماعتی، تعلیمی اور مجلسی اداروں کے ساتھ یکساں تعلق ہو، ان کی نظر میں انسانوں کی جانوں کو بچانا، جانوروں کی جانوں کے بچانے سے زیادہ اہم ہو، جن میں کسی سیاسی مسلک کے لیے صرف قربانی ہی کا جذبہ نہ ہو، بلکہ دیانت اور قوت نظم بھی ہو جن میں قوم ہی نہیں، بلکہ خلق کی خدمت کے لیے بھی لگن ہو۔

مسلمانوں کے لیے ان کا معاملہ انتخابات ختم ہونے سے پہلے اور ختم ہونے کے بعد بھی یکساں غور و فکر کا مستحق ہے، کہ ان کا مستقل دینی وجود اس ملک میں کیونکر قائم ہو سکتا ہے، اور اس سرزمین میں جو بقول مولانا حالی اکال الامم (قوموں کو کھا جانے والی) ہے، امت محمدیہ کی حفاظت کا کیا سامان ہوگا، یہاں کے برہمنوں نے اپنی اقلیت کے باوجود ساری قوم کی سرداری اور نیابت کا مرتبہ حاصل کیا ہے، اور دوسری

قوموں کو اپنے جھنڈے کے نیچے کسی نہ کسی گوشہ میں جگہ دے کر ان کو اس طرح بے خبر بناتے رہے، کہ خود ان کو اپنی آپ خبر نہیں رہی، اور پھر ان کو اچھوت، راکشش اور ملیچھ بنا کر ان کی ہستی کو کھو دیا، اس لیے قومیت متحدہ کا تصور نہایت خطرناک ہے، البتہ وطنیت متحدہ میں گنجایش ہے، اس کے حقوق اسلام میں بھی ہیں۔

اس حقیقت کا یہ اظہار آج ہی نہیں ہو رہا ہے، بلکہ ۱۹۳۶ء میں پہلی وزارت اور اسکی تعلیمی اسکیم کے موقع پر بھی "معارف" اور "مدینہ" میں ان اندیشوں کا اظہار میرے قلم سے ہوا ہے، اور اس کے لیے میں نے اپنے بعض دوستوں کو ناراض کیا ہے، اور مجھ سے یہ کہا گیا کہ مسلمان اپنے مستقل دینی وجود کے لیے اپنی تعلیم کا نظام اس طرح قائم کریں، جس طرح یہودیوں نے جرمنی میں کیا ہے، گویا مسلمانوں کی حیثیت ہندوستان میں ویسی ہی ہے، جیسی یہودیوں کی جرمنی میں تھی، جسکا انجام معلوم ہو چکا، غرض مقصد مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے، اور ضرورت ہے کہ مسلمان رہنما اس تنبیہ کا بار بار اعادہ کرتے رہیں تاکہ مسلمان بھی بے خبر ہو کر بتیس ۳۲ کروڑ کی بھیڑ میں اگلوں کی طرح گم نہ ہو جائیں۔

(معارف ماہ مارچ ۱۹۴۶ء)

(۴)

اس وقت دنیا جن منزلوں سے گذر رہی ہے، اس سے صاف ظاہر ہے، کہ دلوں سے امن و اطمینان دور ہو گیا ہے، اور ہر ملک میں انتشار اور پراگندگی برپا ہے۔ یورپ کو چند صدیوں سے مشرق میں جو غلبہ اور استیلا حاصل تھا، اس کی بنیادیں بھی ہل گئی ہیں، اور ہر طرف ملکی خود مختاری اور قومی استقلال کے نعرے لگ رہے ہیں، اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ خود حاکم قوموں کو بھی اپنی نوآبادیوں پر اپنی غاصبانہ حکومت کے طریق سے شرم آنے لگتی ہے، اور وہ چاہتی ہیں کہ اب ان پر ان کی رضامندی کی حکومت کے بجائے اور مادی طاقت کے بجائے صلح و آشتی سے ان سے مادی مراعاتیں حاصل کی جائیں، یہ تاریخ کا ایک اہم دور ہے، اور یہ ہر حکومت کے آخر میں آتا رہتا ہے، اور ایسا ہونا بالکل طبعی ہے۔

اس کے اثرات ہمارے ملک میں بھی نمایاں ہیں، مجرم چھوڑے جا رہے ہیں، روٹھے منائے جا رہے ہیں، جن کو کل باغی کہا جا رہا تھا، آج وہ درباروں میں جگہ پا رہے ہیں، صلح کے شرائط اور دوستی کے آداب طے ہو رہے ہیں، ملکی فرقوں میں لین دین کی بات چیت ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید صدیوں سے اہل مشرق کو جس نعمت کی تلاش تھی، وہ آج ان کے سامنے ہے، لیکن دنیا میں کتنی دفعہ ایسی شکلیں بن بن کر بگڑ چکی ہیں، یا جس چیز کو بادی النظر میں ہم نے نعمت سمجھ کر قبول کیا وہ آزمائش کے بعد صرف دھوکہ ہی ثابت ہوئی۔

ان لوگوں کو جو ہندوستان سے باہر نہیں گیے ہیں، کسی ملک کی آزادی کا پورا تصور نہیں ہو سکتا، اور نہ ان کو اپنی غلامی کی ذلت کی حقیقی تلخی محسوس ہو سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ملک کی آزادی کا جذبہ ان لوگوں میں زیادہ ہے، جو باہر کی ہوا کھا آئے ہیں، اور جن کو آزاد قوموں کی صفوں میں کھڑے ہونے سے بارہا اپنی ذلت و حقارت کے ذاتی تجربے ہو چکے ہیں، اور بار بار اپنی غلامی کے دلدوز طعنے سننے پڑے ہیں، اور ہر قدم پر ان کو بیچارگی اور بے کسی محسوس شکل میں نظر آتی ہے۔

کسی ملک کی آزادی کے لیے سب سے پہلی شرط اس کے باشندوں کا مقصد خاص پر اتفاق و اتحاد ہے، جب تک یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، ان کے اندر وہ طاقت نہیں آسکتی، جس سے وہ دوسری طاقت کے مقابلہ میں اپنی قوت کا ثبوت دے سکیں، اور جب تک اس قوت کا ثبوت نہ پیش کیا جائے گا، اہل ملک کا ہر دعویٰ نامسلم اور ہر قول نامسموع رہے گا۔

سب کو معلوم ہے کہ ملک کی دو بڑی قوموں میں آزادی کے بعد کی منزل میں اختلاف ہے، لیکن واقعی اگر ہم سب کو آزادی محبوب ہے، اور اس کی سچی طلب ہے، تو ضرور ہے کہ ہم اس اختلاف کی خلیج کو جس طرح سے ہو پاٹنے کی کوشش کریں، اقلیت کو اکثریت کی بے اعتنائی بلکہ ظلم کا خطرہ ہے، اور اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک قوم سے چھوٹ کر دوسری قوم کی غلامی میں دیے جا رہے ہیں، ایسی حالت میں اکثریت کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر طور سے اس کو مطمئن کرے،

اور اس کے اعتبار کو حاصل کرے، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو، کہ اس کو اصل مقصد واقعیؐ اس قدر عزیز ہے کہ اس کی خاطر خواہ تھوڑا سا نقصان بھی برداشت کرنے کو تیار رہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے پیش نظر سیاسی انقلاب خواہ کتنا ہی خوش آیند ہو، ان کا اعلیٰ مطمح نظر نہیں بن سکتا، ان کا اصلی مقصد حیات تو اشخاص کا عروج وزوال پارٹیوں کی شکست وریخت، وزارتوں کا عزل ونصب اور زمینوں کا ردوبدل نہیں، بلکہ عقائد واصول کی تصحیح، مقصد حیات کی تعیین اور مسائل زندگی میں اسلامی نظام کی سچی تقلید اور پیروی ہے، اور اس کی برقراری کے لیے دلوں میں سچی تڑپ اور ناقابل سکون اضطراب، غرض ہم کو نئے سرے سے ایک نئی عمارت کا کام کرنا ہے۔

بحمداللہ کہ مسلمان نوجوانوں میں اس حقیقت کا ادراک ہو رہا ہے، اور یہ آواز پہلے کی طرح اب نامانوس نہیں رہی ہے، وہ زمانہ جاچکا، جب ہمارے رہنما یہ کہتے تھے، کہ حرف انگریزوں کی نقالی ہمارے ہر مرض کی دوا ہے، اب انہی بیماروں میں ایسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں، جنہوں نے یہ پوری طرح سمجھ لیا ہے، کہ یہ صحت کا نسخہ نہیں، بلکہ ایک بیماری کی جگہ دوسری بیماری کے بدلنے کی محض تدبیر تھی، چنانچہ بیماری بدل گئی، اور پہلے مرض کا مریض اب دوسرے مرض کا مریض ہے، اور شکر ہے کہ اب مریض نے بھی سمجھ لیا کہ مرض کے تبادلہ کا نام صحت نہیں، چنانچہ اب بہت سے نوجوان اس جراثیم کے گھر سے نکل کر جس کا نام شفا خانہ رکھا گیا تھا، اصلی شفا خانۂ صحت کی طرف لوٹ رہے ہیں، رجوع الی الاسلام یعنی زندگی کے ہر اصول میں اسلام کی طرف بازگشت ہی ہماری ہر بیماری کا علاج ہے۔

حکومت کا خواب دیکھنے والوں کو پہلے اسلام کا خواب دیکھنا چاہیے، کہ اسلام کیا ہے، اس کا نظام کیا ہے، اس کے احکام کیا ہیں، اور اس کے مطابق ہمارے افراد کی زندگی ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو ہمارے اندر وہ انقلاب کیسے پیدا ہو، جو ہم کو ترکستان کی راہ سے ہٹا کر حجاز کی طرف لے جائے جو ہم کو یورپ کی نقالی کے بجائے خود اپنی اصلیت مفقودہ کی تصویر ہم کو دکھا دے، تاکہ ہم خلافت موجودہ کے مستحق ٹھہریں۔

جب تک ہمارا مقصود صرف اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین نہ ہوگا، اور اسی کے لئے

روٹھنا اور بننا، اور مرنا اور جینا نہ ہوگا، ہم اسی طرح ممبریوں اور وزارتوں، لیڈریوں کے لیے آپس میں لڑتے، مرتے اور کٹتے رہیں گے، کیونکہ ہم نے اپنا مقصود، انہی شخصی اعزازات اور اسی جاہ و منصب کے حصول کو بنا رکھا ہے، اور اسی کا نام ہم نے اسلامی ترقی رکھ چھوڑا ہے۔

ضرورت ہے کہ عقائد و عبادات کے ساتھ اسلامی سیاسیات، اسلامی اقتصادیات، اسلامی طریق تجارت، اسلامی اصول مضاربت (یعنی سرمایہ اور مزدوری کے طریق تعاون) اسلامی طریق کاشتکاری، اسلامی طریق کارخانہ داری، کسانوں اور مزدوروں کے اسلامی حقوق، اسلامی لین دین، اور معاملات کے مسائل اور دیگر تمام ضروری امور زندگی کے متعلق خالص اسلامی حل لوگوں کے سامنے رکھا جائے اور اس کے قبول و عمل کی دعوت دی جائے، جس سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہو، اور مسلمان، مسلمان بن کر دنیا میں ظاہر ہوں۔

(معارف ماہ اپریل سنہ ۱۹۴۶ء)

(۵)

احادیث نبویؐ کے ترک اور تنہا قرآن سے ہر شخص کے اجتہاد کے دعویٰ کو تسلیم کر لینے سے امت میں کیا کیا ضلالتیں اور گمراہیاں پیدا ہو سکتی ہیں، ان کا نمونہ پہلے بھی نظر سے گذر چکا ہے، اور اب بھی ہر روز گذر رہا ہے، ایک ایسے ہی محقق صاحب کا ایک قلمی رسالہ نام کے اخفا کے ساتھ میرٹھ سے آیا ہے، جس میں قرآن پاک کی رو سے شراب اور جوے کے جواز کا فتویٰ دیا گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ سب کیوں ہو رہا ہے، اس لیے کہ یورپ کے پھیلائے ہوئے تمدن و معاشرت کو ان کا دل قبول کر چکا ہے، اور اب اس کے لیے جواز کی سند کی تلاش اس لیے ہے، تاکہ ٹھیٹ مسلمان ان کو بدنام نہ کریں، اور وہ اسلام کے ایک فرقہ کا پردہ رکھکر یہ کہہ سکیں:

جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج

یہ بارہا لکھا جا چکا ہے، اور اب پھر عرض ہے، کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو کتاب اور سنت کی جو دو نعمتیں عنایت فرمائی تھیں، ہدایت انہی دونوں کے اندر منحصر ہے، اب جو بھی

ایک کو چھوڑ کر صرف دوسرے پر قناعت کرے گا، وہ یقیناً گمراہ ہوگا، اور وہ ضلالت کی خودکشی سے کبھی بچ نہیں سکتا۔

عام لوگ یورپ کے اس استیلاء کو دیکھ رہے ہیں، جو اس کو مسلمانوں کے جسم پر حاصل ہے، لیکن اہل نظر اس کے اس استیلا کو دیکھ کر متاسف ہیں، جو مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھا گیا ہے، اور عجیب بات ہے، کہ ہم جن ملکوں کو اسلامی کہتے ہیں، اور جہاں کسی طرح کی مسلمانوں کی حکومت قائم ہے، وہاں یہ بلا اور بھی زیادہ محیط ہے، ابھی ہمارے دوست ڈاکٹر ناظم صاحب (محکمۂ آثار قدیمہ لاہور) ایران و عراق کے سفر سے واپس آکر لکھنؤ میں ازراہ محبت ملے، انہوں نے بڑے رنج و غم سے ان دونوں ملکوں کے مسلمانوں اور مسلمان ہوٹلوں کی جو کیفیت بیان کی، وہ ہر مسلمان کے لیے افسوس بلکہ صد ہزار افسوس کا موجب ہے، کہ اب شراب اور خنزیر گویا مسلمانوں کے لیے حرام ہی نہیں، انا للہ۔

ایک زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی مالی پستی کا سبب اسلام میں سود کی حرمت کو قرار دیا جاتا تھا، لیکن جب سے یورپ میں سوشلزم نے پر و بال پیدا کیے، اور سرمایہ داری لعنت سمجھی جانے لگی، تو سود کے متعلق اس کا نقطۂ نظر بھی بدلا، اور اب سود جو کبھی افراط دولت کے لیے ضروری سمجھا جارہا تھا، افراط غربت کا باعث سمجھا جارہا ہے، اور اس حیثیت سے سہو کے متعلق اب اسلام کے فیصلہ کو رحمت قرار دیا جارہا ہے، اور خود مسلمان بھی اپنے مذہب کی اس برتری کو فخر کے ساتھ ظاہر کرنے لگے ہیں، یہی حال دوسرے مسائل کا ہے کہ اس کے حسن و قبح اور جواز اور عدم جواز کے فیصلوں کو یورپ کے فیصلے ماننے اور سمجھنے والے کیا عجب کہ جب ان کے متعلق یورپ کا نقطۂ نظر بدلے وہ بھی اپنے نقطۂ نظر کو بدلنے پر مجبور ہوں، یہ ذہنی غلامی حقیقت میں ان کی جسمانی غلامی سے کہیں بدتر ہے۔

معارف کے پچھلے نمبروں میں دار الحرب کے اندر حربی اور مسلم کے درمیان بعض معاملات فاسدہ کے مسئلہ پر جو متعدد تحریریں شایع ہوئی ہیں، اور آیندہ ہوں گی، ان کا مقصود حنفی مسلک کے ایک مسئلہ کی تحقیق اور تشریح ہے، اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں، کہ سود کو کوئی فریق بھی کسی حیثیت سے نعوذ باللہ جائز اور

حلال سمجھتا ہے، بلکہ یہ مسئلہ حقیقت میں اس بنیاد پر زیر بحث ہے کہ دار الحرب میں چونکہ حربیوں کے اموال مسلمانوں کے لیے معصوم نہیں، اس لیے اگر کوئی حربی اپنا مال اپنی رضامندی سے کسی مسلمان کو کسی ایسے معاملہ کے ذریعہ سے دے جو اسلام میں ناجائز ہے، تو آیا یہ عدم جواز دار الحرب میں بھی قائم رہے گا یا نہیں، یہی نقطۂ نظر ان مباحث کا موضوع ہے۔

ایک دوست لاہور سے لکھتے ہیں:

> "بعض اکابر کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں بہت سے معاملات کی نئی نئی صورتیں پیدا ہو جانے کی وجہ سے ایک جدید فقہ کے مرتب کرنے کی ضرورت ہے، اور مذہبی نظام کو قائم رکھنے اور اس کے اضمحلال کو دور کرنے کے لیے موجودہ زمانہ کا ایک اہم سوال ہے، اس سلسلہ میں اگر کوئی کتاب شایع ہوئی ہو، یا کوئی ادارہ ادھر توجہ کر رہا ہو، تو خاکسار کو اس سے مطلع فرمائیں۔"

جواب میں گذارش ہے کہ افراد کی طرف سے بعض بعض مسائل اور فتووں کے جواب وقتاً فوقتاً شایع ہوتے رہے ہیں، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اپنے حوادث الفتاویٰ میں ایسے بعض مسئلوں کے جواب دیئے ہیں، اور ان کے زیر نظر جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نے کچھ رسالے لکھے ہیں، دار المصنفین نے فقہ کی مفصل و مکمل کتاب کئی جلدوں میں لکھوانے کا ارادہ کیا ہے، جس میں قدیم و جدید سارے مسئلوں کے استیعاب کا ارادہ ہے، بالفعل یہ پہلی جلد کتاب الطہارۃ تک تیار ہو چکی ہے، اب اس کو دیگر اہل نظر کے سامنے پیش کرنا ہے۔

لیکن اصلی صورت یہ ہے کہ جیسا کہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تجویز فرمایا تھا، کہ اہل معاملات پہلے ان جدید معاملات کی ان صورتوں کو جو ان کو پیش آتی ہیں، یکجا کر کے علماء کے سامنے رکھیں، اور علماء ان کے جوابات مرتب فرمائیں، حضرات علماء کو بے تعلقی کے سبب سے جدید معاملات کی خبر نہیں، اور نہ ان کی حقیقت سے پوری واقفیت ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ ان معاملات کی تفصیلات خود اہل معاملہ کھول کر سامنے رکھیں، تاکہ حضرات علماء ان پر غور و فکر کر سکیں۔

عام مسلمانوں کی سہولت کے خیال سے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک خیال ظاہر فرمایا ہے، کہ معاملات میں مختلف ائمہ مجتہدین کے مسائل میں سے اس زمانہ کے مطابق جس میں مسلمانوں کے لیے زیادہ سہولت اور آسانی ہو، اہل ضرورت کو اس کا فتویٰ دیا جائے، چنانچہ اسی اصول پر مظلوم مسلمان عورتوں کے لیے "الحیلۃ الناجزہ" تصنیف فرمائی، جس میں فقہ حنفی کو چھوڑ کر متعدد مسائل میں فقہ مالکی کے مطابق جوابات تحریر فرمائے۔ اور ان صورتوں کو اختیار فرمایا، جن میں مسلمان عورتوں کے لیے زیادہ سہولت نظر آئی، اسی طرح معاملات کے دوسرے مسائل پر بھی نظر کی جا سکتی ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ کام ہر کس و ناکس کے کرنے کا نہیں ہے، بلکہ محقق و دیندار مستند اہل فتویٰ کا ہے، جن کی بصیرت پر علماء اور عام مسلمانوں کو اعتبار ہو۔

(معارف ماہ مئی ۱۹۴۶ء)

(۶)

سیرت عائشہ رضؓ کا تیسرا اڈیشن!

سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا دوبارہ چھپ کر تیار ہو گئی ہے، پہلی دفعہ جب چھپی تھی تو میں یورپ کے سفر میں تھا، دوسری دفعہ بھی نظر ثانی کے بغیر چھپی، اب تیسری دفعہ مولف کی نظر ثانی اور حک و اصلاح کے بعد چھپی ہے، بعض مسائل کی تحقیق، بعض روایات کی تنقید، بعض معلومات کا اضافہ اور کہیں کہیں لفظ و عبارت میں بھی تبدیلی کی گئی ہے، اور امید ہے کہ سابق اڈیشنوں سے یہ زیادہ بہتر ہو۔

الاصابہ فی استدراک عائشہؓ علی الصحابہؓ

کتاب کے آخر میں حافظ سیوطیؒ کا رسالہ "الاصابہ فی استدراک عائشہ علی الصحابہ" بھی ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا گیا ہے، یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جس میں حافظ موصوف نے حدیث کی کتابوں سے ان روایتوں کو یکجا کر دیا ہے، جن میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے بعض صحابہ کی روایتوں پر نقد اور استدراک کیا ہے، گو یہ رسالہ کسی زمانہ میں حیدرآباد میں چھپا تھا، اب ناپید ہے، اور ساتھ ہی وہ نہایت غلط اور مسخ صورت میں چھپا تھا، اب اس کی تصحیح اور احادیث کے مقابلہ اور حواشی کے اضافہ کے ساتھ چھاپا گیا ہے، کتاب سے الگ بھی یہ چھپا ہے، جن صاحبوں کو ضرورت

ہو، وہ تنہا یہ رسالہ بھی منگوا سکتے ہیں۔

(۷)

غبار خاطر

مدت کے بعد اردو ادب شائقین کے سامنے مولانا ابوالکلام آزاد کے قلم کی کوئی تحریر آئی ہے، یہ ان کے ان بیس خطوں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے قلعہ احمد نگر کی چار دیواری میں بیٹھ کر نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو عالم تصور میں مخاطب بنا کر لکھے تھے، اور جو ان کی رہائی کے بعد ایک سالہ مطبوع صورت میں ان کے حوالے کیے گیے، ان خطوں میں مولانا نے کچھ اپنے قید و بند کے احوال، قلعہ کے بعض مناظر، بعض علمی و تاریخی و مذہبی مسائل اور بعض ادبی نکات بیان کیے ہیں، یہ خط اکثر بادہ و ساغر کے بجائے چائے کی پیالی اور فنجان کے دلچسپ کیفیات کی مستی کی تمہید سے شروع ہوتے ہیں، جا بجا اچھے اچھے فارسی شعر برمحل اس طرح سپرد قلم ہوئے ہیں، گویا یہ معلوم ہوتا ہے، کہ یہ شعر اسی موقع کے لیے کہے گیے تھے، اس وصف خاص میں مولانا کا کمال مشہور و معروف ہے، مخاطب تنہا "صدیق مکرم" حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہیں، جن کے ساتھ ان کے چہل سالہ تعلقات محبت ہیں، لیکن بعض ان کے ایسے "صدیق عزیز" بھی زندہ ہیں، جن کو گو دوستی کا دعویٰ نہیں، مگر نیاز مندی کا تو بہر حال ہے، اور جس کی مدت اس چالیس سال کے تعلق سے بھی زیادہ ہے، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ لسان الغیب حافظ نے اس واقعہ کی پیشین گوئی صدیوں پہلے اپنے اس شعر میں فرمادی تھی،

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفان بادہ پیما را

مولانا نے اپنے ان خطوں کے مجموعہ کا نام "غبار خاطر" رکھا ہے، اس میں گل و بلبل اور بادہ و تریاک کی حکایتوں کے پردہ میں، در اصل انھوں نے اپنے سوانح کے بعض گم شدہ اوراق بخط غبار لکھے ہیں، اور بعض ایسے حالات سپرد قلم کیے ہیں، جو اپنی نصف صدی کی قلمی زندگی کے عرصہ میں پہلی دفعہ انہوں نے ظاہر فرمائے ہیں، مثلاً ایران اور لبنان کے سفر کے بعض مشاہدات، ضرورت تھی، کہ موصوف ان سفروں کا سال اور مدت سفر بھی ظاہر فرما دیتے، تاکہ ان کے سوانح نگار ان کی سوانح عمری کے چوکھٹے میں

ان کو مناسب جگہ پر جڑ سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو ذہانت اور حافظہ کی غیر معمولی دولت اور قوت اظہار و بیان کی بے مثال فراوانی عنایت فرمائی ہے، اور یہی ان کے خداداد فضل و کمال کے ایوان کے ستون ہیں، ان کو جو کچھ ملا ہے وہ سراسر عطا و موہبت ہے، سچ ہے:

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جی چاہتا ہے کہ اب جب کہ ہندوستان کی سیاست اپنے سفر کی بہت بڑی منزل طے کر چکی ہے، وہ بھی اپنی زندگی کے سفر کا رخ بدلتے" اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے وہ سرمایہ مہیا کرتے جس کو انہوں نے اپنے سفر کے آغاز میں الہلال کے اوراق میں جمع کرنا شروع کیا تھا، عام مسلمان گو ایک زمانہ سے ان کے طرز سیاست سے منحرف ہیں، لیکن ان کے فضل و کمال کے اب بھی معترف ہیں، اور اسلامی مسائل پر ان کے زور قلم اور قوت بیان کے اب بھی ویسے ہی مشتاق ہیں، اور حقیقت میں انہی کی دعوت تھی، جس نے نوجوان تعلیم یافتوں کو دین کی طرف متوجہ کیا تھا، اور کتاب و سنت کے پیغام سے ان کے کان آشنا ہوئے، اقبال، محمد علی اور ابوالکلام تھوڑے تھوڑے فرق سے ایک ہی منزل رجوع الی الاسلام کے منادی تھے، دو جا چکے اب تیسرے کو اپنے ادھورے کاموں کی تکمیل کا موقع حاصل ہے۔

مولانا اگر جیل سے باہر ہوتے اور سیاسیات کے منہمک مشاغل کے سبب سے امت اسلامیہ کی موجودہ ذہنی رفتار سے غافل نہ ہوتے تو وہ دیکھتے کہ جس تخم کو ۱۹۱۲ء میں انھوں نے بویا تھا، وہ بارآور ہونے کو تیار ہے، اور حزب اللہ کی حقیقت کا مستور چہرہ اب اپنے ظہور کے لیے بے تاب ہے۔

رجوع الی الاسلام کی بعض تحریکیں اس وقت قائم ہیں، اور جس طرح فضا کے تغیر سے موسم کا حال معلوم ہو سکتا ہے، اسی طرح ان تحریکوں کی وسعت رفتار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یاس و قنوط کے بعد اب ابر رحمت کا فیض درافشانی کو آمادہ ہے، ضرورت ہے کہ تھوڑے تھوڑے اختلاف لیے رہنے کے باوجود اصل متفقہ مقصد پر سب متحد رہیں۔

اس سلسلہ میں ابھی ہمارے نوجوان عزیز مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی کتاب "اسلام کے زوال سے

مسلمانوں کو کیا نقصان پہنچا" شایع ہوئی ہے، انھوں نے دل کی دردمندی کے ساتھ زبان کی تاثیر بھی پائی ہے، اس لیے یہ وقت ہے کہ ان کی یہ کتاب زیادہ سے زیادہ پڑھی اور سمجھی جائے، اور اس کے طرز پر احیائے دین کی خدمت شروع کی جائے۔

بمبئی سے ہمارے پاس اصلاحی و تبلیغی دستور العمل کے نام سے ایک پمفلٹ اور بعض اشتہارات آئے ہیں، پراگندہ بیانی کے باوجود جن باتوں کی طرف توجہ کی گئی ہے، وہ درست ہیں، مگر ایک ایسی تحریک کے لیے جس کی دعوت پھیل رہی ہے، کسی نئی مجلس کار کی بالاستقلال بنیاد رکھنے سے بہتر ہے کہ پہلے سے موجود تحریک میں شامل ہوکر قوت عمل کا اظہار کیا جائے، اور تحریک کا سررشتہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو، جن کے علم و عمل پر مسلمانوں کو اعتبار ہو، ہر عامی کا یہ کام نہیں، کہ وہ اپنے لیے ایک نیا راستہ تجویز کرے، اور اپنی ایک نئی دعوت پیش کرے، اس طوائف الملوکی کا نتیجہ خوش آیند نہیں ہوسکتا، امید ہے کہ بمبئی کے مخلص کارکن میرے اس مخلصانہ مشورہ کو قبول فرمائیں گے۔

(معارف ماہ جون ۱۹۴۶ء)

(۷)

ہندوستان میں انگریزوں نے انگریزی تعلیم کو جس غرض سے رواج دیا تھا، اس کو انھوں نے راز نہیں رکھا تھا، بلکہ یہ کہہ دیا تھا کہ اس سے مقصود ایسے ہندوستانیوں کو پیدا کرنا ہے، جو گو نسل اور وطن کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں، مگر دل و دماغ اور مذاق کے اعتبار سے انگریز ہوں، تاکہ انگریزی سلطنت کے خلاف جو باغیانہ خیالات پیدا ہوتے ہیں، وہ یک قلم دور ہو جائیں، چنانچہ شروع شروع میں ایسا ہی ہوا، اور ایسے ہندوستانی پیدا ہوئے جو انگریزوں سے بھی بڑھکر انگریز ثابت ہوئے، انھوں نے مشرقی تہذیب، مشرقی علوم اور مشرقی تعلیم کی ہر طرح مخالفت کی، اور وہ ہر چیز کو یورپ کی نظر سے دیکھنے اور ہر اچھائی برائی کا فیصلہ انگریزی آنکھ سے کرنے لگے،

لیکن کیا عجیب بات ہے کہ وہی چیز جو ہندوستانیوں کے باغیانہ خیالات کے مٹانے کے لیے بنائی گئی تھی، وہی دوسری قسم کے باغیانہ خیالات کی پیدائش کا ذریعہ بھی بن گئی یعنی جب ان ہندوستانی مصنوعی انگریزوں نے یہ دیکھا کہ اپنی تہذیب و تمدن اور دین و مذہب اور قوم و وطن کے قیود سے نکلنے کے بعد بھی وہ ٹینو دیسی

کالا آدمی اور انگریزوں سے بہر حال گھٹیا ہی رہے، تو پہلے انہوں نے برابری اور مساوات کا مطالبہ کیا، اور جب اس میں ناکامی ہوئی، تو جذبہ غم و غصہ اور انتقام کی صورت میں بدل گیا، اور اس سے ہندوستانی قومی اور وطنی تحریکوں کا آغاز ہوا، جو آج سیاسی انجمنوں اور کانفرنسوں، لیگوں اور کانگریسیوں کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں،

ان اصلی اور مصنوعی انگریزوں میں پوری آدھی صدی لڑائی ہوتی رہی، اور آخر ہندوؤں میں گاندھی جی نے اگر مصنوعی انگریز ہندوؤں کے اندر پرانی ہندو تہذیب و تمدن کے زندہ کرنے کا شوق پیدا کر دیا، اور تیس ۳۰ برس کے عرصہ میں یہی مصنوعی انگریز ہندو جو اکثر بڑے بڑے تعلیم یافتہ اور بیرسٹر اور کیمبرج اور آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے یا ہندوستانی یونیورسٹیوں کی پیداوار ہیں، اس تحریک کے علم بردار ہیں، اور اس وقت انگریزی سیاست کے تار و پود کے ادھیڑنے میں لگے ہیں۔

اب ہندوؤں میں جوان سے لے کر بوڑھے تک پراچین ہندو تہذیب، سنسکرت تہذیب، سنسکرت زبان، سنسکرت علوم کے زندہ کرنے میں مصروف ہیں، گاندھی جی کی شام کی پرارتھنا، گرو نانک وغیرہ کی طرح ایک نئی ہندو مذہبی دعوت کی بنیاد ڈال رہی ہے، جس کے اصولوں میں نیشنلزم اور وطنیت دوسرے رنگ میں جگہ پا رہی ہے، اور اب ہر ہندو اپنے ہر رنگ میں اپنی پرانی تہذیب و تمدن کو دوبارہ زندہ اور اپنے بزرگوں کی پرانی بزرگی اور عظمت کو دوبارہ قائم کرنے میں لگا ہوا ہے، اور اس کی خاطر ان کو اپنے ملک میں سیاسی آزادی اور خود مختاری کی ضرورت ہے۔

لیکن یہیں پر اب سوال یہ ہے، کہ اے مسلمان تو کیا چاہتا ہے، کیا حقیقت میں اب ہماری قوم کے مصنوعی انگریزوں میں بھی رجعت پیدا ہوئی ہے، یہ تو سچ ہے کہ ہندوؤں سے تو ان کو اختلاف پیدا ہو گیا ہے، لیکن کیا انگریزوں سے بھی اختلاف پیدا ہو گیا ہے، اور انگریزی تمدن، انگریزی تہذیب، انگریزی لباس، انگریزی معاشرت سے ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہو گئی ہے، اور ان کو بھی اپنے مذہبی علوم، مذہبی معاشرت اور مذہبی تہذیب نہ سہی تو اپنے قومی علوم، قومی زبان، قومی معاشرت اور قومی تعلیم سے محبت پیدا ہوئی ہے؟ اگر ہے تو مبارک، اور اگر نہیں ہے تو افسوس!

کاش مسلمان اگر اپنی ایک غلطی کو محسوس کر لیں تو ہر غلطی کو محسوس کر لیں، اور وہ یہ کہ مسلمان دوسری

قوموں کی طرح نسل و وطن سے نہیں بنے ہیں، بلکہ ان کی بنیاد ذہنی معتقدات زندگی کے بعض اصول اور معاشرت و اقتصاد کے خاص قوانین اور اس خیال پر ہے کہ موجودہ زندگی کا ہر کام آئندہ دوسری زندگی کے بہبود پر مبنی ہے، اصطلاح میں اسی کا نام دین ہے۔

ہمارا دین غیر قوموں کی طرح کسی علم الاصنام، دیومالا اور میتھالوجی پر قائم نہیں ہے، بلکہ وہ اسی دنیاوی زندگی کے ٹھوس معاملات کو احکام الٰہی کے مطابق اور قانون ربانی کے موافق سرانجام دینے کا نام ہے، یہ احکام اور یہ قانون جس طرح اپنے مآخذ کے لحاظ سے الٰہی اور آسمانی ہیں، اپنی حکمتوں اور مصلحتوں کے لحاظ سے سراسر عقلی ہیں۔

عقلی ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں، کہ ہر شخص کی عقل میں ان کی مصلحت کا آجانا ضروری ہے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ ان میں عقلی حکمتیں اور مصلحتیں بھی ہیں، گو ہم میں سے بعض ان کو نہ سمجھ سکیں، جب دنیاوی سلطنتوں کے سارے قوانین کی مصلحتوں اور حکمتوں کا ہر دہقان کی سمجھ میں آجانا ضرور نہیں، تو خدائی احکام کی مصلحتوں اور حکمتوں کا ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آجانا کیوں ضروری ہو۔

بات ذرا آگے بڑھ گئی، پوچھنا تو یہ تھا، کہ انگریزی خط ذہنی سے ہٹ کر ہمارے نوجوان رجعت کر کے کہاں ٹھہرنا چاہتے ہیں، اور اس کے لیے ان کے دلوں میں کیا خیالات برپا ہیں، اور آخر پاکستان اور حکومت میں مساوات اور گروپ بندی وغیرہ کے تحفظات کی ضرورت کیا ہے، اور ہندوؤں کی بنیادی تعلیم سے گھبراہٹ کیوں ہے، یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اگر وہ صرف سلبی ہے یعنی ہندو کی مخالفت تو اس سے مسلمانوں کی زندگی کیسے بنے گی، آیا مسلمان نوجوانوں اور رہنماؤں کے دلوں میں اس کے متعلق کچھ ایجابی اور اثباتی خیالات بھی ہیں یا نہیں۔

مسلمانوں کو اپنے اصول حکومت، اصول اقتصاد، اصول معاشرت، معاملات، قانون، اور احکام کے متعلق یہ سوچنا نہیں ہے، کہ ان کی جگہ پر کیا ہو، کیونکہ اس کے معنی تو یہ ہیں، کہ ان کا دین کیا ہو، بلکہ یہ سوچنا ہے کہ ان کو کس طرح رائج کیا جائے، اور نئی شکلوں کے لیے اسلامی اصول کے مطابق کیا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ (معارف ماہ جولائی ۱۹۴۶ء)

(۸)

آج کل خاکسار بھوپال میں ہے، اور عجب نہیں، کہ یہ اقامت کچھ دراز ہو، واقعہ یہ ہے کہ وسط ہند کے ظلمت کدہ میں یہی ایک اسلامی مرکز ہے، یہاں علم کی مشعل حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کے خاندان سے مولانا عبدالحی صاحب بڈھانویؒ کے صاحبزادے مولانا عبدالقیوم صاحب بڈھانویؒ لائے، اور معرفت کا نور حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے خانوادہ کے چشم و چراغ حضرت شاہ رؤف احمد صاحب مجددیؒ جو حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلویؒ کے خلیفہ تھے، لائے۔ اور بحمد اللہ کہ یہ چراغ اب بھی روشن ہے، پھر منشی جمال الدین خاں مدار المہام اور نواب صدیق حسن خاں کے زمانہ میں عرب و ہند کے بہت سے علماء و فضلاء کا یہاں مجمع تھا، جنکی یاد بھی اب فراموش ہو چکی ہے،

زمانہ کا جو انقلاب عہد انگریزی سے شروع ہوا، اس کے اثرات آخر کار اسلامی ریاستوں میں بھی پہنچے اور انگریزی تعلیم کے سامنے علوم عربی و مشرقی کا زوال دیکھتے دیکھتے آنکھوں کے سامنے ہو گیا، بھوپال جو کبھی علماء اور طلبہ کی منزل مقصود تھا، نئی تعلیم کے فروغ نے اس کو بالکل ماند کر دیا، یہاں تک کہ یہاں کے عربی و مذہبی مدرسے تنزل کی انتہا کو پہنچ گیے، اور درسگاہیں جو کبھی علماء اور طلبہ سے معمور تھیں، ویران ہو گئیں، اور وہ شہر جو کبھی اپنے علمی کارناموں کے سبب سے شہرۂ آفاق تھا اپنے مرتبہ سے گر گیا۔

اعلیٰحضرت فرماں روائے بھوپال حمید اللہ خاں کو سات آٹھ سال سے بھوپال کے اس انحطاط اور تنزل کا احساس ہے، چنانچہ چھ سات برس ہوئے کہ انہوں نے مستند علماء اور اہل تعلیم کی ایک مجلس مقرر کی تھی، جس کی صدارت پر اس ہیچ مدان کو نامزد فرمایا تھا، اس مجلس نے ان مدارس کے لیے نیا نصاب بنایا، اور ان کی اصلاح و تنظیم کے لیے کچھ ضوابط بنائے، دوسرے سال پھر یہ مجلس طلب ہوئی جس میں مقامی اور بیرونی اصحاب علم اسی حقیر کی صدارت میں پھر جمع ہوئے، اور ان

مدارس کے لیے فنون کی تعیین کی، اور ہر فن کے مدرسین کی تعداد مقرر کی، اور ان کی تنخواہ و مصارف کا پورا موازنہ (بجٹ) تیار کیا، یہ موازنہ امسال ریاست کے مالی اور انتظامی اداروں کی بحث و تمحیص اور فرمانروائے بھوپال کی پیشی سے منظور ہوا، اور اس کے لیے چالیس ہزار کی رقم بجٹ میں رکھی گئی،

ایک سال سے زیادہ ہوا، کہ اعلیٰ حضرت نے مجھے یاد فرمایا، اور مجھ سے یہ خواہش کی، کہ ان مدارس کا جو خاکہ میری صدارت میں بنا ہے، میں ہی اس کو عملی صورت میں بھی لاؤں، اور اظہار فرمایا، کہ "میں چاہتا ہوں کہ بھوپال جس طرح پہلے ان علوم کا مرکز تھا، پھر ہو جائے۔" مجھ پر اعلیٰ حضرت کے اس فقرے کا بڑا اثر ہوا، اور میں نے ان کے اس بلند جذبہ کی بڑی قدر کی، اور اسی احساس سے متاثر ہو کر میں نے عرض کیا، کہ گو میری صحت اچھی نہیں؛ اور دار العلوم ندوہ اور دار المصنفین کی ذمہ داریوں سے گراں بار ہوں، تاہم ارشاد والا کے مطابق سال ڈیڑھ سال یہاں رہ کر ان مدارس کی خدمت کروں گا۔

چنانچہ اسی کے مطابق اس سال اپریل ۱۹۴۶ء کے وسط میں مجھے بھوپال آنے کی دعوت دی گئی، لیکن میں اپنی مصروفیتوں کے سبب سے آخر جون میں یہاں پہنچا، اور یکم جولائی سے جو یہاں کے تعلیمی سال کے آغاز کا زمانہ ہے، میں نے اپنا کام شروع کر دیا، اس اثنا میں دار القضاء اور بعض دوسرے صیغے بھی میرے حوالے کیے گئے، جن کا میں گو اہل نہیں، مگر ان کی خدمت کا جذبہ اپنے دل میں پاتا ہوں، اور جی چاہتا ہے کہ ان صیغوں کو جو ریاستوں میں ان کی شان کے مطابق نہیں ہیں، ایسی ترقی دی جائے۔ کہ وہ ریاستوں کے دوسرے ترقی یافتہ صیغوں کے برابر ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں سرکار بھوپال سے تالیف و تصنیف اور مفید کتابوں کی طبع و اشاعت کی غرض سے پانچ سو ماہانہ کی امداد بھی منظور کی گئی ہے، تاکہ اس سے غیر مطبوعہ عربی و فارسی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری کیا جائے، اور مفید اردو کتابوں کی تالیف و اشاعت عمل میں آئے، اور یہ کام بھی میری ہی نگرانی میں دیا گیا، چنانچہ اس کے لیے بعض تجویزیں درپیش ہیں۔

اس سلسلہ میں بے شبہہ کچھ زمانہ تک مجھے بھوپال میں قیام کرنا پڑے گا، لیکن ریاست نے یہ منظور کیا ہے کہ دار العلوم اور دار المصنفین کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لیے سال میں تین چار بار، مجھے لکھنؤ اور اعظم گڈہ آنے جانے کی اجازت رہیگی،

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ،

ہمارے دوست مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی رکن دارالمصنفین نے ہمیشہ میری غیر حاضری کے زمانہ میں دارالمصنفین کی علمی نگرانی کی ہے، چنانچہ میرے سفر یورپ کے زمانہ میں آٹھ ماہ کے قریب اور سفر حجاز کے موقع پر تین ماہ تک دارالمصنفین اور معارف کی نگرانی فرمائی ہے، اور اس وقت بھی جب میں بھوپال میں ہوں، ارکان دارالمصنفین کی خواہش پر انہوں نے اس خدمت کو قبول کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی جزائے خیر دے۔

احباب سے درخواست ہے کہ ان میں سے جو صاحب ذاتی طور سے مجھ سے خط وکتابت کرنا چاہتے ہیں، وہ بھوپال کے پتہ سے کریں، لیکن معارف سے متعلق ہر قسم کی مراسلت صرف اڈیٹر کے نشان سے اعظم گڈھ اور دارالمصنفین سے متعلق مراسلت مہتمم دارالمصنفین اعظم گڈھ کے نام سے کی جائے، اور ان دونوں میں میرا نام نہ لکھا جائے ورنہ تعمیل میں دقت ہوگی۔

دارالمصنفین میں پرانی کتابوں کے ذخیروں کے ختم ہوجانے کے سبب سے ان کی دوبارہ اشاعت کا کام اتنا بڑھ گیا ہے، کہ نئی کتابوں کی اشاعت کا کام التوا میں پڑ رہا ہے، اسی لیے اس بات کی کوشش کی جارہی ہے، کہ مطبع کے سامان کو بڑھایا جائے، چنانچہ نئی مشینوں کی خریداری اور تلاش کا کام جاری ہے، اگر مقصد کے مطابق مشین مل گئی، تو انشاء اللہ نئی کتابوں کی اشاعت کا کام بھی شروع کردیا جائیگا۔

نئے رفقاء دارالمصنفین میں بعض نئے رفقاء کا اضافہ ہوا ہے، گذشتہ سال سے مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی دارالمصنفین کی رفاقت میں ہیں، جن کا مضمون "سرمد" معارف کی پچھلی اشاعت میں نکلا ہے، اور اب مولوی وحید احمد صاحب ندوی اور مولوی وحید الرحمٰن صاحب ندوی کا انتخاب ہوا ہے، یہ دونوں صاحب دارالمصنفین میں آگیے ہیں، اور کتابوں کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔

(معارف ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۶ء)

(۹)

خاکسار تین ماہ کے بعد دارالمصنفین کے کاموں کی دیکھ بھال اور معاینہ کے لیے حسب تجویز سابق

آیا ہوا ہے، اور ایک ہفتہ کے قیام کے بعد بھوپال واپس جائے گا، مجھے اس کے اظہار میں خوشی ہے، کہ بحمد اللہ توقع کے مطابق دار المصنفین کے علمی اور انتظامی کاروبار بدستور سابق چل رہے ہیں، اور نئے رفقا مطالعہ و تحقیق کے کاموں میں مصروف ہیں، اور مراسلت و مکاتبت سے وہ اس حقیر سے اپنے مشورے حاصل کرتے رہے ہیں۔

تاریخ ہند اور تاریخ اسلام کی اکثر جلدیں تیار ہو چکی ہیں، مگر کاغذ اور سامان طباعت کی کمیابی اور پریس میں کاموں کے ہجوم کے سبب سے ان کے چھپنے میں اندیشہ ہے کہ کافی انتظار کرنا پڑے گا۔ دوسرے شہروں اور پریسوں میں بڑی بڑی کتابوں کے چھپنے اور اصلاح سنگی و تصحیح کا انتظام بھی ممکن نہیں، اس لیے دوسری جگہوں پر بھی چھپنے کا انتظام ناممکن نظر آتا ہے، نئی مشینوں کی نایابی کے سبب سے پریس میں بھی اب تک زیر تجویز اضافہ نہ ہو سکا۔

خوشی کی بات ہے کہ دار المصنفین کا سلسلۂ تاریخ اسلام مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہو رہا ہے، انشاء اللہ جب یہ سلسلہ مکمل ہو جائے گا، تو معلوم ہوگا، کہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیر الصحابہؓ کے سلسلوں کی طرح یہ سلسلہ بھی دار المصنفین کی عظیم الشان علمی و مذہبی خدمت ہے۔

دار المصنفین کو علمی حلقوں میں جو فروغ اور استناد حاصل ہے، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ مشرقی و ادبی و تاریخی علوم میں سارے ملک سے اس کی طرف رجوع عام ہے، ڈاکٹریٹ کے مقالوں کے امتحان کی خدمت بھی اس کے سپرد ہوتی ہے، اور ان علوم میں امتحانات کے پرچوں کے ممتحن بھی ہمارے رفقا ہوتے رہتے ہیں۔

پچھلے مہینہ دار المصنفین کے رفقا سے ملنے اور ان کے علمی کاموں میں مشورہ کی خاطر ہماری مجلس کے رکن مولوی عبد الماجد صاحب دریابادی یہاں تشریف لائے، اور تین روز قیام فرما کر ان کے کاموں میں مناسب مشورے دیکر واپس تشریف لے گیے، امید ہے کہ ان کا یہ سلسلۂ فیض آیندہ بھی اسی طرح جاری رہے گا۔

گاندھی جی نے ۱۹۲۰ء میں جو خواب دیکھا تھا، ۱۹۴۶ء میں اس خواب کی تعبیر ان کو مل گئی،

وہی قیدی اور زندانی جو کبھی تختہ دار کے مستحق تھے، آج تخت حکومت پر متمکن ہیں، اور جو کبھی باغی قرار دیئے جاتے تھے، آج انہی کو حکومت کی عنان سپرد کی جا رہی ہے، لیکن یہ تاریخ کا نیا واقعہ نہیں، دنیا میں ہمیشہ یہی ہوا ہے، اور ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا۔

اس کے ساتھ اگر کوئی یہ سمجھ لے کہ اس سے ہندوستان کی سطح میں سیاسی سکون پیدا ہو جائیگا تو وہ سخت غلطی کا ارتکاب کرے گا، دنیا میں نہ کبھی کسی انقلاب سے سب نے موافقت کی ہے، اور نہ اس پر قناعت کی ہے، کانگریس کے پیچھے پیچھے سوشیلزم کا انقلاب اور اس کے پیچھے کمیونزم کا سیلاب آنے والا ہے، جس طرح کانگریس نے سابق حکام سے آزادی چاہی، اور گویا پائی، اسی طرح آیندہ کانگریسی حکام کے مظالم کے نام سے سوشیلسٹ اٹھیں گے، اور سوشیلسٹوں کے مظالم کے خاتمہ کے لیے کمیونسٹوں کا گروہ آگے بڑھے گا۔

مجھے اس موقع پر محمد علی مرحوم کا ایک فقرہ یاد آیا، سنہ ۱۹۲۰ء کے دسمبر میں گاندھی جی جب سوراج دلا رہے تھے، میں نے مرحوم سے کہا کہ مبارک، آپ کی قید و بند کا زمانہ ختم ہو رہا ہے، اب آپ ہی حکمراں ہوں گے، فرمایا مجھے اطمینان کہاں نصیب، اب جو فریق برسر حکومت آئے گا، اس سے لڑنا پڑے گا، اور اب وہ ہم کو قید خانوں میں بھیجا کرے گا، موجودہ سوراج کے عہد میں دوسری سیاسی پارٹیوں سے جو سلوک ہوگا، یا ہونا شروع ہوا ہے، وہ اس پیشین گوئی کی صداقت کی دلیل ہے، اور یہ طبعی ہے،

اس نقطہ پر سب سے اہم مسئلہ ہندو مسلمانوں کی مصالحت اور مفاہمت کا ہے، اس مصالحت و مفاہمت کے بغیر ہندوستان میں سکون پیدا نہیں ہو سکتا، اور نہ ہندوستان یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ کل ہندوستانیوں کی حکومت تھی بلکہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ پہلے انگریزوں کی حکومت تھی، اب کانگریسیوں کی ہے، اور اسکا لازمی نتیجہ ملک میں نئے نئے فتنوں اور فسادوں کا پیدا ہونا ہے۔ چنانچہ اس کا بدترین مظاہرہ کلکتہ، ڈھاکہ، بمبئی، احمد آباد، الٰہ آباد اور آگرہ میں ہوا اور ہو رہا ہے، ہندو ہوں یا مسلمان، اس خونی سیلاب کی رو سے نہ وہ ملک میں کوئی انقلاب کر سکتے

ہیں، نہ کسی اکثریت کو اقلیت سے بدل سکتے ہیں، نہ اس سے مصالحت کی شرطوں میں آسانی پیدا ہو سکتی ہے، بنگال کی لیگی وزارت اور بمبئی کی کانگریسی وزارت کے زمانہ میں ان دونوں صوبوں میں بلووں کا ہونا دونوں ہی کے لیے مشکلات کا باعث ہوا ہے۔

ریڈیو کی زبان سے متعلق نئی حکومت کے عہد میں جو فیصلہ ہوا ہے، اس سے ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے دعویدار خوش ہیں، یعنی یہ کہ خبروں کے علاوہ باقی کی تقریریں یا خالص معیاری ہندی میں ہوں گی، یا خالص معیاری اردو میں، معلوم نہیں ریڈیو کے بعد عدالتوں اور کونسلوں اور اسمبلیوں اور یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں کی زبانوں کے متعلق بھی یہی فیصلہ ہوگا، یا اس سے مختلف ہوگا، اس کے معنی یہ ہیں کہ اس فریق کی جیت ہے، جو ملک میں دو زبانوں کا مطالعہ کرتا ہے، لیکن اس کے اثرات بہت دور تک پہنچتے ہیں، اور ابھی اس پر پوری طرح غور نہیں کیا گیا ہے۔

معارف ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء

شذرات

بابت ماہ جولائی ۱۹۴۸ء تا ماہ نومبر ۱۹۴۸ء

اس دفعہ دار المصنفین ایک مدت کے بعد میرا آنا ہوا، جس کی وجہ سفر کی زحمتوں اور مشکلوں کا وہ سلسلہ ہے، جس نے کمال اتصال کے باوجود ہندوستان کے ایک شہر کو دوسرے شہر سے پہلے سے زیادہ دور بنا دیا ہے، بہرحال دار المصنفین کو آکر میں نے دیکھا اور خوش ہوا، کہ اگرچہ ملک کے اندر جہاں اکثر علمی ادارے بند ہوگیے، یا بند ہونے کے قریب ہوگیے، دار المصنفین زندہ ہے، اور اپنے کاروبار میں بدستور مصروف ہے، رفقا، مطالعہ و تحقیق و تسوید و تحریر میں، اور اہل مطبع طبع و اشاعت کے کاموں میں مشغول ہیں، صرف ایک چیز کام میں تعویق کا سبب بن رہی ہے، اور وہ کاغذ کی کمیابی ہے، تاہم حکومت کے ذمہ داران نظم و نسق کے ذریعہ کارروائی جاری ہے، امید ہو کہ یہ مشکل بھی حل ہو جائیگی۔

بزم تیموریہ بالفعل سیرت نبوی، تاریخ اسلام اور سیر الصحابہ کے سلسلہ کی متعدد جلدیں زیر طبع ہیں، اور نئی کتابوں میں سید صباح الدین عبدالرحمن کی کتاب "بزم تیموریہ" یعنی آل تیمور کا علمی و ادبی تذکرہ چھپ رہا ہے، اس کے چھپ جانے سے اردو کی دلچسپ کتابوں میں ایک نئی کتاب کا اضافہ ہوگا۔

ابھی سفر کی دقتوں کا تذکرہ تھا، حالانکہ ایک پہلو سے دیکھا جائے تو ہوائی ذریعہ سفر نے سفر کی مشکلوں کو کم کرنے میں بڑی مدد دی ہے، ہوائی ڈاک کا انتظام اور ہوائی سفر کا اہتمام اب شہر بہ شہر ہے، لیکن بایں ہمہ جس طرح غلہ اور کپڑا شہر بہ شہر موجود ہونے کے باوجود خلق خدا کھانے اور پہننے کی مشکلوں میں گرفتار ہے، اسی طرح شہر بہ شہر ہوائی جہازوں کی پرواز کے باوجود ڈاک کا سلسلہ درہم اور سفر کی ترتیب برہم ہے، اور کسی اگلے شاعر کا یہ شعر ہر پہلو سے صادق ہے۔

ایں طرفہ تماشا ہیں کہ تشنہ بآب اندر،

جس طرح ریلوں نے مہینوں کے سفر کو دنوں کا بنا دیا ہے۔ ان ہوائی جہازوں نے دنوں کے سفر کو گھنٹوں کا بنا دیا ہے۔ اور یہ "علی جناح استعجال" سفر کا طریق اب منسٹروں اور لیڈروں کے حلقہ سے نکل کر مولویوں تک پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ان ہوائی بساطوں پر نماز کا سوال بھی پیدا ہوا ہے، ہم عصر صدق کے کسی راوی صادق البیان کا خیال ہے کہ بعض علماء نے ان ہوائی جہازوں پر نماز نہ پڑھے جا سکنے کا فتویٰ دیکر بواسطہ خود ہوائی جہازوں کے سفر سے مسلمانوں کو پرہیز کا مشورہ دیا ہے۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ قبل اس کے کہ اس طریق سفر پر علماء کو دسترس حاصل ہو، اس صدی کے سب سے بڑے عالم فقیہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دقت کو پہلے ہی حل فرما چکے ہیں، ان کا فتویٰ "حکم نماز در ہوائی جہاز" ان کی آخری تالیف "بوادر النوادر" (ص ۳۴) میں موجود ہے، جس میں بضرورت جواز کا حکم دیا گیا ہے، باقی جو لوگ زمین ہی پر نماز نہیں پڑھتے ان کے کانوں میں تو پرواز کے وقت ملا اعلیٰ سے یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

تو کار زمیں را نکو ساختی　　　کہ با آسماں نیز پرداختی

ابھی اوپر کی سطریں لکھ کر قلم اپنی عبارت آرائی کے خیال خام پر رقص کر رہا تھا کہ طاؤس کی نظر اپنے پاؤں پر پڑ گئی۔

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست خلق　　　تحسین کنند و او خجل از پائے زشت خویش

وہ طاؤس کا پاؤں کیا تھا، یہ خیال تھا کہ آج اردو اس فصاحت و بلاغت کے دعووں کے ساتھ لکھی جا رہی ہے، کہ کل کیا ہماری اولاد پڑھ اور سمجھ بھی سکے گی یا نہیں، خصوصیت کے ساتھ جب حکومت وقت کے افراد کی زبان سے یہ فقرے ادا ہوتے ہیں، تو سوچنا پڑتا ہے کہ واقعی کیا انہی بزرگوں کے الفاظ میں جو قومیت واحدہ کے مدعی اور قومیت متحدہ کے داعی ہیں، قاصد سے بار بار پوچھنا پڑتا ہے۔

سچ سچ بتا یہ لفظ انہی کی زبان کے ہیں۔

ٹنڈن جی کی قومیت واحدہ کے فلسفہ سے تو مدتوں سے آگاہی ہے، مگر نیک صفات پنت جی کی زبان سے وہ تقریر سن کر جو فیض آباد کے الکشن میں فرمائی ہے، بڑی حیرت ہوئی، اور پرانی عقیدت کے شیشے کو بڑی ٹھیس لگی، جب دولت و اقبال کی بدمستی کا یہ عالم ہو، کہ بڑوں بڑوں کو اپنی زبان پر قابو نہ رہے، تو چھوٹوں کا کیا ذکر ہے، پنت جی سے ذاتی واقفیت کی بنا پر اب بھی وہی حسن عقیدت قائم ہے، اور خیال کرتا ہوں کہ سوشیالسٹوں کے مقابلہ میں کامیابی کے سہل نسخہ کا یہ بھی اسی طرح بضرورت استعمال ہے، جس طرح مسلم لیگی، اور مہاسبھائی مذہبی و قومی تباہی کو کانگریس کی طرز سیاست کا نتیجہ بتا کر کل کانگریس کی مخالفت کرتے تھے، اور آج اسی کو سوشیالسٹوں کے مقابلہ میں کانگریسی رہنما استعمال کر رہے ہیں، اور فریق مخالف کا یہ طنز سن رہے ہیں۔

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند،

پنت جی تو صرف ہندی زبان ہی کے قبول کو قومیت متحدہ کی شرط قرار دیکر رہ جاتے ہیں، لیکن ٹنڈن جی اس کے لیے ہندو کلچر کے قبول کو ضروری سمجھتے ہیں، مگر اس حکم سے پہلے ان کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ کس عہد کے اور کس صوبہ کے ہندو کلچر کے اختیار کرنے پر وہ مسلمانوں کو مجبور کرنا چاہتے ہیں، اور کیا مدراس و بنگال سے لیکر پنجاب تک کے ہندوؤں میں کوئی متحدہ کلچر کا نقشہ ان کے سامنے ہے، کیا پگڑی باندھی جائے یا ننگے سر رہا جائے، پھر پگڑی بھی کیسی پنجابی یا راجپوتی، یا گجراتی یا مرہٹی یا مرواڑی یا میواڑی یا بنگالی یا سر برہنگی اختیار کیجائے، کس دیس کا کھانا کھایا جائے، اور کس دیس کی ہندی بولی جائے۔

میرے خیال میں ٹنڈن جی جلدی کر رہے ہیں، ان کو چاہیے کہ پہلے اپنے ہم خیالوں کو تہذیب و شائستگی کے اعلیٰ درجہ پر پہنچنے دیں، اور ہندی کو علوم و فنون سے معمور زبان بنالیں پھر تو ہندوستان کا ہر باشندہ غالب قوم کی ہم نوائی اور ہم شکلی اور ہم لباسی کو بضرورت زمانہ اور بغرض حصول اعزاز از خود قبول کرے گا، اور اس وقت نہ دعوتوں کی ضرورت ہوگی، اور نہ دعووں کی، اور نہ وعیدوں کی، حسن کو اشتہار کے بغیر عشق کا پیام عبودیت پہنچتا رہتا ہے، انگریزوں نے اپنی

تہذیب و تمدن اور زبان اور کلچر کو جن اصولوں سے پھیلایا، وہی اصول اب دوسرے بھی اختیار کر سکتے ہیں، جن میں نہ زور ہے نہ ظلم ہے، اور مقصد بہمہ وجوہ حاصل ہے۔

لیکن ٹنڈن جی کو مسلمانوں سے پہلے خود اپنی حکومت کو مشورہ دینا چاہیے، کہ وہ نئی دلی کی یورپین کلچر کی عمارتوں، کوٹھیوں، فرنیچروں، دفتروں، قاعدوں، قانونوں، طریقوں، سکریٹریوں، کلرکوں، چپراسیوں، سڑکوں اور سواریوں کو چھوڑ کر بنارس کی گلیوں میں چلی آئے، موٹروں کے بجائے ہمارے منتری رتھوں پر نکلیں، اور ہماری سینا بانوں سے لڑیں۔

ٹنڈن جی کو جاننا چاہیے کہ کسی قوم کا کلچر نہ اس آسانی سے بنتا اور نہ اس آسانی سے بگڑتا ہے، پھر وہ کانگریس جس کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہندو مسلمان، یہودی، عیسائی، پارسی سب کی نمائندہ ہے۔ اس کے کسی لیڈر کا یہ کہنا کہ مسلمان، یہودی، پارسی سب مل کر ہندو کلچر اختیار کریں، اپنے دعویٰ کی آپ تردید ہے، کلچر ایک ترقی پذیر تحریک ہے، وہ کوئی جامد اور ساکن چیز نہیں، ٹنڈن جی کی اس دعوت کے یہ معنی ہیں کہ آج بیسویں صدی عیسوی سے ہٹ کر بکرمی سمت کی ابتدائی صدیوں میں ہم پہنچ جائیں، اور زمانہ کی ہر ترقی کا ساتھ چھوڑ کر ہم عہد تاریک کی خاموش تصویریں بن جائیں، اس دعوت کو نہ مسلمان ہی قبول کر سکتے ہیں، نہ سمجھدار ہندو۔

ہندو کلچر کی بنیاد تو ہندو دھرم شاستر پر ہے، جس کی بنا پر ذاتوں کی تقسیم، چھوت، اچھوت کی تمیز، راج اور ہنر اور پیشہ اور مزدوری کی طبقاتی تقسیم ہے، مجھے ڈر ہے کہ اس شاستر کے زور سے ٹنڈن جی کی تجویز پر راجپوت دلی اور صوبوں کے دارالحکومتوں کا قبضہ چاہیں گے، اور پنڈتوں کو سیاست سے نکال کر پوجا پاٹ اور بکھشا کے پرانے دھندوں میں اور کایستھوں کو ان کے اپنے کاموں پر لگا دیں گے۔ اور اپنے تمام سفیروں کو سمندر پار سے بلوائیں گے، اور اچھوت ادھار اور گاؤں سدھار اور ہریجن کی تعلیم و ترقی کی ہر تجویز کو مٹا دیں گے، کیا اس سے بھی زیادہ کوئی احمقانہ بات ہو سکتی ہے۔

(معارف ماہ جولائی ۱۹۴۸ء)

(۲)

اردو ہندی کا قصہ تو ۱۴ ؍ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ختم ہو چکا، اب ہندی اور ہندوستانی کا قصہ چل رہا ہے، معارف کے پرانے پڑھنے والوں کو معلوم ہے، کہ میں نے سمجھوتہ کے طور پر ہمیشہ ہی ہندوستانی ہی کی تائید کی ہے، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا، کہ ہندوستانی کی تحریک چلانے والا اگر میں اکیلا نہیں، تو اس کے چلانے والوں میں سے ایک میں بھی ہوں۔ آخر ۱۹۴۵ء میں وہ دن بھی آیا، جب گاندھی جی نے بھی اس کو مان لیا، اور انہوں نے وردھا میں اس کے لیے ایک جلسہ بلایا، جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے، اور اس میں ہندوستانی کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کی تجویز سوچی اور مانی گئی۔

اس جلسہ میں بہت سے ہندو اور مسلمانوں نے اپنی اپنی تقریریں کیں، جو ہندوستانی پرچار سبھا کی رپورٹ میں چھپ بھی چکی ہیں اس میں جتنی تقریریں ہوئیں۔ وہ اس انداز پر ہوئیں، کہ جو کوئی جو کچھ کہے اس کو سب ہی سمجھیں، بڑے اچنبھے کی بات یہ ہے، کہ یوپی غالباً پرتاب گڈھ کے ایک نوجوان نے، جن کو لباس سے میں پہلے مسلمان سمجھا، بعد کو وہ ہندو نکلے، اپنی تقریر میں یہاں تک کہا کہ اس وقت یہاں جتنی تقریریں ہوئیں، ان میں پوری پوری ہندوستانی سید سلیمان کی تقریر تھی، حالانکہ میں ہندی نہیں جانتا، مگر بات یہ ہے کہ اردو میں سیدھے اور صاف اور آسان لفظ اتنے ہیں، کہ ان کے سہارے سے اچھی خاصی تقریر کی جا سکتی ہے۔

اس جلسہ میں گاندھی جی نے ٹنڈن جی کو بھی بلایا تھا، مگر وہ حیلہ بہانہ کرتے رہے، اور اخیر تک نہیں آئے اور پھر بعد کو اخباروں میں ہندوستانی سے اپنا اختلاف صاف صاف ظاہر کر دیا، اور اب بھی وہ اسی پر اڑے ہوئے ہیں، ان کے جی کی بات یہ ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے، اس کی بولی بھی وہی ہونی چاہیے، جو ہندوؤں کی ہے، اگر ہم ان کی اس رائے کو مان بھی لیں تو بھی یہ بات نہیں مانی جا سکتی کہ وہ ہندی یعنی سنسکرتی ہندی جس کو وہ ہندوؤں کی بولی بتاتے ہیں، وہ حقیقت میں آج بھی جب ہندی کا اتنا پرچار ہو چکا ہے، کسی صوبہ کے بھی ہندوؤں کی مادری بولی ہے، جب چاہیے

بیچ کے کسی جلسہ اور ملاقات میں اس کا تجربہ کر لیجئے، باقی ہندی کے اخباروں اور کتابوں میں جو بولی لکھی جا رہی ہے، وہ بناوٹ سے چند سال سے لکھی ضرور جا رہی ہے مگر بولی نہیں جاتی۔ معلوم نہیں یہ سنسکرتی ہندی والے ہندوستانی کو کیا سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ اس بولی کا نام ہے جس کو ہم آسان اردو اور آسان ہندی دونوں کہہ سکتے ہیں، اور جس کو ہندو اور مسلمان بول رہے ہیں، ہم نے بھی کبھی کبھی ریڈیو پر گاندھی جی، راجندر پرشاد، جواہر لال، پنڈت پنت، بلکہ پٹیل صاحب کی تقریریں سنی ہیں، ابھی کچھ دنوں پہلے ۲ر اگست کی رات کو پنت جی کی تقریر غلوں اور کپڑوں کے کنٹرول پر سنی، یہ پوری ہندوستانی تھی، جس کو اردو اور ہندی دونوں کے جاننے والے اور دیہات اور شہر دونوں کے رہنے والے برابر سمجھ سکتے تھے، کہیں کہیں ان میں زبردستی سنسکرتی ٹھاٹ کا کوئی لفظ آ جایا کرتا تھا، مگر صاف معلوم ہوتا تھا، کہ یہ آورد ہے آمد نہیں، یعنی اس کو لایا گیا ہے، یہ خود آیا نہیں ہے۔

کانگریس کی پہلی وزارت کے زمانہ میں صوبہ بہار کی وزارت تعلیم نے ملک کے اردو اور ہندی ادیبوں کی ایک کمیٹی بنائی تھی، جو ہندوستانی زبان کی صرف و نحو کے قاعدے لکھے، ڈکشنری تیار کرے، اور علمی اصطلاحوں کو بنائے، یہ کام پٹنہ میں کئی سال تک ہوتا رہا، اور سب کچھ جب بن کر تیار ہو چکا تو حکومت بدل گئی، خیال تھا، کہ اب جب کانگریس کی آزاد حکومت قائم ہو گی پھر اسی بنیاد پر زبان کا سوال طے ہو جائے گا، مگر معلوم ہوا کہ ملک کی آزادی پا کر بعض ناسمجھ اس بنے ہوئے کام کو بھی بگاڑنے میں لگے ہیں، ۹ر جولائی کو بہار کے موجودہ وزیر تعلیم سے ملنا ہوا، جو خود بھی ہمارے ساتھ اس ہندوستانی کمیٹی کے ممبر اور اس کام میں شریک تھے، تو معلوم ہوا کہ سارا معاملہ ابھی تک جیوں کا تیوں ہے، اور ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا ہے، کیا عجب ہے کہ وہ بہار ہی اس اردو ہندی کے سوال کو حل کرے، جہاں پہلی دفعہ یہ جھگڑا انگریزوں نے کھڑا کیا تھا۔

مجھے گذشتہ جولائی کے بیچ میں بہار کے صیغۂ تعلیمات کے بلاوے پر رانچی جانا پڑا، بھوپال سے لکھنؤ، پھر اعظم گڈھ، پھر پٹنہ، اور پٹنہ سے رانچی تک راہ میں ہر جگہ مسافروں سے ملنے

اپنے ہم سفروں سے باتیں کرنے، ٹکٹ لینے، ٹکٹ دینے، سودا کرنے میں ایک ہی بولی سنائی دی، او وہی لوگوں کو بولتے اور سمجھتے سنی، اور دیکھی، جس کا نام ہندوستانی کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا، پھر کیا یہی بولی دفتروں، اسمبلیوں، کونسلوں اور یونیورسٹیوں میں نہیں بولی جا سکتی؟

جولائی کے پرچہ میں ہندو کلچر کی بات میرے قلم سے نکلی تھی، وہ اخباروں میں چھپی اور اس پر کچھ سوال و جواب بھی ہوئے، مگر ابھی تازہ سفروں میں میرے سامنے بعض ایسے منظر گذرے کہ جن سے میری بات کی سچائی کھلی کھلی معلوم ہونے لگی، ابھی تین مہینے ہوئے مجھے اناؤ جانا ہوا، بعض ہندو دوستوں نے اپنے ہاں شام کو چائے پر بلایا، ہندو، مسلمان، عیسائی اور سکھ سب ہی تھے، کرسیوں پر نشست تھی، میزوں پر کھانے کی چیزیں، چائے کی پیالیاں اور شربت کے گلاس تھے، سب مل کر ایک ساتھ کھا رہے تھے، غور سے دیکھا تو کھانے کی چیزوں میں کھانے کے سامان اور برتنوں میں ہندو مسلمان کا کوئی فرق محسوس نہیں ہوا، اتنے میں مغرب کا وقت آگیا، میزبان نے ایک کمرہ بتایا، اس میں کھدر کی صاف سپید چادر بچھی تھی، ہم نے اس پر مغرب کی نماز پڑھی، ہندو نوکر چاکر جو ادھر سے گذرتے، ہم کو نماز پڑھتے دیکھ کر ادب سے پیچھے ہٹ جاتے، یہ دیکھ کر میں تھوڑی دیر کے لیے بھول گیا کہ میں اس وقت کسی مسلمان کے گھر میں ہوں یا ہندو کے۔

رانچی سے چل کر گومو اسٹیشن پر، دہرہ اکسپریس پر بیٹھا، اس ڈبے میں دو تین مدراسی ہندو اور ایک مدراسی رومن کیتھولک پادری اور ایک دو بہار یا یوپی کے ہندو تھے، عجیب تماشا تھا، کہ ان مدراسی ہندوؤں سے لباس میں، بول چال میں، سر کے بالوں میں، ادھر کے ہندوؤں کو کوئی مناسبت نہ تھی، ہم میں آپس میں بات چیت ہو رہی تھی، مگر نہ انہوں نے ہماری اور نہ ہم نے ان کی طرف توجہ کی، کیونکہ وہ نہ ہماری اور نہ ہم ان کی سمجھ سکتے تھے، ان کو دیکھ کر نظر آیا، کہ صوبہ صوبہ کی تہذیب اور کلچر تو الگ الگ ہے، مگر مذہبی عبادات و رسوم یا بعض اور رسمی چیزیں جیسے ہندو لٹیا، اور مسلمان لوٹے کا فرق تو تھا، مگر جتنا اودھ کے ایک ہندو کو اودھ کے ایک مسلمان سے قربت ہے، اتنی اودھ کے ایک ہندو کو مدراس یا بنگال کے ہندو سے نہیں، آپ جب چاہیں اس کو آزما کر دیکھیں۔

اتنے میں جونپور آیا، رمضان کا دن تھا، ایک صاحب آئے، ادھیڑ عمر، تن و توش والے، داڑھی مونچھ صاف، قمیص، شروانی، ڈھیلا پاجامہ، سر پر اسی شروانی کے کپڑے کی کشتی نما ٹوپی، شروانی کے بٹن کھلے ہوئے، چہرہ پر تھوڑی سی بدحواسی، ایک ہاتھ میں بڑے رومال میں دو تین کھانے کی پلیٹیں بندھی ہوئی، جس میں سے پریشانی میں شوربے کا روغن بہہ کر شروانی کے دامن پر ٹپک پڑا تھا، مجھے ذرہ بھی شبہہ نہیں ہوا کہ یہ مسلمان نہیں ہیں، یہی سمجھا کہ مسلمان ہیں، روزہ کا دن ہے، کھانے کا سامان ہے، بات چیت کسی چیز میں فرق محسوس نہیں ہوا، لکھنؤ کے قریب آکر نام سن کر یا کسی اور طریق سے معلوم ہوا کہ ہندو ہیں، اسی سفر میں راجہ عظمت گڈھ (اعظم گڈھ) کے خاندان کے ایک صاحب بھی ساتھ تھے، ملازم نے چاندی کا خاصدان لاکر ان کو دیا، انھوں نے خاصدان، تمباکو کی ڈبیا، اور الائچی سب کے سامنے پیش کی، مدراسیوں کے سوا کہ انھوں نے قبول ہی نہیں کیا، کسی نے لیا اور کسی نے نہیں لیا، اور جس نے نہیں لیا، اور جس نے لیا، سب نے ایک طرح سے آداب کرکے ان کا شکریہ ادا کیا، اب میں سوچ میں پڑ گیا، کہ وہ ہندو کلچر کون سا ہے جس کی ٹنڈن جی مسلمانوں کو دعوت دے رہے ہیں، ان کو تو چاہیے کہ پہلے ہندوؤں ہی کو اپنے فرضی ہندو کلچر کی دعوت دیں۔ (معارف ماہ ستمبر ۱۹۴۸ء)

(۳)

قائد اعظم محمد علی جینا

افسوس ہے کہ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی شب کو قائد اعظم محمد علی جینا کا کراچی میں بہتر برس کی عمر میں انتقال ہوگیا، پاکستان، ہندوستان اور عالم اسلام نے اس حادثہ پر بڑا صدمہ محسوس کیا، دوسرے دن عصر کے وقت کئی لاکھ کے مجمع میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی، اور تدفین عمل میں آئی، عام مسلمانوں میں ان کو جو ہر دلعزیزی حاصل تھی، اس کا اثر یہ ہے کہ ہندوستان اور اکثر اسلامی ملکوں، ریاستوں اور شہروں نے ان کا ماتم کیا، اور ان کے لیے قرآن خوانی اور مغفرت کی دعا کی گئی۔

مرحوم کے سیاسی کارنامے آفتاب کی طرح روشن ہیں، وہ بڑے قانون داں، بڑے مناظر، اور اجتماعیات کے بڑے نبض شناس تھے، اور اپنے پیرووں پر بلا کا اثر رکھتے تھے، ان کی بڑی خصوصیت اپنی

بات پر جم کر دوسروں سے اپنی بات منوانے کی قوت تھی ، انھوں نے اپنی قوت کا مظاہرہ پاکستان کے مطالبہ میں پوری طرح کیا ، اور بالآخر کامیابی حاصل کی ، اور ایک ایسی حکومت قائم کی جس کا دعویٰ ہے کہ وہ اس وقت سب سے بڑی اسلامی حکومت ہے ، اور آبادی کے لحاظ سے اس کا پانچواں درجہ ہے ،

ہندوستان کی سیاست میں مرحوم کا بڑا حصہ ہے ، ۱۹۱۶ء سے لے کر جب لیگ اور کانگریس میں ان کی کوشش سے مشہور پیکٹ ہوا ، ۱۹۴۸ء تک سوائے ان چند سالوں کے جب وہ ترک موالات کی تحریک میں کانگریس سے الگ ہو گئے ، ہمیشہ ایک لیڈر کی حیثیت سے ملک میں ممتاز رہے ، ان کی نسبت ان کے دوست اور دشمن ایک بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں ، کہ وہ نہ کبھی حکومت وقت سے ڈرے ، اور نہ جاہ و منصب کی کوئی حرص و طمع ان کو اپنی جگہ سے ہٹا سکی ۔

مرحوم پاکستان کے بانی اور یہ کہنا چاہیے کہ اس کی کشتی کے تنہا ملاح تھے ، ایسے طوفان حوادث کے موقع پر جب ہر ملک اندرونی خطروں سے گھرا ہوا ہے ، ان کی وفات صدر درجہ افسوسناک ہے ، یہ وہ وقت ہے ، جب پاکستان کے حکمراں اور رہنما صرف اپنی بے لوث خدمت ، مخلصانہ کوشش ، سادہ زندگی ، ایثار ، حب ملت ، عاقبت اندیشی اور ذاتی اغراض سے بلند ہو کر باہمی اتحاد اور باہمی اعتماد سے پورے ضبط و نظم کو قابو میں لا کر اپنی مملکت کو نشو و نما دے سکتے ہیں ، اور تاریخ میں نئے شاندار کارناموں کا اضافہ کر سکتے ہیں ، ورنہ ان کی ذرہ سی غلطی اس نئے ملک کو ایسا سخت صدمہ پہنچائے گی ، جس سے وہ صدیوں تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتا ۔

مرحوم سے میری ذاتی ملاقات کبھی نہیں ہوئی ، البتہ چار دفعہ ان کو دور سے اور ایک دفعہ نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ، پہلی دفعہ میں نے انہیں اس وقت دیکھا جب ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس تھے ، اور وہ پہلی دفعہ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں میں ظاہر ہوئے ، سابق راجہ محمود آباد کی سرکردگی میں لکھنؤ نے ان کا شاندار شاہانہ استقبال کیا تھا ۔

اس کے بعد دوسرے سال بمبئی میں لیگ و کانگریس کے اجلاس ہوئے ، مسلم لیگ کے صدر مظہر الحق مرحوم تھے ، اور جناح صاحب اس اجلاس کے بانی اور داعی تھے ، لیکن مسلم لیگ کا یہ جلسہ

جیساکہ اس وقت سمجھا گیا، انگریزی حکومت کے چند کارندوں کی شرارت سے درہم برہم ہوگیا، یہ مرحوم قائداعظم کے دیکھنے کا دوسرا موقع تھا،

تیسرا موقع یہ آیا کہ سنہ ۱۹۲۱ء میں خلافت کی تحریک کے زمانہ میں محمد علی مرحوم ایڈیٹر کامریڈ کے ساتھ جینا صاحب کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں دونوں لیڈروں میں اس وقت کے مسئلوں پر گفتگو ہوئی، اور جس کا خاتمہ بالآخر ایک دوسرے کی علیحدگی پر ہوا۔

اس کے بعد میں نے انہیں ناگپور کانگریس میں دیکھا، جب ترک موالات کی تجویز کی مخالفت کے لیے وہ کھڑے ہوئے، اور پورے جلسہ کی مخالفت کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑے رہے، اور اس کے بعد وہ کانگریس کے اجلاس بلکہ کانگریس سے نکل گیے، اور پھر اس میں شریک نہیں ہوئے،

سالہاسال کے بعد ابھی دو تین سال ہوئے جامعہ ملیہ کی جوبلی میں انہیں دیکھا، اور انکی تقریریں

پاکستان ایک بات زبان پر آکر رکتی نہیں، کسی کو پسند ہو یا ناپسند ہو، اب یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کا براعظم ایک بار پھر دو مملکتوں میں بٹ گیا، اب ان دونوں مملکتوں کی بقا، ان کے درمیان صلح و آشتی ہی سے ہوسکتی ہے، ان دونوں مملکتوں میں ہزارہا خاندانوں کے لاکھوں افراد بکھر گیے ہیں، ان کی سلامتی ان دونوں مملکتوں کی سلامتی و خیرخواہی ہی میں ہے، اس لیے ان دونوں میں جتنا زیادہ باہمی اتحاد اور اعتماد بڑھے اتنا ہی انسانیت اور دنیا کے امن کے لیے مفید ہے۔

حیدرآباد کا معاملہ جس صورت میں ختم ہوا، اس پر افسوس ہے، یعنی اس سے پہلے فریقین میں مصالحت کی جو تجویزیں جتنی اور جس طرح سے بار بار پیش ہوتی رہیں، اگر ان میں سے کسی ایک تجویز پر بھی فیصلہ ہو جاتا، تو دونوں کے لیے بہتر ہوتا، اور دونوں کی آبرو قائم رہتی، مگر ہندوستان کو معاملہ سلجھانے کے لیے فوج کشی کرنی پڑی، جس سے بقول مسٹر پنڈت "لوگوں کو دنیا میں ہندوستان کے بدنام کرنے کا موقع ہاتھ آیا، اور ادھر حیدرآباد کو زبان خلق سے سوءِ تدبیر اور ناعاقبت اندیشی کا طعنہ سننا پڑا، تاہم حیدرآباد کے اس اخیر فیصلہ پر پورے ہندوستان نے اطمینان کی سانس لی، اور ایک

آئی ہوئی بلا سر سے ٹل گئی، خدا کرے کہ یہ اس ملک کی آخری بلا ہو، اور اب ملک میں امن و امان کا دور ہو

زبان کے معاملہ میں کانگریس کے بعض تنگ نظر ممبروں کی رائے سے مرعوب ہو کر حکومت صوبہ متحدہ کا جلد بازی کا فیصلہ افسوس کے قابل ہے، اس صوبہ میں جو زبان عام و خاص بولتے ہیں، اس کو ہندی اور وہ بھی سنسکرتی ہندی کہنا دن دھاڑے واقعات کا انکار کرنا ہے، اور اس طرح اکثریت کا اقلیت پر جابرانہ حکم نافذ کرنا اس دستور کے خلاف ہے، جس پر نیا ہندوستان اپنی حکومت کی بنیاد قائم کرنا چاہتا ہے، اور اس سمجھوتہ کے خلاف ہے، جو گاندھی جی نے اپنی اخیر زندگی میں برملا ظاہر کیا، ممکن ہے کہ ہماری آواز پر آج کان نہ دھرا جائے، اور ہندوستانی حکومت کے بجائے ہندو حکومت کا خواب دیکھنے والوں کو منانے کے لیے صحیح سیاست و تدبر کا خون کیا جائے۔ لیکن ہندوستان سے زیادہ کس کو یہ معلوم ہے کہ تاریخ کا باب ایک دن میں ختم نہیں ہو جاتا۔ ع

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

کیا عجب ہے کہ کل کانگریس ہی کے اندر سے کوئی طاقت سچائی کی حمایت کے لیے کھڑی ہو جائے۔

(معارف ماہ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

(۴)

ایک غلط راہ

ہندوستان میں ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد اور خصوصاً مشرقی پنجاب اور دہلی کے غیر متوقع واقعات سے مسلمانوں پر ایک حیرت سی چھا گئی ہے، ان کو اپنے لیے ہندوستان کی اس نئی دنیا میں عزت کی کوئی راہ نظر نہیں آتی، بہتیرے دماغ تو سوچنے اور سمجھنے سے معذور ہو گیے ہیں، اور وہ نہیں جانتے، کہ نئے ماحول سے وہ اپنے کو کیسے مطابق کریں، بعضوں نے اب سوچنا شروع کیا، تو ان کو یہ راستہ نظر آتا ہے کہ وہ محکوم ہیں، اور ہندو ان کے حاکم ہو گیے ہیں، اس لیے مسلمانوں کے لیے عزت کی زندگی کا راستہ یہ ہے کہ محکوم قوم حاکم قوم کے ساتھ محکومانہ وفاداری کا تعلق پیدا کرے

اور اس کے علوم و فنون اور زبان کو اپنائے، اور اس کے طور و طریق اور تمدن و تہذیب کو اختیار کرے، چنانچہ اس وقت جو نئے اخبارات نئے پیغاموں کے ساتھ نکلنے لگے ہیں۔ وہ کبھی صراحۃً اور کبھی اشارۃً اس قسم کے خیالات پھیلا رہے ہیں، افسوس کہ یہ مقصد سرتاسر غلط ہے، اور یہ غلط رہنما مسلمانوں کی خودکشی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔

صحیح صورت یہ ہے کہ کانگریس کا اعلان اور حکومت وقت کا منظور کردہ دستور اساسی ظاہر کرتا ہے، کہ ملک ہندوستان اس ملک کے سارے باشندوں کی متحدہ جمہوری حکومت ہے، جس میں اس ملک کی ہر قوم برابر کی شریک و سہیم ہے، البتہ نمایندگی اور تقسیم ملازمت میں قوموں اور فرقوں کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد ہوگی، اور لازماً اس کا نتیجہ یہ نکلے گا، کہ جس قوم کی تعداد بڑی ہوگی، اس کو اکثریت کی قوت حاصل ہوگی، مگر اس کا نتیجہ اقلیت والے گروہ کی محکومی نہیں، بلکہ ہندوستان کے ہر فرقہ اور گروہ اور اہل مذہب کو اپنے دین، تمدن، تہذیب اور طریق معاشرت کی پوری آزادی کا مساویانہ حق حاصل ہے، اور اس وقت تک کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، جب تک وہ اپنی قومیت کے عناصر کی پوری طرح حفاظت نہ کرے، اور اس کے لیے پوری جد و جہد نہ کرے، اور اس راہ میں جانی و مالی خدمت و ایثار کے جذبات سے اپنی خود مختاری کا ثبوت نہ دے۔

جب سے جناح و گاندھی کی بمبئی والی گفتگو میں ایک قومی اور دو قومی نظریہ پیدا ہوا ہے بار بار یہ سوال سامنے آتا ہے، کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں، یا دو قوم، دونوں طرف دو گروہ ہیں، اور ہر قسم کی حقیقت کا سبب ان نظریوں کو بتایا جا رہا ہے، مگر غلطیاں دونوں طرف ہیں،

ایک یا دو قوم کے نظریہ کو زبان پر لانے سے پہلے اس کا فیصلہ کیجئے کہ قوم سے آپ کا مقصود کیا ہے، اگر یہ ہے کہ ایک ملک کے سارے رہنے والے ایک قوم ہیں، تو بلاشبہ اس ملک کے رہنے والے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں، اور اگر اس سے مقصود ان عناصر کی وحدت ہے، جن پر ان دونوں قوموں کے مذہبی و روحی خیالات و جذبات و رجحانات کی بنیاد ہے، تو ہندوستان میں ہندو اور مسلمان

دو ہی قومیں نہیں، بلکہ بیسیوں قومیں ہیں، جس طرح ہندو مذہب، ایک مذہب نہیں، بلکہ بیسیوں مذہبی تصورات اور رسوم کا مجموعہ ہے، اور ہر ایک دوسرے سے الگ ہے، پھر بھی وہ ایک مذہب ہے، اور ان کو ایک قوم سمجھا جاتا ہے، اسی طرح ہندو اور مسلمان اپنے مذہبی عقائد و عبادات اور تمدنی و تہذیبی عناصر میں ایک دوسرے سے ممتاز ہیں، پھر بھی وطنی حیثیت سے ہندوستان کے تمام باشندے ایک قوم ہیں۔

ہندو مہاسبھائی اور بعض کانگریس کے بھیس میں ہندو مہاسبھائی جو یہ خیال کرتے ہیں، کہ ہندوستان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ تمام ہندوستانی قوموں کے امتیازی عناصر و اوصاف کو مٹا کر ایک واحد ہندوستانی قوم بنائیں، وہ بڑی بھول میں ہیں، ہندوستان کی پچھلی تاریخ گواہ ہے، کہ جب جب ہندو قوم کی اس تنگ خیالی نے ظہور کیا ہے، ملک غلامی میں مبتلا ہو گیا ہے، میں نے بمبئی کی تقریر میں پی، ان، اے کے جشن جوبلی میں یہ کہا تھا، کہ ہندوستان سینکڑوں قوموں کے رنگ برنگ کے موتیوں کی مالا ہے، جو لوگ ان کو زبردستی ایک بنانا چاہتے ہیں، وہ ان رنگ برنگ کے بیش قیمت موتیوں کو کوٹ کر ایک سفوف بنانا چاہتے ہیں، یہ سفوف تو تیار ہو سکتا ہے، مگر پھر ان میں سے کسی بڑے یا چھوٹے موتی کی اتنی اعلیٰ قدر و قیمت باقی نہیں رہ سکتی۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے یا بیگانے جو یہ مشورہ دیتے ہیں، کہ وہ اپنی ممتاز ہستی کو خیرباد کہہ کر اکثریت میں مدغم ہو جائیں، وہ مسلمانوں کو خودکشی کی دعوت دے رہے ہیں، میرے نزدیک ملک کے ساتھ پوری وفاداری اور اکثریت کے ساتھ مصالحانہ حسن تعلق رکھنے کے باوجود مسلمان، مسلمان رہ سکتے ہیں، اور مسلمانوں کو مسلمان رہنے کی دعوت دی جا سکتی ہے، اور ان کی امتیازی حیثیت کو باقی رکھا جا سکتا ہے، اور ان کے دین، تہذیب، زبان اور علوم کو جو ان کی اپنی قومیت کے عناصر ہیں، نہ صرف باقی رکھا جا سکتا ہے، بلکہ ان کے باقی رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ اور مسلمان قوم ہندوؤں کے ساتھ وطنی وحدت قائم رکھنے کے باوجود اپنی مذہبی و تہذیبی ہستی کو برقرار رکھ سکتی ہے، ان کو اس ملک میں زندہ رہنے کے لیے یہ تعلیم کیوں دی جائے، کہ اب ہندوستان کی وحدت کے لیے یہ

ضروری ہے، کہ وہ اپنے تمام امتیازی اوصاف و خصائص کو خود چھوڑ دیں، یا ان سے زبردستی چھڑا دیا جائے، جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں، وہ مسلمانوں کو غلط راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں، اور پوری قوم کی قوم کو ہلاک و برباد کرنا چاہتے ہیں،

بے شک ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جو صداقت کے نہیں بلکہ قوت کے پرستار ہیں، جو کل انگریزوں کی طاقت کے عہد میں انگریزی نقالی کو اپنا فخر سمجھتے تھے، آج وہ ہندو اکثریت کی طاقت کے عہد میں ہندو کی نقالی کو اپنا فخر سمجھیں گے، مگر ایسے بہروپیے کبھی اعتبار کے قابل نہیں۔

مسلمانو! اٹھو اور تم اپنے کو ہندوستان کی سلطنت کا حصہ دار سمجھو، اور ملک کی وفاداری اور اہل ملک سے دوستی کے ساتھ اپنے مذہبی و تہذیبی امتیازات کے قیام و تحفظ و بقا کے لیے مردانہ وار جدوجہد کرو، اور اسی کو اپنی زندگی کا راز سمجھو۔ ع

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق۔

(معارف ماہ نومبر سنہ ۱۹۳۶ء)

شذرات

ماہ مئی و جون ۱۹۵۰ء

(۱)

بھوپال سے واپسی ساڑھے تین برس کے بعد میں بھوپال سے رخصت ہو کر واپس آیا، ابھی تو تین ماہ کی رخصت میں نے لی ہے، مگر امید یہی ہے کہ اب پھر واپسی نہ ہوگی، لیکن ابھی یہ طے نہیں کیا ہے، کہ زندگی کے باقی دن کہاں اور کس طرح گذارے جائیں، احباب اب مجھے بھوپال کے پتہ سے خط نہ لکھیں۔

ان ساڑھے تین برسوں میں دنیا بدل گئی، بیسیوں خیالات بدل گیے، بہت سے نظریوں میں انقلاب آگیا، بعض ممکن اب ناممکن اور ناممکن اب ممکن ہو گیے، ایک ملک دو ملک ہو گیے، ایک ملک کے رہنے والے خود اپنے ملک میں بیگانہ ہو گیے، غالباً تاریخ میں اس واقعہ کی مثال نہ ملے گی۔

ان دونوں ملکوں کے درمیان بڑھتے ہوئے اختلافات کا طوفان امنڈا آرہا تھا، اور ڈر تھا، کہ اس سیلاب کی زد میں خدا جانے کیا کیا آئے، کہ خلیج بنگال کے دہانہ پر آکر وہ تھم گیا، یعنی بنگال کے پچھلے واقعات نے دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم کو پچھلے دور زندگی پر غور کرنے اور ایک مصالحتی معاہدۂ

نوٹ:- ۱۹۴۶ء سے معارف میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے شذرات کا تسلسل برقرار نہیں رہ سکا ہے، کیونکہ اس زمانے میں بیشتر ان کا قیام بھوپال میں رہا اور وہیں سے شذرات بھی تحریر فرما کر بھیج دیتے تھے، اس کا بھی التزام نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۹ء کے کسی مہینے میں سید صاحب کے شذرات نہیں شایع ہو سکے، البتہ ۱۹۴۸ء میں چار اور ۱۹۵۰ء میں دو ماہ کے شذرات انہیں کے قلم سے ہیں اور انہیں پر شذرات سلیمانی کا اختتام ہوتا ہے۔

پر متفق کر دیا، بنگال ہی سے (کلکتہ اور نواکھالی) یہ سیلاب اٹھا تھا، اور شاید بنگال (مشرقی و مغربی بنگال) پر آکر ختم ہو گیا، خدا کرے کہ انسان کے حیوان بننے کا سلسلہ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

ہندوستان اور پاکستان کا یہ معاہدہ دونوں ملکوں کی اقلیتوں کے لیے پناہ کا سایہ ہے، اور جیسا کہ لیاقت علی خاں نے اپنے امریکہ کے ایک بیان میں کہا ہے کہ یہ قدم تقسیم کے بعد سب سے پہلے اٹھنا چاہیے تھا، مگر سوءِ اتفاق نے ایسا نہ ہونے دیا، بہر حال اب جو قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھ چکا ہے، اب اس سے ہٹنا نہ چاہیے، کہ اس ہٹنے میں دونوں کی تباہی ہے۔

اس معاہدہ نے دونوں ملکوں کی قدر دنیا کی نظروں میں بڑھا دی، اور دونوں ملکوں کے وزیر اعظموں کے اخلاص، تدبر اور دانش مندی کی تحسین دنیا بھر کے اخباروں نے کی، خصوصیت کے ساتھ پاکستان اور ہندوستان کے اڈیٹروں کی باہمی ملاقات اور مبادلۂ خیال اور میل جول کے تعلقات نے ملک میں جو خوشگوار فضا پیدا کی ہے، اس سے امید ہوتی ہے کہ شاید ہماری مصیبتوں کے بادل ان دونوں ملکوں کے افق سے ہمیشہ کے لیے چھٹ گئے۔

ہندوستان کے باشندوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ آج وہ زمانہ ہے جس میں ساری دنیا سمٹ کر ایک گھر میں جمع ہو گئی ہے، اور ساری قومیں مل جل کر آیندہ دنیا کا نقشہ بنا رہی ہیں، ایسی حالت میں ہندوستان کے کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ وہ اپنی دنیا الگ بنائیں، اور ہزارہا سال پیچھے ہٹ کر پھر ملک کو ویسا ہی بنا دیں جیسا پہلے تھا، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ریل اور ہوائی جہاز کے اس دور میں پھر سے بہلی اور رتھ پر سوار ہو کر اپنا سفر شروع کر دیں، اور آپ دیکھیں گے کہ یہ تخیل ہندوؤں اور مسلمانوں میں نہیں، بلکہ ہندوؤں اور ہندوؤں میں تفرقہ پیدا کر دے گا، اور اس باقی ملک کو بھی بیسیوں ملکوں میں تقسیم کر دے گا۔

اپنے صوبہ کے ٹنڈن جی کی آواز تھم تھم کر پھر سنائی دیتی ہے، اخباروں میں آیا ہے کہ راج رشی نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ ہندو کلچر کو اختیار کریں، ورنہ پاکستان کی راہ لیں، اگر یہ بیان صحیح ہے تو ٹنڈن جی سے اول تو میرا یہ کہنا ہے کہ کیا وہ ملک کے ڈکٹیٹر ہیں، یا بادشاہ،

جو پوری قوم کی طرف سے اپنے خیال کا اظہار حکم کے لہجہ میں کر رہے ہیں، وہ اس صوبہ کی اسمبلی کے ایک اسپیکر اور اس صوبہ کی کانگریس کے صدر ہیں، اس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں، اور اس لیے وہ اس تحکمانہ لہجہ میں باتیں کر کے اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔

وہ ہندو کلچر جس کے وہ منادی ہیں، کہاں پایا جاتا ہے، کیا ان کی داڑھی ہندو کلچر ہے، کیا ان کا ننگا سر ہندو کلچر ہے، کیا بھارت کی یونیورسٹیوں میں ہندو کلچر ہے، کیا ہمارے بڑے بڑے عہدیداروں، نئے تعلیم یافتوں اور طالب علموں کے طور طریق اور لباس وصورت اور زبان وبیان اور طریق زندگی میں ہندو کلچر ہے، آج ہر جگہ یورپ کا تمدن پھیل رہا ہے، اسی کی پیروی ترقی کا نام پا رہی ہے، ہمارے نوجوان برملا کہتے ہیں، کہ یورپ کے اس غلبہ اور استیلا کو جو ہر میدان میں نظر آ رہا ہے، آج ہندو کلچر سے نہیں، بلکہ اسی کے طور و طریق سے روک سکتے ہیں، اور اب یہ پرانی باتیں کسی پرانے ڈھنگ کے ملک میں بھی نہیں چل سکتی ہیں، اس لیے اگر کوئی نئے زمانہ کا دل جلا نوجوان کسی دن خود راج رشی سے یہ کہدے کہ رشی جی آپ یورپین کلچر اختیار کیجئے، ورنہ ہندوستان چھوڑ کر نیپال کی ترائی میں چلے جایئے، اور وہیں تپسیا کیجئے، تو کیا ہوگا۔

ہندوستان کے بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ ہے، کہ ملک آنکھیں بند کر کے جواہر لال کے پیچھے چلے۔ ان کے خیالات کو دل میں جگہ دے، اور ان کے احکام کی تعمیل اور ان کی نصیحتوں پر عمل کرے، ورنہ تنگ خیال تحریکیں ملک کو ویران کر دیں گی، صوبوں کی زبان وار تقسیم، ہزار سال کی مردہ ریاستوں کو دوبارہ جنم دینے کا خیال، سنسکرت کو ملک کی زبان بنانے کی تحریک، یہ سب اسی تنگ خیالی کی پیداوار ہیں۔

بھارت نے جو اپنا آئین تیار کیا ہے، اس میں اقلیتوں کے جان ومال، عزت وآبرو، اور مذہب و تمدن و زبان کی حفاظت اور حقوق کی مساوات کی جو دفعہ رکھی ہے، اس کا بار بار ذکر آتا ہے، اور اس کو اقلیتوں کی حفاظت کا سنگی قلعہ سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے، مگر یہ نکتہ ذہن سے نکل جاتا ہے، کہ کاغذ پر لکھا ہوا آئین کسی اقلیت کی حفاظت کا سامان نہیں، بلکہ اس پر عمل حفاظت کا سامان ہے، اگر اکثریت کا مزاج

اس آئین کے مطابق نہ ہو، تو آئین بھی ردی کاغذ کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں، ضرورت ہے کہ بھارت کے باشندے اس آئین کی قدر کرنا سیکھیں، اور اپنی غلط کاری سے انصاف اور برابری کی ان سطروں کو نہ کاٹ دیں، جو ان کے نمایندوں نے ان کی رہنمائی کے لیے اس آئین نامہ میں لکھی ہیں۔

(معارف ماہ مئی ۱۹۵۰ء)

(۲)

مئی کے شذرات میں ٹنڈن جی کے اس مطالبہ پر کہ مسلمان ہندو کلچر اختیار کریں، میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے لہجہ میں گو سختی ہے، جس کا مجھ کو افسوس ہے، تاہم جو بات لکھی گئی ہے، اس کی سچائی میں کوئی شبہہ نہیں، ٹنڈن جی اس صوبہ کی کانگریس کے اس وقت سب سے بڑے آدمی ہیں، کانگریس کے اصولوں میں ہندو و مسلمانوں کا امتیاز نہیں، ایسی حالت میں ٹنڈن جی کا بار بار یہ مطالبہ کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ ہندو کلچر اختیار کریں، کانگریس کی بولی نہیں، ہندو مہاسبھا کی بولی ہے،

کانگریس کے بڑے لوگوں نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ ہندوستان کے کل باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، یا عیسائی، سب ایک قوم ہیں، اور اسی لیے انھوں نے ہندو کلچر اور مسلمان کلچر کی تفریق ماننے سے انکار اور صرف ایک ہندوستانی کلچر کا اقرار کیا ہے، ایسی صورت میں صوبہ کانگریس کے موجودہ صدر کی یہ بار بار رجز خوانی کہ مسلمان ہندو کلچر اختیار کریں، مسلم لیگ کے اس دعوے کی تصدیق ہے کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں، اور دونوں کے دو کلچر ہیں، لیکن اب ان میں سے ایک کو مٹ جانا اور صرف دوسرے کو زندہ رہنا چاہیے۔

پھر ٹنڈن جی کو چاہیے کہ آئین ہند کی اس دفعہ کو مٹوا دیں جن میں اقلیتوں کے مذہب، زبان اور کلچر کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں، کہ آئین بنانے والوں اور آئین کے ماننے والوں کے ذہنوں میں یہ چیز تھی کہ ہندوستان میں مختلف مذہب، مختلف زبانیں، مختلف تمدن اور مختلف کلچر ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کو زندہ رہنا چاہیے۔

ملک کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر پنڈت جواہر لال نے آج سے بہت پہلے اپنی آپ بیتی میں

بڑے شد ومد سے یہ ثابت کیا تھا، کہ ہندوستان میں کوئی ہندو کلچر اور مسلمان کلچر نہیں ہیں، اور ان میں لوٹا اور لٹیا کے سوا کوئی فرق نہیں ہے، اگر ان کا یہ بیان سچ ہے تو پھر صدر صوبہ راج رشی ٹنڈن جی کے اس مطالبہ کے کہ "مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ہندو کلچر اختیار کرلیں" کیا معنی ہوسکتے ہیں۔

اتفاق دیکھئے کہ عین ان سطروں کے لکھتے وقت "پانیر" مورخہ ۲۱ مئی سنہ ۱۹۵۰ء میں پنڈت جواہر لال نہرو کی وہ تقریر چھپی ہے، جو انھوں نے دہلی کی نمائندہ نیشنل اسٹوڈنٹس ایسی سی ایشن دہلی میں ۲۰ مئی کو کی ہے، اس میں کہتے ہیں کہ:

> "ملک کے نوجوانوں میں ہندو کلچر کے نعروں کی رہبری کی جارہی ہے، جو نہایت گھٹیا، عامیانہ، تنگ دلانہ اور مغرورانہ ہے، ہمارے خیال میں کلچر طریق، کردار اور طریق عمل کا نام ہے، اس کے معنی جو تم ہوتے ہو، نہ کہ جو تم پکار کر کہتے اور لکھتے ہو، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم ترقی یافتہ قوم بنیں، تو ہم کو چاہیے کہ ہم اپنی ذہنیت کو بھی ترقی دیں، ملک کی تقسیم سے پہلے جب اسلامی کلچر کی بات کہی جارہی تھی، تو آج سے سترہ برس پہلے میں نے اپنی کتاب آپ بیتی میں ہندو کلچر اور اسلامی کلچر پر بحث کی تھی، کہ ہندو اور مسلم کلچر سے کیا مراد ہے، میں اس کے سمجھنے سے قاصر ہوں،......... البتہ ہندوستانی کلچر، عرب کلچر اور ایرانی کلچر تک تو سمجھ میں آسکتا ہے۔

پنڈت جی نے جو بات کہی ہے، وہ کانگریس کا نقطۂ خیال ہے، اور اسی پر اس کی ساری سیاست کی بنیاد ہے، ایسی صورت میں ٹنڈن جی کا مطالبہ ایک ایسی بات ہے جو سراسر کانگریس کے اصولوں کے خلاف ہے، اور بجائے اس کے کہ مسلمان اس کی مخالفت میں آواز اٹھائیں، خود کانگریسیوں کو اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے، اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو وہ اپنے اصولوں سے پیچھے ہٹتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں پنڈت جی نے وہ بات کہی ہے جو معارف میں بار بار کہی گئی ہے، کہ ہندوستان کی ترقی کا زمانہ ہمیشہ وہ رہا ہے، جب اس نے دوسری قوموں اور ملکوں سے تعلقات پیدا کیے، اور بیرونی

اثرات کو قبول کیا ہے، اور اس کے زوال کا زمانہ وہ ہے جب وہ دنیا سے اپنے کو الگ تھلگ کرکے اپنے اندر محدود ہو گیا ہے۔

۲۳ رمئی ؁۵۰ء کے "پانیر" میں وحید احمد صاحب پارلی منٹری سکریٹری یوپی کی ایک تحریر نظر سے گذری، جس سے معلوم ہوا کہ ٹنڈن جی نے ملک کی معاشرتی اصلاح کی طرف بھی قدم اٹھایا ہے اور اپنی ایک تقریر میں انٹر میریج یعنی ہندوستان کے مختلف فرقوں کے درمیان شادی بیاہ کے رواج کی تجویز پیش کی ہے، میں نے یہ تقریر نہیں پڑھی، اگر اس سے ٹنڈن جی کا مقصد ہندو جاتیوں کے درمیان شادی بیاہ کے رواج کی تجویز ہے، تو مجھے اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں ہے، لیکن اگر اس سے مقصود ہندو مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ کی تجویز ہے، جیسا کہ مضمون نگار کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، تو میں ٹنڈن جی کی اس تحریک کو مسلمانوں کی امتیازی حیثیت کو فنا کر دینے کے لیے دوسرا قدم سمجھتا ہوں منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا بحیثیت مسلمان کے جداگانہ وجود باقی نہ رہے۔

لیکن مجھے اس تحریر کو پڑھ کر ٹنڈن جی سے زیادہ خود مضمون نگار کے جواب سے جو اسلام کی طرف سے انھوں نے دیا ہے، سخت تکلیف ہوئی ہے، مضمون نگار نے راج رشی کو اس تجویز کی بنا پر مغل اعظم کا خطاب دیا ہے، کہ اکبر نے راجپوت شہزادیوں سے بیاہ کرکے جس رواداری کا ثبوت دیا تھا، راج رشی اسی کا رواج اب اس عہد کے مغل اعظم بن کر دینا چاہتے ہیں، اور اس کے بعد مضمون نگار نے ہندوؤں کی مذہبی کتاب "وید" کو الہامی کتاب مان کر اور ہندوؤں کو اہل کتاب میں داخل کرکے مسلمانوں اور ہندوؤں میں نکاح کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔

مضمون نگار میرے پرانے دوست ہیں، اس لیے اوّل تو ان سے مخلصانہ عرض ہے۔

چیزے کہ نخواندۂ تو تفسیر مکن صیاد نۂ اگر تو نخچیر مکن

"کتاب" قرآن پاک میں ہر اس کتاب کا نام نہیں، جس کو کوئی قوم اپنی الہامی کتاب مانے، بلکہ اس کتاب کا نام ہے، جس کے الہامی کتاب ہونے کی قرآن پاک نے خبر دی ہے، اور وہ صرف تورات، زبور اور انجیل ہیں، اور ان کتاب ...... والوں کی بھی، عورتوں کا نکاح مسلمان

مردوں سے جائز ہے، مردوں کا نکاح مسلمان عورتیں سے درست نہیں، اور ایسی قوموں کو جو اسلام سے پہلے کسی ایسی کتاب کی مدعی ہوں، جس کی تصدیق قرآن پاک نے نہیں کی ہے، فقہا نے بہ شبہ اہل کتاب کا خطاب دیا ہے، ان سے نکاح کسی طرح کا قطعاً ناجائز ہے، افسوس ہے کہ کمزور عقیدہ کا مسلمان آج اپنے کو اکثریت سے مغلوب پاکر اپنے بچاؤ کے لیے اپنے قتل نامہ پر اپنے ہاتھ سے دستخط کرنے کو تیار ہے۔

ہم ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ اور میل جول پر دل سے یقین رکھتے ہیں، لیکن یہ قطعاً ضروری نہیں سمجھتے کہ اس غرض کو دین دھرم کا فرق مٹا کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے، بلکہ ہندو ہندو اور مسلمان مسلمان رہ کر بھی اس غرض کو حاصل کرسکتے ہیں، جس کی مثالیں انگریزوں کی پھیلائی ہوئی تعلیم سے پہلے ہندوستان میں کثرت سے تھیں، اور اب بھی ہیں۔

(معارف ماہ جون ۱۹۵۰ء)

اشاریہ

شذراتِ سلیمانی

حصہ سوم

مرتبہ

محمد عارف عمری رفیق دارالمصنفین

اشخاص

(الف)

آرتھر اسٹینلی : ۴۳
آزاد سبحانی (مولانا) ۲۵۹، ۳۳۳
آرگب (پروفیسر) ۴۷
آرنلڈ (پروفیسر) ۳۶
آصف فیضی : ۱۸۳
آغا خاں : ۱۸۱
آغا سنجر طرانی : ۳۰۸، ۳۰۹
آقائے محمد تقی : ۲۴۷
ابراہیم حمدی (شیخ) ۱۶۲، ۲۱۱
ابراہیم زکی : ۳۷
ابن تیمیہ (علامہ) ۳۴۱
ابن سعود (سلطان) ۳۲
ابوالاعلیٰ مودودی (مولانا) ۱۶۳،
۱۶۴، ۲۳۶، ۲۵۹، ۲۶۶، ۳۳۳
ابوالحسن علی ندوی (سید) ۲۰۵،
۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۸۹
ابوالفضل (شیخ الازہر) ۹۳
ابوالوفا قندھاری : ۱۸۰، ۲۱۰
ابوبکر صدیقؓ (حضرت) ۱۵۷
ابوالکلام آزاد (مولانا) ۵۴، ۱۸۲،
۳۳۲، ۳۸۸، ۳۸۹
ابوبکر جونپوری (مولانا) ۴، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰
ابوسعید خزار : ۱۸۳
ابوظفر ندوی (سید) ۶۷
ابومحمد (سید) ۱۰
ابویوسف (قاضی) ۱۳۶، ۱۳۸
احسان اللہ شاہ (پیر) ۱۸۷
احتشام الحق تھانوی (مولانا) ۳۷۳
احمد الشناوی : ۳۷
احمد بن یحییٰ بلاذری : ۱۳۳
احمد علی (مولانا) ۷۸
احمد علی خاں (شوق) ۹، ۴۰
احمد معمار : ۱۵

احمد یار خاں دولتانہ : ۲
اختر یار جنگ : ۲۴۱
ادریس (مولانا) ۲۴
اسحاق سندیلوی (مولانا) ۲۷۹
اسنوک (پروفیسر) ۱۱۹
اشرڈ ٹمان (پروفیسر) ۱۴۳
اشرف علی تھانوی (مولانا) ۱۱۶، ۳۱۱، ۳۸۶
اعظم کوفی : ۱۷۷
افضال قادری (ڈاکٹر) ۳۵۹
اقبال (سر ڈاکٹر) ۱۵، ۳۲، ۷۸، ۱۱۸، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۳۳۲
اکبر حیدری (سر) ۲۳۵، ۲۸۴
اکرام اللہ خاں ندوی (مولوی) ۲۳۳
الطاف حسین (مولوی) ۱۳۶
الطاف علی : ۷۶
الطاف کریم (سید) ۲۶۲
الیاس برنی (مولوی) ۲۱۰
الیاس کاندھلوی (مولانا) ۳۳۵
امتیاز علی عرشی : ۲۶۴
امجد (حکیم الشعراء) ۱۵۷
امرناتھ جھا (پروفیسر) ۱۴۱
امیر مینائی : ۲۴۱
انوار اللہ خاں (مولانا) ۲۲۸
انوار الحق (مفتی) ۲۴۲
انور شاہ کشمیری (مولانا) ۱۹، ۲۱، ۳۳۹
انیس امام (لیڈی) ۱۸۶
اورنگزیب عالمگیر (بادشاہ) ۱۰۷، ۲۳۳
اویس ندوی (مولانا) ۲۵۸
اے اے فیضی : ۴۷
اے۔ جی ویسنک : ۳۸، ۴۰، ۴۳، ۴۵
ایس۔ اے جبار : ۳۳۹
ایس۔ ڈی۔ ایف گوئیٹین : ۱۳۴
اے فسر (پروفیسر) ۴۷
اینڈرسن (مسٹر) ۲۳۷

(ب)

بادر (پروفیسر) ۱۴۳
بادشاہ میاں (حکیم) ۵۶
بٹ (ڈاکٹر) ۱۲

بدرالدین چینی : ۳۶، ۹۳، ۱۱۷
بدرالدین علوی (مولانا) ۹۴
بدرالدین (مولانا) ۲۳۳
بذل الرحمن (ڈاکٹر) ۲۲۹
براؤن (پروفیسر) ۲۴۷
برلڈ فان کلوبر (ڈاکٹر) ۴
برہان اللہ حسینی (شاہ) ۱۵۲
بشار بن برد : ۹۴
بشیرالدین (مولوی) ۱۰۲، ۱۳۶
بشیر حسین زیدی : ۲۶۴
بلنٹ (مسٹر) ۳۷۶
بہجت عطار : ۱۱۲
بہجت وہبی (ڈاکٹر) ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷

(پ)

پرنس کائتانی : ۱۱۹
پریم چند (منشی) ۱۲۳
پنت جی : ۴۰۱

(ت)

تاثیر (ڈاکٹر) ۲۳۶
تاراچند (ڈاکٹر) ۱۴۹
تیج بہادر سپرو (سر) ۲۱۵

(ٹ)

ٹڈل (ڈاکٹر) ۳۶۳
ٹنڈن جی : ۳۵۵، ۴۰۱، ۴۱۳، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸
ٹویامہ (مسٹر) ۱۷۵

(ج)

جابر بن حیان : ۸۸
جالب (سید) ۱۵۱
جرماتوس (ڈاکٹر) ۶۳
جمال الدین افغانی : ۹۴
جواہر لال نہرو (پنڈت) ۱۴۹، ۱۸۲، ۴۱۴، ۴۱۶، ۴۱۷

(ح)

حالی (مولانا) ۱۰۳، ۱۷۳
حامد اسطرلابی : ۱۵۲
حامد نعمانی (خلف علامہ شبلی) ۲۹۲، ۲۹۳
حبیب احمد ندوی (حکیم) ۲۳۰

حبیب الرحمن خاں شیروانی: ۹، ۱۰، ۲۰، ۳۱، ۶۷، ۱۶۱، ۲۰۷، ۲۳۳، ۲۵۴، ۳۰۴، ۳۲۳

حسن برنی (مولوی سید) ۳۰۹

حسین رؤوف بے: ۱۰

حمیدالدین فراہی (مولانا) ۱۱۲، ۱۲۰

حیدر حسن ٹونکی (مولانا) ۲۹۹، ۳۰۰

(خ)

خالدہ ادیب خانم: ۴۴

خدیجۃ الکبریٰؓ (حضرت) ۱۵۷

خلیل الرحمن (مولوی) ۱۵۹

خلیل اللہ خاں خلیل: ۱۲۷

خواجہ حسن نظامی: ۷۷

خواجہ عبدالوحید: ۷۸

خورشید الاسلام: ۲۶۸، ۲۶۹

(د)

دارا شکوہ: ۱۳۶

داؤد پوتا (پروفیسر) ۱۸۳

داؤد غزنوی (مولانا) ۲۴۶

دیانرائن نگم (منشی) ۸۲، ۳۱۵

دین محمد (ماسٹر) ۲۱۱

(ذ)

ذاکر حسین (ڈاکٹر) ۱۷۶، ۲۶۶

ذکاء اللہ (خان بہادر) ۲۸۸

ذکی ولیدی (ڈاکٹر) ۱۲۸

(ر)

راجندر پرشاد (بابو) ۱۴۷

راجہ محمود آباد: ۱۲۱، ۳۴۴

راس مسعود (سر) ۳۲، ۷۴، ۱۴۳

راشد الخیری (مولانا) ۱۰۷

رتھ (ڈاکٹر) ۱۴۲

رشدی صالح الملحس: ۳۵

رشید احمد صدیقی: ۱۰

رشید احمد گنگوہی (مولانا) ۳۱۱

رشید رضا مصری: ۹۲، ۹۳، ۱۱۲

رشید الدین (چودھری) ۳۳

رئیس احمد جعفری: ۱۷، ۲۳۰

ریاست علی ندوی (سید) ۱۳، ۱۸۹، ۳۵۲

ریاض حسن خاں (مولوی) ۲۵۱
ریاض حسن خاں خیالی : ۱۹۴
ریاض خیر آبادی : ۶۰

(ز)

زغول پاشا : ۲۵۹
زکریا (مولانا شیخ الحدیث) ۳۳۷
زئیر اسٹین (پروفیسر) ۷۴
زین العابدین (امام) ۱۵۷

(س)

سارجنٹ (مسٹر) ۳۳۸
ساعاتی : ۱۷۹
سخاوت علی جونپوری (مولانا) ۲۴۸
سراج احمد (مولانا) ۲۴
سر سلیمان (جسٹس) ۳۳، ۷۴
سردار شاہ محمود خاں : ۳۵
سر علی امام : ۵۶، ۵۷
سر محمد یعقوب : ۵۹
سرور خاں گویا : ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۲۷، ۱۹۳، ۱۹۴
سعد الدین ندوی (مولوی) ۱۶۴، ۲۱۱
سعید الحق ایم اے : ۳۳۹
سکینہ (پروفیسر) ۲۱۵
سلطان جہاں بیگم (نواب) ۳۹، ۱۵۶
سلیمان (سرشاہ) ۲۶۲، ۲۶۳
سلیمان اشرف (مولانا) ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷
سلیمان پھلواروی (شاہ) ۲۰۵
سمپورنا نندجی : ۱۸۲
سید احمد گیسو دراز : ۱۵۷
سید امین الحسینی : ۳۳
سید حفیظ (ڈاکٹر) ۱۳۶
سید عبداللہ (ڈاکٹر) ۲۳۶
سید علی بلگرامی : ۲۲۵

(ش)

شافٹ (پروفیسر) ۱۴۳
شبلی نعمانی (علامہ) ۳۹، ۸۹، ۲۳۱، ۲۴۴
شبیر احمد عثمانی (مولانا) ۲۴، ۱۳۰، ۲۵۹
شرف الدین یحیٰی منیری : ۵۵
شریف علی (مکہ) ۳۲
شفاعت احمد خاں (ڈاکٹر) ۳۳

شفیق احمد : ۳۶۱

شکیب ارسلان (امیر) ۱۳۱

شمس الدین محمد (میجر) ۲۳۷

شوکت علی (مولانا) ۱۸۹

شیر علی (مولانا) ۱۰۷

(ص)

صباح الدین عبدالرحمٰن (سید) ۳۴۸

صدرالدین خاں (نواب) ۲۱، ۲۲

صدریار جنگ : ۱۲۲، ۲۰۷

صدیق حسن خاں (نواب) ۱۸۰

صلابت جاہ بہادر (نواب) ۴۴

صوفی تبسم (پروفیسر) ۷۸، ۲۳۶

(ض)

ضیاء الحسن علی ندوی : ۲۰

ضیاء الدین احمد (ڈاکٹر) ۸۶، ۱۲۱

ضیاء الدین محمد قائم اصطرلابی : ۴

(ظ)

ظاہر خاں (شاہ) ۳۵

ظفر حسن (مولوی) ۱۳۶

ظفر علی خاں (مولوی) ۲۲۵

(ع)

عبدالباری ندوی (مولانا) ۲۰، ۱۳۲، ۱۵۴، ۱۶۱، ۲۲۶، ۲۳۳

عبدالحامد بدایونی (مولانا) ۲۵۹

عبدالحق (مولوی) ۵۹، ۱۲۲، ۱۴۷، ۲۹۱، ۲۹۲، ۳۲۳، ۳۳۷

عبدالحق مدنی (مولانا) ۳۳۷

عبدالحمید سعید بے : ۲۴۵، ۲۴۶

عبدالحمید یونس : ۳۷

عبدالرحمٰن (سید) ۲۴۷

عبدالرحمٰن (مولانا) ۱۶

عبدالرحمٰن کاشغری (مولوی) ۲۵۸

عبدالرزاق کانپوری (مولوی) ۱۹۰

عبدالرشید ابراہیم : ۱۷۶

عبدالرؤف عشرت (خواجہ) ۲۴۱

عبدالستار صدیقی (ڈاکٹر) ۲۰۷

عبدالسلام قدوائی (مولانا) ۳۴۶

عبدالعزیز (شیخ) ۹۴

عبدالعزیز (مولانا) ۲۵۳

عبدالعلیم صدیقی (مولانا) ۱۶۵

عبدالقادر (پروفیسر) ۶۷، ۱۵۳، ۲۲۸

عبدالقادر سروری (پروفیسر) ۲۲۸، ۳۱۰

عبدالقادر قصوری (مولانا) ۳۱۳، ۳۱۴

عبدالقدوس الانصاری : ۱۰۵

عبدالقدیر بدایونی : ۲۲۸

عبدالقوی (ڈاکٹر) ۷۸

عبداللہ چغتائی (مولانا) ۱۶، ۱۵۳، ۲۳۶، ۳۳۰

عبداللہ خاں (قاری) ۱۳۱

عبداللہ یوسف علی : ۶۵

عبدالماجد دریابادی (مولانا) ۱۷، ۵۸، ۶۵، ۹۲، ۱۱۶، ۱۶۱، ۲۲۳، ۲۵۹، ۲۶۶، ۲۸۱، ۲۸۲، ۳۹۵

عبدالمجید صدیقی (پروفیسر) ۲۲۸

عبدالوحید (خواجہ) ۲۲۵، ۲۳۶

عبدالوہاب دہلوی (مولانا) ۲۹

عبدالوہاب عزام : ۲۲۴

عبیداللہ سندھی (مولانا) ۲۹، ۳۲۵، ۳۴۰

عزیزالحسن مجذوب : ۳۴۰

عزیزالحق (چودھری) ۲۲۳

عزیز مرزا (مولوی) ۲۲۵

علی محمد جکلائی : ۴۷

عمران خاں ندوی (مولانا) ۱۶۳، ۱۸۳، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۳۳

عنایت اللہ (شیخ) ۱۶

عنایت اللہ فرنگی محلی (مولانا) ۲۷۲

عنایت اللہ مشرقی : ۳۳۲، ۳۳۳

(غ)

غازی رؤوف : ۴۴

غلام احمد پرویز : ۴۲، ۴۳

(ف)

فرائٹلائن لشٹن اسٹیٹر : ۱۴۶

فخرالدین (سر) ۳۶

فخر یار جنگ بہادر : ۱

فضل حق : ۱۸۶

فضل حق آزاد : ۳۰۸، ۳۰۹

فضل حق رامپوری (مولانا) ۲۳۱

فضل صمدانی : ۲۷۴

(ق)

قاسم علی جیراج بھائی (حاجی) ۱۸۱

قربان علی : ۱۷۶

قطب الدین عبدالوالی (مولانا) ۳۳

(ک)

کشن پرشاد کول : ۱۲۰

کفایت اللہ (مولانا) ۳۳

کلکر (مسٹر) ۲۱

کمال یار جنگ : ۲۲۲

کھرے (ڈاکٹر) ۱۸۲

(گ)

گامو (پروفیسر) ۹۷

گاندھی جی : ۱۶۴، ۱۸۲

گویدی (پروفیسر) ۱۱۹

(ل)

لال چند (مسٹر) ۵۹

لطف اللہ (مولانا) ۹

لطف اللہ شاہجہانپوری (مولانا) ۱۲۰

لطف اللہ مہندس : ۱۵

لوئی مینان (پروفیسر) ۴۷

لیاقت علی خاں : ۴۱۴

(م)

مارگولیوتھ : ۴۷، ۱۴۶، ۲۳۳

مبارز الدین رفعت (سید) ۱۵۲

مجیب اللہ ندوی (حافظ) ۳۹۵

محبوب عالم (منشی) ۲۱

محمد آغا اوگلو : ۴۰

محمد ابراہیم (پروفیسر) ۷۶

محمد اسد : ۴۶، ۶۹، ۲۸۵

محمد اقبال (پروفیسر) ۳۶، ۸۳

محمد ایم اے : ۳۱۰

محمد بن حبیب بغدادی : ۱۴۶

محمد پاشا : ۲۵۹

محمد پکتھال : ۵۷، ۱۱۹

محمد ثابت آفندی : ۳۷

محمد حامد الفقی : ۱۳۸

محمد حسن مالدیپی : ۲۲۵

محمد حسین آزاد : ۱۷۳، ۱۸۰

محمد حسین (خان بہادر) ۶۷
محمد حسین (مولوی سید) ۳۶
محمد حسین (مولوی محوی) ۱۵۸، ۱۵۹
محمد حمید اللہ (ڈاکٹر) ۸۸، ۱۱۳، ۱۱۵، ۱۲۹، ۱۷۵
محمد حنیف ندوی : ۲۶
محمد سجاد (ابوالمحاسن) ۲۵۲، ۲۵۳
محمد سلیمان (قاضی) ۲۰۵
محمد سورتی (مولانا) ۳۰۵، ۳۰۶
محمد شاکر ندوی : ۶۸
محمد شاہ آغا خاں : ۷۳
محمد شفیع (پروفیسر) ۱۶، ۳۶، ۱۵۳، ۱۸۳
محمد شفیع (مفتی) ۳۸۶
محمد طیب (مولانا) ۱۲۰
محمد عبدہ : ۹۳
محمد عرفان (مولانا) ۲۰۳
محمد عزیر (ڈاکٹر) ۸۳
محمد علی (مولانا) ۱۷۲، ۳۳۲، ۳۳۹
محمد علی جینا : ۳۳۳، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸
محمد عمر نعمانی (مولوی) ۲۵۳
محمد فضل الرحمن انصاری (حافظ) ۱۶۶
محمد فواد عبدالباقی : ۷۵
محمد فیروز آبادی : ۳۰
محمد ناظم (ڈاکٹر) ۷۶
محمد یار جنگ بہادر : ۳۰۶، ۳۰۷
محمد یعقوب (سر) ۳۱۳، ۳۱۵
محمد یوسف باقوی : ۵
محمد یوشع (مولوی) ۱۵۸، ۱۵۹
محمود جونپوری (مولانا) ۲۶۲
محمود حسن خاں (مولانا) ۲۹۹
محمود شیرانی (حافظ) ۳۶، ۹۵
محی الدین رضا : ۱۱۲
مختار احمد انصاری (ڈاکٹر) ۳۳
مختار بیگم : ۲۹۷
مزمل اللہ خاں (نواب) ۲۰، ۳۷، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۸۶
مسعود عالم ندوی (مولوی) ۲۶۳، ۳۵۲

مسعود علی ندوی (مولوی) ۱۷، ۲۵، ۱۹۶
مشکوۃ (سید محمد) ۲۷۹
مصطفےٰ کمال (اتاترک) ۱۸۸، ۱۸۹
مصطفےٰ مراغی: ۱۱۹
مطلوب الرحمٰن (مولوی) ۱۶، ۲۶
مظفر الدین ندوی (مولانا) ۲۶، ۹۰
مظہر الحق: ۴۰۷
معین الدین (جسٹس) ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۶۴
معین الدین ندوی (حاجی) ۲۶۵
معین الدین اجمیری (خواجہ) ۱۵۷
معین الدین اجمیری (مولانا) ۲۳۱
معین الدین احمد ندوی (شاہ) ۱۳۸، ۱۹۰، ۳۵۲
مناظر احسن گیلانی (مولانا) ۴۵، ۵۴، ۲۰۷، ۲۲۶، ۳۵۹
منظور نعمانی (مولانا) ۳۳۷
منہیار: ۱۸۵
موسیٰ جار اللہ: ۱۹۳، ۲۶۰
مہدی یار جنگ: ۱۲۲، ۲۲۱، ۲۲۲
میر عثمان علی خاں (فرماں روائے دکن) ۳۱، ۱۰۰، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۵۴
میونک (پروفیسر) ۱۴۳

(ن)

نادر خاں (شاہ افغانستان) ۳۲
نجیب اشرف ندوی: ۷۶، ۲۳۰
نذیر احمد (ڈپٹی) ۱۰۳
نذیر احمد (صوفی) ۳۳۳
نصیر (بیرسٹر) ۳۱۲، ۳۱۳
نظام الدین اولیاء: ۱۵۷
نعیم الدین مرادابادی (مولانا) ۳۳
نعیم الرحمٰن (پروفیسر) ۲۹۴
نکلسن (پروفیسر) ۴۷
نور الحسن برلاس (پروفیسر) ۶۹، ۹۷، ۱۱۵، ۱۶۷، ۱۷۵
نور الحسن نیر: ۱۲۰
نور الحق ندوی (مولوی) ۲۳۴
نولکشور (منشی) ۲۱

(و)

وائلس وائلز (پروفیسر) ۱۴۳

وتک (ڈاکٹر) ۱۷۵

وحید احمد ندوی : ۳۹۵

وحید الدین سلیم (مولوی) ۱۵۱

وحید الرحمٰن ندوی : ۳۹۵

وصل بلگرامی : ۳۱۱

ولی اللہ دہلوی (شاہ) ۲۹، ۱۱۹

(ھ)

ہدایت حسین (حافظ) ۱۰۷

ہشام بن عبد الملک : ۲۳

ہلال بن یحییٰ بن مسلم : ۱۳۸

ہوش بلگرامی : ۱۵۵

(ی)

یحییٰ بن آدم القرشی : ۱۳۸

یعقوب خاں : ۱۸

یمین السلطنت (مہاراجہ) ۱۵۷، ۲۴۰، ۲۴۱

یوسف کوکن عمری (مولانا) ۲۱۵، ۲۱۶

کتب

(الف)

آثار المدینۃ المنورۃ : ۱۰۵
آداب الحرب : ۱۸۳
آواز پر جبریل (رسالہ شیخ سہروردی) ۱۱۸
اپنشد (فارسی ترجمہ) ۱۴۲
اخبار الدولۃ السلجوقیۃ : ۳۶
اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلی : ۲۱۰
ارض القرآن : ۹۰، ۳۳۹
ازالۃ الخفار : ۲۹
اسباق النحو : ۱۳۸
اسرار حج : ۲۴۷
اسلام ان کراس روڈ : ۶۴، ۶۵
اسلام کا سیاسی نظام : ۲۷۹، ۳۲۱
اسلام کے زوال سے مسلمانوں کو کیا نقصان پہونچا : ۲۹۰
اشتراکیت اور اسلام : ۳۵۲
افکار عصریہ : ۲۸، ۳۹، ۶۸
الابانۃ عن اصول الدیانۃ : ۳۲۶
الاصابہ فی استدراک عائشہؓ : ۳۸۷
البدایۃ والنہایۃ : ۸۹
البرامکہ : ۳۱۵، ۳۱۶
التفہیم فی صناعۃ التنجیم : ۲۳۶
التنقیح لالفاظ الجامع الصحیح : ۸۹
التوسل الی الترسل : ۱۸۰
الحیلۃ الناجزہ : ۳۸۷
الرد علی سیر الاوزاعی : ۲۱۰
الفاروق : ۲۲۵
الفتح الربانی : ۱۸۰
الکفایہ : ۱۹۴، ۲۷۳
الکلام (علامہ شبلی) ۲۷۶، ۲۷۷
الکواکب الدراری : ۸۹
المعتبر : ۱۹۴
الٰہی نامہ : ۱۴۳
امہات الامہ : ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵
انساب الاشراف : ۱۳۳، ۱۳۴، ۲۱۰

(ب)

بدر الاسلام : ۲۵۸

بزم تیموریہ : ۳۹۹

بیان مذاہب الباطنیہ : ۱۴۳

(ت)

تابعین : ۱۳۸، ۱۴۲

تاریخ آل سبکتگین : ۱۹۴

تاریخ ابن خلدون : ۱۳۱

تاریخ اخلاق اسلام : ۲۰۴

تاریخ ادبیات ایران : ۲۴۷

تاریخ اسلام : ۱۱۷، ۱۱۸، ۲۰۳، ۲۰۹، ۳۲۰

تاریخ الحکماء : ۳۶

تاریخ القرآن : ۲۴۷

تاریخ بخاری : ۲۴۶

تاریخ بغداد : ۳۱

تاریخ بیہق : ۲۴۶

تاریخ حیات پیغمبرؐ : ۲۴۷

تاریخ دولت عثمانیہ : ۲۰۴، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۷، ۳۲۰

تاریخ سندھ : ۳۷۰

تاریخ صقلیہ : ۳۹، ۵۳، ۶۸

تاریخ عالم آرائے عباسی : ۲۴۶

تاریخ کبیر : ۵۱، ۲۷۳

تاریخ محمود شاہی : ۲۷۳، ۲۷۴

تاریخ مکہ : ۲۸، ۲۹

تاریخ منتظم : ۲۷۳

تاریخ ہند : ۱۳۷، ۱۳۸

تتمہ تیمیۃ الدہر : ۱۸۰

تجوید القرآن : ۲۴۷

تحفہ سامی : ۱۸۰

تذکرۃ الشعراء نصر آبادی : ۲۴۶

تذکرہ شعرائے اردو : ۳۶

تذکرہ کاملین رام پور : ۴۰

تفسیر ابن کثیر : ۱۸۰

(ج)

جامع کبیر (امام محمد) ۱۸۰

جوامع اصطلاح المنطق : ۵۱

(چ) چینی مسلمان : ۳۷، ۱۰۲

(ح)

حدود العالم : ۱۸۰

حقیقت دین : ۷۵

حکیم سنائی : ۱۲۷

حیات سعدی : ۱۸۰

حیات شبلی: ۲۱۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۷۲، ۳۲۰

(خ)

خطبات شبلی : ۲۷۳

خطبات مدراس : ۳۳۹

خلفائے راشدین : ۲۲۵

خیام : ۲۸، ۳۲، ۳۵، ۱۲۸

(د)

درۃ التاج لغرۃ الدباج : ۲۷۹

دروس الادب : ۱۳۹

دعوت اسلام : ۳۶

دی آوٹ لائن آف دی ورلڈ ہسٹری : ۱۱۷

دیوان بشار بن برد : ۹۴

دیوان بیدار : ۱۵۹

دیوان حکیم سنائی : ۲۴۶

دیوان حکیم نظامی : ۲۴۶

دیوان کلیم : ۲۴۶

(ذ) ذیل جامع تواریخ رشیدی : ۲۴۶

(ر)

رحمت عالمؐ : ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴،
۲۵۵، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۶۲، ۲۷۵، ۲۷۶،
۲۸۱، ۲۹۱، ۲۹۷، ۳۰۷، ۳۲۰

رسالہ اہل سنت والجماعت : ۴، ۵

رسالہ بیرونی : ۱۱۸

رسالہ ابن ہیثم : ۲۷۳

رسائل بوعلی سینا : ۲۴۶

رسائل جابر بن حیان : ۸۸، ۸۹

رسائل شیخ سہروردی : ۲۴۶

رسائل طوسی : ۲۷۳

رسول وحدت : ۱۶۴

(ز)

زندگانی حضرت علیؓ : ۲۴۷

(س)

سخندان فارس : ۱۳۱، ۱۸۰

سخنوران ایران : ۱۲۸

سسلی کا اسلامی تمدن : ۱۳

سفر السعادہ : ۳۰

سنن بیہقی : ۵۱، ۱۲۳، ۱۹۴

سیر الصحابہ : ۱، ۱۹، ۲۰، ۲۸، ۳۹

سیرۃ النبیؐ : ۱، ۱۹، ۲۰، ۳۲، ۸۲، ۸۳،
۸۹، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۲۴، ۱۳۲، ۱۶۰، ۱۷۹، ۱۹۵،
۲۰۴، ۲۰۷، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۳۳،
۲۵۹، ۲۹۶، ۳۷۱

سیرت سید احمد شہیدؒ : ۲۰۴، ۲۰۵

سیرت عائشہؓ : ۳۲، ۳۵، ۳۸۷

سیرت محمد بن عبدالوہاب : ۲۶۴

(ش)

شعر العجم : ۱۲۷، ۱۳۱، ۱۸۰، ۲۴۷

(ص)

صحیح بخاری : ۶۹، ۸۲

صفۃ الصفوۃ : ۱۹۴

(ض)

ضرب کلیم : ۱۱۸

(ظ)

ظہور الاسرار : ۲۷۴

(ع)

عربوں کی جہاز رانی : ۱۰۲

عربی لغت کی تاریخ : ۱۳

عظمت محمدؐ : ۲۴۷

عنوان الشرف : ۱۳۹

عورت ایام العرب میں : ۱۴۶

(غ)

غبار خاطر : ۳۸۸

غزالی نامہ : ۲۴۷

(ف)

فتح الباری : ۸۹

فتح البیان : ۱۸۰

فتح الخبیر : ۳۰

فتوح البلدان : ۱۳۳

فتوح السلاطین : ۱۵۹

فخر الاسرار : ۲۷۴

فوز الکبیر : ۲۹

(ک)

کتاب احکام الوقف : ۱۲۳

کتاب احکام القضاۃ : ۱۴۳

کتاب اصلاح الوقف : ۱۲۳

کتاب الآثار : ۱۳۶

کتاب الاموال : ۱۳۸

کتاب الخراج : ۱۳۸

کتاب الصدق : ۱۸۳

کتاب الصیدلہ : ۳۰۴، ۳۰۹، ۳۱۰

کتاب الفہرست : ۱۴۳

کتاب المحبر : ۱۴۶، ۳۲۶

کتاب المعتبر : ۹۴، ۲۷۳

کتاب المنمق : ۱۴۶، ۳۲۶

کتاب الوقف : ۱۳۸

کتاب ہفت باب : ۷۵

کردار و گفتار محمدؐ : ۲۴۷

کشف الظنون : ۲۹۰

کلام ابن درید : ۹۴

کلام حکیم سنائی : ۱۱۵

کلمات محمدؐ : ۲۴۷

کلیات شبلی : ۲۱۹

(م)

مبین : ۲۰۵

مجموعہ مقالات بر محمود شیرانی : ۹۵، ۹۶

محاسن اصفہان : ۱۸۰

محمدؐ نزم : ۱۱۹

مسند احمد بن حنبل : ۱۷۹

مسوی : ۲۹

مصفی : ۲۹

مصیبت نامہ : ۲۴۶

معرفۃ السنن والآثار : ۳۶۱

مقالات شبلی : ۵۳، ۶۸، ۱۳۲

منتخب اعلام النبوۃ : ۱۱۸

منتخب دیوان خاکی : ۷۵

منہاج السنۃ : ۳۴۱، ۳۴۲

موجودہ فرمان روایان عرب : ۶۸

میرج ان ارلی اسلام : ۳۲۶

میزان الحکم : ۲۷۳

میلاد نامہ شیخ عبداللہ عقیقی : ۱۳۳

(ن) نبراس الساری : ۲۵۳ ۔ نقوش سلیمانی : ۲۰۴

(و) واقعات اظفری : ۵۹!

اخبار و رسائل

(الف)

آرس اسلامیکا : ۴۰، ۱۴۳

اتحاد : ۲۷

اسٹیٹمن : ۱۸۲

اصلاح (لکھنؤ) ۱۶، ۲۶، ۳۷

الاصلاح (سرائے میر) ۱۱۳

الامان : ۲۶

البشیر (اٹاوہ) ۱۰۲

البیان : ۲۶۶

الجمیعۃ : ۲۶

الحبیب : ۱۶۵

الضیاء : ۲۰

المرشد : ۸۲

المنار : ۱۱۲

الندوہ : ۲۱۸، ۲۱۹

انقلاب : ۲۶

اودھ اخبار : ۲۱

اورینٹل کالج میگزین : ۱۸۳

(پ) پانیر : ۳۱۷، ۳۱۸

(ت) ترجمان القرآن : ۱۶۳

(ٹ) ٹرتھ (لاہور) ۱۶۷

(ج) جینوین اسلام : ۱۶۶

(خ) خلافت : ۲۶

(ز)

زمانہ (کانپور) ۸۲

زمیندار : ۲۶

(س)

سچ (لکھنؤ) ۶، ۹۲

سرچ لائٹ (پٹنہ) ۱۴۱

سرفراز (لکھنؤ) ۶

(ص) صدق : ۹۳

(ع)

عالمگیر : ۳۱۱

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ : ۱۵۱

(ک) کوثر : ۳۴۴

(م)

مدینہ : ۲۶
مرقع : ۳۱۱
مسلم گزٹ (لکھنؤ) ۱۵۱
معارف (اعظم گڈھ) ۳۹، ۷۳، ۱۲۷،
۱۵۱، ۲۲۱، ۳۲۲، ۳۲۵، ۳۲۸،
۳۲۹، ۳۳۰، ۳۵۲، ۳۵۵
(ملت (دہلی) ۱۷۶

(ن)

ندیم (گیا) ۱۸۹

(و)

والیس آف اسلام : ۱۶۶

(ھ)

ہمایوں (لاہور) ۱۴۵
ہمدم (لکھنؤ) ۱۵۱
ہند جدید : ۲۶
ہندوستان (روزنامہ) ۲۳۰
ہندوستان (ہفتہ وار) ۱۸۲

(ی)

یونیورسٹی میگزین (علی گڑھ) ۱۱

ادارے

(الف)

آکسفورڈ یونیورسٹی : ۱۴۶

آل انڈیا ہسٹاریکل کانگریس : ۳۲۸

ادارہ ادبیات اردو : ۲۲۸، ۲۹۵، ۳۳۹

ادارۂ اقبال : ۲۹۶

ادارہ تعلیمات اسلام : ۳۴۶، ۳۴۷

ادارہ معارف اسلامیہ (لاہور) ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۸۳، ۱۰۷، ۱۷۴، ۱۹۰، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۸۳

اسکول آف فارن لنگویجز (جاپان) ۶۹، ۹۶

اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن (بمبئی) ۷۴، ۷۵، ۱۸۳، ۲۹۶

اسلامک لٹریری سوسائٹی (ہانگ کانگ) ۶۶، ۸۴

اسلامیہ اسکول (اٹاوہ) ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۳۶، ۱۳۹

اسلامیہ دارالاشاعت : ۵

اسلامیہ کالج (پشاور) ۲۳۴، ۲۳۵

اسماعیل کالج (بمبئی) ۲۲۹، ۲۳۰

امریکن اورینٹل سوسائٹی : ۳۲۷

انجمن ادبی (افغانستان) ۱۱۴

انجمن اردو مشرقی بنگال و آسام : ۱۴۸، ۱۸۹

انجمن اردوئے معلی : ۱۰

انجمن اسلام (بمبئی) ۲۳۰

انجمن اسلامیہ (رانچی) ۵۶

انجمن اشاعت اسلام : ۲۱

انجمن ترقی اردو : ۵۳، ۱۲۲، ۱۳۶، ۱۴۷، ۱۷۴، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۷، ۲۳۰، ۲۹۰، ۲۹۲، ۳۴۵

انجمن حیات اسلام : ۷۷، ۷۸

انجمن خدام الدین : ۷۸

انجمن شباب المسلمین : ۲۴۶، ۲۵۲

انجمن عربی صوبہ متحدہ : ۵۹، ۲۹۴، ۲۹۵

انجمن علوم اسلام سنگھائی : ۱۱۷

اورینٹل انسٹی ٹیوٹ (بڑودہ) ۸۳

اورینٹل کالج (لاہور) ۳، ۳۴، ۳۶

ایشیاٹک سوسایٹی : ۳۲۶

(ب)

بنگال ایشیاٹک سوسایٹی : ۱۳۹

بھارت اتہاس شمودھکا منڈل : ۲۲۹

بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ : ۲۲۸، ۲۲۹

(پ) پنجاب کونسل : ۲

(ت) تبلیغی جماعت : ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷

(ٹ) ٹراونکور یونیورسٹی : ۳۱۰

(ج)

جامع ازہر : ۱۱۹، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۸۳، ۱۸۴، ۲۱۱

جامعہ دار السلام عمر آباد : ۳۵۰

جامعہ عثمانیہ : ۹۷، ۲۱۰، ۲۲۶

جامعہ ملیہ : ۱۳، ۴۵، ۴۶، ۸۰، ۸۱

جمعیۃ الشبان المسلمین : ۱۲۸

جمعیۃ العلماء : ۳۵۰

جمعیۃ تعلیم الاسلام (پنجاب) ۱۷۰

جمعیۃ دعوت و تبلیغ (مالابار) ۸۴، ۸۵

جمعیۃ علمائے اسلام : ۳۶۹

(ح) حالی ہائی اسکول (پانی پت) ۱۰۳

(د)

دار الاسلام : ۱۶۳

دار العلوم ندوۃ العلماء : ۲۵، ۲۶،
۱۳۹، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۹۹، ۲۱۲، ۲۱۳،
۲۱۴، ۲۱۸، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۷۵، ۲۹۷،
۳۴۵، ۳۴۶

دار المصنفین : ۳۹، ۴۱، ۶۸، ۸۲، ۸۳،
۱۱۷، ۱۱۸، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۵۷، ۱۶۱، ۱۹۳،
۲۰۹، ۲۲۰، ۲۹۷، ۳۰۲، ۳۲۳، ۳۵۲،
۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۹۶، ۳۹۹

دائرۃ المعارف (حیدر آباد) ۵۱، ۱۲۳، ۱،
۱۲۴، ۱۳۶، ۱۵۷، ۱۷۴، ۱۹۳، ۲۷۳، ۳۰۷، ۳۲۶

دائرۂ حمیدیہ : ۱۱۳

دکن کالج (پونہ) ۲۲۸

(ر)

رضا اکیڈمی : ۲۶۳، ۲۶۴

رکشنا بھارت ہندی پرچار سبھا : ۲

رچگاں یونیورسٹی (امریکہ) ۱۴۳

(س) سندھ عربک یونیورسٹی ایسوسی ایشن : ۲۸۴

(ش)

شاہی نکیتان : ۱۹۴

(ص)

صادق ایجرٹن کالج : ۲۳۷

(ط)

طبیہ کالج (علی گڑھ) ۱۲

(ع)

عرفات : ۶۴

(ف)

فورٹ ولیم کالج : ۱۴۸

(ک)

کبر الاجمعیۃ العلماء : ۱۸۲، ۱۸۴

(ل)

لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر (مصر) ۱۷۵

(م)

مجلس احیاء المعارف النعمانیہ : ۱۸۰، ۲۱۰

مجلس تاریخ مذاہب (امریکہ) 119

مجلس طلبائے قدیم دار العلوم ندوۃ العلماء : ۱۷

مجمع فواد (مصر) ۳۳۸، ۳۳۹

محفل اسلام (راندیر) ۲۳

مدراس یونیورسٹی : ۱۵۸، ۱۵۹

مدرسۃ الاصلاح : ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۳۹

مدرسہ رفیع الاسلام : ۲۷۳، ۲۷۴

مدرسہ نظامیہ : ۲۲۸، ۲۳۳

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس : ۳۷، ۸۶، ۸۷، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۸۶، ۲۲۰، ۲۲۲

مسلم مشن اینڈ لٹریری ٹرسٹ : ۱۸۱

مسلم یونیورسٹی : ۱۰، ۱۱، ۳۴، ۳۳۷

میسور یونیورسٹی : ۳۱۰

(ن)

ناگری پرچارنی سبھا : ۳، ۱۸۲

نظارۃ المعارف القرآنیہ : ۲۹

نظامیہ طبیہ کالج : ۲۲۷

نیشنل اسکول (شبلی کالج) ۲۳۱، ۲۳۲

(ھ)

ہالے یونیورسٹی (جرمنی) ۱۴۳

ہسٹاریکل ریسرچ انسٹیٹیوٹ : ۲۷۴، ۲۹۵

ہندوستانی اکیڈمی : ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۵۹، ۱۷۴، ۱۹۶، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۴

کتب خانے

(د)

دیسنہ لائبریری : ۱۳۹

(ش)

شاہی کتب خانہ ریاست رامپور : ۹, ۱۰, ۱۹۴

(ک)

کتاب خانہ دانش طہران : ۱۸۰

کتب خانہ برٹش میوزیم : ۱۴۶

کتب خانہ حمیدیہ (بھوپال) ۹۶

کتب خانہ راندیرہ : ۲۳

کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت : ۱۶۲, ۱۶۳, ۲۱۱

کتب خانہ صدر الدین خاں مرحوم بڑودہ : ۲۲

کتب خانہ مولوی ناصر حسین : ۱۴۶

کتب خانہ ندوۃ العلماء : ۴

مقامات

(الف)

آسٹریا : ۶۳، ۶۴

آسٹریلیا : ۷۹

استنبول : ۱،

اعظم گڈھ : ۴۱

افغانستان : ۳۲، ۳۵، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۲۷

ایران : ۱۸۰، ۲۴۶، ۲۴۷

(ب)

بدوطھی : ۱۴

بروصا : ۱

برلن : ۱۱۹

بڑودہ : ۲، ۲۱، ۲۲، ۲۳

بسمت نگر : ۱۰۷، ۱۰۸

بمبئی : ۱۸۱، ۲۲۹، ۳۹۰

بنارس : ۱۹۴

بنگال : ۵، ۶، ۱۴۸

بنگلور : ۱۶۵

بوٹسڈم : ۴

بھاول پور : ۲۳۶

بھدوہی : ۲۱۱

بہار : ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۱۷۴، ۲۷۰، ۳۰۳

بھڑوچ : ۲۳

بھوپال : ۹۶، ۱۰۱، ۳۹۳، ۳۹۴

بورنیو : ۱۶۶

بھیکم پور : ۱۸۴

(پ)

پٹنہ : ۳۶، ۵۵، ۱۹۴

پٹھان کوٹ : ۱۶۳

پشاور : ۱۹۴، ۲۳۳

پونہ : ۲۲۸

پھلواری شریف : ۳۶، ۱۹۹

پیرس : ۱۱۸

(ت)

ترکی : ۱، ۱۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۳۲۱

(ٹ)

ٹراونکور : ۵
ٹوکیو : ۸۰، ۱۷۵
ٹونک : ۱۸۰

(ج)

جاپان : ۶۸، ۶۹، ۸۰، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۶۶، ۱۷۵، ۱۷۶، ۳۷۲
جاوا : ۱۶۶
جدہ : ۳۲
جرمنی : ۱۶۶
جزیرہ ٹرمینی ڈاڈ : ۷۹
جھنڈا حیدرآباد سندھ : ۱۸۶

(چ)

چین : ۱۶۶

(ح)

حجاز : ۹۹، ۱۰۰
حیدرآباد دکن : ۹۶، ۹۹، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۶۳، ۱۹۴، ۲۲۶

(د)

دہلی : ۱۳، ۱۹۴
دھولیہ : ۹۴
دیسنہ : ۲۷۰

(ڈ)

ڈابھیل : ۲۴

(ر)

راجپوتانہ : ۲
رام پور : ۱۹۴
رانچی : ۵۶
راندیر : ۲۳، ۲۴
رجولی : ۵۵
رومہ : ۱۱۸

(س)

سماٹرا : ۱۶۶
سندھ : ۲۸۴
سنگاپور : ۱۶۶
سیام : ۱۶۶

(ش)

شاہدرہ : ۱۱۴

(ع)

علی گڑھ : ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۹۴

عمرآباد : ۳۵۰

(ف)

فلسطین : ۳۴

(ق)

قسطنطنیہ : ۱، ۲۰، ۱۸۰

(ک)

کراچی : ۱۶۵

کلکتہ : ۱۹۴

کوڈرمہ : ۵۶

کیرالا : ۸۱، ۸۲

کیوبے : ۸۰، ۱۱۶، ۱۷۵

(گ)

گجرات : ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵

گیا : ۵۵

(ل)

لاہور : ۱۳، ۱۴، ۱۹۴، ۲۳۶

لندن : ۳۲

(م)

مارشس : ۷۹

مالدیپ : ۲۲۵

مڈگاسکر : ۷۹

مرولی : ۲۴

مصر : ۱۸۰

مظفرنگر : ۱۶۶

مکہ معظمہ : ۳۵

ملایا : ۱۶۶، ۱۶۸

منچوریا : ۶۸

(ن)

ناندیڑ : ۱۵۲

نوادہ (بہار) ۵۵

(و)

وردھا : ۳۵۱

ویل وشارم : ۳۵۰

(ھ)

ہانگ کانگ : ۶۶، ۸۴

ہزاری باغ : ۵۶

موضوعات

(مذہبی)

اتحادِ امت : ۸۰، ۲۰۱، ۳۷۳، ۳۷۷، ۳۹۲
احترامِ رسول : ۱۵۸
اخلاص : ۸۵
اسلامزم : ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۱۷، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۹۲
اسلام کے مسائل مالیہ : ۱۳۸
اسلامی لٹریچر بہ زبان انگریزی : ۴۷، ۷۹
انٹرمیڈیٹ : ۳۱۸، ۳۱۹
ایمان وعمل : ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۲۳۰، ۲۳۵، ۲۴۰، ۲۵۱، ۲۹۸
بدعات محرم : ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸
بنگال کے مسلمانوں کی اصلاح : ۵
پیغمبر اسلامؐ کی شان میں گستاخی کا مسئلہ : ۱۱۷
ترکی میں اشاعتِ اسلام ۲۶۰، ۲۶۱، ۳۲۱، ۳۲۲
تبلیغ دین : ۶، ۱۶۵، ۱۶۶، ۲۵۷، ۳۷۳، ۳۹۰
تحریف معنوی : ۳۲۱
تقریرِ سیرت : ۱۶۴، ۲۳۵، ۲۳۷
تقلیس : ۲۱۸
جاپان میں اشاعت اسلام : ۶۸، ۶۹، ۸۰، ۸۴، ۱۱۶، ۱۶۷، ۱۷۵، ۱۷۶، ۳۷۲
جذباتی طریقہ کار : ۴۹، ۵۰
جلسہ سیرت : ۲۱
جہاد فی سبیل اللہ : ۲۵۶، ۲۵۷
چین کے مسلمان : ۳۶، ۳۷
حج کے فوائد : ۱۰۰
دینِ الٰہی کی تردید : ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹
رمضان المبارک کی اہمیت : ۱۵۶
زیوروں میں زکوٰۃ : ۳۱۹
سادگی وکفایت سعاری : ۱۱، ۱۲، ۱۵۵
ضابطہ جنایات کی تدوین : ۳۱
عذاب الٰہی : ۲۷۷، ۲۷۸

عقیدہ اسلام کی تشریح : ۱۶۷، ۱۶۸

عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں پر نظر : ۱۴، ۷۹

فتنہ نگار : ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵،
۲۴۷، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۶۶، ۲۶۷،
۳۶۳، ۳۵۴، ۳۶۵

فتویٰ نویسی : ۳۸۶، ۳۸۷

فقہی مسائل کی کتاب : ۳۷۱، ۳۸۶

قادیانیوں کی سرگرمیوں پہ نظر : ۷۹، ۱۶۷

قانون قتل و قصاص کی ترتیب و تدوین : ۹۶

قرآن پاک کے انگریزی ترجمے : ۵۷، ۵۸،
۶۵، ۶۶، ۲۲۳، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۹۰، ۳۰۷

قرآن پاک کے ترجمہ پر اختلاف : ۱۱۹، ۱۲۰

قرآن مجید کا ملیالم ترجمہ : ۸۲

مجالس محرم : ۲۲۹

مذہب اور سیاست : ۱۶۳

مذہب میں عدم مداخلت : ۱۶۱، ۱۶۲

مسئلۂ تصاویر : ۳۱۸، ۳۱۹

مسئلہ سود : ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶

مسئلہ قضاء : ۳۲، ۳۳

مشرقی قیادت کی تردید : ۳۲۴، ۳۲۵

مصر کی مذہبی حالت : ۹۳، ۹۴

معاشرتی اصلاح : ۹، ۱۵۵، ۵۶، ۳۸۴

سودودی امارت کی تردید : ۳۲۴، ۳۲۵

نئے علم کلام کی ضرورت : ۲۶۷، ۲۶۸،
۲۶۹، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۳

ہندوستان کی مسلم ریاستوں میں عورتوں
کے حقوق : ۹۸، ۹۹

یورپ میں اسلام کی نشر و اشاعت :
۶۳، ۱۶۵، ۱۶۶

موضوعات

(علمی و تعلیمی)

احادیث نبوی کی فہرست : ۴۰، ۷۵، ۷۶

استشراق : ۳۲۶، ۳۲۷

اسلام علوم کی تحقیقات کی راہیں: ۱۲۹

اصلاح نصاب تعلیم : ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۸۸، ۲۰۰، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۹۳

اعزازی علمی ڈگریاں : ۳۲۳، ۳۲۵

افغانستان کی تعلیمی و علمی ترقیاں: ۳۲

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام : ۳۷، ۳۸

انگریزی تعلیم گاہیں اور مضمون عربی: ۱۳۳، ۱۳۸، ۱۵۹

انگریزی داں علماء : ۱۷۸، ۱۷۹

اورنگزیب عالمگیر کی ہندو نوازی: ۱۰۷، ۱۰۸

بڑودہ اور تعلیم : ۲۲

تاج محل کی تعمیر: ۱۵

تجویز تالیف تاریخ ہند: ۲، ۶۶، ۶۷، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۶، ۷۷، ۸۰، ۹۴، ۹۵، ۱۰۹، ۱۵۱، ۱۵۲، ۲۳۸

تحریک ندوہ : ۲۱۲، ۲۶۱

تعلیم نسواں : ۹۶

تعلیمی کانفرنس علی گڑھ: ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶

درسگاہوں کی ذمہ داریاں : ۱۴

دیہاتی تعلیم و ترقی : ۸۷

صحیح بخاری کا انگریزی ترجمہ : ۲۸۵

صوبہ متحدہ اور تعلیم : ۸۶، ۸۷، ۱۶۹، ۱۷۰

عربی صرف و نحو کی تعلیم: ۱۳۸، ۱۳۹

عربی مدارس : ۱۸۷، ۱۸۸، ۲۰۰

علوم عربیہ کی تعلیم : ۱۲، ۱۳، ۲۱۶، ۳۳۶

عمارتوں اور قبروں کے کتبات: ۱۵۲، ۱۵۳

عملی تعلیم کا خاکہ : ۳۳۸

فلسطین میں ایک یونیورسٹی کے قیام کی تحریک : ۳۳، ۳۴

قومی تعلیم و تربیت کے اصول : ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۱۷۷، ۱۷۸

لاہور کی تاریخی عمارتیں : ۱۷، ۱۸

مذہبی تعلیم : ۱۷۰، ۱۸۱، ۲۱۲

مسلمانوں کے علٰحدہ تعلیمی نظام کا مسئلہ : ۱۴

مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم : ۴۷، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۸۱

مسلم یونیورسٹی اور اردو امتحانات : ۴۴

مسلم یونیورسٹی اور صنعتی کالج : ۱۳۴، ۱۳۵

مسلم یونیورسٹی اور مخلوط تعلیم : ۴۴

مصر کی تعلیمی حالت : ۳۸، ۹۳، ۹۴

مصر کی شاہی لغوی مجلس : ۳۸

معلم کے فرائض : ۶۰، ۶۱

مورخین ہند کی کانفرنس : ۳۵۰

نالندہ کے کھنڈرات : ۵۵

وردھا اسکیم : ۱۶۹، ۱۷۶، ۱۸۱

ودیا مندر اسکیم : ۱۷۷

ہندو تہذیب میں سامی عنصر کی موجودگی : ۴۸

ہندوستانی اصطرلاب : ۴۴، ۱۵۲

ہندوستان کے مستقبل کا نظام تعلیم : ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۹۰، ۳۹۱

یادا پوری جینیوں کی پرستش گاہ : ۵۵

یورپ سے علمی مرعوبیت : ۸۷، ۳۸۵، ۳۹۰

موضوعات

(قومی و سیاسی)

آزادی کا تصور: ۳۸۲، ۳۹۷، ۴۰۹، ۴۱۰
اسلام کا سیاسی و اقتصادی نظام: ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۶، ۲۷۸، ۲۷۹
اسلامی کلچرل زون کی تحریک: ۲۰۸، ۲۰۹
ترقی کا مفہوم: ۶، ۷، ۸، ۳۶۷
تقسیم ہند: ۴۰۸، ۴۱۳، ۴۱۴
جرات و ہمت کی ضرورت: ۲۷۰، ۲۷۱
جنگ عظیم: ۲۵۶، ۲۷۷، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۶۶، ۳۶۹
حکومت الٰہیہ: ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳
حکومت حجاز: ۳۰
سکھوں کے مظالم: ۱۷، ۱۸
سیاسی اتحاد کی ضرورت: ۱۹، ۲۷، ۲۸، ۱۱۱، ۱۱۲
سیاسی انتخابات: ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۳۲، ۱۶۱، ۳۶۶
سیاسی خود مختاری: ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹
سیاسیات میں توازن: ۱۹۹، ۳۷۰
سیکولرزم: ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷
شملہ کانفرنس: ۳۶۱
شیعہ سنی تنازعہ: ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۷
عرب ریاستوں کی وحدت: ۳۵۱، ۳۶۲
قوم کے رہنماؤں کی رہنمائی: ۱۳۵، ۱۶۱، ۱۶۲
قوم یہود کا عروج: ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۶۷
قومی ترقی کے اصول: ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۵۰، ۲۵۱، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۳، ۳۸۴
کلچرل آٹانومی (تمدنی و مذہبی خود مختاری): ۱۶۱، ۱۹۹، ۲۰۰
مسلمان قوم کی سیاسی تنظیم: ۲۹۳، ۲۹۴، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۹

مسلمانوں کا عروج وزوال : ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۳۹

مسلمانوں کی سیاست خارجہ : ۱۷۵

مسلم کانفرنس : ۱۹

مسلم لیگ : ۱۹، ۳۳۳، ۳۳۴

معاملہ حیدر آباد : ۴۰۸

نظریہ سلطنت در سلطنت : ۱۶۳، ۱۶۴

وطنیت پرستی : ۳۷۶، ۳۷۷

ہندو تہذیب کے فروغ کی کوشش : ۴۸، ۱۱۰، ۱۱۱، ۳۷۸، ۳۹۱، ۳۹۷، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۱۱، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷

ہندو مسلم اتحاد : ۱۰۸، ۱۹۴، ۱۹۵، ۳۸۲، ۳۹۷، ۴۰۵، ۴۱۱، ۴۱۹

ہندوؤں کے مظالم : ۲۷۰

یک قومی و دو قومی نظریہ : ۴۱۰، ۴۱۱

یورپ کی سیاست : ۳۶۲، ۳۶۳

موضوعات

(زبان و ادب)

ادب لطیف کے اداب : ۳۱۶، ۳۴۴، ۳۴۵

اردو انسائیکلو پیڈیا : ۲۷۳

اردو زبان کی تاریخ : ۲۳۰

اردو زبان کی ترویج : ۲۳۰، ۳۰۳، ۳۰۴

اردو کے مسائل : ۲، ۳، ۶، ۱۱، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۹، ۹۱، ۱۶۵، ۳۳۷، ۳۹۸، ۴۰۰

اردو کانفرنس : ۵۰، ۱۲۱، ۱۶۵، ۲۰۳

اردو کانگریس : ۳۳۹، ۳۴۰

اردو ہندی تنازعہ : ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۷، ۱۴۰، ۳۵۵

اردو یونیورسٹی کی تجویز : ۳۴۵

افسانہ نویسی : ۶

انشاپردازی کے حدود و آداب : ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۴

انگریزی زبان کو سرکاری زبان بنانے کی رائے : ۱۲۰، ۱۲۱

دکنی اور اردو : ۹۱، ۹۲

عربی زبان : ۲۰، ۲۸۴

لاطینی حروف : ۲۰

مادری زبان کی اہمیت : ۵۰، ۳۶۷، ۳۶۸

مسلمانوں کے لیے متحدہ خط : ۴۸، ۴۹، ۲۲۲، ۲۲۳

ہندوستانی زبان کی اصطلاح : ۱۰، ۱۱، ۵۹، ۹۷، ۹۸، ۱۰۹، ۱۱۶، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۵، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۷۴، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۲۱۴، ۲۱۹، ۲۲۴، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۵۱، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵

ہندوستانی زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم : ۱۴۰، ۱۴۱

ہندوستانی زبان کے اخبار : ۱۶۵، ۲۳۰

ہندستانی کے لیے رومن خط کی تجویز : ۱۳۰

ہندی کو سرکاری زبان بنانے کی کوشش : ۵۰، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۱۰۹، ۱۱۰، ۲۱۳، ۲۱۵، ۳۱، ۳۰۲، ۴۰۳، ۴۰۹

موضوعات

(متفرقات)

اورینٹل کانفرنس بلجیم : ۱۷۵
ڈاک کی ابتری : ۳۰۴، ۳۹۹، ۴۰۰
رجوع اور اعتراف : ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹
سید صاحب کا بھوپال میں قیام : ۳۹۳،
۳۹۴، ۳۹۵
سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں پر تبصرہ:
۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱
سید صاحب کی علالت وصحت : ۱۰۶، ۱۰۷، ۱
۱۹۸، ۱۹۹، ۳۶۵، ۳۶۸، ۳۶۹
صد سالہ یادگار حالی : ۱۰۳.
صوبہ متحدہ و بہار کا زلزلہ (۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء)
۴۱، ۴۲، ۴۳
متکلمین اسلام سے گزارش : ۲۸۵، ۲۸۶،
۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴
مدیر ترجمان القرآن کے جواب میں : ۱۶۳، ۱۶۴
مضمون ذبح عظیم پر وضاحت و رجوع :
۱۳۶، ۱۳۷
مولانا شبلی و مولانا حمید الدین پر غوغائے تکفیر :
۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۲۰
نظام حیدرآباد کا خط سید صاحب کے
نام : ۲۰۲
نظام حیدرآباد کی پچیس سالہ جوبلی :
۱۰۱، ۱۲۹، ۱۳۰